انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

نظمیں، غزلیں

MEMBER APNS CPNE
ممبر آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز

مستقل سلسلے

جون 2014
جلد 28 شمارہ 10
قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی-۲۱، بی آئی بی ایچ ایس سوسائٹی کراچی
Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

ادارہ

پیارے نبی کی پیاری باتیں

قرآن اور اہل بیت

احادیث میں سے حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے جو باب اکرام اہل بیت رسول اللہ میں گزر چکی ہے۔ انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں کھڑے ہو کر خطبہ ارشاد فرمایا۔ اللہ کی حمد وثنا بیان کی 'وعظ کیا اور نصیحت فرمائی' پھر فرمایا۔

"امابعد 'اے لوگو! یقیناً 'میں بھی ایک انسان ہوں' قریب ہے کہ میرے پاس میرے رب کا فرستادہ آجائے اور میں اس کا پیغام قبول کرلوں (کیونکہ اسے رد کرنا تو کسی انسان کے بس ہی میں نہیں) اور میں تمہارے 'یعنی جنوں اور انسانوں کے اندر دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں 'ان میں سے پہلی اللہ کی کتاب ہے جس میں ہدایت اور روشنی ہے۔ چنانچہ تم اللہ کی کتاب کو پکڑو اور اسے مضبوطی سے تھام لو۔"

پھر آپ نے اللہ کی کتاب پر عمل کرنے پر) ابھارا اور اس کے بارے میں ترغیب دی۔ پھر فرمایا۔

"(اور دوسری چیز) میرے اہل بیت رضی اللہ عنہم ہیں میں تمہیں اپنے اہل بیت کے بارے میں اللہ تعالیٰ یاد دلاتا ہوں (ان پر کوئی زیادتی نہ کرنا)۔" (مسلم)

فوائد ومسائل : اس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بشریت کے حوالے سے فرمایا کہ انسان کی طرح موت سے مجھے بھی مفر نہیں۔ کاسۂ موت مجھے بھی بہرحال پینا ہے۔ اس حدیث کو یہاں لانے کا مقصد یہ ہے کہ اس میں وصیت کرنے کا استحباب ہے۔ اہل بیت کی فضیلت بھی اس سے ثابت ہوتی ہے اور یہ کہ ان کا معاملہ نہایت نازک ہے 'اس لیے انسان کو ان کا تذکرہ کرتے وقت نہایت محتاط رویہ اختیار کرنا چاہیے کہ ان کی گستاخی ہو نہ غلو۔

علم

حضرت ابوسلیمان مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ہم ایک جیسی عمر کے نوجوان تھے۔ ہم بیس راتیں آپ کے پاس قیام پذیر رہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بڑے مہربان اور نرم مزاج تھے 'چنانچہ آپ کو خیال ہوا کہ ہم اپنے گھر والوں (کی ملاقات) کے مشتاق ہو گئے ہیں 'چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے پیچھے چھوڑے ہوئے ہمارے گھر والوں کی بابت پوچھا تو ہم نے آپ کو اس کی تفصیل سے آگاہ کیا۔ (جسے سن کر) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تم اپنے گھر والوں کے پاس واپس چلے جاؤ اور وہیں رہو اور انہیں بھی (دین کی باتیں) سکھاؤ اور انہیں (بھلائی کا) حکم کرو اور فلاں نماز فلاں وقت میں پڑھو اور فلاں نماز فلاں وقت میں۔ جب نماز کا وقت ہو جائے تو تم میں سے ایک آدمی اذان کہے اور تم میں سے جو بڑا ہو 'وہ تمہیں نماز پڑھائے۔" (بخاری و مسلم)

اور بخاری نے اپنی ایک روایت میں یہ اضافہ کیا ہے۔ "اور اس طرح نماز پڑھو جس طرح تم نے مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔"

فوائد ومسائل :

1۔ اس میں ایک تو نوجوانوں کے علم دین حاصل کرنے کے شوق کا بیان ہے 'جس کے لیے انہوں نے گھربار چھوڑ کر سفر کیا۔ جس سے معلوم ہوا کہ طلب علم کے لیے اگر سفر کرنے کی بھی ضرورت پیش آجائے تو اس سے گریز نہ کیا جائے۔

2۔ استاد یا منتظم کے لیے ضروری ہے کہ وہ طلباء کے حالات سے آگاہ رہے اور اس کے مطابق مناسب اقدامات اور ہدایات کا اہتمام کرے۔

3۔ جن کو دین کا علم اور شعور حاصل ہو جائے 'ان کو چاہیے کہ وہ ان لوگوں کو بھی دین سکھائیں جو دینی علوم اور دین سے بے بہرہ ہیں۔

4۔ پورے شوق اور جذبے سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کریں۔

5۔ نمازوں کے لیے اذان کا اہتمام ضروری ہے۔

6۔ پیشوائی کی خصوصیات میں سب برابر ہوں تو پھر جو عمر میں بڑا ہو 'وہ امامت کا حق دار ہے۔ پیشوائی کی خصوصیات میں سب سے پہلی خصوصیت قرآن کریم کو اچھے انداز سے پڑھنا اور دوسرے نمبر پر قرآن و حدیث کا علم ہے 'یعنی جو سب سے اچھا قاری ہو 'وہ امامت کا سب سے زیادہ حق دار ہے 'اس کے بعد جو بڑا عالم ہو 'وہ ہے۔

7۔ اذان اور امامت کی مذکورہ ہدایت کا مطلب ہے کہ ہر جگہ اور ہر وقت اذان دے کر جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا اہتمام کیا جائے۔ مدرسہ ہو یا تجارتی مرکز 'سفر ہو یا حضر۔

8۔ نماز میں مطلوب صرف رکوع 'سجدہ کرنا ہی نہیں جیسا کہ اکثر لوگ کہتے ہیں کہ نماز ہی پڑھنی ہے جیسے پڑھ لی جائے۔ اس حدیث میں بتایا گیا کہ نماز اس طرح ادا کرنی ضروری ہے جس طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ادا کی ہے۔

دعا

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عمرے کی اجازت مانگی تو آپ نے اجازت مرحمت فرمادی اور فرمایا۔

"اے میرے پیارے بھائی! اپنی دعا میں ہمیں نہ بھولنا۔" یہ آپ نے ایسا کلمہ ارشاد فرمایا کہ اس کے بدلے میں مجھے ساری دنیا بھی مل جائے تو مجھے خوشی نہ ہو (یعنی یہ کلمہ ساری دنیا سے بڑھ کر مجھے عزیز ہے۔

اور ایک روایت میں ہے "اے میرے پیارے بھائی! اپنی دعا میں ہمیں بھی شریک رکھنا۔" (اسے ابوداؤد اور ترمذی سے روایت کیا ہے اور ترمذی نے کہا ہے یہ حدیث حسن صحیح ہے۔)

الوداع

حضرت سالم بن عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ آدمی سے فرماتے جب وہ کسی سفر کا ارادہ کرتا۔

میرے قریب ہو تاکہ میں تجھے الوداع کہوں جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں الوداع فرمایا کرتے تھے۔ آپ فرماتے۔

"میں تیرے دین 'تیری امانت اور تیرے آخری اعمال کو اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔" (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث حسن صحیح ہے۔)

فائدہ : اس میں مسافر کو الوداع کہنے اور مذکورہ دعائیہ کلمات کے ساتھ اس کے حق میں دعا کرنے کا استحباب ہے۔ وہ دعا یہ ہے۔

استودع اللہ دینک وامانتک وخواتیم عملک۔

زاد راہ

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا۔

"یارسول اللہ! میرا سفر کرنے کا ارادہ ہے 'آپ مجھے زاد راہ عنایت فرمائیں (یعنی میرے حق میں دعا فرمادیں)۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اللہ تعالیٰ تجھے تقویٰ کے توشے سے آراستہ فرمائے۔"

اس نے کہا "میرے لیے مزید دعا فرمائیں۔"
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"اور تیرے گناہ معاف فرما دے۔"
اس نے کہا "کچھ اور۔"
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تو جہاں کہیں بھی ہو' اللہ تعالیٰ تیرے لیے بھلائی کو آسان کر دے۔"

(اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث حسن درجے کی ہے۔)

فائدہ : اس سے معلوم ہوا کہ مسافر کے لیے بہترین زادِ راہ اس کے لیے دعائے خیر ہے۔

استخارہ اور باہم مشورہ کرنے کا بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔
"اور (اہم) معاملے میں ان سے مشورہ کر۔"
(عمران 159)
اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔
"ان کا کام آپس کے مشورے سے ہوتا ہے۔" (الشوریٰ۔38)
یعنی اس میں وہ ایک دوسرے سے مشورہ کرتے ہیں۔

فائدہ آیات : پہلی آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہے' اس میں آپ کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کرنے کا حکم ہے اور دوسری آیت میں مسلمانوں کا طرزِ عمل یہ بتلایا گیا ہے کہ وہ باہمی مشاورت سے اپنے کام کرتے ہیں۔ ان دونوں آیتوں سے واضح ہے کہ ایک دوسرے سے مشورہ کرنا چاہیے۔

استخارہ

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں قرآن کی سورتوں کی طرح ہر معاملے میں استخارہ کرنے کی تعلیم دیا کرتے تھے

فوائد و مسائل :

1۔ استخارہ کے لغوی معنی ہیں' خیر طلب کرنا یعنی اس دعا کے ذریعے سے انسان اللہ سے خیر طلب کرتا ہے۔ یہ دعا قبول ہوتی ہے یا نہیں؟ اس کے معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ استخارہ کرنے والے کو خواب کے ذریعے سے صحیح بات بتلا دی جاتی ہے۔ یا اس کے دل میں خیر والے پہلو کی طرف رحجان پیدا کر دیا جاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن یہ باتیں کسی حدیث میں بیان نہیں ہوئی ہیں۔ ممکن ہے کچھ لوگوں کو خواب یا رحجان کے ذریعے سے بتلا دیا جاتا ہو' جن کے لیے اللہ کی مشیت ہو۔ لیکن یہ اصول یا قاعدہ کلیہ نہیں ہے کہ جو بھی استخارہ کرے گا' اسے ضرور غیبی اشارہ ہو جائے گا۔ اس لیے غیبی اشارے کا انتظار نہیں کرنا چاہیے بلکہ استخارے کے بعد' سوچ سمجھ کر ظاہری اسباب کے مطابق جو بات مناسب لگے' اسے اختیار کر لیا جائے۔ اگر اس کی دعائے استخارہ قبول ہو گئی ہو گی تو یقیناً" اس میں اس کے لیے خیر ہی ہو گی۔ بصورت دیگر نقصان کے امکان کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ بہرحال ایک مسلمان کو دعا کرنے کا حکم اور اس کی تاکید ہے' اس میں تساہل اور تغافل یا اس سے اعراض جائز نہیں۔ دعا کی قبولیت یا عدم قبولیت' اللہ کی مشیت پر موقوف ہے۔ استخارہ بھی ایک دعا ہی ہے اور اس کی تاکید و اہمیت حدیث مذکورہ بالا سے واضح ہے' اس لیے ہر اہم کام میں استخارے کا اہتمام ضرور کرنا چاہیے۔

2۔ یہ استخارہ ان ہی امور کے لیے ضروری ہے جن کا تعلق مباحات سے ہے' جن میں انسان کو خیر اور شر کا علم نہیں ہوتا۔ باقی جو فرائض و واجبات اور سنن و مستحبات ہیں' ان کی ادائیگی تو ہر صورت میں ضروری ہے۔ اسی طرح جو محرمات و مکروہات شرعیہ ہیں' ان سے اجتناب ضروری ہے۔ ان اوامر و منہیات میں استخارہ کرنا جائز نہیں ہے۔ علاوہ ازیں استخارے کا مسنون طریقہ چھوڑ کر نجومیوں' دست شناسوں اور دیگر اسی قسم کے فراڈیوں کے پاس جا کر مستقبل میں پیش آنے والے حالات کا علم حاصل کرنے کی کوشش کرنا جہالت و نادانی کے علاوہ بہت بڑا گناہ ہے۔ غیب کا علم صرف اللہ کو ہے۔ انسان کو صرف اللہ ہی سے خیر کا طالب ہونا چاہیے' تمام قدرتوں کا مالک وہی ہے' ہر قسم کی قوت کا مالک وہی ہے' اسی سے قوت و طاقت کا سوال کرنا چاہیے اور اپنے تمام معاملات اسی کو سونپنے چاہئیں۔

3۔ دعائے استخارہ کسی بھی وقت کی جا سکتی ہے۔ صرف نماز کے مکروہ اوقات میں یہ جائز نہیں کیونکہ اس کے لیے پہلے دو رکعت پڑھنا ضروری ہیں۔ اکثر لوگ سمجھتے ہیں کہ اس کا وقت رات کو سونے سے قبل ہے۔ یہ بات صحیح نہیں۔ دعائے استخارہ کا پڑھنا دو رکعت نماز پڑھنے کے بعد بھی صحیح ہے اور نماز ہی میں تشہد و درود کے بعد سلام پھیرنے سے قبل یا سجدے کی حالت میں بھی جائز ہے۔ دعا یاد نہ ہو تو نماز پڑھنے کے بعد کتاب سے دیکھ کر بھی پڑھی جا سکتی ہے۔

4۔ دوسروں سے استخارہ کرانے کی قرآن و سنت میں کوئی دلیل نہیں ہے' البتہ کسی صاحب بصیرت کو مکمل حالات بتا کر مشورہ کیا جا سکتا ہے' نیز ٹیلی ویژن پر آن لائن استخارہ بھی بدعت ہے' جس کی قرآن و سنت میں کوئی اصل نہیں بلکہ یہ سنت نبوی کی حیثیت کو کم کرنے کے مترادف ہے۔

نمازِ استخارہ

جب کسی کو کوئی (جائز) امر درپیش ہو اور وہ اس میں متردد ہو کہ اسے کروں یا نہ کروں' یا جب کسی کام کا ارادہ کرے تو اس موقع پر استخارہ کرنا سنت ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ دو رکعت نفل خشوع و خضوع اور حضور قلب سے پڑھے۔ رکوع و سجود اور قومہ و جلسہ بڑے اطمینان سے کرے۔ پھر فارغ ہو کر یہ دعا پڑھے :

اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْتَخِيرُكَ بِعِلْمِكَ وَأَسْتَقْدِرُكَ بِقُدْرَتِكَ، وَأَسْأَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ الْعَظِيمِ، فَإِنَّكَ تَقْدِرُ وَلَا أَقْدِرُ، وَتَعْلَمُ وَلَا أَعْلَمُ، وَأَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ۔ اَللّٰهُمَّ إِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ أَنَّ هٰذَا الْأَمْرَ خَيْرٌ لِي فِي دِينِي وَمَعَاشِي وَعَاقِبَةِ أَمْرِي۔ فَاقْدُرْهُ لِي وَيَسِّرْهُ لِي ثُمَّ بَارِكْ لِي فِيهِ، وَإِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ أَنَّ هٰذَا الْأَمْرَ شَرٌّ لِي فِي دِينِي وَمَعَاشِي وَعَاقِبَةِ أَمْرِي فَاصْرِفْهُ عَنِّي، وَاصْرِفْنِي عَنْهُ، وَاقْدُرْ لِيَ الْخَيْرَ حَيْثُ كَانَ، ثُمَّ أَرْضِنِي بِهِ

ترجمہ: اے اللہ! یقیناً" میں (اس کام میں) تجھ سے تیرے علم کی مدد سے خیر مانگتا ہوں اور (حصول خیر کے لیے) تجھ سے تیری قدرت کے ذریعے استطاعت مانگتا ہوں اور میں تجھ سے تیرا فضل عظیم مانگتا ہوں' بے شک تو (ہر چیز پر) قادر ہے اور میں (کسی چیز پر) قادر نہیں۔ تو (ہر کام کا انجام) جانتا ہے اور میں (کچھ) نہیں جانتا اور تو تمام غیبوں کا جاننے والا ہے۔ الٰہی! اگر تو جانتا ہے کہ یہ کام (جس کا میں ارادہ رکھتا ہوں) میرے لیے میرے دین' میری زندگی اور میرے انجام کار کے لحاظ سے بہتر ہے تو اسے میرے لیے مقدر کر اور آسان کر' پھر اس میں میرے لیے برکت پیدا فرما۔ اور اگر تیرے علم میں یہ کام میرے لیے میرے دین' میری زندگی اور میرے انجام کار کے لحاظ سے برا ہے تو اس (کام) کو مجھ سے اور مجھے اس سے پھیر دے اور میرے لیے بھلائی مہیا کر جہاں (کہیں بھی) ہو۔ پھر مجھے اس کے ساتھ راضی کر دے۔"

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ **هذا الامر** کی جگہ اپنی حاجت کا نام لو۔(1)

اگر عربی زبان میں اپنی حاجت کا نام لے سکیں تو بہتر ہے ورنہ یہ دعا ان ہی الفاظ سے پڑھ کر بعد میں اپنی بولی میں اپنی حاجت کا اظہار کیجیے۔

جب آپ یہ مسنون استخارہ کر کے کوئی کام کریں گے تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ضرور اس میں بہتری کی صورت پیدا کرے گا اور برے انجام سے بچائے گا۔ استخارہ رات یا دن کی جس گھڑی میں بھی آپ چاہیں کر سکتے ہیں' سوائے اوقات مکروہہ کے۔

حسن سلوک

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"کوئی پڑوسی اپنے پڑوسی کو (اپنی مشترکہ) دیوار میں لکڑی (یا کیل وغیرہ) گاڑنے سے نہ روکے۔"

پھر حضرت ابو ہریرہ فرماتے۔

"کیا وجہ ہے کہ (اس فرمان رسول کے باوجود) میں تمہیں اس حکم سے منہ پھیرتے ہوئے دیکھتا ہوں' اللہ کی قسم! میں اسے تمہارے کندھوں کے درمیان پھینک کے رہوں گا۔ (یعنی ضرور تمہارے سامنے پیش کروں گا۔)(بخاری و مسلم)

فائدہ :

اس حکم اور تاکید کی اہمیت ان آبادیوں اور بستیوں میں سامنے آتی ہے جو جھونپڑیوں اور خیموں پر مشتمل ہوں' یا ایسے علاقوں میں جہاں اب بھی دو پڑوسیوں کے درمیان پختہ دیوار ایک ہی ہوتی ہے (بڑے شہروں کی طرح اپنی اپنی الگ الگ دیوار نہیں ہوتی) تاہم اس سے یہ اصول ضرور معلوم ہوتا ہے کہ پڑوسیوں کے معاملے میں انسان کو بدمزاج اور بد معاملہ نہیں ہونا چاہیے کہ ایک کیل کا ٹھونکنا یا ایک لکڑی کا گاڑنا بھی اسے ناگوار ہو' بلکہ بعض دفعہ دیکھا گیا ہے کہ صرف ٹھک ٹھک کی آواز ہی سے وہ مشتعل اور لڑنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ بلکہ اس کے برعکس پڑوسیوں کے ساتھ باہم ہمدردی اور تعاون کا معاملہ ہونا چاہیے۔ مسلمان تو تمام ایک جسم کی طرح ہیں' چہ جائیکہ دو پڑوسی بھی آپس میں ایک دوسرے کے دست و بازو نہ ہوں۔

ایمان

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے' وہ اپنے پڑوسی کو ایذا نہ پہنچائے' جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے' اسے چاہیے کہ وہ مہمان کی عزت کرے اور جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے' اسے چاہیے کہ وہ بھلائی کی بات کرے ورنہ خاموش رہے۔" (بخاری و مسلم)

فائدہ : اس حدیث میں ایمان کے ثمرات کا بیان ہے۔ جس میں مذکورہ خوبیاں نہیں ہیں' اسے سمجھ لینا چاہیے کہ وہ ایمان کی برکات سے محروم ہے' اس کا ایمان بے ثمر درخت کی طرح یا اس پھول کی طرح ہے جو خوشبو سے محروم ہے یا ایک ایسا قالب ہے، جس میں روح نہیں۔

پڑوس

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے کہا۔

"اے اللہ کے رسولؐ! میرے دو پڑوسی ہیں' ان میں سے میں کس کو ہدیہ بھیجوں؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

"جس کا دروازہ تیرے زیادہ قریب ہو۔" (اسے بخاری اور ابوداؤد نے بیان کیا ہے)

فائدہ : جب انسان سب پڑوسیوں کو ہدیہ دینے کی استطاعت نہ رکھے اور صرف کسی ایک ہی کو ہدیہ دینا چاہے' تو اس کی ترتیب اس میں بیان کر دی گئی ہے کہ الاقرب فالاقرب کا اصول پیش نظر رہے۔

بہتر ساتھی

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اللہ کے ہاں' ساتھیوں میں سب سے بہتر ساتھی وہ ہے جو اپنے ساتھی کے لیے بہتر ہو۔ اور پڑوسیوں میں سب سے بہتر پڑوسی وہ ہے جو اپنے پڑوسی کے حق میں بہتر ہو۔"

بیٹھے کو سیر دو جہاں کرنا

کہی نہ جائے

مصنف : ممتاز مفتی
تبصرہ : آمنہ زریں

زندگی۔۔۔ ازل تا ابد۔۔۔ کہانی' کرداروں سے جڑی ہوئی۔۔۔ کیفیات کی ارزانی میں مبتلا۔۔۔ وابستگی کے مشاہدے سے منسلک۔۔۔ واقعات کا تسلسل لیے۔ نارسائی کی کسک میں مبتلائے ابتلا۔۔۔ ناآسودگی کا اضطراب سمیٹے۔ تجربات کے بھنور میں ڈوبتی ابھرتی کہانی۔۔۔ زندگی ہے۔

مصنوعات کے اس پُر ہجوم دور میں انسان کو رسائی کا زعم حاصل ہے۔ لیکن یہ رسائی احساس کی شراکت مشاہدے کے رچے عمل اور جڑے زمین کے رستے جیسی ٹھہرائی کے وصف سے محروم ہے؟ ایجادوں سے قبل کا دور' دریافت سے پہلے کی جستجو کا دور تھا۔ زندگی رابطے اور مشاہدے' احساس کی پنہائیوں کا عنوان تھی۔ چیزوں کی فراوانی سے محرومی کو محرومی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اور ایسے ہی دور میں زندگی کو سمجھنے' اس کے ساتھ بھڑنے کا آغاز کرنے والی ہستیوں نے اپنے اپنے کام پر سفر طے کیا اور کس طرح اپنی منفرد لیکن قدرتی صلاحیتوں کے ساتھ نام اور مقام حاصل کیا۔ ممتاز مفتی' اشفاق احمد' قدرت اللہ شہاب' احمد بشیر' ابن انشاء اور دیگر کئی۔۔۔ اس کی مثالیں ہیں!

زیر نظر کتاب "کہی نہ جائے" 1943ء سے شروع ہونے والا ان کا ادبی سفر ارتقا کے مختلف مدارج طے کرتا ہوا۔۔۔ مختلف جہات کا تجربہ کرتے ہوئے ایک منفرد مقام پر پہنچ چکا تھا۔

انسانی نفسیات کی پُرپیچ گتھیوں کو سمجھنے کی خواہش نے انہیں تمام عمر جستجو کے اضطراب میں مبتلا رکھا۔۔۔ اور زندگی کے جیتے جاگتے کرداروں کی کیفیات محض تجسس کے سانچے میں ڈھلنے کی چیز نہیں بلکہ رابطہ' مشاہدہ اور تجربہ ان کے تجسس کی غذا ثابت ہوا۔

کس کس نے علی پور کا ایلی کو پڑھا ہے؟

ممتاز مفتی نے ایلی کو جیا ہے!

ان کی شخصیت' تکلم و فن اور زندگی کا جائزہ لینا ایک نشست میں ممکن نہیں۔۔۔ فی الوقت ان کی مختصر کہانیوں سے لطف اٹھاتے ہیں۔

اکیس کہانیوں پر مشتمل کتاب مختصر سی ہے۔۔۔ مگر۔۔۔!

"شام کے بارے میں تو آپ جانتے ہی ہیں۔ شام پڑتی ہے تو اک بے نام اداسی چھا جاتی ہے۔ نبضیں مدھم پڑ جاتی ہیں۔ دل یوں لگتا ہے جیسے ڈوبا ڈوبا سا ہو حرکات میں شدت نہیں رہتی۔ پتا نہیں کہاں سے ان جانا سا دکھ رستا رہتا ہے۔ میں نے تو یہ سمجھا ہے کہ شام وقت نہیں بلکہ ایک عالم ہے۔"

"مکانوں کے متعلق میرے مشاہدے عجیب سے ہیں۔ وہ عقل پر نہیں بلکہ حسیات پر مبنی ہیں۔ کوئی مکان ایسا ہوتا ہے کہ آپ کو دیکھتے ہی آگے بڑھتا ہے۔ بانہیں پھیلا دیتا ہے۔ آیئے آیئے بسم اللہ۔۔۔ جی آیاں نوں۔ آپ اس مکان میں یوں سیٹ ہو جاتے ہیں جیسے پرانے جوتے میں پاؤں' کوئی مکان ایسا ہوتا ہے کہ آپ کو دیکھ کر پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ ماتھے پر تیوری پڑ جاتی ہے۔ کون ہیں آپ' خواہ مخواہ اندر گھسے آ رہے ہیں۔ کچھ مکان اداس ہوتے ہیں۔ آہیں بھرتے ہیں۔ کراہتے ہیں۔ کچھ ہنسنے کھیلنے پر مائل کرتے ہیں۔ خواہ مخواہ جی چاہتا ہے کہ اٹھ کر بیٹھ جائیں۔ کچھ کریں' اور کچھ نہیں تو مل بیٹھیں۔۔۔"

سنتے ہیں ایک بحث جو طریقہ علاج کے بارے میں مل کر بیٹھے کچھ دوست کر رہے ہیں۔ لیکن کہانی

دراصل اس بحث کا موضوع نہیں ہے۔

"ایلو پیتھی نے جو مرض کو دبا دینے کی رسم پیدا کی ہے اس سے امراض میں اضافہ ہو گیا ہے اور صرف اضافہ ہی نہیں اس سپریشن کی وجہ سے مرض نے کیمو فلاج کرنا سیکھ لیا ہے لہٰذا مرض بھیس بدل بدل کر خود کو ظاہر کرتا ہے۔ اسی وجہ سے اس میں اسرار کا عنصر بڑھتا جا رہا ہے۔ تشخیص کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ کیوں طاؤس! تمہارا کیا خیال ہے۔ ہم نے پوچھا۔ میں تو صرف ایک بات جانتا ہوں۔ طاؤس بولا۔ ہمارا طریق علاج یعنی ہومیو پیتھی یقیناً" روحانی طریقہ علاج ہے۔ ڈاکٹر صاحبان! رشید ہنس کر بولا۔ آپ لاکھ کوشش کریں لیکن ایلو پیتھی کو ری پلیس نہیں کر سکتے۔

وہ کیوں؟ حامد نے پوچھا۔

سیدھی بات ہے! رشید نے جواب دیا۔ آج کل مریض کیور نہیں چاہتا۔ وہ صرف ریلیف چاہتا ہے۔ کیور کے لیے صبر چاہیے۔ استقلال چاہیے۔ آج کل لوگوں کے پاس اتنا وقت نہیں کہ وہ کیور کا انتظار کریں۔

ہمارے نوجوان میڈ کراؤڈ کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے اندر کے فرد کو دبا رکھا ہے۔ بالکل ایسے جس طرح اینٹی بایوٹکس اندر کی بیماری کو دبا دیتے ہیں۔ وہ اکیلے ہونے سے ڈرتے ہیں۔ طاؤس نے ایک لمبی آہ بھری اور گویا اپنے آپ سے بولا۔ کاش کہ میں کوئی ایسی دوا بنانے میں کامیاب ہو سکتا جو اندر کے فرد کو ریلیز کر سکتی۔ میڈ کراؤڈ کی نفی کر سکتی۔

"آدھے چہرے" سے لیا گیا یہ مکالمہ کہانی کو زندگی کے حقائق سے جوڑ رکھنے کی مثال ہے۔ ورنہ کہانی تو دراصل حمید اختر اور صفیہ سنبل کی ہے۔

کسی بھی مصنف کی تحریر سے رمز آشنائی کا مرحلہ طویل ہو سکتا ہے مگر یہ سلسلہ شروع تو ایک تحریر سے ہی ہوتا ہے۔ ہر مصنف کا ذاتی وصف اس کی تحریر میں ضرور جھلکتا ہے، جیسے اشفاق احمد کو واقعاتی بیان پر ملکہ حاصل تھا۔ اسی طرح ممتاز مفتی کی تحریر سے ان کی بے مثال مشاہداتی حس ہر طرف چھائی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

"اس بنے سجے آرام دہ کمرے میں ہم دو تھے لیکن دونوں ہی اکیلے تنہا اگر ہم دونوں اکیلے اکیلے ہوتے تو یقیناً" اس قدر اکیلے نہ ہوتے۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے بہت دور تھے۔ بہت دور، وہ مجھ سے بے زار تھی، میں اس سے بے زار تھا۔ چالیس سال ہم ایک دوسرے کے ساتھ رہتے آئے تھے۔

دن میں دو ایک بار بات کرنے کی ضرورت پڑ جاتی، وہ آلو چھیلتے ہوئے چاقو سے مخاطب ہو کر کہتی۔

"آلو میں بینگن ڈال لوں؟"

میں شیو کرتے ہوئے استرے سے کہتا۔ "ڈال لو۔"

اور اب۔۔۔ اب ہم دونوں بوڑھے ہو چکے ہیں۔ لڑ لڑ جھگڑ جھگڑ کر تھک گئے ہیں۔ وہ مجھے گوارا کر رہی ہے۔ مجبوراً" ۔ میں اسے گوارا کر رہا ہوں۔ وہ کہتی ہے۔ "اس کا تو دماغ خراب ہے۔ یہ کیا سمجھے گا۔" میں کہتا ہوں۔ "اس کا تو دماغ سرے سے ہے ہی نہیں، سمجھانے کی کوشش عبث ہے۔"

ظاہر ہے کہ یہ میاں بیوی کے متعلق خیال آرائی ہے۔ جن کے درمیان رائج ہوئی چپ کو ایک چوہے کی آمد و رفت نے توڑا۔ کہانی کا نام ہے "چوہا"

کچھ عناصر جن کا ذکر تواتر لیکن ہر دفعہ نئے انداز سے اس کتاب میں آپ کو ملتا ہے۔ ان میں میاں بیوی کے اختلاف، رنجشیں، شام اور ہومیو پیتھی شامل ہیں۔

"جی ہاں، جی ہاں۔ سن سن کر میرے کان پک گئے ہیں۔ صاحبو! میرا المیہ یہ ہے کہ میں نے ایک "جی ہاں" سے شادی کر رکھی ہے۔ اس بدنصیبی کی تمام تر ذمہ داری خود مجھ پر پڑتی ہے۔ میں تین سال جانے ان جانے میں دعائیں مانگتا رہا تھا کہ یا اللہ میں اپنی بیوی کے منہ سے کبھی "جی ہاں" بھی سنوں۔ لوگو! بھی بن سوچے سمجھے دعا نہ مانگنا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ دعا منظور کرے۔"

"سانپ" سے لی گئی یہ خود کلامی بھی ایک شوہر کی ہے۔ جس کی پہلی بیوی اس کی بات نہیں مانتی تھی۔ حادثاتی موت کے بعد، دوسری بیوی پر جب دعا منطبق ہو گئی تو صاحب کا جینا دوبھر ہو گیا۔

"دوستو! ہم مرد بھی کتنے احمق ہوتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ دلیل دے کر ہم بیوی کو سمجھا سکتے ہیں۔ اب میں جان گیا ہوں۔ اس لیے میں نے ایک ہاتھ کی تالی بجانا چھوڑ دیا ہے۔"

سنجیدہ گمبھیر مسائل اور پیچیدہ انسانی کیفیات کو بیان کرتے کرتے یہ واحد موضوع ہے جو ہلکی پھلکی سی لطافت لیے ہوئے ہے۔

"وہ دونوں میرے کانوں میں سرگوشیاں کرتی رہتی ہیں۔ ایک کہتی ہے۔

دیکھ مرد بن۔ ووجی کو اپنے جوتے تلے رکھ۔

ووجی کہتی ہے۔ مجھے پتا ہے کہ وہ تیرے کان بھرتی رہتی ہے، جو تو اس کی باتوں میں آگیا تو کیا ہو گا۔

ایک کہتی ہے۔ تو نے سنا نہیں، سیانے کہتے ہیں گربہ کشتن روز اول یہ ہنس مکھیاں پہلے بھرماتی ہیں پھر چڑیل کی طرح سر چڑھ جاتی ہیں۔

ووجی کہتی ہے۔ "توبہ اس کی زبان تو قینچی ہے۔ کاٹنا جانتی ہے، جوڑنا نہیں جانتی۔"

ایک آنسو چھلکاتی ہے۔ ہے یہ میں نے کیا کر دیا۔ اپنے ہاتھوں تجھے کانٹوں میں دھکا دے دیا۔ یہ تیرے لائق نہ تھی۔

یہ ایک بے چارے مرد کی کتھا ہے۔ "ایک" جس کی ماں ہے اور "ووجی" بیوی۔ ساس بہو کی کھینچا تانی کا شکار بے چارہ بھگت کے کہنے پر جگن ناتھ بن گیا۔

تم خود بدل جاؤ۔ نہ اس کی سنو نہ اس کی سنو۔ ادھر کاٹھ ادھر کاٹھ بیچ میں بیٹھا جگن ناتھ۔

جگن ناتھ بننا بہت مشکل تھا۔ خود کو کاٹھ بنا لینا۔ من لاگ نہ لگاؤ۔ دکھ درد خوشی سب ختم ہو گئے۔ گھر کے جھگڑے چلتے رہے۔ چکی کے پاٹ چلتے رہے۔ میں کو کڑو بن گیا جو نہ گلتا ہے نہ پستا ہے۔ دونوں طرف آنسوؤں کی جھڑیاں لگی رہیں لیکن میں سوکھا رہا۔

یہاں ایک سیتے کی بات دیکھیں کس آسانی سے ہمارے فہم تک رسائی حاصل کرتی ہے۔

"مجھ پر بھید کھل گیا کہ سکھ خوشی کا نام نہیں غم اور خوشی دونوں سے بے نیاز ہو جانے کا نام ہے۔ مجھے پتا چل گیا کہ دنیا کو بدلنا خیال خام ہے۔ خود کو بدل لو۔"

لیکن کہانی کا انجام جگن ناتھ کی توقع کے خلاف رہا۔ اور وہ دونوں آپس میں صلح سلوک سے رہنے لگیں۔

جگن ناتھ کے بغیر!

43ء سے جاری ادبی سفر میں مفتی نے جدید زمانے اور نئی پود کے مشاہدے کو بھی اپنے قلم کی بصیرت عطا کی۔۔۔ جوان کی ذہنی استعداد اور مشاہدے کی قوت کو

عیاں کرتا ہے۔

"پرانے زمانے میں لڑکی خاموشی کے ذریعے جواب دیا کرتی تھی۔ آج کل سوال میں جواب دیتی ہے۔ پرانے زمانے میں مثل مشہور تھی کہ لڑکی کہے نہیں تو مطلب ہوتا ہے شاید۔ شاید کہے تو مطلب ہوتا ہے ہاں۔ اور اگر ہاں کہہ دے تو جان لو کہ وہ لڑکی نہیں کوئی اور جنس ہے۔

آج کل لڑکی نہیں کہے تو مطلب ہوتا ہے نہیں۔ شاید کہے تو مطلب ہوتا ہے شاید۔ اور ہاں کہے تو صاحبو! جان لو کہ لڑکی ہی ہے کوئی اور جنس نہیں۔"

سوالیہ جواب دینا ماڈرن لڑکی کی ایجاد ہے۔

وہ پوچھتا ہے۔ "ریکس بار میں برگر کھاؤ گی؟"

وہ کہتی ہے "وائے ناٹ۔"

وہ کہتا ہے۔ "کل مینا بازار چلو گی؟"

وہ کہتی ہے۔ "نہ جاؤں کیا؟"

وہ کہتا ہے۔ "یہ کالی شال کتنی اچھی لگتی ہے۔"

وہ کہتی ہے۔ "کیسے نہ لگے۔"

ماڈرن ازم کے نمائندہ نوجوان جوڑے کی دلچسپ کہانی "بلیک ہاٹ" سے لیے گئے یہ جملے جدت اور قدامت کے زبردست امتزاج کی کہانی ہے۔ جو مکالموں کے ذریعے ہم پر خود بخود عیاں ہوتی ہے۔ جبکہ لکھاری اپنی ذات 'اپنی رائے کو کہانی پر مسلط بھی نہ کرے۔ قاری کے لیے یہ تجربہ پر لطف ٹھہرتا ہے۔

"اس کی کامیابی زور بازو کا نتیجہ تھی۔ زور بازو کا نتیجہ ہو تو بازو اکڑ جاتا ہے۔ گردن تن جاتی ہے۔ چہرے پر کلف لگ جاتا ہے۔ یہ بات بھول جاتی ہے کہ بیسیوں بازو زور لگاتے ہیں 'لگائے رکھتے ہیں لیکن زور لگتا نہیں۔ یہ احساس نہیں ہوتا کہ زور بازو میں صرف بازو کا زور نہیں ہوتا۔ زور بازو کا احساس اللہ سے بے نیاز کر دیتا ہے 'خود کو خدا بنا دیتا ہے۔"

"سیانے کہتے ہیں کہ اگر "میں" کے بوجھ سے آزاد ہونا چاہتے ہو۔ اگر ذہنی کشمکش کی کھینچا تانی سے بچنا چاہتے ہو تو کسی پھیلاؤ میں جا رہو۔ چاہے وہ پانی کا پھیلاؤ ہو 'ریت کا ہو یا آسمان کا پھیلاؤ سے رشتہ استوار رکھو گے تو دل تنگ نہ ہوگا۔ آسمان سے تعلق قائم کرو گے تو ایک امید سی بندھی رہے گی۔

سیانے کہتے ہیں 'دینا ایک مشکل عمل ہے۔ جب آپ دینے لگتے ہیں تو اندر سے ایک بریک لگ جاتی ہے اور ہاتھ آگے نہیں بڑھتا 'رک جاتا ہے۔ کیا یہ حاجت مند ہے 'حق دار ہے حق دار نہیں۔ یہ تو منگتا ہے۔ مشٹنڈا ہے کام نہیں کرتا۔ دینے کے عمل میں ایک ساؤنڈ بیرئیر سی رکاوٹ آجاتی ہے۔ اگر یہ ساؤنڈ بیرئیر ٹوٹ جائے تو پھر دینے کے عمل میں ایک لذت ایک نشہ ابھرتا ہے۔ سید اکبر کا بیرئیر ٹوٹ چکا تھا۔

"پھیلاؤ کی زیر پی" سید اکبر کی کہانی ہے جس کی داخلی کیفیت نے اسے صحرا کے پھیلاؤ سے منسلک کر دیا۔

کردار کی کیفیت کو جھیلنا اور بلا لحاظ جنس و عمر' محسوسات کو بیان کرنا اداکاروں کے علاوہ لکھاریوں کا بھی ہنر ہے۔

عطیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس مخلوق کا بھی جواب نہیں۔ ہر دانے کا اپنا ہی سواد ہوتا ہے۔ ایک سے دوسرا نہیں ملتا۔ اللہ نے اپنے رنگ میں بنایا ہے۔

سنبل گھبرا کر بولی۔ ہئے۔ میرے میاں تو اتنے اچھے ہیں کیا بتاؤں۔

سلمیٰ نے کہا۔ سنبل تیری بات اور ہے۔ شادی کو ابھی چھ مہینے ہوئے ہیں۔ وہ ابھی میاں نہیں بنا۔ ابھی تو وہ محبت کے چولہے پر چڑھا ہوگا۔ یہ دیگ تو ایک دو سال کے بعد تیار ہوتی ہے۔

"میاں" سے لیا گیا یہ مکالمہ سہیلیوں کے درمیان چل رہا ہے اور میاں کی اقسام اور خصوصیات پر سیر حاصل معلومات کے علاوہ عورتوں کا اظہار رائے بھی ملتا ہے۔ کچھ کہانیوں کے آخری جملے فیصلہ کن تاثرات کے حامل ہیں۔ اور یہ کہانی بھی ان ہی میں سے ایک ہے۔

"اور چار دن کے بعد ایک رجسٹری موصول ہوئی' کھولا تو اندر طلاق نامہ تھا۔"

پراسرار۔ بھید بھری کہانی "ممتاز کا بھید" سے کچھ راز آشکار کرتے ہوئے جملے

"نہیں بٹی۔ بیگماں بولی۔ ہم عورتوں کا کام مردوں کو لبھانا ہے۔ اگر مرد لمبے بال پسند کرتے ہیں تو ہم بال بڑھالیں گی۔ اگر انہیں بھرا بھرا جسم اچھا لگے گا تو ہم فربہ بن جائیں گی۔ اگر انہیں ترت پھرت اچھی لگے گی تو ہم ہڈیاں نکال لیں گی۔ پہلے وہ وفا کو پسند کرتے تھے تو عورتوں نے وفا اپنائی تھی۔ اب وہ ہرجائی پسند کرتے ہیں تو عورتیں ہرجائی ہو گئی ہیں۔

"نہیں ماں! امنا نے کہا۔ وہ عورتیں نہیں 'وہ تو ناریاں ہیں جن کا کام مردوں کو لبھانا ہے۔ ناری بن کر عورت نے اپنی قدر گنوا دی ہے۔ عورت تو ممتا کے لیے بنی ہے جس میں ممتا جاگ اٹھے 'وہ تو آپ محبت بانٹے گی۔ وہ محبت کی بھیک کیوں مانگے۔

امنا کی بات سن کر بیگماں چلائی۔ یا اللہ میں اس لڑکی کو کیسے سمجھاؤں۔

امنا مسکرا دی۔ بولی 'ماں! جسے تو پکار رہی ہے۔ وہ تو آپ ماں ہے جگت ماں۔"

چہرے پڑھنے کا شوق رکھنے والی نفسیات کی طالبہ کی کہانی ''آدھے چہرے'' سے ہماری تجزیاتی حس کو بھی مہمیز عطا ہوتی ہے کہ وہ کون کون سے زاویے ہیں جن سے شخصیت کا بھید پایا جا سکتا ہے۔

البموں سے مایوس ہو کر وہ باہر لان میں جا بیٹھتی اور سڑک پر آتے جاتے چہروں کو دیکھنے لگتی۔ شہری چہرے ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہوتے ہیں۔ ذہانت 'مصروفیت اور دکھاوے کی چمک کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ عورتوں کے چہرے میک اپ نے ڈھانپ رکھے ہوتے ہیں۔ متمول لوگوں کے چہرے تو بالکل ٹھپ ہوتے ہیں۔ نوجوانوں کے چہروں میں زندگی تو ہوتی ہے لیکن بے جہتی اور "سو واٹ" کی مدو جزر انہیں گرگٹ بنا دیتی ہے۔

پھر کچھ ڈرائنگ روم تھے۔ سوٹ ٹائی۔ شو شائن' مستعف کالر 'ان کا رومان مخملی تھا 'جو اپنے لباس اور برتاؤ کے دھیان میں ڈوبے ہوں۔ "میں کیسا لگتا ہوں" میں کھوئے ہوئے ہوں۔ وہ دوجے کو کیسے توجہ دے سکتے ہیں بھلا۔"

بہت کچھ کہتے ہوئے کچھ جملے

"آج کل خدوخال کا حسن نہیں چلتا۔ انداز کا حسن چلتا ہے۔ اسارہ کے انداز میں بڑی گریس تھی۔ حرکت میں ردھم تھا اور بات میں رنگ۔"

"شہر میں خالق اور مخلوق کے درمیان رشتہ قائم نہیں ہوتا۔ اس لیے شہر میں گردنیں تنی رہتی ہیں۔ شاید اس لیے کہ شہر میں انسان خود کو خالق سمجھتا ہے۔"

"لیکن وہ بوٹے جو چلتی نہر کے کنارے اگے ہوتے ہیں 'وہ کیا جانیں پیاس کیا ہوتی ہے۔"

"میں دکھنے کی اتنی دیوانی ہوئی کہ بار بار دیکھتی کیسی دکھتی ہوں۔"

"مل بیٹھنے میں تو زندگی شوخی سے بھرپور ہوتی ہے لیکن اکیلے میں دکھ سے چور چور۔ یہ کیا بھید ہے سوچتے سوچتے وہ کٹیا سے باہر نکل آیا۔"

کچھ کہانیوں میں مفتی کی ذاتی جھلک ہے 'لیکن صرف وہی لوگ اس کو جان سکتے ہیں۔ جو دیگر تحریروں کے ذریعے ان کو جانتے ہیں۔

"افسر" کا ذکر نہ کرنا بھی مشکل ہے اور کرنا سوا تر۔۔۔ کچھ بھی نہ کہا اور کہہ بھی گئے کی تیکنیک خوبی اور مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

زندگی 'کیفیت 'قوت 'مشاہدے سے بھرپور نفسیات اور شخصیت کی پرتیں کھولتی ہوئی۔۔۔ مفتی کی تحریروں میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ دوسروں تک رمز شناسی کا فہم اور جستجو منتقل کر دیں۔

کیا آپ جاننا چاہتے ہیں؟

☆

بندھن

فائق خان ہمراہ ثانیہ فائق خان

شاہین رشید

جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں اور ان کی تکمیل دنیا میں ہوتی ہے اور اس ایک رشتے سے کتنے رشتے جنم لیتے ہیں۔ "بندھن" کا رشتہ جتنا نازک ہے اتنا ہی مضبوط بھی ہے' مگر اس کی ڈور میاں بیوی کے ہاتھ میں ہی ہوتی ہے چاہیں تو مضبوطی سے تھامے رہیں اور چاہیں تو ڈھیل دے کر دلوں میں دراڑیں ڈال دیں۔

اس بار بندھن میں آپ کی ملاقات فائق خان اور ان کی مسز سے کروا رہے ہیں۔

"کیسے ہیں فائق خان اور بیٹے کی پیدائش بہت مبارک ہو۔"

"جی الحمدللہ بالکل ٹھیک ٹھاک اور شکریہ۔"

"بیٹے کے آنے کے بعد زندگی کیسی لگ رہی ہے؟"

"بہت اچھی۔ بہت حسین۔ لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا اپنے احساسات کو۔"

"اب جب تھکے ہارے گھر آتے ہیں تو کیسا محسوس ہوتا ہے؟"

"گھر آتے ہی پہلے اپنے بیٹے کو پیار کرتا ہوں۔ گود میں اٹھاتا ہوں اور پھر کوئی اور کام کرتا ہوں۔"

"مسز سے یہ نہیں پوچھتے کہ دن کیسا گزرا؟ بیٹے کے ساتھ اور بیٹے کا؟"

قہقہہ۔ "یہ کام میں سارا دن فون کرکے کرتا رہتا ہوں۔"

"بیٹے کا نام کیا رکھا۔"

"بیٹے کا "حمدان" رکھا ہے اور یہ "حمد" سے نکالا ہے اور یہ ایسا نام ہے کہ میرا نہیں خیال کہ اس کو کوئی بگاڑ سکتا ہے۔ جہاں تک کسی نام سے بلانے کی بات ہے تو ابھی تو "حمدان" بہت چھوٹا ہے اور اس کے پیار کے بہت سے نام ہیں' جس کا جو دل چاہتا ہے بلا لیتا ہے' مگر جب وہ بڑا ہو گا تو اس کا نام بگڑنے نہیں دوں گا۔"

"آپ ایک کمپنی کے برانڈ ایمبیسڈر ہیں۔ جراثیم کا بہت دھیان رہتا ہے آپ کو۔ اب بیٹے کے لیے بھی ایسی ہی ہدایات دیتے ہوں گے۔"

قہقہہ۔ "بالکل جی۔ یہ تو بہت ضروری ہے کیونکہ ہمارے ملک میں تو صفائی ستھرائی کا فقدان ہے اس لیے ڈر لگتا ہے کہ بچوں پر اس کا اثر نہ ہو جائے۔ اس لیے اگر اچھے برانڈ کے صابن استعمال کریں گے تو واقعی جراثیم سے بچ سکتے ہیں۔"

"اور کیا مصروفیات ہیں آپ کی؟"

"آج کل تو "ملکہ عالیہ" میں ہی مصروف ہوں۔ آپ دیکھ ہی رہی ہوں گی کافی اچھا رسپانس مل رہا ہے۔"

"کافی دنوں کے بعد کسی بڑے رول میں آپ کو دیکھا۔"

"ایسا نہیں ہے۔ میرے کافی ڈرامے انڈر پروڈکشن ہیں اور کچھ دیگر چینلز پہ آن ایر بھی ہیں۔ اب چونکہ اتنے چینلز ہو گئے ہیں اور ڈرامے بھی تو کچھ پر نظر پڑ جاتی ہے اور کچھ پر نہیں۔"

"یعنی کبھی کام نظر آ جاتا ہے تو کبھی نہیں۔"

"جی بالکل۔ ورنہ کام تو بہت ہو رہا ہے۔"

"گڈ۔ کچھ بندھن کی باتیں ہو جائیں۔"

"جی جی۔ بالکل۔"

"مجھے یاد ہے کہ جب ایک بار آپ سے بات ہو رہی تھی اور شادی کا ذکر ہوا تو آپ نے جو کہانی سنائی وہ تو بالکل فلمی کہانی لگی تھی۔ ذرا دہرائیں گے۔"

قہقہہ۔ "کتنی پرانی بات آپ کو یاد ہے۔ چلیں آپ کہتی ہیں تو میں دہرا دیتا ہوں۔ بہت پرانی بات ہے۔ میں نے ثانیہ کو عاطف اسلم کے ایک کنسرٹ میں دیکھا تھا۔ اس وقت عاطف اسلم بھی اتنے پاپولر نہیں تھے تو جب کنسرٹ ختم ہوا تو یہ ہجوم سے جلدی نکلنے کے چکر میں بھاگتی ہوئی آ رہی تھیں۔ میرے قریب آتے ہی گر پڑیں۔ بہ حیثیت ایک مرد کے کہ لڑکی گر پڑی ہے میں نے سنبھال لیا اور بس پہلی نظر میں ہی فدا ہو گیا۔" (قہقہہ)

"او اچھا۔ فلم میں تو رائٹر کے ہاتھ میں سب کچھ ہوتا ہے اور ملاپ بھی ہو جاتا ہے۔ آپ کا پھر ملاپ کیسے ہوا۔؟ اسی وقت تو اظہار محبت نہیں کیا ہو گا۔"

"جی جی بالکل۔ اگر ڈراموں کا رائٹر زمین پر ہے تو حقیقی رائٹر تو اوپر ہے اور اس نے ہمارا ملاپ اس طرح کرایا اور کہانی یہاں سے شروع ہوئی کہ ثانیہ نے مجھ

سے آٹوگراف مانگا اور ساتھ ہی ای میل ایڈریس بھی دے دیا۔ بس پھر بات چیت شروع ہو گئی۔ تھوڑی سی انڈراسٹینڈنگ بھی۔۔۔ بات چیت کے دوران ایک دوسرے کی فیملیز کا تعارف بھی کرایا تو اندازہ ہوا کہ ثانیہ کی فیملی تو ماشاءاللہ بہت اچھی ہے۔"

"کتنے سال رہی یہ دوستی اور کب رشتے داری میں بدلی؟"

"تقریباً" سات سال ہماری دوستی رہی اور 13 مارچ 2011ء کو ہماری دوستی رشتے داری میں بدلی۔"

"کیوں؟۔۔۔ اتنا لمبا انتظار؟"

"لمبا انتظار اس لیے کیا کہ ایک تو ثانیہ پڑھ رہی تھی' پھر کم عمر بھی تھی اور میں بھی جلدی شادی کرنا نہیں چاہتا تھا تو بس اس لیے دونوں نے اپنی صحیح عمروں کا انتظار کیا۔ کیونکہ میں بھی چاہتا تھا کہ کچھ بن جاؤں' کچھ کمالوں' اسٹیبلش ہو جاؤں۔"

"شادی کی صحیح عمر آپ کے خیال میں کیا ہوتی ہے؟"

"بات عمر کی نہیں بات وقت مقررہ کی ہے۔ جب وقت لکھا ہوتا ہے تب ہی ہوتی ہے' اس سے پہلے بہانے بنتے چلے جاتے ہیں کہ جی لڑکی چھوٹی ہے لڑکا اسٹیبلش نہیں ہے' ویسے شادی اس وقت کرنی چاہیے جب لڑکی تھوڑی میچور ہو جائے اور لڑکا کماؤ پوت ہی نہیں بلکہ اچھا کماؤ پوت ہو ورنہ دو وقت کی روٹی تو سب کو ہی مل جاتی ہے۔"

"تو پھر 13 مارچ 2011ء کو شادی ہوئی۔۔۔ منگنی' شادی سے پہلے ملاقاتیں ہوتی تھیں؟"

"13 مارچ 2011ء کو بات پکی ہوئی تھی اور ساتھ ہی شادی کی ڈیٹ بھی فکس ہو گئی تھی اور یہ سب کام گھر کی خواتین نے کیے کیونکہ میں تو شوٹ پر تھا۔ شادی ہماری 30 ستمبر 2011ء کو یعنی نکاح ہوا اور 2 جنوری 2012ء کو رخصتی کا عمل ہوا۔"

"جہاں تک ملاقاتوں کی بات ہے تو ایسا کچھ نہیں ہوا کیونکہ ثانیہ بھی بہت مصروف رہتی تھی اور میں بھی۔ ہاں البتہ شادی کی شاپنگ کے دوران ایک دوسرے سے ملاقات ہوتی تھی کیونکہ شاپنگ ہم نے مل کر کی اور پھر چونکہ نکاح ہو چکا تھا لہٰذا کسی کو اعتراض بھی نہیں تھا۔"

"ظالم سماج آیا؟۔۔۔ اور ثانیہ کی تعلیم کیا ہے؟"

"ظالم سماج تو خیر نہیں آیا۔۔۔ لیکن چونکہ میرا تعلق شوبز سے ہے تو تھوڑا پرابلم ہوا' مگر پھر مسئلہ جلدی حل ہو گیا اور ثانیہ نے مائیکرو بیالوجی میں ماسٹرز ڈگری حاصل کی ہے۔"

"تعلیم کے بعد لڑکیاں گھر نہیں بیٹھتیں' ثانیہ نے جاب کے لیے اصرار کیا؟ اور کچھ بتائیں کہ موڈی ہے' ہنس مکھ ہے یا غصے کی تیز ہے؟"

"نہیں۔ ثانیہ نے جاب کے لیے کبھی اصرار نہیں کیا اور نہ ہی میں نے کہا البتہ اپنی فیلڈ میں اس نے پریکٹس ضرور کی ہے اور اب تو ماشاءاللہ ہمارا بیٹا ہے تو اسے گھر کی ذمہ داریوں کا احساس ہے' ہاں جب ذمہ داریاں تھوڑی کم ہو جائیں گی' بیٹا بڑا ہو جائے گا تب مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا اور ثانیہ مزاج کی بہت اچھی ہے بلکہ بہت معصوم ہے اور اس کی فرمائشیں بھی بہت معصومانہ ہوتی ہیں۔"

"اب تو ماشاءاللہ ثانیہ کی ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں' لیکن کیا آپ کا کبھی دل چاہا کہ وہ آپ کے ساتھ اس فیلڈ میں کام کرے؟"

"نہیں۔ ایسا کبھی نہیں چاہا اور اگر ایسا چاہتا تو پھر شاید اس فیلڈ کی کسی لڑکی سے شادی کر لیتا۔"

"بیگم کی کوئی اچھی اور بری عادت جو آپ محسوس کرتے ہیں' بتائیں؟"

"بری عادت تو یہ ہے کہ تھوڑی ضدی ہے' انا پرست ہے اور حساس ہے اور اچھی بات یہ کہ ہمدردی کا مادہ بہت ہے' ہر انسان کے لیے بہت رحم دل ہے۔"

"ہنی مون کے لیے کہاں گئے تھے اور آزاد زندگی کون سی تھی یہ یا پہلے والی؟"

"ہنی مون کے لیے ملائیشیا گئے تھے اور اس میں تو کوئی شک و شبے کی گنجائش ہی نہیں ہے کہ آزادی والی زندگی تو شادی سے پہلے کی ہوتی ہے۔ شادی کے بعد تو ذمہ داریوں والی زندگی ہو جاتی ہے تو بس زندگیاں دونوں اچھی ہیں اور انسان کو دونوں ہی زندگیاں انجوائے کرنی چاہئیں۔"

"میں نے دیکھا ہے کہ جہیز اور بری میں اتنا کچھ ملنے کے باوجود لڑکیوں کو شادی کے فوراً" بعد شاپنگ ضرور کرنی ہوتی ہے آپ کی بیگم نے بھی ایسا کیا؟"

"نہیں۔۔۔ اس معاملے میں' میں لکی ہوں کہ میری بیگم بہت سمجھ دار ہے' اسے احساس ہے کہ مہنگائی بہت ہے اور انسان بڑی مشکل سے کماتا ہے تو اللہ کا شکر ہے کہ میری بیگم فضول خرچ نہیں ہے۔"

"آپ کی لو میرج ہے۔ شادی کے بعد یہ فیصلہ صحیح لگا یا غلط اور کون سی شادی زیادہ کامیاب ہوتی ہے؟"

"مجھے اپنا فیصلہ بالکل ٹھیک لگا اور کامیابی کی گارنٹی تو کسی شادی کی بھی نہیں دی جا سکتی۔ کبھی لو بہت کامیاب ہو جاتی ہیں اور کبھی ارینج بہت کامیاب ہو جاتی ہیں۔"

"سات سال دوستی رہنے کے بعد نکاح اور رخصتی کے وقت کیا کیفیت تھی؟"

"سچ بتاؤں۔۔۔ مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ ثانیہ سے میری شادی ہو گئی ہے' اس سے جس کو میں بہت پسند کرتا ہوں۔ بہت شکر ادا کیا اللہ تعالیٰ کا کہ اس نے میری خواہش کو پورا کیا۔"

اور اب کچھ باتیں' ثانیہ فائق خان سے....

"کیسی ہیں ثانیہ اور بیٹا مبارک ہو۔ دن رات کیسے گزر رہے ہیں؟"

"جی بالکل ٹھیک ۔ بہت شکریہ اور دن رات تو بہت اچھے گزر رہے ہیں' مصروفیات میں بہت اضافہ ہو گیا ہے۔"

"کیسی لگ رہی ہیں مصروفیات۔"

"جی بہت اچھی۔ زندگی مکمل ہو گئی ہے' جیسے اور اب تو وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلتا۔"

"تو پہلے چلتا تھا؟"

ہنستے ہوئے۔۔۔ "پتا تو پہلے بھی نہیں تھا' کیونکہ فائق کے اتنے کام ہوتے تھے کہ کچھ اور کرنے کا ٹائم ہی نہیں ملتا تھا۔"

"ہوں۔۔۔ گڈ۔۔۔ اب ڈبل مصروفیات ہو گئی ہیں تو فائق تمہارے ساتھ کاموں میں ہاتھ بٹاتے ہیں؟"

"جی جی۔ بالکل۔۔۔ پہلے بھی ہاتھ بٹاتے تھے جب "حمدان" اس دنیا میں نہیں آیا تھا اور اب تو بہت زیادہ خیال رکھتے ہیں۔"

"فائق ایک مشہور شخصیت ہیں' شروع شروع میں تو بہت اچھا لگا ہو گا' وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ شہرت پریشانی کا باعث تو نہیں بن رہی؟"

"نہیں جی بالکل نہیں۔۔۔ اب تو لوگ مجھے بھی پہچاننے لگے ہیں اور میری بہت عزت کرتے ہیں اور شہرت ہر ایک کے حصے میں نہیں آتی یہ تو بڑی خوش قسمتی کی بات ہے؟"

"سسرال کیسا لگا؟"

"سسرال ماشاء اللہ بہت ہی اچھا ہے۔ سب ہی لوگ بہت محبت کرتے ہیں۔ چھوٹی سی تو فیملی ہے' یہ اکلوتے بیٹے ہیں اور ان کی دو بہنیں ہیں اور اگرچہ سب ہی بہت اچھے ہیں' مگر میری ساس تو بہت ہی اچھی ہیں۔ ان کی تعریف کے لیے تو میرے پاس الفاظ ہی نہیں ہیں۔"

"غصے کے تیز ہیں؟۔۔۔ اور عاشق مزاج کتنے ہیں؟"

ہنستے ہوئے۔ "عاشق مزاج۔۔۔ یہ غلط جملہ ہے' ہاں یہ رومینٹک مزاج ہیں صرف بیوی کے لیے یا پھر ڈراموں میں کیونکہ وہ ان کا پروفیشن ہے۔ ہاں غصے کے تیز ہیں اور چھوٹی چھوٹی بات پر انہیں غصہ آجاتا ہے اور میں تو ایسی ہوں کہ یہ اگر پیار سے بات بھی کرلیں تو میں خوش ہوجاتی ہوں اور غصے میں ہوں یا موڈ خراب ہو تو فوراً" ٹھیک بھی ہوجاتی ہوں۔"

"شوبز سے ڈر لگتا ہے؟"

"جب ان سے دوستی ہوئی تھی اور تھوڑی بہت انڈراسٹینڈنگ بھی' تب تھوڑا ڈر لگتا تھا کہ کچھ گڑبڑ نہ ہو۔ ان کی فیلڈ ہی ایسی ہے' مگر جب تقریباً" سات سال کے بعد ہماری منگنی اور نکاح ہوا تو میں بالکل بھی ڈری ہوئی نہیں تھی کیونکہ جو بندہ سات سالوں میں نہیں بدلا' وہ شادی کے بعد کیوں بدلے گا تو مجھے اب ان کی شوبز سے ڈر نہیں لگتا۔"

"شادی کی رسمیں کیسی لگی تھیں اور منہ دکھائی میں کیا ملا تھا؟"

"چونکہ پہلے نکاح ہوچکا تھا' اس لیے میں نے خود بھی ان کی رسموں میں۔۔۔ شرکت کی اور ہم دونوں نے انجوائے کیا اور حالانکہ مجھے پتا تھا کہ شادی کی رسمیں ہیں اور اب مجھے رخصت ہوکر دوسرے گھر جانا ہے' مگر اس کے باوجود مجھے رخصتی کے وقت بہت رونا آیا تھا۔ اور منہ دکھائی میں انہوں نے مجھے بریسلیٹ دیا تھا اور ہنی مون ہم نے ملائیشیا میں منایا تھا۔"

"شادی کی شاپنگ فائق کے ساتھ کی تھی یا سسرال میں ساس نندوں کے ساتھ؟"

"جی فائق کے ساتھ شادی کی شاپنگ کی تھی اور بہت اچھا لگا تھا ان کے ساتھ شاپنگ کرکے۔۔۔ کچھ شاپنگ سسرال والوں کے ساتھ بھی کی تھی۔"

"ماڈرن ہیں یا مشرقی؟"

"میں نے تو جی طبیعت بھی مشرقی ہی پائی ہے۔ ماڈرن ڈریسز مجھے پسند نہیں' سادگی پسند ہوں' فیشن کرتی ہوں' مگر لمٹ میں رہ کر۔"

"اپنی فیملی کے بارے میں بتائیں؟"

"جی۔ ہماری فیملی بھی خاصی مختصر ہے۔ والد صاحب لائر ہیں جبکہ میری امی ہاؤس وائف ہیں۔ مجھ سے ایک بڑے بھائی اور مجھ سے چھوٹی ایک بہن ہے۔"

"اور کچھ کہنا چاہیں گی؟"

"نہیں جی' شکریہ۔ آپ نے سب کچھ تو پوچھ لیا ہے۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے اس جوڑے سے اجازت چاہی۔

☼

آپ کے خط اور ان کے جوابات لیے حاضر ہیں۔

آپ کی عافیت' سلامتی اور خوشیوں کے لیے دعائیں۔

اللہ تعالیٰ آپ کو ہم سب کو اور ہمارے پیارے وطن کو سلامت رکھے۔ آمین

اب آتے ہیں آپ کے خطوط کی طرف۔

پہلا خط ملتان سے شیریں ظفر کا ہے۔ لکھتی ہیں۔

"پیارے نبی کی پیاری باتیں" "خوابوں اور ان کی تعبیر سے متعلق موضوع بہت زبردست تھا اور جتنی بھی روایات درج تھیں اس سے قبل کم سے کم میں نے تو نہیں پڑھی تھیں۔ لہٰذا بہت ہی انہماک اور توجہ سے پڑھیں۔

تابندہ گوہر قریشی نے جاوداں زندگی کے عنوان کے تحت محمود ریاض صاحب کے بارے میں لکھا۔ آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے۔

بس وہی بات کہ

وہ قلم کار جس کا صحیفہ ہے یہ
آج ہم میں نہیں ہے' یہی رنج ہے

مریم عزیز نے "تعبیر" لکھا اچھا لکھا۔ ایک روایتی کہانی ہے۔

"رقص بسمل" نبیلہ عزیز جی کا ایک ہٹس ناول ہے۔ اب بور کرنے لگ گیا ہے۔ نبیلہ جی "ماورا" نے رضا حیدر سے جو بدلہ لینا ہے' وہ بلی تھیلے سے باہر نکال دیں' کہیں تیمور "ماورا" کا بھائی تو نہیں۔

اس بار پورے شعاع کی جان تھا نگہت سیما کا "انہونی" بہت ہی زبردست لکھا' کردار جان دار' کہانی شان دار' لکھنے کا اسلوب اور بیان زبردست امایہ خان کا "بت شکن" بھی بہت اچھا ہے۔ کہانی کا ٹیمپو اچھا ہے۔ مجھے رامین اور مہرزخان کا ملنا بہت اچھا لگا۔ مجھے رامین کا کردار بہت پسند آیا۔ شازیہ جمال نیر کا "سرخ جوڑا" اور مسرت ناز کا مکمل ناول "وہ کون تھی" بہت ہی سو سو تحریریں تھیں' اپنا کوئی اثر نہ چھوڑ سکیں۔ "دستک" میں فنکاروں سے چھوٹی سی ملاقات اور مدیحہ رضوی کی حسن نعمان کی بندھن میں دلچسپ ملاقات بہت پسند آئی۔

امتل جی! جب سے آپ نے "تاریخ کے جھروکے" میں "روکسے لانا" عرف "حورم سلطان" کے بارے میں لکھا ہے۔ یہ ایک واحد ڈرامہ تھا جو کہ میں

خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
shuaamonthly@yahoo.com

چوبیس گھنٹے میں خاص ایک گھنٹہ ٹی وی کے سامنے بیٹھ رہی تھی۔ بہت اچھا ڈراما تھا۔ مگر اس کردار سے مجھے نفرت ہوگئی ہے۔ ایسی عورتیں بھی ہوتی ہیں۔ پوری سلطنت اور حکومت کا وقار تباہ کردیا۔ اب ڈرامہ مجھ سے بالکل دیکھا نہیں جاتا۔

پیاری شیریں! آپ کا خط اور مکمل تفصیلی تبصرہ ہمیشہ کی طرح بہت اچھا لگا۔ دو ماہ سے آپ شامل نہیں ہوسکیں اس کا ہمیں واقعی افسوس ہے۔ آپ کے خط ہمیں موصول ہوگئے تھے لیکن اس وقت موصول ہوئے جب شعاع کا یہ سلسلہ تیار ہوچکا تھا اور پرچا پریس جانے والا تھا۔

سائرہ رضا کی کہانی میں تھر کے لوگوں کے حالات' ان کی قناعت' سادگی' غربت اور بدحالی سامنے لانا یا مصنفہ کا مقصد تھا اور وہ اس میں پوری طرح کامیاب رہیں' آپ نے جس کہانی کے بارے میں لکھا' وہ ہم نے بھی پڑھی ہے

لیکن یہ مماثلت اتفاقیہ ہے۔ سائرہ کا اپنا اسٹائل اپنا انداز ہے اور بات وہی ہے کہ انداز بیاں بات بدل دیتا ہے ورنہ دنیا میں کوئی بات نئی بات نہیں۔

فریدہ فرید نے پاک پتن شریف سے لکھا ہے

خوب صورت ٹائٹل کو نگاہ بھر کے دیکھتے پھولوں کے بہترین استعمال کو داد دیتے' جب داخل رسالہ ہوئے تو "پہلی شعاع" میں میڈیا کو ضابطہ اخلاق کی تنبیہہ سے خود کو صد فیصد متفق پایا۔ "اس ماہ کی مسکراہٹ" میں سلیپنگ سوٹ یونیک اور مزے کا تھا۔ "باتوں سے خوشبو آئے" میں "اہل بیت کا اخلاق" دل و روح کو مہکا گئے' بلاشبہ اہل بیت عظام سراپا خوشبو ہیں۔

"کھلتا کسی پہ کیوں" باکمال انتخاب شاعری "موسم کے پکوان" میں گول گپے نہ صرف پڑھے بلکہ بنانے کی ناکام کوشش بھی کی۔

"تاریخ کے جھروکے میں" حورم سلطان کے اصل کردار سے واقفیت ہوئی۔ ہم خوامخواہ ان کے حسن و ذہانت کے قائل ہوئے جا رہے تھے۔ "خط آپ کے" میں خط تو ہماری رائے کے عکاس ہوتے ہی ہیں مگر شیریں لب و لہجے میں مدلل جواب ارسال کرنے والی ہستی کو میرا اسلام۔

سلسلے وار ناولز "میں ایک تھی مثال" معذرت کے ساتھ ابتدائی اقساط کے بعد ادھورا چھوڑ چکی ہوں۔

رخسانہ جی میری فیورٹ رائٹر ہیں مگر تکلیف وہ اسٹوری پڑھنے کے بعد ذہن و دل دیر تلک بوجھل رہتے ہیں۔ "رقص بسمل" پڑھ تو رہے ہیں مگر یوں سمجھیے بس پڑھ ہی رہے ہیں۔ اس سال شعاع کے سلسلے وار ناولز زیادہ متاثر کن نہیں رہے' یہ میری ناچیز رائے ہے۔ مکمل ناول میں "تعبیر" مریم عزیز کے مخصوص انداز کی عکاسی کرتا ناول تھا۔ "وہ کون تھی" اسلوب پر کشش نہیں تھا۔ اسٹوری مگر ذرا ہٹ کے تھی۔ "بت شکن اور انمول" دو لفظی تبصرہ ویل ڈن۔

افسانوں میں "سرخ جوڑا" غیر متوقع اینڈ تھا' عموماً اس عنوان اور ٹاپک کا ایسا اینڈ پہلے کبھی نہیں ہوا' بہرحال سب اچھا ہے۔ اور پھر بیان اپنا' صبا سحر ٹاپک یونیک تھا تو انداز تحریر بھی شعاع کے مروجہ انداز سے الگ تھا' ذرا سا جاسوسی کا اسلوب نمایاں تھا مگر بلاشبہ تحریر انٹرسٹنگ تھی۔

بہت شکریہ فریدہ! بہت خوبصورت' تفصیلی خط لکھا آپ نے۔ آپ کی تعریف و تنقید مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

کائنات عابد دسوہہ فیصل آباد سے شریک محفل ہیں۔ لکھا ہے۔

"ٹائٹل اچھا لگا اور اس بار شعاع تھا بھی بہت اچھا "بت شکن" بہت اچھا ناول ہے۔ رامین کو مہرز کے ساتھ دیکھ کر دلی خوشی محسوس ہوئی "ایک تھی مثال" میں مثال تو بس کر رہ گئی بے چاری' کتنے خود غرض نکلے دونوں ماں باپ۔ نبیلہ عزیز اپنے ناول کی اسپیڈ تھوڑی بڑھا دیں۔ "تعبیر" کا اینڈ بہت اچھا ہوا۔ افسانوں میں سوداگری ٹاپ پر تھا۔ ثانیہ کے بارے میں پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ نگہت سیما کا ناولٹ زبردست تھا۔ لیکن اینڈ اچھا نہیں ہوا اس کا۔

کائنات! اللہ تعالیٰ آپ کو ایف ایس سی کے پیپرز میں کامیابی عطا فرمائے۔ ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

سعدیہ ملک اسلام آباد سے لکھتی ہیں

مئی کے شمارے میں سب سے پہلے تو "بت شکن" پڑھا۔ مہرز اور رامین کے دوبارہ ملنے پر انتہائی خوشی ہوئی۔ اس وقت کا انتظار میں نے دوسری' تیسری قسط پڑھنے کے بعد ہی سے شروع کر دیا تھا۔ امایہ خان نے اسے بہت خوبی سے لکھا ہے۔ انداز تحریر و بیاں قابل ستائش ہے۔ "رقص بسمل" بہت سلو جا رہا ہے کوئی قابل ذکر واقعہ ہوئے بنا قسط ختم ہو جاتی ہے۔ "ایک تھی مثال" بھی بہت سلو جا رہا ہے۔ "تعبیر" ایک ٹیپیکل کہانی تھی۔ انداز تحریر بھی کچھ خاص نہ تھا۔ "وہ کون تھی" میں ساری کہانی پہلے ہی سمجھ میں آ گئی تھی۔ پڑھ کر یوں لگا جیسے وقت ضائع کیا ہے۔ "انمول" کا اینڈ اچھا تھا۔ پڑھ کر لاکھ لاکھ شکر کیا کہ اس میں مین کریکٹر اور چند سائڈ کریکٹر خوب صورتی کی انتہا پر نہیں پہنچے ہوئے تھے۔

افسانوں میں سائرہ رضا نے تھر کے لوگوں کی حالت اور آخر میں سوچ کو بہت اچھی تحریر کیا۔ "سرخ جوڑا" کا آخر پر اثر تھا۔ "سوداگری" افسانہ کافی اچھا لگا۔

شعاع کی مجھے یہ بات بہت ناپسند ہے اور میں اس بات سے بہت Irritate ہوتی ہوں کہ۔۔۔ اس میں ہیرو صاحب وجیہہ و شکیل ہوتے ہیں۔ ہیروئن بھی حسن کے اعلا مرتبہ پر فائز ہوتی ہے' اور اس کے پیچھے کئی کئی لوگ پاگل ہو رہے ہوتے ہیں۔ حوالہ "تعبیر' رقص بسمل' وہ کون تھی" وغیرہ مصنفین کو چاہیے کہ وہ عوامی انداز اختیار کریں اور ہر کریکٹر کو حور اور غلمان نہ بنا دیں۔ کچھ ایسا لکھیں جو حقیقت کے قریب لگے۔

پیاری سعدیہ! ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو بہت اچھے نمبروں سے کامیاب کرے۔ آمین ماورائی حسن کے حامل ہیرو یا ہیروئن' ہمیں بھی پسند نہیں اور ہم اس کا خیال بھی رکھتے ہیں لیکن کبھی کبھی کہانی کا تقاضا ہوتا ہے' بہرحال آئندہ مزید خیال رکھیں گے۔

آپ کی تعریف و تنقید ان سطور کے ذریعے متعلقہ مصنفین تک پہنچائی جا رہی ہے۔

حلیمہ زمان' ندا بابر اور ردا ہمایوں نے شرکت کی ہے لکھتی ہیں۔

اس دفعہ بھی ٹائٹل بے حد اچھا تھا' "رقص بسمل" بہت اچھا ہے لیکن پلیز! اس کی رفتار تیز کر دیں۔ مریم عزیز کی ہر تحریر دلوں کو چھو لیتی ہے۔ امایہ خان بلاشبہ نئے رائٹرز میں یقیناً" اچھا اضافہ ہے "بت شکن" پر ان کی گرفت بہت مضبوط ہے' دعا ہے آپ کے قلم کا زور اسی طرح جاری رہے' افسانے تمام اچھے تھے۔ "ایک تھی مثال" کی اسپیڈ بہت کم ہے۔

حلیمہ' ندا' ردا! شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

سونو گوندل نے جہلم سے شرکت کی ہے' لکھتی ہیں

میں نے اسی سال بی کام مکمل کیا ہے۔ آج مجھے شعاع کو پڑھتے ہوئے تقریباً" نو' دس سال ہو گئے ہیں۔ میرے گھر والوں' اساتذہ کے علاوہ شعاع کا میری تربیت میں بڑا ہاتھ ہے۔

مجھے ٹائٹل وہ اچھا لگتا ہے جو سادہ سا ہو' ماڈل نے ہلکا ہلکا میک اپ کیا ہوا ہو۔ شعاع کی تمام رائٹرز بہت ہی اچھا لکھتی ہیں۔ ہنستی مسکراتی رہیں۔

پیاری سونو! نو دس سال سے شعاع پڑھ رہی ہیں' اور کبھی خط نہیں لکھا' کتنے عرصہ بعد خط لکھا تو بھی اتنا مختصر۔ آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ شرکت کیجئے گا۔

آمنہ اجالا ڈہرکی سے شریک محفل ہیں۔

ٹائٹل اس بار بہت دلکش تھا۔ آپ نے پچھلی بار کی شکایت دور کر دی۔ سب سے پہلے مریم عزیز کا مکمل ناول "تعبیر" پڑھا۔ گو کہ ناول اچھا تھا' اینڈ بھی صحیح تھا۔ لیکن پھر بھی مریم عزیز ہمیشہ کی طرح اس بار کچھ خاص رنگ نہیں جما سکیں۔ سائرہ رضا کا "اری او جھیگری" پڑھ کر دل سندھ دھرتی پہ آباد تھر واسیوں کے دکھوں پہ ڈوب ڈوب کر ابھرا اور اج اج (پیاس' پیاس) پکارتے انسانوں' روز بروز دم توڑتے موروں کے دل فگار نوحوں پر مجھے بے اختیار سندھی شاعر سائل پیرزادہ کی نظم یاد آ گئی۔

اور اب واقعی تھر میں موروں کا رقص نہیں ہے۔ بس ہر سو دور دور تک سفاک موت کا رقص ہے۔ ہاں سائرہ آپی سے کہنا ہے کہ ان کے افسانے میں کہیں کہیں سندھ کی پیاری میٹھی زبان کے خوبصورت الفاظ بہت اچھے لگے۔ نگہت سیما کا ناولٹ "انمول" اس ماہ کی سب سے بیسٹ تحریر تھی۔ مسرت ناز کا مکمل ناول "وہ کون تھی" مسرت ناز۔ نیا نام' نیا کام' ناول اگر اچھا نہیں تھا تو برا بھی نہیں تھا۔ میرے خیال میں نئی لکھاری ہونے کے ناتے ایک اچھی کوشش تھی۔ ہمارے موسٹ فیورٹ سلسلے وار ناول "رقص بسمل" کی یہ قسط بس گزارے لائق تھی۔ مزا نہیں آیا پڑھ کر۔ اشعار کے دو صفحات دیکھ کر جہاں دل خوش ہو گیا۔ وہاں اپنا شعر نہ دیکھ کر یہ سلسلہ سونا سونا لگا۔

پیاری آمنہ! ہر بار کی طرح اس بار بھی آپ کا بہت اچھا تبصرہ۔ آپ کی رائے متعلقہ مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔ نبیلہ عزیز کچھ مسائل کی بنا پر ناول پر پوری توجہ نہیں دے پا رہی ہیں۔ صفحات بھی کم ہیں' اس لیے آپ کو کمی محسوس ہوئی۔ آپ دعا کریں آپ کی پسندیدہ مصنفہ مطمئن اور پرسکون ہو کر پوری یکسوئی سے لکھیں۔

عائشہ نواز نے نیا لاہور سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں

ہم دو بہنیں' تین بھائی ہیں۔ ابو بہت اچھے کسان اور امی گھریلو خاتون ہیں۔ میں سب سے بڑی ہوں۔ میں آٹھویں کلاس میں تھی جب پھپھو اسکول چلی گئیں تو میں

نے چوری چوری شعاع پڑھا بہت مزا آیا۔ اس دن سے شعاع سے دوستی ہوگئی۔ ہمارے گھر والے تو پڑھنے نہیں دیتے۔ کہتے ہیں تم بگڑ جاؤگی لیکن میں کہتی ہوں کہ شعاع نے میری لائف سنوار دی اور میں سدھر گئی۔ "رقص بسمل" بہت زیادہ پسند ہے' نادرا کا رول اچھا لگا اور شکر ہے کہ وہ جاب کے لیے مان گئی۔ "ایک تھی مثال" عدیل نے اچھا کیا شادی کرلی۔ مثال عدیل کے پاس رہے تو بہتر ہے یہ دو ناول مجھے بے حد پسند ہیں۔ "تعبیر" بہت افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے اس کے ساتھ کسی نے بھی اچھا برتاؤ نہیں کیا۔ شاہدہ بیگم کے تو نام ہی سے نفرت ہے۔

پیاری عائشہ! بہت خوشی ہوئی۔ آپ نے ہمیں خط لکھا' آپ اپنی پڑھائی پر پوری توجہ دیں' گھر کے کام میں ای کا ہاتھ بٹائیں پھر شعاع پڑھنے پر کوئی اعتراض نہیں کرے گا۔ جہاں تک بگڑنے کی بات ہے تو ہماری قارئین تو یہی کہتی ہیں کہ شعاع اور خواتین نے ان کو زندہ رہنے کا سلیقہ سکھایا۔ ان کی شخصیت سنوار دی۔

حنا سلیم اعوان' کنزیٰ شاہین اعوان' گاؤں آخون باندی تحصیل و ضلع ہری پور ہزارہ سے شریک محفل ہیں لکھا ہے۔

گاؤں کا حال کیا لکھوں۔ بس اتنا ہی کہ گندم کے خوشوں اور دھرتی کے درمیان جدائی کا لمحہ بس آیا ہی چاہتا ہے۔ شاید اسی غم میں مبتلا ہو کر وہ ابھی سے زرد پڑنے لگی ہے۔ باغوں میں ہر سو پرندوں کی چہکار' لوکاٹ کی مخصوص مہک ہر پگڈنڈی پر چکراتی پھرتی ہے۔ ہمارے گاؤں کا حسن' اور رونق ان دنوں اپنے عروج پر ہے۔ لوکاٹ ختم ہونے کے بعد شاید رونق بھی نہ رہے گی۔

ٹائٹل پسند آیا۔

"جاوداں زندگی" پڑھ کر یوں لگا جیسے میں بھی محمود ریاض صاحب سے مل چکی ہوں۔ اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔ آمین۔ "ایک تھی مثال"۔ بہت ترس آتا ہے مثال پر۔ عاصمہ کی مشکلات کو بھی تھوڑا کم ہونا چاہیے۔ بہت غم اٹھا لیے اس نے "رقص بسمل" نادرا کا کردار شروع میں جتنا پسندیدہ تھا۔ اب نہیں ——— اور عزت بی بی کب اپنی "عزت" کا خیال کریں گی۔ کچھ سدھار ادھر بھی ہونا چاہیے۔ "بت شکن" آغاز ہی سے من پسند ٹھہرا۔ رامین کی زندگی میں یہ

نئی تبدیلی اچھی لگی۔ "تعبیر" کی شادی ضرار سے ہوگی یہ تو پہلے ہی اندازہ ہوگیا تھا۔ "وہ کون تھی" مسرت ناز نے بھی کافی اچھا لکھا۔ نگہت سیما کا نام دیکھ کر خوشی میں اضافہ ہوا۔ حاجرہ منیر نے اتنی بڑی غلطی تو نہ کی تھی کہ اسے ایسی سزا ملتی۔ افسانے سب ہی زبردست تھے۔ چھوٹی کہانی میں بڑی بات کہنا یہ تو واقعی کمال ہے۔ "ارے او چھبگری" لاجواب تھا۔

حنا اور کنزیٰ! اللہ تعالیٰ ہمارے محنت کش کسانوں کو سلامت رکھے وہ پورے ملک کو اناج' گندم' چاول' پھل سبزیاں مہیا کرتے ہیں۔ لیکن انہیں ان کی محنت کا پورا صلہ نہیں ملتا' ان کے حالات میں آج تک کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ صدیوں سے پسماندگی کا شکار وہ آج بھی زندگی کی بنیادی ضروریات سے بھی محروم ہیں۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہ دل سے شکریہ۔

تنزیلہ غفور نے کوٹ رادھا کشن سے لکھا ہے

ٹائٹل بہت خوب صورت تھا۔ اسپیشلی "سرخ گلاب کے پھول" نبیلہ عزیز کا ناول "رقص بسمل" بہت شان دار جا رہا ہے۔ پلیز اس ناول کے صفحات بڑھا دیں۔ میں پہلے جب بھی گول گپے بناتی تھی' وہ کم پھولتے تھے مگر اس دفعہ ترکیب کامیاب رہی۔

تنزیلہ! مبارک باد کہ آپ گول گپے بنانے میں کامیاب ہوگئیں۔ اب گھر والوں کو بنا کر کھلائیں اور داد وصول کریں۔ نبیلہ عزیز کے ناول کے صفحات واقعی بہت کم ہوتے ہیں۔ ہم نے نبیلہ عزیز سے کہا ہے کہ وہ ناول کے صفحات بڑھا دیں۔ ٹائٹل کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

کراچی سے مسرت الطاف احمد نے شرکت کی ہے۔ لکھتی ہیں۔

اس بار شعاع میں ناولز' افسانے بس نارمل ہی رہے "ایک تھی مثال" میں اس بار کچھ نیا پڑھنے کو ملا۔ "رقص بسمل" نبیلہ عزیز کا طرز تحریر بہت اثر انگیز ہے جو روانی اور پختگی ان کی تحریر میں ہے' وہ لاجواب ہے' نادرہ اس ناول میں میرا موسٹ فیورٹ کردار ہے جب کہ ولید اور عزت کی نوک جھونک بہت مزا دیتی ہے۔ نادرا کے کردار میں ذرا بھی اٹریکشن فیل نہیں ہوئی۔ "بت شکن" کی یہ قسط پڑھی تو بہت خوش گوار یت کا احساس ہوا

پلیز امایہ جی مہرو کی زندگی کی روشنی کو بجھنے نہ دیں۔ "تعبیر" یہ ناول حقیقت سے بہت ہی دور محسوس ہوا۔ اچھا خاصا جھول محسوس ہوا' مبالغہ آرائی کی حد ہی کردی۔ لیکن اینڈ پھر بھی پسند آیا اور ضرار کا کردار سب سے زیادہ قابل تعریف تھا۔ "انہونی" حاجرہ کا خود غرض اور بے حس رویہ بہت ہی شاکڈ کر گیا۔ "وہ کون تھی" روایتی موضوع لیکن دلچسپ انداز تحریر۔ حورعین کا کردار دل کو بھا گیا۔ افسانوں میں "اری او چھبگری" قابل تعریف تھا۔

پیاری مسرت! یہ جان کر افسوس ہوا کہ آپ کو ہمارے جواب سے دھکا لگا۔ دراصل آپ اتنے اچھے خط لکھتی ہیں کہ ہم نے سوچا' آپ کا تعارف بھی بہت اچھا ہونا چاہیے۔ اس لیے آپ کو دوبارہ لکھنے کو کہا' ورنہ وہ تعارف بھی شائع ہو سکتا تھا۔ تفصیلی تبصرے کے لیے تہ دل سے شکریہ۔

زندگی احمد نے ڈیرہ غازی خان سے شرکت کی ہے' لکھتی ہیں۔

ٹائٹل بہار کی نسبت سے کافی دلکش لگ رہا تھا۔ پہلی شعاع میں آپ کی دل فریب باتیں پڑھیں۔ حمد و نعت حسب معمول دل کو چھو لینے والی تھیں۔ پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں تو ہوتی ہی پر اثر ہیں۔ آپ جو فوائد و مسائل ساتھ ساتھ بتاتے ہیں اس سے سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ یقیناً" آپ کو اس کا اجر دے گا۔ (ان شاء اللہ) ویسے اپنا ایک خبر نظر سے گزری۔ جس کے مطابق ایک لڑکی نے شادی سے انکار پر لڑکے پر تیزاب پھینک دیا۔ اپیا یہ جو کہتے ہیں ناکہ آج کی لڑکی اپنا حق لینا جانتی ہے تو ایسا صرف شہروں میں وہ بھی مخصوص طبقے میں ہوتا ہے۔ گاؤں قصبوں کا نظام شہر سے ٹوٹلی ڈفرنٹ ہوتا ہے۔ افسوس صد افسوس آج بھی عورت کا حق پامال کیا جاتا ہے۔ انہیں رسوا کیا جاتا ہے۔ انہیں بھیڑ بکری سمجھا جاتا ہے۔ سمیرا حمید بہت بہت اچھی رائٹر ہیں۔ آگے جا کر یہ بہت نام و مقام کمائیں گی۔ امایہ خان اچھا لکھ رہی ہیں۔ امایہ خان نام بہت اچھا ہے۔ صباحت یاسمین اچھے افسانے لکھتی ہیں۔ راشدہ رفعت میری فیورٹ رائٹرز کی فہرست میں شروع سے شامل رہی ہیں۔ باقی مستقل سلسلے سب اپنی جگہ فٹ ہیں۔ خاص طور پر "تاریخ کے جھروکے" بہت اچھا ہے۔

زندگی! سب سے پہلے تو معذرت کہ آپ کے پچھلے خط شامل نہ ہو سکے۔ تفصیلی تبصرے کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔

افسانوں کے لیے معذرت' فی الحال صرف مطالعہ پر توجہ دیں۔

بنوں سے تہمینہ روف نے لکھا ہے۔

"رقص بسمل" کا مطلب پہلے ہمیں بتائیے۔ (حیران ہوئے نا آپ سب میری کم علمی پہ) تو بات دراصل یہ ہے کہ اپنے خاندان کی میں وہ واحد چشم و چراغ ہوں۔ جس نے شعاع اور خواتین کو پڑھنے کی ہمت کی ہے۔ میرے علاوہ باقی کوئی بھی نہیں پڑھتا۔ کسی سے پوچھنے کی ہمت نہیں ہوتی' سو بغیر مطلب کے بہت انہماک سے پڑھتی ہوں اس ناول کو' ولید رحمٰن کا کردار قابل تعریف ہے۔ ثمرہ جی! کافی عرصہ ہوگیا ہے' شبلی اور جوادی سے ملاقات نہیں ہوئی۔ ملاقات کا کوئی راستہ ڈھونڈیے نا۔ فائزہ جی آپ کن بھول بھلیوں میں کھوگئی ہیں؟ جبین سسٹرز نظر نہیں آرہیں۔ لبنیٰ جدون بھی کبھی کبھی لکھتی ہیں۔ لبنیٰ جی کیوں۔

پیاری تہمینہ! آپ خواہ مخواہ اتنا عرصہ خط لکھنے کے لیے سوچتی رہیں۔ بہت اچھا خط لکھا ہے آپ نے ویسے بھی الفاظ کی خوب صورتی لاکھ متاثر کن سہی' جذبات کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ آپ اپنے جذبات خواہ کتنے ہی ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں ہم تک پہنچائیں۔ دل سے نکلی بات دل تک پہنچ جاتی ہے۔

کسی لفظ کے معنی نہ آنا کم علمی نہیں۔ سب کچھ جاننے کا دعوا تو کوئی بھی نہیں کرسکتا۔ "بسمل" کے معنی گھائل یا تڑپنے والے کے ہیں یہ عاشق کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے' رقص کے معنی تو آپ جانتی ہی ہوں گی۔

آپ کی تحریر ابھی پڑھی نہیں' کوئی بھی کتاب منگوانے کے لیے آپ اس نمبر پر فون کرلیں۔ آپ کو کتاب کی قیمت اور منگوانے کا طریقہ بتا دیں گے نمبر یہ ہے 021-32735021

رضوانہ شکیل راؤ نے لودھراں سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں۔

ماڈل گرل مسکراتی ہوئی گلابوں سے لدی اچھی

گی۔ سب سے پہلے "پیارے نبی کی پیاری باتیں" پڑھ کر قلب وجاں کو منور کیا۔ بندھن میں مدیحہ اور نعمان حسن اچھے لگے۔ دستک میں وہی انٹرویو جو ہم بار بار پڑھ چکے ہیں۔ "ایک تھی مثال" پڑھ کر دل کا ایک کونا بھیگ سا گیا۔ "اری او چھبکری" میں سائرہ رضا کے قلم کی جولانیاں عروج پر نظر آئیں۔ "سرخ جوڑا" شازیہ نے ایک کھلی حقیقت کو عمدگی سے لکھ کر یہ ثابت کردیا کہ وقت کے ساتھ آپ کے قلم میں مزید نکھار آیا ہے۔ "وہ کون تھی" مسرت ناز نے بارہا لکھا ہوا ٹاپک ریپیٹ کیا۔ "محبت کا ستارہ" معیاری تحریر تھی۔ مریم عزیز کی "تعبیر" میں وہی اسلوب خوب صورت لفظوں کا چناؤ' خوب صورت طرز تحریر جوان کی تحریر کو منفرد بناتے ہیں۔ "رقص بسمل" سست روی کا شکار ہے۔ بات ہوجائے امایہ خان کے "بت شکن" کی معذرت کے ساتھ امایہ جی آپ کے ناول میں کوئی خاص موڑ نہیں۔ "خط آپ کے" یہ سلسلہ مجھے بے حد پسند ہے جس میں تمام بہنیں اپنی رائے کا اظہار کرتی ہیں۔ سونیا بابی کو شادی کی مبارک باد اللہ آپ کو نوال افضل گھمن کو بیٹے کی مبارک باد۔

پیاری رضوانہ! ہمیں افسوس ہے کہ آپ کا بھجوایا ہوا شعر کسی اور نام سے شائع ہوگیا۔ اس سہو کے لیے معذرت تنقید اور تعریف کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔

حنا صدف اور مقدس لکھنوال کلاں ضلع گجرات سے لکھتی ہیں

ٹائٹل گرل کا آئی میک اپ بہت اچھا لگا۔ پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں میں خواب کی تعبیر پڑھ کر اچھا لگا۔ مدیحہ رضوی اور حسن نعمان کا بندھن پڑھ کے بہت اچھا لگا۔ "ایک تھی مثال" مثال پر ترس آرہا ہے۔ سائرہ رضا کی "اری او چھبکری" خود کو جب ضمیر کے کٹہرے میں کھڑا کیا تو روح کانپ اٹھی۔ ہم لوگ پانی کی ٹونٹی کھول کر بند کرنا بھول جاتے ہیں اور کوئی اس کی ایک بوند کے لیے ترس رہا ہے گرمیوں میں لوڈ شیڈنگ کی بدولت اگر ٹھنڈا پانی نہ ملے تو برا حال ہوتا ہے اور گھر واسیوں کو ٹھنڈا اگر نہیں بلکہ پانی کی بوند خوشی کا سماں پیدا کرتی ہے۔ مریم عزیز "تعبیر" اچھی تحریر تھی۔ زید جیسے لوگوں کا انجام ایسا ہی ہونا چاہیے۔ "رقص بسمل" ماورا مرتضیٰ کے کراچی جانے کا انتظار ہے پچھلے ماہ کے شعاع میں کسی بہن نے لکھا تھا کہ تیمور جو کہ ناول کا ہیرو ہے اس کی پرسنالٹی زبردست تھی مگر اب ٹین ایجر کی طرح بی ہیو کررہا ہے تو میں کہنا چاہوں گی کہ محبت انسان کو بے بس کردیتی ہے وہ نفع و نقصان نہیں دیکھتی۔ نبیلہ عزیز صاحبہ بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ بس کہانی کے صفحات بڑھادیں مسرت ناز "وہ کون تھی" اچھا تھا۔ ہمارے جلال پور جٹاں شہر میں ہائی اسٹینڈرڈ کا اسکول دارارقم ہے جس میں نرسری کلاس کے بچے کی ماہانہ فیس پچیس سو روپے ہے۔ والدین وہاں پر ماہانہ پچیس سو روپے دے دیتے ہیں مگر ان ہی لوگوں کو اگر دس روپے کسی فقیر کو دینے ہوں تو ان لوگوں کو پریشانی ہوتی ہے۔ ہمارا احساس ختم ہوچکا ہے یہ اگر ایک دفعہ سوچ لیں کہ تھر میں اناج کے دانے پانی کے قطرے کی کمی کے باعث ماؤں کی گود اجڑ رہی ہے اگر پچیس سو میں سے چند سو ہم ان کو دے دیں تو شاید کسی ایک ماں کی گود بچ سکے۔

حنا اور مقدس! آپ کی بات درست ہے لیکن آپ کو یہ اندازہ نہیں ہے سب تو نہیں لیکن بیشتر والدین اپنی اولاد کی تعلیم کے لیے یہ فیسیں کس طرح مہیا کرتے ہیں۔ ہاں یہ سچ ہے کہ بہت سارے لوگ اس قابل ہیں کہ وہ بہت کچھ کرسکتے ہیں مگر بات صرف احساس کی ہے۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ آپ کی تعریف و تنقید ان کے سطور کے ذریعے متعلقہ مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔ "محبت بے بس کردیتی ہے۔" آپ کی اس سوچ سے ہم متفق نہیں' انسان کو اپنے وقار کا خیال رکھنا چاہیے۔ محبت ہو یا نفرت کسی بھی جذبے میں حد سے گزرنا انسان کو انسانیت کے درجے سے گرا دیتا ہے۔

سلمیٰ یونس مردان طورو سے لکھتی ہیں

سب سے پہلے تو ٹائٹل کی طرف جو انتہائی پروقار اور نفیس سی ماڈل سے جگمگا رہا تھا۔ دل خوش کردیا۔

اسٹوری آف دی ٹاپ "رقص بسمل" لیکن بہت مختصر اور سست روی کا شکار ہے۔ کہاں تیمور حیدر جیسا شاندار آدمی کہ بندہ خوامخواہ امپریس ہوجائے لیکن جب بات محبت کی آئی تو بقول ولید اپنے مقام سے بہت نیچے کی طرف آتا رہتا ہے۔ نئی رائٹر امایہ خان بھی بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔

لگتا ہی نہیں کہ یہ نئی رائٹر ہیں۔ مریم عزیز کا مکمل ناول "تعبیر" بہت اچھا ہے لیکن آج کے دور میں اتنا صبر اور اپنی خواہشوں اور خوابوں کو دوسروں کے لیے قربان کرنا کہاں کی عقل مندی ہے۔ "تاریخ کے جھروکوں سے" ہمیشہ سے میرا فیورٹ رہا ہے۔ دوسرے سلسلے بھی ٹھیک ہی تھے۔

پیاری سلمیٰ! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ دوسروں کے لیے نہیں اپنوں کے لیے اپنوں کی خوشیوں کے لیے تعبیر نے یہ سب کچھ کیا۔ بے شک شاہدہ بیگم جیسے لوگ بھی ہوتے ہیں دنیا میں لیکن اگر سب ان جیسے ہوجائیں اور دنیا سے ایثار' قربانی اور محبت کے جذبوں کا وجود ختم ہوجائے تو تصور کریں یہ دنیا تب کیسی ہوگی محبت ہو یا نفرت انسان کو اپنے مقام اور اپنا وقار بہر صورت قائم رکھنا چاہیے۔

اقصیٰ بتول نے نیا لاہور سے لکھا ہے۔

سرخ گلابوں کی بہار نے ٹائٹل کو خوب سجایا۔ صحیح کہتی ہیں آپ کوئی بھی کام تب ہی انجام بخیر کو پہنچتا ہے جب سچائی کو ملحوظ خاطر رکھا جائے مگر سچائی تو گیا۔ یہاں انسانیت کو ہی مسخ کیا جارہا ہے آج جب انفرادی طور پر اخلاقیات ختم ہوچکی ہیں تو بڑی سطح پر ہم کیسے امید کرتے ہیں؟ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتوں کا تو کوئی مول ہی نہیں۔ "ایک تھی مثال" رخسانہ جی کا قلم بہت مشتاقی سے مثال کی نفسیات کو ٹوٹتے بکھرتے دکھا رہا ہے۔ سائرہ رضا لفظ نہیں لکھتیں' کوئی سحر سا پھونک دیتی ہیں۔ سائرہ جی اتنا خوب صورت حساس' درد بھرا اور رب تعالیٰ کی عظمت بیان کرتا افسانہ لکھنے پر بہت بہت مبارک باد اسے پڑھ کر رواں رواں اپنے رب کا شکر گزار ہوگیا۔ اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔ "تعبیر" کا اینڈ بہت اچھا گیا۔ رقص بسمل کی اب تک یہ پہلی قسط ہے جو کچھ اچھی لگی۔ ماورا کا کردار اتنا خاص نہیں جتنا دکھانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ایسے شو آف کرتے کریکٹر کبھی بھی اچھے نہیں لگے مجھے۔ بندے کے اندر مروت' خلوص' عاجزی ہونی چاہیے۔ "بت شکن" کی تو کیا ہی بات ہے۔ اس میں رامین کا کردار بہت اچھا ہے۔ "سوداگری" واقعی سوداگری اور محبت میں بڑا فرق ہے۔ مگر لوگ کم ہی سمجھتے ہیں۔ نگہت سیما کا نام دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ "سرخ جوڑا" بہت ہی اچھا لگا یہ ناول "وہ کون تھی" کچھ خاص نہیں لگا۔ حقیقت سے دور تھا لیکن خیر اتنا برا بھی نہیں تھا۔ زہرا تنویر اور حرا قریشی کا تبصرہ پسند آیا۔ "تاریخ کے جھروکے زبردست موضوع کے ساتھ بہت پسند آرہا ہے۔"

پیاری اقصیٰ! تفصیلی تبصرے کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔

مہوش کنول مشی نے جنڈانوالہ بھکر سے لکھا ہے

میں تین کہانیاں بھیج چکی ہوں' لیکن کوئی بھی شائع نہیں ہوئی۔ کیا سب ناقابل اشاعت تھیں۔

> **قارئین متوجہ ہوں!**
>
> 1 شعاع ڈائجسٹ کے لیے تمام سلسلے ایک ہی لفافے میں بھجوائے جاسکتے ہیں۔ تاہم ہر سلسلے کے لیے الگ کاغذ استعمال کریں۔
>
> 2 افسانے یا ناول لکھنے کے لیے کوئی بھی کاغذ استعمال کرسکتے ہیں۔
>
> 3 ایک سطر چھوڑ کر خوش خط لکھیں اور صفحے کی پشت یعنی صفحے کی دوسری طرف ہرگز نہ لکھیں۔
>
> 4 کہانی کے شروع میں اپنا نام اور کہانی کا نام لکھیں اور اختتام پر اپنا مکمل ایڈریس اور فون نمبر ضرور لکھیں۔
>
> 5 مسودے کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں۔ ناقابل اشاعت صورت میں تحریر کی واپسی ممکن نہیں ہوگی۔
>
> 6 تحریر روانہ کرنے کے دو ماہ بعد صرف پانچ تاریخ کو اپنی کہانی کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔
>
> 7 شعاع ڈائجسٹ کے لیے افسانے' خط یا سلسلوں کے لیے انتخاب' اشعار وغیرہ درج ذیل پتے پر رجسٹری کروائیں۔
>
> ماہنامہ شعاع۔ 37 اردو بازار کراچی۔

مہوش! ہمیں افسوس ہے کہ آپ کی کہانیاں قابل اشاعت نہیں ہیں۔ فی الحال صرف مطالعہ پر توجہ دیں۔

مسز جبین اجمل روہڑی ضلع سکھر سے شریک محفل ہیں۔ لکھا ہے۔

سرورق پیارا لگا مگر بنا دوپٹے کے ماڈل اچھی نہیں لگی۔ خوابوں سے متعلق احادیث اچھی لگیں۔ ایک بڑی غلطی درست کی۔ میں درود شریف پڑھتی تھی برے خوابوں کے لیے لیکن حدیث کی رو سے "تعوذ" پڑھنی چاہیے۔ "بت شکن" امایہ خان شان دار لکھ رہی ہیں جملہ مکمل ہے۔ خاص کر یہ دو جملے کہ "میرے اعمال اتنے کریہہ تو نہ تھے" اور "زندہ کرو ان تصویروں کو' بتوں میں جان ڈالو....."

سندھ میں رہنے کے باوجود میں تھر کے باسیوں کے لیے دعا کے علاوہ کچھ نہیں کرسکتی۔ بس حکومت سے کہنا چاہتی ہوں کہ اس وقت سے ڈریں جب کوئی کچھ نہ کرسکے گا۔ اور یہ بے گناہ بچے اللہ کے سامنے اپنی فریاد لے کر جائیں گے تب بھی کیا آپ کے پاس کوئی نیا بہانہ یا وعدہ ہوگا۔

جبین! آپ کے خط لیٹ موصول ہونے کی وجہ سے شامل اشاعت نہ ہوسکے ہمیں احساس ہے کہ پرچا بہت سے شہروں میں دیر سے پہنچتا ہے اور ہماری قارئین اس وجہ سے جلدی خط نہیں لکھ سکتیں۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہ دل سے شکریہ۔ کہانی کے لیے معذرت۔

سمیعہ سحر قریشی نے ضلع بہاول نگر سے لکھا ہے

جب میری سسٹرز کی شادی ہوئی تو میرا دل نہیں لگتا تھا اور میں روتی ایک دم میری نظر شعاع پر پڑی وہ دن اور آج کا دن شعاع شعاع بس شعاع کیونکہ شعاع نے رونا بند کروایا مسکرانا شروع۔ ٹائٹل پر معصوم سی ماڈل اچھی لگی۔

"رقص بسمل" تو ہے ہی سپرہٹ اسٹوری۔ "ایک تھی مثال" پڑھ کر دل خون کے آنسو رویا۔ اتنی سی بچی اور اتنے امتحان۔ خیر اب دوسری ماں اچھی آئی (قسمت سے) تو دل کو سکون ملا۔ اب بات کی جائے زبردست ناول "تعبیر" کی۔ جی ہاں "تعبیر" کی۔

مجھے دل کے بے حد قریب لگا۔ جتنا ماموں اچھا اور مامی اتنی ہی بری۔

پیاری سمیعہ! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ مثال کی آزمائش ختم نہیں ہوئی۔ دوسری ماں نے تو اس سے باپ بھی چھین لیا ہے۔ آگے دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔

فاطمہ سکندر گرین ٹاؤن لاہور سے شریک محفل ہیں لکھا ہے۔

مریم عزیز صاحبہ نے کمال ہی کردیا۔ کہانی بہت ہی زیادہ اچھی تھی اور آخر میں ہمارے تو آنسو ہی ٹپک پڑے۔ میری امی جان کو بھی یہ کہانی بہت بہت اچھی لگی۔ اس کے بعد جو افسانہ نمبر لے گیا وہ ہے جی "سوداگری" ایسا افسانہ جس کی تعریف ممکن نہیں۔ "ایک تھی مثال" بھی اچھا چل رہا ہے۔ "رقص بسمل" اچھا ہے مگر ساورا جو اتنی اعتماد ہے اس کا تیمور کی نوکری کی آفر جھٹ سے قبول کرنا اچھا نہ لگا۔ ناولٹ "انسولی" بھی قابل تعریف تھی۔ نگہت سیما صاحبہ کا نام دیکھ کر ہی دل خوش ہوگیا۔ مکمل ناول بھی اچھا تھا اور اس کے علاوہ تمام افسانے بھی قابل ستائش تھے۔ "بت شکن" کی بھی یہ قسط اچھی تھی۔ غرض یہ کہ سارا رسالہ ہی خوب تھا۔

فاطمہ! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے متعلقہ مصنفین تک پہنچائی جارہی ہے۔

رخسانہ نگار عدنان

ایک تھی مثال

عدیل اور فوزیہ نسیم بیگم کے بچے ہیں۔ بشریٰ ان کی بہو ہے اور ذکیہ بیگم کی بیٹی ہے۔ عمران بشریٰ کا بھائی ہے۔ مثال ذکیہ بیگم کی نواسی اور نسیم بیگم کی پوتی ہے۔ بشریٰ اور نسیم بیگم میں روایتی ساس بہو کا تعلق ہے۔ نسیم بیگم مصلحتاً بیٹا بہو سے لگاوٹ دکھاتی ہیں۔ دوسری طرف ذکیہ بیگم کا کہنا ہے۔ ان کی بیٹی بشریٰ کو سسرال میں بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ پانچ سال کی مسلسل کوششوں کے بعد بشریٰ کی نند فوزیہ کا بالآخر ایک جگہ رشتہ طے پا جاتا ہے۔ نکاح والے روز بشریٰ دولہا ظہیر کو دیکھ کر چونک جاتی ہے۔

عدیل سے شادی سے قبل ظہیر کا بشریٰ کے لیے بھی رشتہ آیا تھا مگر بات نہ بن سکی تھی۔ نکاح والے دن زاہدہ اور ذکیہ بیگم بھی ایک دوسرے کو پہچان لیتی ہیں۔ بشریٰ اپنی ماں سے یہ بات چھپانے کے لیے کہتی ہے مگر عدیل کو پتا چل جاتا ہے۔ وہ ناراض ہوتا ہے مگر فوزیہ اور نسیم بیگم کو بتانے سے منع کر دیتا ہے۔ بشریٰ اور عدیل ایک ہفتے کے لیے اسلام آباد جاتے ہیں۔ وہاں انہیں پتا چلتا ہے کہ بشریٰ کے ہاں سات سال بعد پھر خوش خبری ہے۔

عفان اور عاصمہ اپنے تین بچوں اور والد کے ساتھ کرائے کے گھر میں رہتے ہیں۔ عفان کے والد فاروق صاحب سرکاری نوکری سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ گریجویٹی اور گاؤں کی زمین فروخت کر کے وہ اپنا گھر خریدنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ڈیڑھ کروڑ میں زمین کا سودا کر کے وہ عفان کے ساتھ خوشی خوشی شہر آ رہے ہیں۔ عاصمہ کو فون کے ذریعے کوئی اطلاع ملتی ہے، جسے سن کر وہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔

فون پر پتا چلتا ہے کہ شہر آتے ہوئے عفان اور فاروق صاحب ڈکیتی کی واردات میں قتل ہو گئے۔ عفان کے قریبی دوست زبیر کی مدد سے عاصمہ عفان کے آفس سے تین لاکھ روپے اور فاروق صاحب کی گریجویٹی سے سات لاکھ روپے وصول کر پاتی ہے۔ زبیر گھر خریدنے میں بھی عاصمہ کی مدد کر رہا ہے۔

اسلام آباد سے واپسی پر عدیل دونوں متقولین کو دیکھتا ہے۔ زاہدہ، نسیم بیگم سے بیس لاکھ روپے سے مشروط فوزیہ کی رخصتی کی بات کرتی ہیں۔ وہ سب پریشان ہوجاتے ہیں۔ عدیل بشریٰ سے ذکیہ بیگم سے تین لاکھ روپے لانے کو کہتا ہے۔

حمیدہ خالہ، عاصمہ کو سمجھاتی ہیں کہ عدت میں زبیر کا اکیلے اس کے گھر آنا مناسب نہیں ہے۔ لوگ باتیں بنا رہے ہیں جبکہ عاصمہ کی مجبوری ہے کہ گھر میں کوئی مرد نہیں۔ اس کا بیٹا ابھی چھوٹا ہے اور سارے کام اس نے خود کرنے ہیں۔ وہ جلد از جلد اپنا گھر خریدنا چاہتی ہے۔ عاصمہ کے کہنے پر زبیر کسی مفتی سے فتویٰ لے کر آجاتا ہے کہ وہ انتہائی ضرورت کے پیش نظر گھر سے نکل سکتی ہے بشرطیکہ مغرب سے پہلے واپس گھر آجائے، سو وہ عاصمہ کو مکان دکھانے لے جاتا ہے۔

رقم مہیانہ ہونے کی صورت میں فوزیہ کو طلاق ہوجاتی ہے۔ نسیم بیگم جذباتی ہوکر بشریٰ اور اس کے گھر والوں کو موردِ الزام ٹھہرانے لگتی ہیں۔ اسی بات پر عدیل اور بشریٰ کے درمیان خوب جھگڑا ہوتا ہے۔ عدیل طیش میں بشریٰ کو دھکا دیتا ہے۔ اس کا ابارشن ہوجاتا ہے۔ عدیل شرمندہ ہوکر معافی مانگتا ہے مگر وہ ہنوز ناراض رہتی ہے اور اسپتال سے اپنی ماں کے گھر چلی جاتی ہے۔

اسی اسپتال میں عدیل عاصمہ کو دیکھتا ہے جسے بے ہوشی کی حالت میں لایا گیا ہوتا ہے۔ عاصمہ اپنے حالات سے تنگ آکر خودکشی کی کوشش کرتی ہے تاہم بچ جاتی ہے۔ نو سال بعد عاصمہ کا بھائی ہاشم پریشان ہوکر پاکستان آجاتا ہے۔ عاصمہ کے سارے معاملات دیکھتے ہوئے ہاشم کو پتا چلتا ہے کہ زبیر نے ہر جگہ فراڈ کرکے اس کے سارے راستے بند کردیے ہیں اور اب مفرور ہے۔ بہت کوششوں کے بعد ہاشم، عاصمہ کو ایک مکان دلا پاتا ہے۔ بشریٰ اپنی واپسی الگ گھر سے مشروط کردیتی ہے۔ دوسری صورت میں وہ علیحدگی کے لیے تیار ہے۔ عدیل سخت پریشان ہے۔

عدیل مکان کا اوپر والا پورشن بشریٰ کے لیے سیٹ کروا دیتا ہے اور کچھ دنوں بعد بشریٰ کو مجبور کرتا ہے کہ وہ فوزیہ کے لیے عمران کا رشتہ لائے۔ نسیم بیگم اور عمران کسی طور نہیں مانتے۔ عدیل اپنی بات نہ مانے جانے پر بشریٰ سے جھگڑتا ہے۔ بشریٰ بھی ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ عدیل طیش میں بشریٰ کو طلاق دے دیتا ہے اور مثال کو چھین لیتا ہے۔ مثال بیمار پڑجاتی ہے۔ بشریٰ بھی حواس کھودیتی ہے۔ عمران بہن کی حالت دیکھ کر مثال کو عدیل سے چھین کرلے آتا ہے۔ عدیل، عمران پر اغوا کا پرچا کٹوا دیتا ہے۔

عاصمہ اسکول میں ملازمت کرلیتی ہے مگر گھریلو مسائل کی وجہ سے آئے دن چھٹیاں کرنے کی وجہ سے ملازمت چلی جاتی ہے۔ اچانک ہی فوزیہ کا کہیں رشتہ طے ہوجاتا ہے۔

انسپکٹر طارق دونوں فریقین کو سمجھا بجھا کر مصالحت پر آمادہ کرتے ہیں۔ ذکیہ بیگم کی خواہش ہے کہ عدیل، مثال کو لے جائے، تاکہ وہ بشریٰ کی کہیں اور شادی کرسکیں۔ دوسری طرف نسیم بیگم بھی ایسا ہی سوچے بیٹھی ہیں۔ فوزیہ کی شادی کے بعد نسیم بیگم کو اپنی جلد بازی پر پچھتاوا ہونے لگتا ہے۔

انسپکٹر طارق، ذکیہ بیگم سے فوزیہ کا رشتہ مانگتے ہیں۔ ذکیہ بیگم خوش ہوجاتی ہیں مگر بشریٰ کو یہ بات پسند نہیں آتی۔ ایک پراسراری عورت عاصمہ کے گھر بطور کرائے دار رہنے لگتی ہے۔ وہ اپنی حرکتوں اور انداز سے جادو ٹونے والی عورت لگتی ہے۔ عاصمہ بہت مشکل سے اسے نکال پاتی ہے۔

بشریٰ کا سابقہ منگیتر احسن کمال ایک طویل عرصے بعد امریکا سے لوٹ آتا ہے۔ وہ گرین کارڈ کے لالچ میں بشریٰ سے منگنی توڑ کر نازیہ بھٹی سے شادی کرلیتا ہے، پھر شادی کے ناکام ہوجانے پر ایک بیٹے سیفی کے ساتھ دوبارہ اپنی چچی ذکیہ بیگم کے پاس آجاتا ہے اور دوبارہ شادی کا خواہش مند ہوتا ہے۔ بشریٰ تذبذب کا شکار ہوجاتی ہے۔

بالآخر وہ احسن کمال سے شادی پر رضامند ہوجاتی ہے اور سادگی سے دو گھنٹے کے اندر نکاح بھی ہوجاتا ہے۔ عاصمہ اس جادوگر عورت کو نکالنے کے بعد اپنا مکان دوبارہ کرائے پر نہیں دیتی بلکہ پڑوس میں رہنے والی سعدیہ کے ساتھ کوچنگ سینٹر کھول لیتی ہے۔ ساتھ ہی اس کے مشورے پر بی اے کے پرائیویٹ امتحان دینے کی تیاری شروع کردیتی ہے۔

—۱۶—

سولہویں قسط

عدیل نے چیز گھورتی نظروں سے پرسکون موڈ میں گپیں لگاتی عفت کو دیکھا۔ جو خود بھی یہ شور بھری آواز سن کر بے اختیار ٹھٹکی تھی۔

"پھر کچھ توڑ ڈالا؟ اس گھر میں تو اب چیزیں بنتی کم ہیں، برباد زیادہ ہوتی ہیں۔ یہاں کسی کو اس مزدور کے خون پسینے کی کمائی کا احساس ہو تب ناں، سب نے تو اسے کاٹھ کا الو سمجھ رکھا ہے 'لاتا جا' کماتا جا' کھلاتا جا۔ یہ اڑانے اور اجاڑنے والے بیٹھے ہیں۔" نسیم بیگم کو بولنے کا خبط ہو گیا تھا گزرتے سالوں کے ساتھ۔

"اٹھ جاؤ اب۔ دیکھو بھی لو۔ کیا ہوا ہے کچن میں۔ کون تھا وہاں پر؟" عدیل بظاہر مدھم آواز میں مگر گھرکتے لہجے میں عفت سے بولا جو ابھی بھی بظاہر کچھ پریشان سی اپنی جگہ پر ہی جمی بیٹھی تھی۔

"جاتی ہوں، جا رہی ہوں اور سب کچھ تو تیار تھا صرف ٹرالی میں رکھنا تھا پتا نہیں اس کمبخت نے کیا بیڑا غرق کیا ہے سب چیزوں کا۔" عفت بڑبڑاتی ہوئی باہر نکل گئی۔

"عفت بھابھی اچھی ہیں بھائی۔ ہے نا۔" فوزیہ بظاہر بڑے احساس مند انداز میں بولی، جیسے اسے بھائی کے جذبات کی بڑی فکر رہی ہو۔

"ہوں۔ اچھی ہے بہت۔" بہن کی عزت بہنوئی کے سامنے رکھنا تو ضروری تھا بلکہ زیادہ تو اپنی عزت رکھنے کو اس نے یہ چار حرفی جواب کچھ رک کر دیا تھا۔

فوزیہ اور خالد ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرانے لگے۔ اس بار پورے سات سال بعد فوزیہ نے چکر لگایا تھا۔ پچھلی بار وہ تقریباً پانچ سال کے وقفے کے بعد آئی تھی اس کے دونوں بچے دس گیارہ برس کے ہو چلے تھے۔

فوزیہ خوب فربہ ہو چکی تھی۔ بالکل کسی بھینس کی طرح جس پر خوب سونا چڑھایا گیا ہو۔

پھر اسے اپنے دیناروں، سونے کے زیورات اور قیمتی چیزوں کی نمائش کرنا بھی خوب آگیا تھا۔

پرس، جوتا، شال، لباس، میچنگ ایئر رنگز، جو بھی چیز پہنتی دکھاتی تو پہلے اسے دیناروں میں بتاتی اور پھر فوراً" کسی کیلکولیٹر کی طرح اسے پاکستانی کرنسی میں تبدیل کرکے روپوں میں بتاتی تو سامنے والا بے حد متاثر ہو جاتا۔

نسیم کے پاس بیٹھنے کا اس کے پاس زیادہ وقت نہیں ہوتا تھا۔ یوں بھی اسے اب عفت کی برائیوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

عدیل اور عفت میں انتہائی محبت تھی۔ وہ اس کے ایک اشارے پر آدھی رات کو بھی اٹھ کر کچھ بھی کرنے جا سکتا تھا، ہاں ماں کی دوا میں لانا بیس بار یاد دلانے کے باوجود بھولنا اس کی پختہ عادت بن چکی تھی۔ نسیم بولتی چلی جاتیں کہ اس گھر میں سب کی پسند کے کھانے بنتے ہیں سوائے اس بڑھیا کے۔

ہر ایک کی مرضی اور پسند کے مطابق کپڑا، لتا، جوتا۔ آتا ہے صرف ان سے ان کی خواہش نہیں پوچھی جاتی۔ کسی متروک شدہ سامان کی طرح انہیں گھر کے کونے میں ڈال دیا گیا ہے۔

"فوزیہ! تو اس بار عدیل سے ذرا کھڑک کر بات کرنا۔ اسے احساس دلانا میں ماں ہوں اس کی۔" وہ آتے ہی فوزیہ کے آگے اپنے دکھڑے روتے ہوئے بولیں۔

فوزیہ اس دوران اپنے قیمتی موبائل سیٹ پر اپنی کسی سہیلی کے میسجز کا جواب بڑے انہماک سے ٹائپ کرتی رہی۔

"سن رہی ہے نا ماں کی بکواس؟ یا تو بھی بھائی کی طرح ایک کان سے سنتی ہے، دوسرے سے اڑا دیتی ہے۔ کچھ سنا میں نے کیا بولا ہے۔" نسیم اسے متوحش انداز میں جھنجھوڑتے ہوئے بولیں۔

فوزیہ نے ناگواری سے ماں کے جنگلی انداز کو برداشت کیا تھا۔ اس کا بے حد نازک سوٹ کندھے سے مسک نہ جائے۔ وہ ماں سے ذرا پرے ہٹ کر بیٹھ گئی۔

"کر چکی ہوں آپ کے بولنے اور بتانے سے پہلے ہی یہ سب باتیں میں بھائی سے۔ آتے ہی دیکھ لیا تھا کہ کیسے اس گھر میں صرف عفت کا راج ہے آپ کو ایک کونے میں ڈال دیا گیا ہے۔ میں نے پہلے ہی عدیل بھائی سے بول دیا ہے اور امی! آپ پریشان نہیں ہوں' اس بار جاؤں گی تو آپ کو الگ سے پیسے بھیجا کروں گی۔ اس سے آپ اپنی پسند کی چیزیں منگوا لیا کریں اور جیب میں پیسہ ہو تو یہ عفت جس نے پیچھے سے کچھ نہیں دیکھا' دب کر رہے گی آپ سے۔ میں پھر بات کروں گی بھائی سے۔ آتی ہوں۔ میرے خیال میں عدیل بھائی آ گئے۔" وہ ماں سے جان چھڑا کر وہاں سے بھاگ گئی۔

"آ گیا ہے تو اسے یہیں لے آ میرے پاس' دو گھڑی کو تم دونوں بیٹھ جاؤ۔ ترس جاتی ہوں۔ میرے بچے بھی میرے پاس آ کر بیٹھیں۔ کچھ ماں کے دکھ درد سنیں۔ کچھ اپنی کہیں اور دیکھو لو میری دوا میں لے کر آیا یا پھر بھول گیا۔ بیوی بچوں کی فرمائشوں کے تھیلے بھر کر لایا ہو گا۔ بوڑھی خبطی ماں کہاں یاد رہتی ہے۔"

نسیم پیچھے سے بولتی رہ جاتیں اور فوزیہ عفت کے ساتھ کھڑی ہنس ہنس کر باتیں کیے جاتی۔

دونوں میں خوب گاڑھی چھنتی تھی۔ بہت سے تحائف لے کر آئی تھی فوزیہ عفت اور اس کے دونوں بچوں کے لیے۔

مشال کے لیے وہ ایک سوٹ اور گڑیا لے کر آئی تھی' جسے دیتے ہوئے وہ خود بھی کچھ الجھی رہی تھی کہ مشال کا قد تو فوزیہ سے بھی بڑا ہو چکا تھا۔

اور وہ اسے ابھی بھی چھوٹی بچی سمجھ کر گڑیا اٹھا لائی تھی۔ یوں بھی پچھلے سال عروسہ کی سالگرہ پر اتنی گڑیاں اکٹھی ہو گئی تھیں کہ فوزیہ نے اس میں آدھی تو یہاں پاکستان میں اپنی دھاک جمانے کو قریبی رشتہ داروں کے بچوں میں "تحفتاً" دی تھیں۔ وہ مشال کی عمر کے سال بھولی نہیں تھی۔

بس یونہی لاپروائی سے وہ مشال کے لیے بھی ان ہی گڑیوں میں سے ایک اٹھا لائی۔

"پھپھو! یہ تو مجھے دے دیں۔" بارہ سال کی پریشے نے وہ گڑیا فوراً" فوزیہ سے جھپٹ لی۔

یوں بھی مشال نے اسے لینے کے لیے ابھی ہاتھ نہیں بڑھائے تھے۔ مشال نے بے تاثر نظروں سے پریشے کو گڑیا لیتے اور خوش ہوتے دیکھا اور خاموشی سے جانے لگی۔

"ارے موڈ خراب کر کے کیوں جا رہی ہو۔ میں تمہارے لیے یہ سوٹ بھی تو لائی ہوں۔ لو۔" فوزیہ نے پیچھے سے بہت جتانے والے انداز میں آواز دی تھی۔

مشال ان ہی قدموں پہ ٹھٹک گئی مگر مڑی نہیں۔

کیونکہ وہ جانتی تھی اول تو یہ سوٹ جو اسے بہت احسان کر کے دیا جانے والا ہے' سب کا مسترد کردہ ہو گا یا اچھا بھی ہوا تو اس تک نہیں پہنچے گا۔

"کم سنتی ہے میرے خیال میں تو یہ مشال بی بی ماں کی طرح۔ بشریٰ کو بھی یہی بیماری تھی۔ مطلب کی بات فوراً" اچک لیتی' مطلب کی نہ ہو تو بہری بن جاتی۔" فوزیہ کے دل میں پرانی ناپسندیدگی نے چٹکی کاٹی تھی۔ مشال بے تاثر چہرے کے ساتھ پھوپھی کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔

بلیک کلر کا جارجٹ کا سوٹ تھا جس پر شاکنگ پنک اور سلور بہت خوبصورت چھوٹے چھوٹے پھول اور ڈیزائن تھے۔ مشال کی توقع کے برعکس سوٹ بہت خوب صورت تھا۔

"خاص میں نے اپنی پسند سے لیا ہے اپنے لیے سرخ رنگ میں اور تمہارے لیے یہ بلیک۔" وہ مشال کی آنکھوں میں پسندیدگی دیکھ کر فخریہ انداز میں بولی تھی۔ مشال نے آہستگی سے سوٹ لینے کے لیے ہاتھ بڑھائے۔

"یہ تو بہت خوب صورت کلر ہے فوزیہ اور سچ میں تو مشال کو یہ منحوس کلر کبھی نہ پہننے دوں۔ ہماری اماں بہشتی

کہا کرتی تھیں۔ کنواریوں کو یہ کلر نہیں پہننا چاہیے' خدانخواستہ آگے چل کر یہ رنگ ان کی زندگی کو بھی منحوس کر دیتا ہے اور یہ تو سارا ہی بلیک ہے۔ شلوار بھی دوپٹا بھی... رہنے دو بھئی! مشال نہیں پہنے گی یہ رنگ۔" مشال کے ہاتھوں میں پہنچنے سے پہلے سوٹ "حق دار" کے ہاتھوں میں پہنچ گیا۔

فوزیہ اس حملے کے لیے تیار نہیں تھی۔ فوری طور پر کچھ بول نہیں سکی۔

"میرے پاس ایک شوخ سا سوٹ پڑا ہے الماری میں' وہ میں اس کی جگہ مشال کو دے دوں گی۔ ٹھیک ہے نا۔" وہ جیسے فوزیہ کی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے فوراً" سے بولی۔

مشال کچھ کہے بغیر خاموشی سے جانے لگی۔

"ویسے اچھا لگتا مشال کے رنگ روپ پر اٹھتا۔ میں نے تو اس کے خیال سے لیا تھا۔" فوزیہ کو عفت کی حرکت کچھ اچھی نہیں لگی تھی۔ سرسری سے انداز میں بولی۔

"تو تم دے دو اس کو۔ میں نے تو اس کے بھلے کو لیا تھا۔" عفت فوراً" ناگواری سے بولی۔

"ارے نہیں۔ میں کوئی اور دلا دوں گی مشال کو۔ تم رکھو یہ۔" فوزیہ فوراً" سنبھل کر بولی۔

اب اتنے سارے دن تو اسے یہیں رہنا تھا۔ عفت سے تعلقات میں معمولی بگاڑ بھی وہ نہیں چاہتی تھی۔

مشال باہر چلی گئی۔ باہر اس کے کرنے کو بے شمار کام تھے۔ اس کے کندھے ابھی سے بغیر کوئی کام کیے جیسے دکھنے لگے تھے۔

"آج تیرہ تاریخ ہے۔ دو دن بعد مما کے پاس۔ اور وہاں بھی اسی طرح نہ موجود ہونے کا احساس اور بے شمار کام۔"

تھک کر ایک طرف بیٹھ گئی۔

"اس گھر میں کسی کمبخت کو یاد ہے کہ اس بڑھیا کو بھی کچھ کھانے کو دینا ہے۔ صبح سے چائے کے ساتھ ایک سوکھا توس کھلا رکھا ہے۔ اس کے بعد مجال ہے جو کسی مردود کو خیال بھی آیا ہو کہ اس مریضہ کو بھی کچھ کھانے' پینے کی ضرورت ہو گی۔ مر گئے سارے کہیں پر۔ کوئی میری بکواس سنتا ہے یا نہیں۔"

نسیم ایک دم پوری طاقت لگا کر چیخنے لگی تھیں۔

انہیں ہر دو گھنٹے بعد کچھ نہ کچھ کھانے کو چاہیے ہوتا تھا اور کھانے کے بعد خود بھی بھول جایا کرتی تھیں کہ کب کیا کھایا تھا۔

مشال تھکے تھکے قدموں سے اٹھ کر کچن میں آ گئی۔

ظاہر ہے عفت اور فوزیہ میں سے تو کسی نے نسیم کی یہ تقریر سنی بھی نہیں ہو گی۔ سنی بھی ہو گی ان سنی کر دی ہو گی۔

وہ نسیم کے لیے سوپ گرم کرنے لگی۔

"تم اپنی حرکتوں سے باز نہیں آؤ گی؟" پیچھے سے عفت آ کر بجلی کی طرح اس کے سر پہ کڑکی تھی۔

مشال حیرت زدہ سی کھڑی رہ گئی۔

"کیسے شکل پر بارہ بجائے نحوست پھیلائے پھرتی ہو' ذرا سا سوٹ کیا لے لیا۔ ایسی شکل بنالی جیسے ہمیشہ ہی تم سے اس گھر میں ایسا سلوک کیا جاتا ہے' کچھ نہیں دیا جاتا۔ یہی ظاہر کرنا چاہ رہی تھیں نا تم؟" وہ جانتی تھی' عفت اسی طرح آ کر اسی پر چڑھ دوڑے گی۔

لیکن اس بار اس نے حتی الامکان کوشش کی تھی کہ اپنے چہرے کے تاثرات نارمل رکھے مگر پھر بھی... یہ جرم بھی اس کے کھاتے میں آ ہی گیا۔

"کیا بہتر نہیں ہوگا مہمانوں کے سامنے آپ مجھ سے یوں بلاوجہ میں نہ الجھیں۔ میں کچھ کہہ دوں گی تو آپ ہسٹریائی مریضوں کی طرح چیخنے چلّانے لگیں گی۔" وہ کھولتے سوپ کو دیکھتے ہوئے سرد لہجے میں بولی۔ عفت کو تو جیسے ہزار والٹ کا کرنٹ لگا۔

مثال بہت کم بولتی تھی بلکہ کبھی کبھی تو پورا دن کچھ نہیں بولتی تھی۔ عفت اس پر چیختی چلّاتی۔ سارے گھر کا کام کروانے کے باوجود کسی نہ کسی بات پر یہ برہم ہوتی رہتی مگر وہ جواب میں خاموش رہتی اور آج۔۔۔

"کیا میں مریضہ ہوں ہسٹریا کی مریضہ؟ پاگل ہوں چیختی چلّاتی ہوں۔ تم نے یہ بکواس کی ابھی۔" وہ جیسے غصے میں پاگل ہی تو ہو گئی۔

"پریشے کل اپنا ڈول ہاؤس ٹوٹ جانے پر اسی طرح چیخ چلّا رہی تھی جب فوزیہ پھپھو نے کہا تھا کہیں اسے دورے تو نہیں پڑتے۔ آپ اس طرح چیخیں گی تو سوچ لیں۔ آپ کے بارے میں ان کے خیالات کیسے ہو سکتے ہیں آگے آپ کی مرضی۔ دادو کو کر سوپ دے کر آتی ہوں۔" عفت تو جیسے کھڑے کھڑے پتھر کی ہو گئی تھی۔

یہ وہ مثال تو نہیں تھی 'جو اتنے سالوں سے بے دام کی غلام بنی گونگی بہری بس کام کیے جاتی تھی۔ کبھی پلٹ کر جواب نہیں دیتی تھی۔۔۔ یہ تو۔۔۔

"کمینی کو ایک کالا سوٹ لے لینے کا اتنا صدمہ لگا ہے کہ مجھ سے زبان چلانے لگی ہے مگر یہ پریشے کے بارے میں کیا بکواس کر کے گئی ہے۔ اللہ نہ کرے میری بچی میں ایسا کوئی عیب ہو یا کوئی اس کے بارے میں ایسی بات کرے۔ فوزیہ تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتی۔"

عفت پریشان سی ہو گئی۔

"ضرور اسی کمینی نے یہ بات اپنے دل سے گھڑی ہے صرف میرا جی جلانے کو۔"

وہ بے قرار سی سارے گھر میں ٹہلنے لگی۔

"جلتی ہے یہ پریشے سے 'میری بیٹی پریوں جیسی ہے جو اسے دیکھتا ہے اسی کو دیکھتا رہتا ہے۔ یہ مثال کسی کو کیا نظر آئے گی۔ اسی کی جلن نکال رہی ہوگی۔ فوزیہ لٹو جو ہو گئی ہے پریشے پر۔ ابھی سے مذاق مذاق میں اپنے فیصل کے لیے مانگ رہی تھی۔ بس اسی دم جل بھن گئی ہو گی چڑیل ماں کی بیٹی۔۔۔" عفت کا غصہ کم نہیں ہو رہا تھا۔

اور جو فوزیہ اور خالد کی آمد کے دن شام کی چائے میں اس کھٹیا لڑکی نے عفت کی شادی کا سب سے قیمتی ٹی سیٹ توڑ ڈالا تھا۔

جب عفت کچن میں آئی تو ٹرے پورے سیٹ کے ساتھ زمین بوس ہو چکی تھی۔

سارے ہی برتن چکنا چور تھے اور مثال نیچے بیٹھی کرچیاں اٹھا رہی تھی۔

عفت نے پیچھے سے اسے دو ہتھڑ مارے تو وہ انہیں کرچیوں کے اوپر جا گری۔ اس کے ہاتھ زخمی ہو گئے۔

اور جیسے ہی عدیل بھی عفت کے پیچھے آیا۔ وہ فوراً" وہیں زمین پر بیٹھ کر مثال کے ہاتھوں میں خون کے ساتھ چپکی کرچیاں دیکھنے لگی تھی۔

"میں نے تو کہا ہماری بچی کا صدقہ گیا 'جو یہ چار برتن ٹوٹ گئے۔ میں تو عدیل ڈر گئی تھی کہ کہیں خدانخواستہ اس کو کہیں چوٹ نہ لگ گئی ہو اور دیکھیں! پھر بھی اس نے ہاتھ زخمی کر لیے۔ درد تو نہیں ہو رہا۔"

وہ بہت حساس لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

مثال اس کے یوں گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے اور اس کے اتنے سارے روپ بہروپ دیکھنے کی عادی ہو چکی تھی۔

"نہیں۔ میں ٹھیک ہوں۔" وہ درد سہتی آہستگی سے کہہ کر ٹونٹی کے نیچے خون رستے ہاتھوں کو رکھ کر بیٹھنے لگی۔

عدیل اسے دیکھے جا رہا تھا۔

"چلو 'میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے جاتا ہوں مثال! آؤ میرے ساتھ۔" کوئی ایسا لمحہ بھی ہوتا تھا 'جب عدیل اس کی فکر میں بہت سال پہلے والا باپ بن جایا کرتا تھا۔

"نو پاپا! اس کی ضرورت نہیں۔ میں ٹھیک ہوں بالکل۔" وہ اسی طرف رخ کیے حلق میں گھلتے نمکین پانیوں کو پیتی ہوئی بظاہر بڑے ٹھہرے لہجے میں بولی۔

"عدیل! آپ جا کر مہمانوں کے پاس بیٹھیں۔ کیا سوچیں گے خالد بھائی۔ ہم دونوں ہی اندر آ گئے ہیں۔ میں چائے سرو کروں تو پھر خود اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاتی ہوں۔ آپ بلیز مہمانوں کے پاس جا کر بیٹھیں۔"

عفت فوراً" عدیل کو احساس دلاتے ہوئے بولی تو وہ سر ہلا کر وہاں سے چلا گیا۔ عفت نفرت بھری نظروں سے مثال کو دیکھتے ہوئے بڑبڑاتے ہوئے چائے کا پانی بھر کے رکھنے لگی۔

پریشے اور دانی یہ دو اضافے تھے جو اس کے باپ کے گھر میں آئے۔

جن کے آتے ہی اس کی اہمیت جو عفت پہلے ہی مختلف طریقوں سے کم کرتی چلی گئی تھی اور بھی کم ہوتی گئی۔

پریشے یوں بھی اتنی خوب صورت 'اتنی دودھیا سفید صحت مند بچی تھی کہ وہ فوراً" ہی ہر کسی کی توجہ کھینچ لیتی۔

خود مثال کی کوشش ہوتی وہ جو پندرہ دن یہاں رہے 'اسکول سے آنے کے بعد سارا وقت صرف پریشے کے گرد منڈلائے۔

جب پریشے چھوٹی تھی تو عفت اسے مثال کو نہیں پکڑاتی تھی۔ ہاتھ لگانے پر بھی جھڑک کر روک دیتی کہ اس کے گندے ہاتھوں سے جراثیم بچی کو لگ جائیں گے۔

عدیل بھی آفس سے آنے کے بعد سارا وقت پریشے میں ہی لگا رہتا۔ وہ دادی کی بھی لاڈلی تھی۔

بالکل ویسے جیسے کبھی مثال ہوا کرتی تھی۔

کبھی کبھی پریشے کو بھی سب کی محبتوں کا مرکز بنے دیکھ کر اس کے دل میں بہت جلن ہوتی۔ آنکھوں میں کچھ نہ چبھنے کے باوجود نمی آ جاتی۔ اس کا جی چاہتا۔ وہ پریشے کو کہیں چھپا دے۔

کئی بار اس نیت سے اس کے پاس جاتی مگر پھر اس کی موہنی صورت دیکھ کر بے اختیار اسے پیار کرنے لگتی۔

جیسے ہی مثال کچھ بڑی ہوئی 'پریشے اس کی ذمہ داری بنتی چلی گئی۔

یوں بھی دانیال اس گھر کا دوسرا خوب صورت اور بہت دیر کا خدا سے مانگا ہوا اضافہ تھا۔

دانی نے ماں اور باپ کو خود میں مصروف کر لیا۔

پریشے کی اہمیت کم تو نہیں ہوئی لیکن دانیال تو سب کی آنکھ کا تارا تھا 'خود پریشے کا بھی۔

مثال کو بھی وہ اچھا لگتا مگر پریشے پر اسے زیادہ پیار آتا تھا۔ پریشے کو سنبھالنے کی ذمہ داری اس کے سپرد ہوئی۔

پھر برتن دھونے کی۔۔۔ پھر ڈسٹنگ اور گھر کا پھیلاوا سمیٹنے کی۔۔۔

پھر ایک کے بعد دوسرا کام خود بخود مثال کے ذمے ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ عفت کوکنگ میں بھی اس سے خوب کام کروانے لگی 'لیکن سب کے سامنے یہی کہا جاتا۔ "میں اسے اس لیے ساتھ لگائے رکھتی ہوں کہ پرائی بچی ہے نظروں کے سامنے رہے۔ کل کوئی اونچ نیچ ہو گئی خدانخواستہ تو اس کی ماں آ کر تو مجھے پکڑے گی نا۔"

اور عدیل نے کبھی بھی عفت کو پرائی بچی کہنے پر نہیں ٹوکا۔ وہ باپ کے چہرے کی طرف دیکھتی رہتی۔

یوں لگتا جیسے وہ خود بھی دل سے اسے پرائی بچی تسلیم کر چکا ہے۔ پریشے بھی اس سے پیار تو کرتی تھی مگر جب اس کا اپنا دل ایسی خواہش کرتا۔

یوں بھی کوئی پندرہ دن کے لیے کسی سے جی لگائے اور پندرہ دن کے لیے اجنبی بن جائے۔ اس کی زندگی اس

بڑوارے سے بہت عجیب تر ہو گئی تھی۔

وہ کوئی بھی کام جم کر دل لگا کر ہی نہیں پاتی تھی۔

اسکول بشریٰ کے گھر سے قریب تھا تو عدیل کے گھر سے دور!

اکثر ہی اس بات کو بہانہ بنا کر عفت اس کی چھٹی کروالیا کرتی تھی۔ پھر اکثر رنج' دکھ اور پریشانی میں اس کی کوئی نہ کوئی ضروری چیز کبھی بشریٰ کے گھر رہ جاتی تو کبھی عدیل کے۔۔۔

کوئی ٹیسٹ کاپی' کوئی نوٹس فائل' کبھی کوئی ضروری کتاب۔ آہستہ آہستہ اس کا پڑھائی سے بھی دل اچاٹ ہوتا جا رہا تھا۔

وہ ہر چیز' ہر معاملے میں اکھڑی اکھڑی رہتی تھی۔

کوئی بھی اس سے وہ کام نہ کہتا جو کچھ دنوں میں مکمل ہوتا ہوتا کیونکہ اگلے ہفتے تو وہ چلی جاتی۔

وہ خود بھی پر اعتماد نہ رہی تھی اور دوسرے بھی اس پر جی سے بھروسا نہ کرتے تھے۔

مثال تو سب کے لیے ایک مثال ہی بنتی جا رہی تھی۔

اس کے اکھڑے اکھڑے رویے کے سبب کوئی بھی اس سے خوش نہیں تھا۔ وہ خود بھی کسی سے خوش نہیں تھی۔ کسی کے ساتھ کسی جگہ یہ اس کا دل نہیں لگتا تھا۔ کیونکہ وہ جانتی تھی یہ جگہ' یہ لوگ۔۔۔ عارضی ہیں۔ اسے چاہتے ہوئے نہ چاہتے ہوئے ٹھیک پندرہ دن بعد یہاں سے چلے جانا ہوتا تھا۔

وہ پڑھائی میں واجبی سی رہ گئی تھی۔ بس نارمل نمبروں کے ساتھ بمشکل پاس ہو کر اگلی کلاس میں چلی جاتی۔

بشریٰ نے شروع میں اس کے یوں گریڈز گرنے کا غم کھایا پھر جیسے اسے اس کے حال پہ چھوڑ کر اپنی نئی زندگی' نئی دنیا میں مگن ہو گئی۔

وہاں اس کے لیے بھی ایک دوسری مثال آئینہ موجود تھی۔ احسن کمال' بشریٰ اور سیفی کی آنکھوں کا تارہ۔ آئینہ۔

جس کے آتے ہی اس گھر میں پہلے سے نظر انداز مثال کو بالکل جیسے بھلا دیا گیا تھا۔

پتا نہیں کیوں کوشش کے باوجود بشریٰ کے اکسانے پر بھی اس کو یہ عام سے نقوش والی کمزور سی بچی پہ بالکل بھی پیار نہیں آیا تھا۔

شاید اسے آئینہ سے انسیت ہو بھی جاتی مگر سیفی اسے آئینہ کے قریب نہیں پھٹکنے دیتا تھا۔

وہ بہت خود پسند' ضدی' جھگڑالو اور لڑاکا تھا۔

مثال سے اسے خاص ضد اور چڑ سی تھی۔ وہ اس کو جھڑکنے' ذلیل کرنے کے بہانے ڈھونڈتا تھا۔

وہ لاؤنج سے گزرتی' آئینہ رو رہی ہوتی اپنی کاٹ میں پڑی۔ سیفی وہیں سے شور مچا دیتا کہ مثال نے آئینہ کو مارا ہے۔ اگر احسن کمال گھر پہ ہوتا تو وہ جن خاموش' سرد' بے مہر نظروں سے اسے گھورتا۔ مثال کی وہیں جان نکل جاتی۔

وہ اس درجہ گھبرا جاتی کہ اپنے دفاع کے لیے ایک لفظ بھی بول نہیں پاتی تھی۔ بس ہاتھ مسلتی ہوئی تھر تھر کانپنے جاتی۔

بشریٰ شروع میں اس کی حالت پر پریشان ہو کر اس کا دفاع کرنے کی کوشش کرتی مگر پھر وہ بھی جیسے مثال کی غلطی جان کر اسے ڈپٹنے لگتی۔

نتیجتاً" مثال آئینہ سے دور ہوتی چلی گئی۔

اس عام سی شکل صورت کی بچی سے اسے کوئی رغبت نہیں تھی۔ ہاں جب گھر میں کوئی نہیں ہوتا تھا اور ایسا

بہت کم ہوتا تھا جب مثال کے اسکول میں آف ہوتا اور سیفی گھر پر نہیں ہوتا تھا تو بشریٰ پہلے کی طرح اسے ساتھ لپٹا کر پیار کرتی۔ اس سے باتیں تو بہت کم کرتی' مگر اسے سننے کی خواہش مند ہوتی۔

مگر مثال تو جیسے ماں سے بات کرنا بھی بھول چکی تھی۔

اب تو اسے بشریٰ کا یہ پیار بھی مصنوعی اور جھوٹا سا لگتا۔ وہ بس سر جھکائے ماں کے پاس خاموش بیٹھی رہتی منتظر کہ کب بشریٰ کو اپنے گھر کے بہت سے ادھورے کام یاد آتے ہیں اور وہ خود ہی اٹھ کر اس کے پاس سے چلی جائے۔

اسے تو اب عدیل کی قربت سے بھی عجیب وحشت ہوتی تھی۔ اس قربت میں بھی اتنی بیگانگی' اتنی اجنبیت ہوتی تھی کہ وہ کھل کر اپنی کسی بھی خواہش کا اظہار کرنا بھول گئی تھی۔

فرمائش کرنا اسے بھول چکا تھا۔ اب تو وہ بہت ضرورت کی چیز بھی یہ سوچ کر کہ کل ماما کے پاس جاؤں گی تو ان کو کہہ دوں گی۔

اور وہاں جا کر اگلے کئی دنوں تک اسے بشریٰ کا موڈ دیکھنا پڑتا کہ اس سے یہ فرمائش کی بھی جائے یا نہیں۔

اور اکثر ہی وہ کچھ نہ کہہ پاتی اور یہ سوچ کر باپ کے گھر آجاتی کہ پاپا سے بات کرنے میں زیادہ سہولت ہے۔ ان سے کہہ دے گی۔ وہ جھٹ پٹ لادیں گے مگر جانے ان دونوں انتہائی قریبی رشتوں کے بیچ کتنی بڑی بڑی دیواریں اٹھ آئی تھیں کہ وہ دونوں کے سامنے اپنا کوئی تقاضا بھی نہ رکھ پاتی۔

وہ دونوں ہی اپنی نئی گھر داری میں الجھ کر رہ گئے تھے۔

مثال کہیں بہت پیچھے ان کے ماضی کا وہ حصہ بن کر رہ گئی تھی' جسے سوچنے سے دونوں کتراتے تھے کہ کہیں ان کے شریک سفر کو ان کی خلوص بھری رفاقت پر شک نہ ہو جائے اور ان کے گھروں میں بدمزگی نہ ہو جائے اور مثال ۔۔۔ وہ دونوں کے دن بدن بدلتے مزاجوں سے جیسے سہم سی گئی تھی۔

اس کے گرمیوں سردیوں کے کپڑے پہلے چھوٹے پھر بے حد چھوٹے ہوتے چلے گئے۔ پہلے پہل بشریٰ کو خیال آجاتا تھا۔ وہ اپنی سیفی اور آئینہ کی شاپنگ کے ساتھ کچھ نہ کچھ اس کا بھی لے ہی آتی تھی' مگر پھر جانے کب اور کیسے وہ یہ بات فراموش کرتی چلی گئی۔ آئینہ کے بیمار ہونے پر کچھ ماہ احسن کمال گھر کی شاپنگ سیفی کے ساتھ کرنے لگے اور اس لسٹ میں مثال کی چیزیں اگر کہیں ہوتی بھی تھیں تو اکثر "بھول گئے بھئی" کی نذر ہو جاتی۔ عدیل بھی پریشے' دانی اور عفت میں تقسیم ہو چکا تھا۔ اسے مثال نظر بھی آتی تھی تو وہ سرسری سا مسکرا کر حال چال پوچھ کر یا "مثال بیٹا! کچھ چاہیے تو نہیں۔"

"سب کچھ موجود ہے مثال کے پاس۔ اپنی اور اپنے بچوں کی ضرورتوں سے پہلے میں مثال کا سب کچھ پورا کرتی ہوں۔ سوتیلی نہ سمجھے گا آپ مجھے۔" عفت کو جانے کیسے خبر ہو جاتی کہ عدیل اس سے ضرور کچھ ایسا پوچھے گا۔ فوراً" پیچھے سے آکر بول پڑتی۔

"ہاں مجھے پتا ہے تم مثال کا کتنا خیال رکھتی ہو۔ میں نے تو یونہی پوچھا تھا۔ مثال! اسٹڈیز کیسی جا رہی ہیں بیٹا! اگر ٹیوشن کی ضرورت ہو تو مجھے بتا دینا۔ میں کسی ٹیوٹر کا یا کوچنگ سینٹر کا بندوبست کروا دوں گا۔" اب اچھا موڈ عدیل کا خال خال ہی ہوتا تھا۔

"پندرہ دن کے لیے بھلا کون سا ٹیوٹر لگے گا۔ وہ یہاں پندرہ دن ہی رہتی ہے۔ پندرہ دن بعد اتنی دور کون جائے گا اسے پڑھانے۔" عفت جل کر بڑے مدبرانہ انداز میں جتا کر کہتی۔

اس پر عدیل ایک دم چپ کر جاتا۔

"پاپا! آپ سے ایک بات کہوں؟" اس رات وہ اسٹڈی میں اکیلا بیٹھا اپنے آفس کا کچھ کام کر رہا تھا۔ جب وہ

آہستگی سے اس کے پاس آ کر بولی۔ عفت دانی کو سلاتے سلاتے خود بھی سو چکی تھی۔ پریشے دادی کے ساتھ لیٹی تھی۔ مثال باپ کے پاس آ گئی۔

"بولو میری جان! کچھ چاہیے؟" عدیل شفقت بھرے لہجے میں بولا۔ اس نے بہت دنوں بعد اسے نظر بھر کر دیکھا تھا۔

"یہ آپ نے پریشے کے کپڑے پہن رکھے ہیں؟" وہ اس کی طرف دیکھ کر پوچھنے لگا۔

مثال نے جلدی سے خود کو دیکھا۔

تیرہ سال کی عمر میں نکلتے قد کے ساتھ اس کے تین چار سال پرانے کپڑے، بہت چھوٹے ہو رہے تھے۔

"نہیں پاپا! میرے ہیں۔" وہ جلدی سے قمیص کو کچھ کھینچ کر بولی۔

"ہوں!" عدیل کچھ سوچنے لگا۔

"کیا کہہ رہی تھیں آپ؟" اسے خیال آیا تو پوچھنے لگا۔

"پاپا! اگر میں یہیں رہ جاؤں۔ آئی مین فل منتھ۔ سارا مہینہ آپ کے پاس یہاں رہوں۔ میں مما سے کبھی کبھی ملنے چلی جایا کروں گی۔ مجھے آپ کے پاس رہنا اچھا لگتا ہے۔" وہ بہت ڈر ڈر کر اٹک اٹک کر بولی تھی۔

عدیل کو کچھ رنج سا ہوا کہ مثال واقعی وہ نہیں رہی تھی جیسی ان دونوں کے ساتھ تھی۔ صحت مند، پُراعتماد، شوخ اور ہر بات منہ پہ کہہ دینے والی یہ وہ مثال تو نہ تھی۔

"آپ کو وہاں کوئی مسئلہ ہے جان؟" وہ سنجیدگی سے بولا۔

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"ممی آپ کو توجہ نہیں دیتیں؟"

وہ کچھ نہیں بولی۔

عدیل خاموش اسے دیکھتے ہوئے کچھ سوچتا رہا پھر گہری سانس لے کر یونہی سر ہلانے لگا۔

"میں آپ کی مما کو کال کروں گا کہ وہ آپ کا خیال رکھا کریں اور میں آپ کو مستقل یہیں رکھنے کی بات بھی کروں گا۔ اگر وہ مان گئیں تو آپ یہیں رہیں گی۔ مجھے اس بات کی خوشی ہوگی۔" عدیل رک رک کر بولتے ہوئے اس کے چہرے کے بدلتے تاثرات کو نوٹس کر رہا تھا۔

اس کا مرجھایا ہوا چہرہ ایک دم سے کھل اٹھا تھا۔

"پاپا! آپ بات کریں گے سچ۔۔۔ میں ماما سے یہ کہیں گے کہ وہ مجھے یہیں آپ کے پاس رہنے دیں۔" وہ بے یقین سی باپ کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر دوزانوں بیٹھتے ہوئے بولی۔

"کیوں نہیں کروں گا بیٹا! ہماری یہی بات طے ہوئی تھی کہ جو کچھ بھی ہوگا۔ مثال کی خوشی اور مرضی سے ہوگا اگر آپ کی خواہش یہی ہے تو مجھے اس کی خوشی ہے۔ میں ایک دو دن میں آپ کی مما کو کال کرتا ہوں۔"

"پاپا۔۔۔ ایکچوئلی بار بار کبھی ادھر کبھی ادھر۔۔۔ میں بہت ڈسٹرب ہوتی ہوں۔ ابھی میں نے لاسٹ ویک اپنے انگلش کے "دو ایسے" لکھے تھے، مگر نوٹ بک مما کی طرف رہ گئی اور ٹیچر نے مجھے سارا دن پنشمنٹ (سزا) میں کھڑا رکھا۔ ان کے نزدیک میں ہر وقت یہی ایکسکیوز کرتی ہوں کہ مما کے گھر رہ گئی نوٹ بک یا پاپا کے گھر۔۔۔ اور پاپا!"

بولتے ہوئے اس کی آواز میں نمی سی گھل گئی۔

"بچے میرا مذاق بھی اڑاتے ہیں کہ ماما پاپا کے گھر الگ الگ کیسے ہو سکتے ہیں۔ اگر تمہارے پیرنٹس میں سپریشن بھی ہو چکی ہے تو بھی تم ایک ہی کے پاس رہتی ہو گی یا آدھی آدھی دونوں طرف۔۔۔" اس کی آنکھوں میں جمع ہونے والے آنسو بہہ نکلے۔

عدیل کے دل پر جیسے گھونسا سا پڑا۔

"میرا بچہ۔" وہ بے اختیار اس کو ساتھ لگا کر اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے اس کی تکلیف سے نظریں چرانے لگا، جو اس بچی کو اپنے ماں باپ کے جذباتی پن کی وجہ سے پہنچی تھی۔

"آپ بات کریں گے نا مما سے؟" وہ خود ہی سنبھل کر آنکھیں رگڑتے ہوئے سرخ چہرے کے ساتھ بولی۔

عدیل اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

"تھینک یو پاپا۔۔۔ ہر پندرہ دن بعد یہاں وہاں جانا۔۔۔ بہت انسلٹنگ لگتا ہے۔" وہ پھر سے نظریں جھکا کر لرزتی پلکوں کے ساتھ نم لہجے میں بولی۔

عدیل تڑپ کر رہ گیا۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں وہ کتنے بڑے بڑے احساسات کی بھٹی سے صرف اپنے پیدا کرنے والوں کی وجہ سے گزر رہی تھی۔

"تم اب جا کر ریسٹ کرو۔ صبح اسکول بھی جانا ہوگا۔"

وہ مزید مثال کا سامنا نہیں کر سکتا تھا۔ نرمی سے بولا۔

وہ خاموشی سے چلی گئی اور عدیل اس رات، بہت دیر تک جاگتا رہا۔

☼ ☼ ☼

"دماغ تو نہیں خراب ہو گیا آپ کا عدیل! اول تو اس کی ماں کبھی نہیں مانے گی، پھر میں ماں ہو کر اس کی بچی کو اس سے چھین لوں۔ یہ میں کبھی نہیں کر سکتی اور پھر دیکھیں! یہ جو ایج ہے نا تھرٹین سے ایٹین کے درمیان۔ مثال کو جتنا اچھا اس کی اپنی ماں سمجھ سکتی ہے، میں لاکھ چاہوں تو ایسا نہیں کر سکتی۔ اپنی ماں تو اپنی ماں ہوتی ہے۔ لاکھ سوتیلی مائیں سگی بننے کی کوشش کریں۔"

عفت عدیل کے منہ سے سب سنتے ہی جیسے بھڑک اٹھی۔ عدیل لمحہ بھر کو کچھ بول ہی نہیں سکا۔

"آپ کا دل چاہتا ہے تو سو بار بشریٰ سے بات کریں، لیکن میں سمجھتی ہوں وہ اس بات کے لیے نہیں مانے گی۔ یوں بھی عدیل اس کی ساری ذمہ داری آپ پر آ جائے گی۔ اس کی ماں جان چھڑا کر پیچھے ہو جائے گی۔ کل کلاں کو اس کی شادی ہوگی۔ رشتے کا معاملہ، جہیز کا معاملہ اور خدانخواستہ کوئی اونچ نیچ ہو گئی تو اس وقت یہی بشریٰ واویلا کرتی آ جائے گی کہ باپ نے ظلم کیا اس کی بچی کی زندگی خراب کر دی۔ آپ سوچ لیں اچھی طرح۔ ایک جذباتی غلطی کے بعد دوسری کو نہ دہرائیں۔ مثال کو ان باتوں کی کیا سمجھ۔ اسے تو یہاں سکون اور سکھ ہے میں تو اسے ہل کر پانی نہیں پینے دیتی۔ اس دن مجھ سے کہہ رہی تھی کہ اس کی ماں وہاں اس سے کام کرواتی ہے سارا دن۔ ظاہر ہے۔ وہ ماں ہے اس کی بہتری کے لیے ابھی سے اسے کام میں ڈالنا چاہتی ہے۔ میں ایسا کروں گی تو ظالم کہلاؤں گی۔ لڑکی کا معاملہ ہے، کچھ گھر کے کام دام آ جائیں گے تو کل کو اس کی اگلی زندگی اچھی گزرے گی اور یہ سب صرف سگی ماں ہی کر سکتی ہے۔ میں تو بابا اس سے کام وام نہیں کرواؤں گی۔ کہیں مجھ سے بھی بدظن ہو جائے یہ۔۔۔"

وہ بغیر رکے سب کچھ کہہ گئی بہت ہوشیاری اور بہت طریقے سے۔

مثال اسکول گئی ہوئی تھی۔ اسے عفت کی اس کارگزاری کا پتا نہ چل سکا۔

"پاپا!" اس کا چہرہ اتر گیا تھا۔

باہر بشریٰ کا ڈرائیور اسے لینے آیا ہوا تھا۔

"میں نے بات کی تھی تمہاری ماں سے۔ وہ بہت ناراض ہوئی اس بات پر۔ بیٹا! ہمارے قانون میں سارا تحفظ صرف ماں کو ہے۔ باپ کو ایسا کوئی حق نہیں۔ اس نے اگر مجھے پندرہ دن کے لیے تمہیں دے رکھا ہے تو یہ اس کی

مہربانی ہے۔ اس نے صاف انکار کردیا ہے کہ وہ تمہیں مستقل میرے پاس نہیں چھوڑ سکتی۔ اب بتاؤ بھلا میں کیا کہتا۔"

عدیل سخت لاچاری سے بولا۔
مثال گم صم سی باپ کی شکل ہی دیکھتی رہ گئی۔
وہ راستہ بھر اپنے آنسو ضبط کرتی رہی۔

☼ ☼ ☼

"نہیں۔ تم کیوں پوچھ رہی ہو مثال!" بشریٰ کچن میں بری طرح مصروف تھی' جب اس نے جاتے ہی اس سے عدیل کے فون کے بارے میں پوچھا۔
بشریٰ کے انکار پر وہ لمحہ بھر کے لیے کچھ بول ہی نہ سکی۔
"آپ سے پاپا نے کوئی بات نہیں کی؟" وہ کچھ پریشان سی ہو کر بولی۔
"کیا بات کرنی تھی۔ تمہارے اسکول سے متعلق تو کوئی بات نہیں ہے کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی رزلٹ میں۔" وہ چونک کر بولی۔
رات کو احسن کمال کے بزنس پارٹنر کو ڈنر پر بلایا گیا تھا۔ بشریٰ کک کے ساتھ مصروف تھی۔ اوپر سے مثال کے سوال جواب۔ وہ کچھ جھلا کر رہ گئی۔
"نہیں مما! ایسی کوئی بات نہیں۔" وہ دل گیری سے بولی۔
"اچھا مثال پلیز! جاکر تم نے جو کرنا ہے وہ کرو' پھر آکر کچن میں میری تھوڑی ہیلپ کرانی ہے تو کراؤ' ورنہ آئینہ کو جاکر دیکھ لو۔ میں اس وقت بہت مصروف ہوں۔ تم سے بعد میں بات کرتی ہوں۔" بشریٰ نے اسے وہاں سے چلتا کیا۔
اور اگلے گیارہ دن تک بشریٰ کو اس سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں مل سکا۔
"مگر احسن! مثال کے اسکول میں تو ٹیسٹ سیشن چل رہا ہے پندرہ دن بعد ان کا سمسٹر اسٹارٹ ہو جائے گا۔"
بشریٰ کھانے کی میز پر احسن کمال سے بولی۔
"نو پرابلم۔ دیکھو مجھے یہ ایک ہفتے کی وکیشنز یوں سمجھو ایک بلیسنگ کے طور پر ملی ہیں کہ ہم ملائیشیا کا ایک وزٹ کر کے آسکیں۔ اس کے بعد پورا سال میرے پاس بالکل بھی ٹائم نہیں ہوگا۔ مثال کو ہم نیکسٹ ٹائم لے جائیں گے۔ یوں بھی ابھی اس کا ویزا وغیرہ نہیں ہے۔"
احسن کمال نے بہت صفائی سے مثال کو اپنی فیملی سے الگ کر دیا تھا ورنہ ویزا تو بشریٰ کے ویزے کے ساتھ بھی بنوایا جاسکتا تھا۔
"یس پاپا... میری وکیشنز بھی بہت کم ہیں ہم خوب انجوائے کریں گے۔
اور... آئینہ کا تو پہلا ایر ٹریول ہو گا نا پاپا!" وہ اسی جوش سے بولا۔
مثال تو خیر یوں بھی ان کے ساتھ جانے پر خوش نہیں ہوتی کیوں کہ بشریٰ کے پاس مثال کے لیے ٹائم نہیں ہوتا تھا۔
"بشریٰ بھئی! پیکنگ آج ہی کر لینا ساری۔ کل رات گیارہ بجے کی ٹکٹس کنفرم ہوئی ہیں۔ اس کے بعد تین دن بعد کی فلائٹ مل رہی تھیں۔" وہ اب آپس میں گفتگو کر رہے تھے یوں جیسے مثال وہاں موجود نہیں۔
"مگر ابھی تو مثال کو یہاں چار دن اور رکنا تھا۔" بشریٰ کو خیال آیا تو کچھ پریشان ہو کر بولی۔

"نو پرابلم! یہ رُکے اس کا اپنا گھر ہے۔ بعد میں ڈرائیور اسے اس کے باپ کے گھر چھوڑ آئے گا۔"
"نو مما! میں یہاں اکیلی نہیں رہوں گی۔" وہ فوراً" ہی گھبرائی تھی۔
"چھوٹی ہے احسن! یہ ابھی۔" بشریٰ بھی پریشانی سے بولی۔
"اتنی بھی منھی نہیں مما!" پریٹنڈ زیبقی اس کا منہ چڑا کر بولا۔
"تو ٹھیک ہے چار دن کی کیا بات ہے۔ یہ نیکسٹ ٹائم یہ چار دن پہلے یہاں آجائے' اگر اتنا ہی سخت حساب کتاب ہے تو۔" احسن کمال سرسری لہجے میں کندھے اچکا کر بولا۔
بشریٰ کچھ پریشان اور رنجیدگی سے مثال کو دیکھنے لگی' جو مسلسل نظریں جھکائے ہوئے تھی اور جس کی لرزتی کانپتی لمبی پلکیں اس کے آنسو روکنے کی کوشش کی گواہی بنی ہوئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

ایک بار پھر شفٹنگ اس کی منتظر تھی۔
یہ والا گھر کوچنگ سینٹر کے لیے بہت چھوٹا پڑ گیا تھا۔
عاصمہ نے گزرتے سالوں میں ماسٹرز اور ایم ایڈ تک تعلیم حاصل کرلی تھی اس نے اپنے کوچنگ سینٹر میں بہت اچھے تعلیم یافتہ ٹیچرز رکھے تھے۔ اس کے سینٹر کا شہر بھر میں ایک نام ہو گیا تھا۔
بہت سوچ بچار کے بعد شہر کے اچھے علاقے میں یہ بنگلہ کرائے پر لیا گیا تھا۔
انہوں نے اپنا گھر کرائے پر دے دیا تھا۔ اپنی بچت سے پوش علاقے میں پلاٹ خرید رکھا اور کچھ پیسے جمع ہونے پر اس پر تعمیر شروع کرانے کا ارادہ تھا۔ واثق پری انجینئرنگ سیکنڈ ایر میں تھا۔
اریبہ اور اریشہ بھی میٹرک اور آٹھویں درجے میں تھیں۔
ورنہ بھی تینوں بہن بھائیوں کی طرح پڑھائی میں بہت اچھی تھی۔ عاصمہ کا گھر محبت اور سکون کا گہوارہ تھا۔
ان گزرتے سالوں میں اس نے دن رات محنت کی تھی۔ اس نے بھی اور اس کے بچوں نے بھی۔
"اللہ کسی کی محنت کبھی ضائع نہیں کرتا۔" عاصمہ کو دیکھ کر اس کی ہمت کو دیکھ کر لوگ یہی کہا کرتے۔
بنگلہ زیادہ بڑا نہیں تھا مگر اتنا تھا کہ ان کی رہائش کوچنگ سینٹر کے طور پر آسانی سے کام دے سکے۔
اوپر کی طرف ایک گیسٹ روم تھا اور ایک ہال' چھوٹا سا کمرا جس میں واثق نے اپنی پینٹنگ اور اسکیچنگ کا سامان جمع کر رکھا تھا۔ اس کی فراغت کا مشغلہ جو اسے بہت دنوں بعد نصیب ہوئی تھی۔
اس شام بھی شفٹنگ کے تھکا دینے والے کام کے بعد اسے کچھ فراغت میسر آئی تھی۔ وہ سب سے نظر بچا کر اوھر رہتا تھا۔
اپنا کمرہ صاف کیا۔ سامان ترتیب سے لگایا اور پھر تھک کر باہر ٹیرس کی طرف آگیا۔
وہ گھر ان کے ٹیرس سے کافی اونچا تھا مگر دیواریں کافی چھوٹی تھیں۔
اور وہاں اس نے پہلی بار مثال کو سیڑھیوں پر بیٹھے دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کے روتے دیکھا تھا۔
پہلے تو اسے لگا کوئی لڑکی وہاں بیٹھی شاید سو رہی ہے۔
پھر وہ ذرا آگے ہو کر غور کرنے لگا تو مثال نے چہرے سے ہاتھ ہٹائے۔ دونوں آنکھیں اور چہرے کو رگڑا اور کسی بھی طرف دیکھے بغیر وہ تیز رفتاری سے نیچے سیڑھیاں اتر گئی تھی۔ اسے لگا اس کی دھیان کی سیڑھیاں چڑھ آئی تھی۔
وہ بہت دیر تک اس خالی چھت کو دیکھتا رہا تھا۔ اگرچہ ابھی نہ تو اس کی اتنی عمر تھی کہ محبت' چاہت یا اس طرح

کے کسی جذبے کو ڈھنگ سے سمجھ سکتا۔ بس اس لڑکی کے آنسو جیسے اسے تڑپا گئے تھے۔ پھر جانے کیسے اتفاق ہوا کہ وہ اگلے چار سال تک اس لڑکی کو وہاں نہیں دیکھ سکا تھا۔

اس کا انجینئرنگ کالج میں داخلہ ہو گیا تھا اور عاصمہ کے کہنے پر وہ کچھ عرصہ مکمل یکسوئی سے پڑھنے کے لیے ہاسٹل میں چلا گیا تھا۔

وہ اس لڑکی کو اور اس شام کو قطعاً" فراموش کرچکا تھا انجینئرنگ کے تیسرے سال کے اختتام پر وہ گھر آگیا تھا۔ اس کے کالج میں چھٹیاں تھیں۔

یوں بھی اس نے فیصلہ کرلیا تھا وہ اب گھر پر ہی رہے گا۔ ہاسٹل کے اخراجات کافی بڑھ گئے تھے۔ عاصمہ کچھ بیمار رہنے لگی تھی۔ مسلسل محنت نے اسے بہت کمزور کردیا تھا۔

پھر پے در پے شہر بھر میں کھلنے والے کوچنگ سینٹرز کی بدولت اس کے سینٹر میں کچھ رش کم ہو گیا تھا۔

عاصمہ کو اریبہ اور اریشہ کی شادی کی فکر دن رات ستانے لگی تھی۔

اس نے کئی جگہ ان کے رشتوں کے لیے کہہ رکھا تھا مگر کہیں بات نہیں بن رہی تھی۔ واثق اور عاصمہ کافی پریشان تھے۔

ڈرائیور اسے عدیل کے گھر کے باہر اتار کر چلا گیا تھا۔ پندرہ دن ہونے میں ابھی چار دن باقی تھے۔

وہ پاپا کو فون کیے بغیر واپس آگئی تھی۔

شاید عدیل نے سیل نمبر چینج کرلیا تھا کیونکہ اس کا سیل مسلسل آف جارہا تھا۔

"عدیل بھائی اپنی مسز اور بچوں کو لے کر اسلام آباد گئے ہیں۔ ان کی مسز کی فیملی میں کوئی شادی تھی۔ کہہ کر گئے تھے کہ وہ چار دن بعد آئیں گے واپس۔"

ساتھ والی آنٹی کے ہوش ربا انکشاف نے مشال کی ٹانگوں سے جیسے جان نکال دی تھی۔

"تم نے اپنے ڈرائیور کو روکنا تھا نا' وہ تمہیں ساتھ واپس لے جاتا کیونکہ ہم بھی آج ثاقب اور ثنا کی نانو کی طرف جارہے ہیں۔" وہ فوراً" اسے بتانے لگیں۔

"وہ تو چلا گیا آنٹی! اور وہاں مما کے گھر میں تو کوئی بھی نہیں۔ وہ لوگ ملائیشیا چلے گئے ہیں۔ رات میں ان کی فلائٹ ہے اس لیے مما نے مجھے اس وقت یہاں بھیج دیا۔" وہ کانپتی آواز میں بولی۔

"تمہارے پاپا کو کال کرکے بتادیا تھا تمہاری ماں نے۔" وہ اب کے کچھ برہمی سے بولیں۔

مشال نے نفی میں سر ہلادیا۔

"مجھے نہیں پتا آنٹی!" وہ بہت ڈر گئی تھی۔

دوسری طرف کا گھر تو کئی سالوں سے بند تھا۔ وہ لوگ کسی دوسرے ملک جاکر سیٹل ہوگئے تھے اب اگر نبیلہ آنٹی بھی چلی جاتی ہیں تو وہ کہاں جائے گی۔

"تو اب کیا کروگی تم؟" وہ بے لحاظ سے لہجے میں بولیں تو مشال خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گئی۔

"تمہاری نانو ہیں نا۔ ان کے گھر چلی جاؤ۔ ماموں بھی۔" نبیلہ کو جیسے خیال آیا تو وہ کہنے لگیں۔

"ماموں اور نانو تو پچھلے ماہ حج کرنے گئے ہیں۔ وہاں ممانی کی خالہ رہتی ہیں نا۔" وہ ہولے سے بولی۔

نبیلہ یوں کھڑی ہوگئیں کہ اب کیا کیا جائے۔

"آنٹی! میں۔ اب کیا کروں؟" وہ ڈر کر خود ہی پوچھنے لگی۔

"میں کیا بتاؤں۔ دیکھ لو۔ اپنے پاپا کو کال کرکے ان سے پوچھو کہ تمہیں کیا کرنا چاہیے۔" وہ رکھائی سے بولی۔ اور پھر کچھ سوچ کر اپنے ہاتھ میں پکڑا سیل اس کی طرف بڑھایا۔ مشال کانپتے ہاتھوں سے باپ کا نمبر ملانے لگی۔

دوسری طرف سیل آف جارہا تھا۔

اس نے ہر کوشش کی اور مایوسی پر سیل نبیلہ کو واپس کرنے لگی۔

"پاپا کا سیل آف ہے۔ شاید ان کا نمبر چینج ہو گیا ہے۔" وہ رندھی آواز میں بولی۔

"مائی گاڈ! کیسے لاپروا پیرنٹس ہیں۔ بچی کی کوئی فکر نہیں۔ اپنی اپنی دوسری فیملیوں کو لے کر سیر سپاٹے کو نکل گئے۔ اب بتاؤ میں تمہارا کیا کروں۔ ہم نے آؤٹ آف سٹی جانا ہے۔ تمہیں ساتھ تو نہیں لے جاسکتے۔" وہ کوفت بھرے لہجے میں بولیں۔

دوسرے لمحے ان کے گیٹ سے گاڑی باہر نکلی۔ ان کے دونوں بچے اور شوہر تیار حلیے میں گاڑی میں بیٹھے تھے اور نبیلہ آنٹی کو بیٹھنے کا کہہ رہے تھے۔

"رکو میں آتی ہوں۔" وہ بے زاری سے کہہ کر شوہر کے پاس گئیں کچھ دیر شوہر سے بات کرتی رہیں۔

مشال کی آنکھوں میں آنسو آتے جارہے تھے۔ اطراف میں شام کے سائے گہرے ہوچکے تھے۔ رات ہونے کو تھی۔ وہ کہاں جائے گی اس وقت اگر یہ لوگ بھی نکل گئے تو۔

اس کے ضبط کرتے کرتے بھی آنسو نکل ہی پڑے۔

"سنو! تمہاری دادی کی کزن ہیں نا یہاں تیسری چوتھی گلی میں رہتی ہیں۔ تمہاری دادی بھی شاید وہیں رکی ہوں تم وہاں چلی جاؤ ناں۔ معلوم ہے نا تمہیں ان کا گھر؟" شوہر سے مشورے کے بعد نبیلہ آنٹی اس کے پاس آکر بولیں۔

"یا ہم تمہیں چھوڑ دیں؟" اس کی خاموشی پر وہ کچھ بے زاری سے بولیں۔

"آپ۔ رہنے دیں۔ میں خود سے چلی جاؤں گی۔ مجھے دادو کی کزن کا گھر معلوم ہے۔" وہ رک رک کر بمشکل بولی تھی۔

"دیکھ لو! اگر جاسکتی ہو تو جانا' ورنہ بتادو یہ نہ ہو کہ رستہ بھول جاؤ یا پھر کہیں اور نکل جاؤ۔" وہ احتیاطاً" بولیں ورنہ ان کا موڈ ایسی کوئی بھی ہمدردی جتانے کا نہیں تھا۔ ان کے شوہر اب گاڑی کا ہارن بجائے جارہے تھے۔

"چلی جاؤ گی نا۔ بتادو مجھے ویسے بھی تمہارے پیرنٹس کون سا مجھے کہہ کر گئے تھے تمہارا خیال رکھنے کو۔" وہ اس خواہ مخواہ کی سر پڑی مصیبت سے جھنجلا رہی تھیں۔

"آنٹی! میں چلی جاؤں گی دادو کی طرف پلیز۔ آپ پریشان نہیں ہوں۔ یہاں سے تین گلیاں چھوڑ کر ان کا گھر ہے۔ مجھے راستہ آتا ہے۔" وہ کچھ خود اعتمادی سے بولی۔

"گڈ۔ تو میں پھر جاؤں؟" وہ جیسے ہلکی پھلکی ہو کر بولیں۔

"جی!" مشال رخ پھیر کر ہاتھ میں پکڑے بیگ کو سنبھالتے ہوئے آہستگی سے بولی۔

نسرین دادو کے گھر وہ ایک بار یا شاید دو بار پاپا کے ساتھ گئی تھی۔ اسے بالکل بھی ان کے گھر کا راستہ نہیں آتا تھا مگر اس کی خوددار طبیعت یہ گوارا نہیں کررہی تھی کہ ساتھ والی آنٹی اس کی وجہ سے خواہ مخواہ پریشان ہوں جب اس کے اپنے والدین کو اس کی فکر نہیں تھی۔

وہ اندھیری گلیوں میں تیز تیز چلنے لگی۔

اندھیرا بڑھتا جارہا تھا۔ اس کے قدموں کی رفتار بھی تیز ہوتی جارہی تھی۔ "مجھے ان سے نانو کے یہاں نہ ہونے کا جھوٹ نہیں بولنا چاہیے تھا۔ وہ مجھے نانو کی طرف ڈراپ کردیتے۔"

وہ اب تقریباً" بھاگ رہی تھی جب کوئی اندھیرے میں اس کے پیچھے بھاگنے لگا۔ اس نے مڑ کر دیکھا اور اس کی چیخ نکل گئی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

سمیرا حمید

عالم لاہوت

"وقت تہجد؟"

نیم اندھیری۔ نیم روشن تنگ و کشادہ گلیوں میں وہ حمزہ عزیز جمالی ایسی چال میں چلتا جارہا ہے جیسے ننھی منی یک رنگ تتلیاں مولانا رومی کے عشق حقیقی کے صفحات پر جھوم جھوم چرن چھوتی ہوں اور پیا رنگ کالا میں رنگ رنگ جاتی ہوں۔ وہ تو من شدی۔ تو من شدی کا الاپ کرتی ہوں۔ اور اس رقص میں شامل ہوتی ہوں جسے رقص یار کہتے ہیں۔

وقت تہجد کا اندھیرا چھایا ہے جو دن کے اجالے سے دنیاداروں کے لیے کیا جاتا ہے ارفع و اعلا ہے یہ اندھیرا جو باطن کو پا جانے والے اللہ کے حضور سجدوں میں جھکے روشن پیشانیوں والوں کے نور سے سجا ہے۔

جاڑے کی سرد ترین رات ہے' جمالی کالی چادر کو سر سے وجود پر جھولتے چھوڑ کر کچھ ایسے قدم بڑھا رہا ہے جیسے اس نے سرگوشیاں سنی ہیں کہ اس پار نور والے بیٹھے ہیں۔ باجماعت ہونے کو ہیں۔ آؤ باجماعت۔ ہاں آؤ۔ وہ عالم وجد میں عالم سماع میں خاک سے کہیں دور شان سے قریب ہو جانے والے۔ آؤ باجماعت۔ عالم ناسوت (فانی دنیا) کو پیچھے چھوڑے عالم لاہوت (سالک کا مقام فنا فی اللہ) کی طرف سفر کریں۔

عالم لاہوت کے شوق میں سفر کرتا عزیز جمالی اپنے قدم بڑھاتا جارہا ہے۔ آجاؤ وجود کو الف کرتے الف میں ڈھالتے الف کو پا جائیں۔ مسجد علاقے کو کہیں پیچھے چھوڑتے ذرا کنارے پر ہے' آس پاس کی کئی آبادیوں کو لگتی ہے۔ اسے جلدی نہیں ہے۔ وہ دیر بھی نہیں کررہا۔ اسے ایسا لگتا ہے یہاں وہاں سے ایک جماعت سی بنی کہیں جارہی ہے۔ یہی جماعت جو گھروں سے نہیں نکلتی جو گھروں میں ملتی بھی نہیں۔ راہ یار میں یار اکھٹے ہوتے جارہے ہیں۔ یہ یار آبادیوں میں نہیں ملتے۔

"کالی چادر" اس کے باپ کی چادر اس کے سر سے وجود پر جھول رہی ہے۔

وہی چادر جو اس کے باپ نے اس وقت اوڑھ رکھی تھی جب وہ دوپٹے سے اپنی بیوی' اس کی ماں کا گلا گھونٹ رہا تھا' یہ چادر اس کے باپ کے وجود سے ایسے لپٹی تھی جیسے شر انسان کے نفس سے لپٹ کر اس کے ہاتھوں خیر کا قتل کرواتا ہے' یہی چادر اس کے سر سے ہوتی اس کے وجود پر ایسے جھول رہی تھی جیسے برگزیدہ صوفی کے وجود سے رضائے حقیقی لپٹی ہوتی ہے۔

یہ چادر اس کے وجود کا وہ حصہ تھی جو لباس ستر پوشوں کے لیے ہوتا ہے۔ یہ ہمہ وقت اسے یاد دلایا کرتی تھی کہ اس کے باپ نے کیا کیا۔ یہ اسے سکھایا کرتی تھی کہ اسے کیا نہیں کرنا۔ یہ صرف ایک کپڑا نہیں تھا یہ وہ بنیاد تھی جس پر اس نے حمزہ عزیز جمالی بشر کی بنیاد کھڑی کی تھی۔

مسجد کا دروازہ کھول کر وہ اندر آیا اور تہجد کی نماز کا اعلان کیا' بمشکل تین چار لوگ آجایا کرتے تھے نماز تہجد کے لیے وہ بھی کبھی کبھار ہی۔

اعلان تہجد' اذان فجر' ظہر اس کے ذمہ تھی کبھی کبھار جمعے کا خطبہ بھی دے دیا کرتا تھا' جب ماموں شہر سے باہر ہوتے ان ہی دنوں وہ پانچ وقت کی اذان اور نمازوں کی امامت کرواتا تھا۔ نوری مسجد کے امام اس

کے ماموں تھے لیکن ہمہ وقت وہ مسجد کے کاموں میں مصروف رہتا۔ مسجد جاتے ہوئے' مسجد سے کھانا لینے آتے ہوئے' مسجد کی صفائی کرتے ہوئے' مسجد کے آس پاس کے وسیع کھلے احاطے کی کچی زمین پر پانی چھڑک کر صفائی کرتے ہوئے۔ چار اطراف بنی کیاریوں کی کانٹ چھانٹ کرتے ہوئے' گیلے کپڑے اور اخبار سے بڑا پھاٹک' دروازے کھڑکیاں صاف کرتے ہوئے' لمبے بانس پر ململ کا سفید اجلا کپڑا لپیٹ

کر دیواروں کی گرد صاف کرتے ہوئے۔ اندر کے باقی سازو سامان کو دھوپ لگواتے ہوئے۔ اس کے پاس جو سارے کام تھے وہ خانہ خدا سے متعلق ہی تھے' جس لگن محبت سے وہ یہ سارے کام کرتا' مانو ایسا لگتا سارے جہاں میں اللہ صرف اسی کا ہے۔ اللہ کا گھر اسے ہی پیارا ہے۔ اس گھر کے مالک کا ایک واحد غلام وہی ہے۔ لوگ مسجد کے دروازے پر جوتیاں اتارتے' وہ دور کچی زمین پر ہی اتار دیتا اور ننگے پیر چلتا اندر آتا۔ راستے میں نظر آتے چھوٹے موٹے تنکے کنکر اٹھاتا آتا۔ بڑے دروازے کے ساتھ اپنی آنکھیں ٹکا دیتا۔

اسے مسجد سے نکلنے کی کبھی جلدی نہیں رہتی تھی۔ اپنی زندگی کی بہت ساری راتیں اس نے یہیں گزاری تھیں۔ جب جب وہ مسجد میں اکیلا ہوتا اس محبت سے گھومتا پھرتا جیسے چپکے چپکے اللہ کو ڈھونڈتا ہو اور چپکے سے اللہ کو پالینا چاہتا ہو۔ جب جب اس نے مسجد میں رات گزاری وہ کبھی نہ سو سکا۔ وہ مسجد کے احاطے میں جہاں نماز جمعہ میں کئی سو نمازی سجدہ کرتے تھے بیٹھ جاتا' دونوں گھٹنے جوڑ کر پکڑ کر بیٹھ جاتا چادر کندھوں پر کچی زمین پر ایسے پھیل جاتی جیسے لمبے سجدے میں غرق ہو چکی ہو اور ماضی کی غفلت پر توبہ کرتی ہو۔

وہ کوئی ورد نہیں کرتا تھا۔ نہ وہ کلام میں مشغول ہوتا' بہت عرصے بعد اسے معلوم ہوا کہ وہ ایسی حالت میں کچھ یہ کہا کرتا تھا۔

"اللہ ھو۔ اللہ ھو۔ اللہ ھو۔ اللہ ھو۔"

ایک رات ماموں آئے۔ کوئی کتاب لینی تھی۔ حجرے سے احاطے میں اسے ایسے بیٹھے دیکھ کر نہیں ڈرے تھے' کہتے تھے کوئی ہجوم سا تھا۔ سب سر جھکائے گم بیٹھے تھے۔ انہیں چکر سا آیا۔ دیکھا تو وہ اکیلا احاطے میں گھٹنے جوڑے بیٹھا تھا۔ اس کے بعد ماموں نے اسے مسجد میں رات رکنے نہ دیا۔ وہ ماموں کو انکار نہیں کرتا تھا اگر وہ کہتے کہ مسجد نہ آیا کر تو وہ اپنے اللہ کے ساتھ مسجد سے باہر آجاتا۔

بمشکل ساڑھے چار سال کا تھا جب ماموں اپنے ساتھ لے آئے تھے۔

علاقے کے بچے' جوان سب ہی اس پر رشک کرتے ان بچوں جوانوں کے والدین بھی کرتے تھے۔ جتنے بھی بچے اس سے قرآن پڑھ گئے تھے اس کے اخلاق و نرم گوئی کے گرویدہ ہو گئے تھے اسکول آتے جاتے' خاص اسے مسجد آکر سلام کر کے جاتے۔ ایک بہت بڑی جماعت تھی جس میں وہ قرآن پاک پڑھایا کرتا تھا۔ بچے اسے پسند کرتے تھے وہ ان کی ماں کی طرح مشفق تھا۔ آپس کی لڑائی میں اگر کوئی ایک آدھ رونے لگتا تو وہ دیر تک انہیں گود میں بٹھائے رکھتا۔ روتے ہوئے بچوں کو دیکھ کر اس کا جی پھٹنے لگتا۔

"جمالی۔ کاکے۔ بھاگ جا۔ مار دے گا تجھے بھی۔"

اس کے باپ نے دوپٹے کا پھندا ابھی کسنا شروع کیا ہی تھا کہ اس کی ماں نے اسے بھگانا چاہا' وہ بت بن کر موت و زندگی کا تماشا دیکھتا رہا۔ روتا رہا۔ روتا رہا۔ اس کا جی پھٹا جاتا تھا۔

حمزہ عزیز جمالی خوبصورت تھا۔ داڑھی اور ہمہ وقت کی چادر گری نے صرف اسے ایک جوان بشر نہ رہنے دیا۔ برے سے برے کردار کی لڑکی بھی اس سے احترام سے ملتی تھی۔

مسجد سے گھر کی طرف اور گھر سے مسجد کی طرف آتے کئی خواتین گھر کے دروازوں میں کھڑی اسے روک لیتیں۔

"جمالی بھائی جی منے کی آنکھ میں پھنسی نکل آئی ہے۔ دم کر دیں۔" وہ دم کر دیتا۔

"اگلے ہفتے اس کے بورڈ کے پرچے ہیں۔ سر کا درد جان نہیں چھوڑ رہا۔" کسی نوعمر جوان لڑکی کا سر آگے کر دیا جاتا۔ وہ ماموں سے سیکھے حکیمی نسخے بتا دیتا۔ دم بھی کر دیتا۔ کچھ جو اسے گلی میں نہ روک سکتے' وہ مسجد کے حجرے میں بلا جھجک نماز عصر کے بعد آجاتے اور رات گئے تک آتے رہتے۔ ماموں عصر کے بعد باقاعدہ بیٹھتے تھے لیکن صرف مغرب تک۔ باقی لوگ کچھ

دن میں چکر لگا جاتے کچھ قبل از عشاء سے بعد از عشاء تک۔

دم کرواتے' پانی پڑھواتے۔ رشتوں کے دعا کرواتے' کسی چھوٹے بڑے نقصان کی بابت پوچھے جاتے وظیفہ و صدقہ' نوافل کا طریقہ لے جاتے' کچھ خواتین صرف خواب بتانے آتیں۔ مولوی عبدالحکیم انہیں تعبیریں بتا دیتے۔ کچھ استخارہ کروانے آتیں کچھ دعا کے لیے کہہ جاتیں' وہ کہتا کہ استخارہ خود کرنا چاہیے لیکن ان پڑھ عورتیں بضد رہتی تھیں کہ وہی ان کا استخارہ کریں۔ جمالی ماموں جتنا قابل تو نہیں تھا لیکن تھوڑا بہت کچھ کر لیتا تھا۔ مزید وہ نکاح خواں بھی تھا کچھ اتفاقات ایسے ہوئے کہ مولوی عبدالحکیم صاحب نے جن جن کا نکاح پڑھوایا۔ انہیں طلاق ہو گئی یا وہ بیوہ ہو گئیں' کچھ بس کر بھی یوں دکھی رہیں کہ شوہر شکی' نکھٹو' برے اخلاق کے نکلے۔ اور جن جن کے جمالی نے نکاح پڑھوائے۔ وہ ہنستی بستی رہیں تو سب ہی نے بس آپوں آپ ہی یقین سا کر لیا کہ جس کا نکاح حمزہ جمالی پڑھوائے گا وہ لڑکی سکھی رہے گی۔

جناب مولوی عبدالحکیم صاحب بھی خوب جانتے تھے لوگوں کے اس یقین کو' کون سا حسد کرنے والے تھے لیکن بشر ہی تھے نا' کبھی کبھی سوچا کرتے۔ "قاتل کا بیٹا ہے۔ خون میں گناہ عظیم کا عیب دوڑتا ہے۔" پھر توبہ کرتے۔ تکبر صرف شیطان کو ہی بھلا۔

اکثر لڑکے والوں کا اعتراض ہوتا "یہ اتنا سا لڑکا نکاح پڑھائے گا کوئی برگزیدہ بزرگ مولوی نہیں ہیں آپ کی مسجد میں؟"

"برگزیدگی کے لیے بزرگ نہیں توفیق ضروری ہے بس۔" کسی نے کہا۔

"نکاح تو جی عزیز جمالی ہی پڑھائیں گے۔" پوچھنے والے کو جواب ملتا بعد ازاں دلہن کی زبانی سب کو معلوم ہو ہی جاتا کہ نکاح عزیز جمالی سے پڑھوانا ہی کیوں ضروری تھا۔

لڑکیاں' بالیاں جو کبھی روایتی انداز میں لڑتیں تو جل کر بددعا دیتیں۔ "اللہ کرے تیرا نکاح مولوی حکیم ہی پڑھائے۔ عزیز جمالی تیری بارات کے دن شہر سے باہر ہوں' بیمار ہو یا صاف صاف انکار کر دیں آمین۔"

نکاح سے متعلق کسی ایسی افواہ کی بھنک اس تک آتی تو وہ شرمندہ سا ہوتا' وہ نہیں چاہتا تھا کہ اسے اس کے ماموں کے سامنے ایسے کھڑا کیا جائے۔ دنیا کے لوگ تو اپنے فائدوں پر عزت و تکریم دیتے ہیں نا۔ لیکن اس کے ماموں نے اسے کسی بھی فائدے کے لیے عزت و تکریم نہیں دی تھی۔ اگر کچھ تھا تو بہن کی محبت اور خوشنودی اللہ۔

دلہنوں کے لمبے گھونگھٹ تلے اس نے کئی بار رجسٹر رکھے۔ قبول ہے قبول ہے اس نے بہت بار سنا۔ کسی مہندی لگے چوڑی سجے ہاتھ نے اس کی توجہ نہ پکڑی۔

"وہ بھی وجود بشر میں گرفتار محبت نہ ہوا۔"

اس کا باپ قاتل تھا۔ نہ جانے کیا سچ تھا اس کی ماں بھی یا باپ کی شکی نظر۔ وہ اسے بھی حرامی کہا کرتا تھا۔

"عمر قید کی سزا کاٹ کر وہ کسی باہر کے ملک چلا گیا تھا۔"

اس نے اپنی آنکھوں سے اپنے باپ کو قاتل بنتے دیکھا تھا اس کی ماں کی آنکھیں ابل رہی تھیں۔ اور موت کے پر اس کی پشت سے ہو کر آنکھوں کے سامنے پھڑپھڑا رہے تھے۔ وہ آنکھیں موت سے خوف زدہ نہیں تھیں وہ تو بس نوحہ کناں تھیں کہ انہیں ایسے غلیظ الزام کے سائے تلے موت کے مقدس دروازے کی طرف وداع نہ کیا جائے۔

حمزہ عزیز جمالی کو اسی عمر سے چپ لگ گئی تھی۔ اسے موت سے نفرت نہ ہو سکی کیونکہ اس کا باپ قاتل تھا۔ اسے زندگی سے محبت نہ ہو سکی کیونکہ اس کی ماں مقتولہ ہو چکی تھی۔

وہ موت کی حیات سے باہر نکل آیا تھا۔ اسی وقت دادا مرحوم نے اس کی آنکھوں کو چوما تھا "اللہ والیوں۔ اللہ والیوں۔"

موت و حیات سے پرے ان آنکھوں میں دیکھ کر لوگ نظریں جھکا لیتے تھے۔ مودب سے ہو جاتے تھے۔

"اللہ والیوں۔"

وہ بشر کی آنکھیں تھیں۔ وہ بشر سے خالی تھیں۔

دادا مرحوم نے اپنے بیٹے کو خود پولیس کے حوالے کیا اور اسے ماموں کے۔

ماموں اسے لے آئے' بے چارے ڈرے ہوئے تھے اس کے خون سے' رات دن ایک ہی سبق دیتے تھے۔

"بچے عزیز جمالی جہاں سے آئے ہیں سب ہی کو وہیں واپس جانا ہے' دنیا میں کتنے بھی ہاتھ پیر مار لو گھوڑے دوڑا لو۔ ٹھیک اسی جگہ جانا ہے۔ جس بنیاد سے اکھاڑ کر اس عارضی ٹھکانے بھیجا ہے۔ پر جیسے پاک صاف آئے تھے ویسے پاک صاف ہی جائیں تو بات بن جائے۔"

"اچھا۔ پھر بات بن جائے گی۔" بہت سالوں بعد مسجد کے احاطے میں صاوقین کی فائل بہ سجدہ آیات کی طرح سر جھکا کر اس نے خود سے پوچھا' خود کو جتایا تھا۔

ایک دن مولوی حکیم نے اسے حالت نماز میں دیکھ لیا تو رو پڑے۔

اس کا باپ قاتل بنا' اس کی ماں مقتولہ بنی' وہ حالت نماز میں نہیں تھا۔ وہ تو بات بنا رہا تھا۔

✲ ✲ ✲

حجرے میں بیٹھا وہ صحیح مسلم بخاری پڑھ رہا تھا وقفے وقفے سے خواتین آتی جا رہی تھیں اپنے مسائل لے کر۔

"مولوی جی' اسے دم کر دیں کہتی ہے سر پھٹا جاتا ہے۔" خاتون لاپروائی سے دوپٹا اوڑھے لکڑی کے بنچ پر آکر بیٹھ گئیں ساتھ ہی ایک لڑکی درد سے بے حال ہوئی آنکھیں تقریباً" بند کیے بیٹھی تھی۔

"یہ پانی لائی ہوں' اسے بھی دم کروانا ہے۔ دو دن سے تڑپ رہی ہے۔ گوجرانوالہ گئے تھے شادی میں' وہیں نظر لگی کہ ٹھنڈ لگی' درد جانے کا نام نہیں لے رہا۔"

وہ چبوترے پر بیٹھا تھا۔ سر ہلا کر آیات پڑھنے لگا۔ ماں پیچھے کو کھسک گئی اور لڑکی چبوترے کے قریب ہو کر بیٹھ گئی۔ وہ مسلسل اپنا سر مسل رہی تھی اور ہائے ہائے کر رہی تھی۔

جمالی نے ذرا سا آگے کو جھک کر لڑکی کے سر پر پھونک مار دی۔

پھونک کی ہلکی سی ہوا اسے ناگوار گزری یا اسے سکون ملا۔ لڑکی نے جھٹ اپنی آنکھیں کھول دیں۔ ہائے ہائے رک گئی۔ آہ میں ڈوبی آنکھیں مجسم ہو گئیں۔ ان آنکھوں میں درد کہاں تھا۔

وہاں تو کچھ اور ہی تھا۔ کیا تھا۔ کیا تھا۔؟؟ وہ درد ہی نہ تھا صرف۔ جمالی دوسری پھونک مارنا بھول گیا۔

جمالی جان نہ سکا۔ وہ دیکھ ضرور رہا تھا لیکن پا نہیں رہا تھا۔

اگر جوگی کا کوئی جوگ تھا تو وہ اس کی آنکھیں تھیں۔

اگر عشق مجسم صورت کہیں تھا تو وہ ان آنکھوں میں ہی تھا۔

لیکن وہ کسی مفہوم میں ملفوف (سربند) تھیں وہ جان نہ سکا۔

ہائے ہائے کرتے لڑکی نے آنکھیں بند کر لی تھیں لیکن وہ جمالی کے اندر وا ہو چکی تھیں' وہ دنگ تھا لیکن انجان تھا کیوں ہے۔ میگھ ملہار کو نجا۔ چھم چھم بارش ہونے لگی۔ اسے اچھا لگا۔

خالہ بتول کی لائی پانی کی بوتل اس نے کانپتے ہاتھوں سے پکڑی اور بہت دیر لگی لیکن پانی پر اس نے دم کر ہی دیا۔

"اس کے لیے دعا کریں ذرا۔ مجھے تو شک ہے کوئی سایہ وایہ ہو گیا ہے اسے۔ روتی رہتی ہے ہر وقت۔ کل رات اٹھ کر جو پاگلوں کی طرح دھاڑیں ماریں اس نے میں تو ڈر گئی۔"

اس نے سورۃ الناس اور سورۃ الفلق پڑھنا شروع کی لیکن دوبارہ اس کی طرف نہ دیکھا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے خالہ جی۔ ٹھیک ہو جائے گا سر درد۔"

"مجھے ایک اور دم کر دیں مولوی جی!" زمین کی آخری تہہ میں دبے ہوئے انسان کی سی آواز نکلی اس کی اور آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے اور ہائے ہائے کی تکرار رک کر خاموش دہائی میں بدل گئی۔

"بڑی وحشت ہوتی ہے جی مجھے۔ مولوی جی۔ مولوی جی۔" اس نے سینہ مسلا۔ "میرا دل پھٹا جاتا ہے۔ میرا اندر۔"

"پنڈ تھا وہ' جہاں ہم گئے تھے مجھے تو یقین ہے کچھ دیکھ آئی ہے وہاں ڈر گئی ہے۔"

جوگی کا جوگ آنکھوں کے رستے بہنے لگا وجود کے آر پار دکھائی دینے لگا۔

"میرا جی چاہتا ہے جی میں مر جاؤں۔ میں مر جاؤں جی۔"

اس نے یہ کہتے آنکھیں پھر سے پوری کھول دیں۔ جمالی کی آنکھیں ان آنکھوں میں گڑ گئیں۔ نہیں' ویسے نہیں جیسے مرد کی عورت کی آنکھوں میں گڑتی ہیں۔ پھر کیسے۔ جیسے بھی بس وہ ان آنکھوں سے ہٹنے کو تیار نہ تھیں۔ وہاں عشق مجسم صورت لیے پھیل کر جما تھا۔

وہ سانولی سی تھی' لمبی پتلی' مڑی تڑی سی' نہ جانے کس رنگ میں سے ڈوب کر ابھری تھی۔ کس رنگ سے یک رنگ ہوئی تھی کہ حمزہ عزیز جمالی کی نگاہیں نہ جھکتی تھیں۔ بس تکتی تھیں۔

وجد در وجد اور جمال در جمال کی وہ دہلیز پر جا کھڑا ہوا۔

یہ کیا ہوا ؟

وہ تو چبوترے پر حجرے میں بیٹھا تھا۔ وہ مسجد کے احاطے میں عشق یار میں کیونکر جھوم رہا تھا۔ اس کا وجود تو حجرے میں بیٹھا تھا۔

جمالی نے ایک اور دم کر دیا۔ اور اپنا سینہ مسلنے لگا۔

"ہائے ہائے" فراق کی دہائی میں بدلی۔

ماں بیٹی دونوں چلی گئیں۔

دم کر کے وہ بے دم ہو گیا۔

خاموش ہی رہتا تھا لیکن اس بار ایسی خاموشی تھی کہ مامی نے عجیب بات پوچھی۔ "ماں یاد آ رہی ہے جمالی؟"

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ بھولے گی تو یاد آئے گی نا۔

"اچھا۔ تجھے دیکھ کر دل کو ہول پڑ رہے ہیں۔"

"رونے کو دل چاہتا ہے۔ جی چاہتا ہے دنیاداری چھوڑ کر کہیں روپوش ہو جاؤں۔"

وہ مامی کی صورت دیکھنے لگا۔

شادی کے اکیس سال بعد مامی ماں بننے جا رہی تھی۔ ایک بار اسے نفلی عبادت کرتے دیکھ کر رونے لگی جب تک اس نے سلام پھیرا تب تک وہ جائے نماز کے قریب زمین پر بیٹھ کر روتی رہی ہچکیاں لیتی رہی۔ پھر اس کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ دیے۔

"تو دعا کر جمالی! ایسے ہی جیسے عبادت کر رہا تھا۔ ایسے ہی دعا کر۔ مجسم دعا بن جا میرے لیے۔ میرے پاس بھی کوئی تیرے جیسا ہو کہ جس کی اذان پر میں نماز کی تیاری کرنے لگوں۔ ایسے ہی جمالی میرے بچے جیسے تو عبادت کرتا ہے۔ میرے لیے فریاد کر دے۔"

وہ مبہوت مامی کو دیکھتا رہا' ایسی شدت اور چاہت جس پر مامی بچھی بچھی جاتی تھی' وہ فدا ہو گیا۔ اتنی چاہ۔ ایسی چاہ۔

اسے اپنی عبادت بے کار لگی۔ اس میں ایسی چاہت تو نہ تھی۔ اسے بدگمانی ہوئی۔ اس میں یہ شدت نہ تھی۔

اس نے خود کو از سر نو جانچا۔

✲ ✲ ✲

اگلے دن خالہ بتول آئیں ہدیے کے ڈبے میں سو روپے ڈالے۔

"وہ کہتی ہے مولوی جی جادوگر ہیں۔ سکون سے سوئی رات بھر' پانی میں نے سارا پلا دیا تھا' یہ بوتل لائی ہوں۔

اسے بھی دم کردیں۔"

اس نے بوتل دم کر کے دے دی' عشاء کے بعد اپنے چھوٹے بھائی کو لے کر عائشہ فاطمہ آئی۔ اس کی سیاہ چادر کے ساتھ تنکے الجھتے تھے اور چادر کے پلو مٹی سے اٹے تھے' شلوار قمیص سے نہیں ملتی تھی اور چادر لباس کے ساتھ' منہ سر اور ہاتھوں پر بھی مٹی لگی تھی کی وہ یقیناً" آتے ہوئے گر گئی تھی اس کے بھائی نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔

"مولوی جی دل پھٹا جاتا ہے جی۔ آگ لگی ہے جی اندر۔ کچھ کردیں۔ کچھ تو کردیں مولوی جی۔"

کچھ کرنے کے لیے وہ کہہ رہی تھی جو عزیز جمالی پر بہت کچھ کرچکی تھی۔

"کیا ہوا ہے۔ خواب میں تو نہیں ڈر گئی؟"

"پتا نہیں جی کیا ہوا ہے۔ بس جی کچھ کردیں۔ آگ لگی ہے اندر۔"

اس کے اندر واقعی آگ بھڑکی تھی۔ اس کا وجود مجسم آتش نظر آتا تھا۔ آخر یہ آگ اسے کیونکر لگی۔

عزیز جمالی کو جتنے دم درود آتے تھے اس نے پڑھ کر اس پر پھونک دیے اور لکڑی کے بینچ پر بیٹھے بیٹھے اس نے ایک ذرا سکون کا سانس لیا۔ وہ دہائی سے آہ میں بدلی۔ اپنے سر منہ کی مٹی چادر کے پلو سے صاف کرنے لگی۔

"آپ بڑے اچھے ہیں جی۔ میں تو کملی ہو گئی ہوں۔ جادوگر ہیں آپ! اماں کہتی ہیں ولیوں کی روح ہے آپ میں۔ بزرگوں کے سائے میں بیٹھتے ہیں آپ جی۔" وہ جھک کر رکی اپنے بھائی کی طرف دیکھا حجرے میں رکھی چیزوں کو دیکھ رہا تھا۔

وہ بول رہی تھی ایسے لگتا تھا کلام امیر خسرو کو مناجات میں شامل کرتی ہو' جیسے سنگیت کار نے اس راگ کو جا پکڑا ہو جو اسے ابن الوقت بنانے والا ہو' وہ چپ ہوئی تو ایسے لگا لاکھوں کروڑوں مجاوروں نے اپنی سانسیں روک لی ہو۔ حق ہو کا ورد انہیں جذب کرتا ہو۔

"وہ جی کچھ کردیں جی۔ مولوی جی۔!" بہتے پانی پر چلنے کے سے انداز سے اس نے کہا کوئی اسے اس پار لگا دے۔ کوئی تو۔

وہ کس پانی پر چل رہی تھی۔ اسے کس پار جانا تھا۔؟ پھر وہ ایک دم سے کھڑی ہو گئی اور چلی گئی۔ زمین پر بچھ بچھ جاتی اس کی چادر پر عزیز جمالی نے کئی بوسے دیے نظر سے۔

عزیز جمالی عبادت کے لیے کھڑا ہوتا تو اسے لگتا اس کی عبادت کھوکھلی ہے۔ وقت تہجد وہ کئی گلیوں کو پار کر کے مسجد تک کا سفر کرتا تو اسے لگتا اس کے آگے پیچھے کا قافلہ اس سے بچھڑ گیا ہے۔ جیسے ہی وہ عائشہ فاطمہ کے بارے میں سوچتا سب کچھ کھوکھلا ہو جاتا۔ آخر وہ کس مقام پر کھڑی تھی کہ اسے دیکھتے ہی اس کے پاتال کا سفر جاری ہو جاتا وہ "کی جاناں میں کون" ہو جاتا "نہ میں مومن وچ مسیتاں۔" اس کا پول کھل کھل جاتا۔

اگلے دن وہ پھر آئی۔ اس بار اکیلی تھی شلوار کے پائنچے مٹی سے اٹے تھے۔ یہی حال چادر کے کونوں کا تھا آنکھوں کی حالت ایسی تھی جیسے آگ اپنی منزلیں طے کرتی ساتویں آخری منزل پر جا ٹھہری ہو۔

"مجھے تعویذ لکھ دیں جی!" اس نے ایسی منت سے کہا جس منت سے مرید اپنے مرشد کو جا پکڑتا ہے۔

"میں تعویذ نہیں لکھتا۔ ماموں جی لکھتے ہیں۔"

"بڑے مولوی جی۔" وہ بہت مایوس ہوئی ایسے لگنے لگا جیسے دھاڑیں مار کر ایسے روئے گی کہ انت کردے گی انت ہی ہو گی پھر۔

اس کے جاتے ہی عزیز جمالی پر بے سکونی موسلا دھار بارش کی طرح برسی' وہ گھر کی طرف بھاگا اور رضائی لپیٹ کر سو گیا۔ مای حیران پریشان کئی بار آئی اسے کانپتے ہوئے دیکھ کر گئی۔ مولوی جی آئے اسے دم کیا بخار دیکھا لیکن بخار نہیں تھا۔

دونوں میاں بیوی نے سوچا' لاکھ انکار کرے اب اس کی شادی کرہی دیں گے۔ کئی دن بعد اس کی حالت سنبھلی تو مای نے بڑے پیار سے پوچھا۔

"شادی کردیں تیری؟"

وہ خاموش رہا۔ "تیرے ماموں کو بہت سے لوگوں نے کہہ رکھا ہے۔ میں چاہتی ہوں۔ لڑکی سید ھی سادی سی ہو۔ آس پاس کے گھروں میں کئی لڑکیاں ہیں' بڑا پیار کرتے ہیں تجھے سب' صاف صاف کہہ جاتے ہیں کہ ان کی خوش قسمتی ہوگی اگر تو انہیں عزت دے۔ کیا کہتے ہو۔ ہاں کردوں اپنی پسند سے۔؟"

وہ خاموش رہا۔ ابھی وہ خود ہاں ناں میں تھا شاید اس کی ماں نے بھی کہا ہو۔ اگر نہ بھی کہا ہو تو مای کے جانے سے ہی۔ عائشہ فاطمہ اور عزیز جمالی اس سوچ سے وہ بے چین سا ہو گیا اور کمال کی بات کہ اسی پر وہ فدا سا ہو گیا جیسے کاہل طالب کو اسباق کاہل ملنے والا ہو۔

وہ رات دن اسے سوچ رہا تھا جیسے حرف بہ حرف قاعدہ عشق پڑھ رہا ہو۔ وہ لفظ لفظ پر دنگ رہ جاتا۔ فدا ہو ہو جاتا لیکن جیسے جیسے پڑھتا جا رہا تھا۔ تشنگی سے مرنے کے قریب ہوتا جا رہا تھا۔

بتول بی بی آئی۔ حجرے میں بڑی حواس باختہ سی تھی ایک پرچی آگے کی۔ اس پر ایک مردانہ ایک زنانہ نام لکھا تھا دوسری طرف عائشہ فاطمہ والدہ بتول بی بی لکھا تھا۔

"ان کا استخارہ کردیں جی!" اس نے ایک گہری سانس بھی لی عزیز جمالی کی آنکھوں کے آگے شب گیر ناچنے کودنے لگے۔

"میرا جیٹھ ہے صدیق سالک اور ایاز اس کا بیٹا۔ کل آئے تھے۔ میرے پیروں میں سر رکھ دیا۔ میں نے بھی کہہ دیا مولوی صاحب سے مشورہ اور استخارہ کرواؤں گی دل مطمئن نہ ہوا تو صاف انکار ہے۔"

بتول بی بی نے آہ سی لی۔

"میرا جوان بیٹا مارا تھا اس مردود نے۔ گاؤں میں زمین کا جھگڑا تھا۔ بدلے میں اس کا بیٹا پھانسی چڑھ گیا۔ کیسے رشتہ دے دوں۔ کیسے دے دوں مولوی جی۔ پر اپنی پگڑی رکھ گیا ہے ہمارے پیروں میں' کہتا ہے جوان بیٹا زہر کھالے گا۔ مرجائے گا۔ ایک مرگیا ہے۔ دوسرے کو کیسے مرے دیں۔ مرجائے میری بلا سے۔ پر۔"

اس نے آہ سی لی۔

"بینڈ شادی میں کیا گئی یہ بلائیں جان کو آگئیں۔ اپنی ساری زمینیں دینے کو تیار ہیں پر اب کیا فائدہ میرا شیر جوان بیٹا مار ڈالا نا۔" بتول بی بی آنکھیں صاف کرتی رہیں "میں کل آجاؤں گی۔ استخارہ بھی کردیجیے گا جی۔ ٹھیک ٹھیک دیکھیے گا جی۔ مجھے بڑا اعتبار ہے آپ پر۔ پھر چاہے زہر کھائے کہ پھانسی چڑھے میری بلا سے۔ میرا شیر جوان بیٹا۔ کیسے دے دوں رشتہ۔ پر حالت دیکھی نہیں جاتی اس کی۔"

مسجد کے خادم کی طبیعت ناساز تھی اس لیے آج مسجد میں اسے ہی رہنا تھا۔ احاطے میں بیٹھ کر وہ دیر تک اس کے حق میں دعا کرنے کی کوشش کرتا رہا پر ہاتھ نہ اٹھے گھر سے آیا اس کا کھانا ٹھنڈا ہو چکا تھا جس بستر پر اسے سونا تھا وہ بے شکن پڑا تھا۔ کندھوں پر گری کالی چادر زمین پر بچھی جا رہی تھی۔

استخارہ بہترین تھا۔

لڑکا لڑکی کے لیے ٹھیک تھا۔ لڑکی لڑکے کے لیے۔

پھر حمزہ عزیز جمالی کا کیا ہوگا؟

عشاء کی نماز کے بعد وہ کوئی پچاس بار حساب لگا چکا تھا۔

اس کی مرضی کا حساب آ کر ہی نہیں دے رہا تھا۔

چاروں اطراف محرابی برآمدوں کے بیچوں بیچ عزیز جمالی سجدہ کرتی کالی چادر لیے کسی اور کے لیے ہی قیام کیے بیٹھا تھا۔

یہاں اب کوئی خدائی سوال نہ تھا۔ آس پاس کوئی ہجوم محسوس نہ ہوتا تھا۔ وہاں کوئی چغہ پوش۔ روپوش کسی صورت موجود نہ تھا۔ کیونکہ وہاں کسی بشر کا سوال نکالا جا رہا تھا۔ عبادت گاہوں کو انسان نہیں "عشق" آباد کرتے ہیں وہاں اب کوئی عاشق نہ تھا سوال بشر کا

نکالا جارہا تھا جواب بشر کا چاہیے تھا مسجد ایسے ہوئی جیسے صدیوں سے ویران ہو وہاں کبھی رقص طالب نہیں ہوا۔ مسجد میں ایسا سناٹا پھیل گیا جو صحرائے عرب میں ظہور نبی آخر الزماں سے پہلے پھیلا تھا۔ آنکھیں عائشہ فاطمہ اور ایاز سالک پر گڑی تھیں۔

رات پل پل بدل رہی تھی اور ایسے منظر کی تاب نہ لارہی تھی سوال عشق تھا۔ جواب بشر تھا۔ اسے خبر نہ ہوئی اس کا سوال ایک ہی رہا جواب کب بدل گیا۔ اسی احاطے میں بیٹھ کر "اللہ ھو۔ اللہ ھو۔" کرنے والا آج وہ۔ وہ۔ کررہا تھا۔

"بابی جی کو خالہ بتول کے گھر بھیج دے گا۔"

نفس کی تہوں میں موجود شب گیر (علامتاً "ابلیس) قہقہہ لگا کر ہنسا۔

"بس اتنی سی بات تھی سالوں کی "ریاضت" دنوں میں ایک لڑکی کے لیے ملیامیٹ کردی۔ بس یہی تھی اصلیت تمہاری۔ بس۔"

اس نے کاغذ قلم ایک طرف رکھ دیا' سب اس کے ہاتھ میں تھا قلم کا کہا تھا۔

سوال عشق جواب بشر اس نے نکال لیا تھا۔

مسجد ویران ہوتی گئی' قافلے کی صورت روپوش ہو کر آنے والوں نے اپنا رخ بدل لیا۔ "حق ہو" میں جذب ہوتے مجاوروں نے بڑی دردناک آہ لی۔ وہ احاطے میں ہی بیٹھا رہا کالی چادر جو اس کے باپ کی تھی اس کے باپ کی ہوئی۔ سوال بشر۔ سوال بشر۔ سوال بشر۔

مسجد کے پھاٹک میں اس نے کسی کے آنے کی آہٹ سنی پھر کسی نے کسی قدر آہستگی لیکن شدت سے پھاٹک کا کنڈا بجایا۔ عزیز جمالی نے اٹھ کر پھاٹک کھولا اور جہاں کھڑا تھا وہیں کھڑا رہ گیا۔ سیاہ چادر میں وہ جوگ سیاہ کھڑی تھی جس پر قافلے والوں نے اپنا رخ اس سے موڑ لیا تھا۔ محبوب حقیقی پر جس کا نام اس نے خود لکھا تھا۔

"مجھے معاف کردیں جی مجھے اندر آنے دیں جی!"

جاڑے کی سرد ترین رات میں دھند کو چیرتی وہ مسجد میں آنے کی اجازت لینے آئی تھی عزیز جمالی ایک طرف ہوگیا وہ اندر آگئی۔

"میں آپ کے گھر گئی تھی۔ خالہ جی نے کہا۔ آپ آج رات مسجد رہیں گے۔ مجھے معاف کردیں جی۔ میں آگئی... بڑا ظلم ہوجاتا اگر میں نہ آتی۔" دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے۔

"اماں آئی تھی نا کل آپ کے پاس نام دے گئی ہے نا آپ کو۔ اماں... کل پھر آئے گی آپ کے پاس جواب لینے مولوی جی۔" وہ یک دم اس کے قدموں میں گر گئی اور اس کے پیروں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے عزیز جمالی بت بن گیا۔

"اللہ کا واسطہ ہے مولوی جی! اماں سے کہنا لڑکا بہت اچھا ہے۔"

"لڑکا اچھا نہیں ہے۔" عزیز جمالی نے بے ساختہ جھوٹ بولا۔

"وہ تو میرا سائیں ہے جی! کیسے منہ موڑلوں۔ آپ جی۔ آپ جی۔ آپ جی کہہ دیجیے گا۔ خدا رسول کا واسطہ ہے جی۔"

"اگر کوئی اور اس سے بہتر تمہیں مل جائے اور وہ بہت خوش رکھے۔ بہت۔"

"اس سے بہتر کوئی نہیں ہو سکتا جی میرے لیے۔ کچھ نہیں چاہیے خوشی بھی نہیں۔ کچھ نہیں چاہیے جی۔ تخت و تاج ملے یا کوئی بادشاہ۔ سودا نہیں ہے جی۔ بیوپار کیسے کروں۔ مرنہ جاؤں۔"

"سودا نہیں ہے جی۔ بیوپار کیسے کروں؟" عزیز جمالی کے اندر گہرے سناٹے پھیل گئے۔

"مجھ پر رحم کریں جی۔ اللہ رسول کا واسطہ ہے۔ میں مرجاؤں گی۔ مرنا آسان ہے جی۔ اس کے بغیر کیسے رہ لوں جی۔ خود کو اسے سونپ بیٹھی ہوں۔ مرجاؤں گی جی۔ مرجاؤں گی۔ اماں کو کہہ دیجیے گا۔"

"عزیز جمالی۔" سرگوشی ابھری۔ "یہ مرجائے گی۔ وہ مرجائے گا۔ بنام عشق دونوں فنا ہوجائیں گے۔ یہ فنا کو پاجائیں گے سوال نہیں بدلیں گے۔ فنا ہوجائیں گے سودا نہیں کریں گے۔"

عزیز جمالی نے اس مجسم عشق کی طرف عقیدت سے دیکھا۔ "تو یہ تھا وہ جوگ جسے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر وہ جوگی ہوگیا تھا' وہ دھڑلے سے دل لگا بیٹھی تھی اور عملی ہوگئی تھی۔ رات کے ان پہروں میں وہ عبادت کے لیے کھڑا ہوا کرتا تھا اور وہ اپنا رانجھا پانے نکلی تھی۔ وہ رحمٰن سے دل لگا بیٹھا تھا اور سوال بدل بیٹھا تھا۔

وہ ایسے سانسیں لے رہی تھی جیسے کوئی اس کے اندر اس کی حیات کی جڑیں کاٹ رہا ہو۔ حیات جو وہ کسی اور کو دینا بیٹھی تھی۔

"کچھ کریں جی۔ کچھ کریں جی۔" وہ سینہ مسلنے لگی۔

عزیز جمالی سر سے پیر کے انگوٹھے تک جل گیا۔

وہ اپنا سوال بدل بیٹھا تھا۔ وہ کیا کر بیٹھا تھا۔ جس سوال پر کوئی بیوپار نہیں اس پر وہ بشر کا سودا کرچکا تھا۔

"ہائے ہائے" وہ کھڑا کھڑا جل گیا۔

"تو من شدی (تو میں ہوا) تو من شدی کی تسبیح پڑھتا وہ اپنی تسبیح توڑ بیٹھا تھا۔

میں۔ میں۔ تو کون؟ وہ اس پاتال میں آن گرا تھا وہ مرکر فنا ہوجائے گی۔ وقت تہجد اٹھ کر رقص یار کرنے والا فنافی اللہ نہ ہوا۔

وہ کھڑی سینہ مسل رہی تھی۔ اس کے اندر آگ لگی تھی۔

وہ اپنی آگ بجھا بیٹھا تھا۔ وہ ٹھنڈا نکلا — اس نے جھٹ پٹ اپنا محبوب بدل ڈالا۔ اتنی سی لڑکی۔ ایسی گہری رات۔ ایسی ضد۔ ایسا ڈھیڑ عشق۔

اتنا بڑا مرد۔ تو فیق عشق اور یہ اوقات۔ یہ اوقات۔

عائشہ فاطمہ پھر سے اس کے پیروں میں گرنے کو تیار تھی۔ ابھی نا سمجھ تھی سمجھ دار ہوجائے گی تو اللہ کا در ایسے جا پکڑے گی کہ لوح قلم ہلا ڈالے گی۔ ایسی استقامت۔ ایسی دلیری۔ ایسا منصب۔

عزیز جمالی کی کیا اوقات تھی۔ اسے معلوم ہوا۔ یہ بھی کہ جب اس کی پاک باز ماں کا گلا گھونٹا جارہا تھا تو اس کے ہاتھ میں شہادت آتی جارہی تھی اور اس کا باپ گناہ عظیم کا مرتکب ہورہا تھا۔

عائشہ فاطمہ کو اپنے حصے میں لکھتے وہ بھی گناہ عظیم کا مرتکب ہوا تھا۔ محبوب حقیقی پر ایسا بیوپار کرتے۔ وہ۔ وہ۔

جاڑے کی سرد رات سرد تر ہوگئی۔ عائشہ فاطمہ آنسو پونچھتی گھر کو چلی گئی' نیک نامی اور بدنامی کو پرے دھکیلتے ہوئے وہ ہر حد سے پار ہوجانے والی تھی۔ ہر کس و ناکس میں یہ کمال نہیں۔

ہر کس و ناکس کو توفیق حقیقی نہیں۔ جمالی نے جان لیا اس نے سسکاری بھری۔

"وقت تہجد ہے۔"

مولوی عبدالحکیم گھر سے مسجد بھاگے آئے وقت گزرا جاتا تھا تہجد کی نماز کا اعلان نہ ہوا تھا۔ مسجد کا بڑا پھاٹک کھلا ملا اور یکدم انہوں نے پھاٹک کی دہلیز مضبوطی سے تھام لی اور چکرا کر گرتے گرتے بچے دھند میں لپٹے ایک وجود کو انہوں نے دیوانہ وار بہت دور ایک کارواں کی طرف بھاگتے دیکھا' باطن کی آنکھ سے انہوں نے آخری بار حمزہ جمالی کو دیکھا پھر وہ دنیا داروں کو آباد کاریوں میں کبھی نظر نہ آیا۔

☆

نورِ عین

"ارے واؤ... کتنا خوب صورت ڈریس ہے۔" ماہم نے شیشے کے شوکیس میں سجے سیاہ انارکلی اسٹائل کے خوب صورت فراک کو دیکھ کر بے ساختہ کہا۔

فراک کے اوپری حصے پر گولڈن اور سلور کلر کے بڑے بڑے نگینے جڑے ہوئے تھے۔ ان نگینوں کے درمیان خالی جگہ کو موتیوں اور چھوٹے چھوٹے ڈائمنڈ کٹ اسٹونز سے اس طرح بھر اگیا تھا کہ بال برابر جگہ بھی خالی نہیں رہ گئی تھی۔ جگر جگر کرتے ہوئے فراک سے پھوٹتی سنہری اور دودھیا روشنی کی شعاعیں آنے جانے والوں کو ٹھٹک کر رکنے پر مجبور کر رہی تھیں۔ فراک کے دوپٹے اور گھیرے پر سجے جامہ وار کے گولڈن اور سلور پیچز اسے اسٹائلش بنا رہے تھے۔ فراک کی خوب صورتی میں کھوئی ماہم حقیقتاً "کسی بت کی مانند بے حس و حرکت ہو چکی تھی۔

"جلدی کرو ماہم! دیر ہو رہی ہے۔ ابھی انعم اور صنم کی شاپنگ کرنی ہے اور تمہارے لہنگے کے ساتھ میچنگ جوتا بھی تو ڈھونڈنا ہے۔ مغرب کی اذانیں ہونے والی ہیں۔ تمہارے ابو پریشان ہو رہے ہوں گے۔" فریدہ بیگم نے ماہم کو بازو سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا جو وہاں کسی مجسمے کی طرح جم کر کھڑی تھی۔

"امی... مجھے یہ ڈریس دلوا دیں! دیکھیں نا کتنا خوب صورت ہے۔ شادی کے بعد جب میں حرا کی شادی پر پھپھو کی طرف جاؤں گی تو یہی پہنوں گی اور اس کے ساتھ گولڈن اسٹونز اور موتیوں کا سیٹ جو خالہ نے گفٹ کیا ہے اور ساتھ میں ڈھیر ساری چوڑیاں اور گولڈن ٹیل والا جوتا پہن کر تو میں بالکل پرنسز لگوں گی۔" ماہم نے آنکھیں میچتے ہوئے کہا۔

"کیا ہو گیا ہے ماہم! کیوں فضول باتیں کر رہی ہو؟ تمہارے جہیز کے سارے کپڑے بن چکے ہیں اور سب ہی تمہاری پسند سے بنوائے ہیں۔ اب مزید کی گنجائش بالکل نہیں ہے اور پھر ذرا اس جوڑے کی قیمت تو دیکھو بارہ ہزار روپے۔ اتنا مہنگا سوٹ نہیں بنوا سکتی میں تمہارے لیے۔ چلو اب یہاں سے اور جلدی سے جوتا پسند کرلو' میری توبہ جو میں تمہیں آئندہ بازار لے کر آؤں' ہر مرتبہ تم میرے لیے ایک نئی مصیبت کھڑی کر دیتی ہو۔" فریدہ بیگم نے شیشے کے پار سے فراک کے ساتھ منسلک ٹیگ کو غور سے دیکھتے ہوئے قطعیت سے کہا۔

"امی! اگر آپ مجھے یہ ڈریس خرید کر نہیں دیں گی تو میں جوتا بھی نہیں لوں گی۔" ماہم کا لہجہ ہٹ دھرمی لیے ہوئے تھا۔

"ٹھیک ہے مت لو' لیکن تمہاری یہ ضد بالکل نہیں مانوں گی۔" فریدہ بیگم نے مین روڈ کی طرف جاتے ہوئے حتمی انداز سے کہا۔

☼ ☼ ☼

"ارے اتنی جلدی آ گئیں تم دونوں ماں' بیٹی۔ ہو گئی شاپنگ پوری۔" ماجد صاحب نے جو گیٹ کے پاس بنی چھوٹی سی کیاری میں لگے پودے سے ہری مرچیں توڑ رہے تھے۔ ماہم کو تیزی سے گیٹ کھول کر اندر آتے دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔ جواباً" ماہم نے انہیں آنسو بھری آنکھوں سے دیکھا اور پھر اگلے ہی لمحے تقریباً" بھاگتے ہوئے اپنے کمرے کے دروازے کے پیچھے غائب ہو گئی۔

"اسے کیا ہوا' جوتا نہیں ملا کیا۔" ماجد صاحب نے تھکے تھکے قدموں سے گھر میں داخل ہونے والی فریدہ بیگم سے استفسار کیا۔

"بتاتی ہوں' ذرا سانس تو لینے دیں۔" فریدہ بیگم نے رنگے ہوئے دوپٹوں کا شاپر تخت پر رکھتے ہوئے کہا۔

"تم سانس لیتی رہو' میں خود ہی ماہم سے پوچھ لیتا ہوں۔" ماجد صاحب تیزی سے اندر کی طرف بڑھے۔ اپنی لاڈلی کی آنکھوں میں آنسو ان سے برداشت نہیں ہو پا رہے تھے۔

"کیا ہوا بیٹا!" ماجد صاحب نے ماہم کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پیار سے پوچھا جو صوفے پر بیٹھی ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ ماجد صاحب کے التفات پر

اس کے رونے میں تیزی آگئی۔

"وہ... ابو آج مجھے بازار میں ایک بہت پیارا سوٹ پسند آگیا۔ میں نے امی سے کہا کہ مجھے وہ فراک دلوا دیں' لیکن امی نے انکار کردیا۔ ابو! میرے کپڑوں میں ایک بھی فراک نہیں ہے اور..."

"کپڑے بنواتے وقت تم نے ایسی کوئی فرمائش نہیں کی اور اب جبکہ ہمارے پاس بارہ سو کا جوڑا خریدنے کی گنجائش نہیں ہے' تم بارہ ہزار کا فراک خریدنے کی فرمائش کررہی ہو۔" فریدہ بیگم نے اسی وقت حاضر ہو کر ماہم کی بات کاٹی۔

"بارہ ہزار۔" اس بار ماجد صاحب کا لہجہ بھی تشویش لیے ہوئے تھا۔

"ماہم بیٹا! تمہیں تو پتا تو ہے کہ اب ہمارے پاس صرف شادی کے کھانے کے پیسے ہی بچے ہیں' بارہ ہزار کا سوٹ خریدنے کی ابھی تو گنجائش نہیں ہے' لیکن فکر نہ کرو' بس تھوڑا سا انتظار کرلو' میں وہ سوٹ تمہیں ضرور دلوادوں گا۔" ماجد صاحب نے ماہم کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"نہیں ابو! مجھے یہ سوٹ ابھی چاہیے۔ آپ امی کا پرس چیک کریں۔ ان کے پرس میں پندرہ ہزار روپے ابھی بھی موجود ہیں۔" ماہم نے خفگی سے ماجد صاحب کا ہاتھ جھٹکا۔

"لیکن ماہم! وہ پیسے تو انعم اور صنم کے کپڑوں اور جیولری کے لیے رکھے ہیں' وہی تو لینے گئی تھی میں' لیکن تمہاری وجہ سے خرید ہی نہیں پائی' تمہیں پتا تو ہے' پھر ان پیسوں کی بات کیوں کررہی ہو؟" فریدہ بیگم کے لہجے میں پریشانی نمایاں تھی۔

"مجھے کچھ نہیں پتا' آپ کے پاس پیسے ہیں۔ آپ بس مجھے وہ فراک خرید کردیں۔" ماہم نے ہٹ دھرمی سے کہا۔ اس کی اونچی آواز انعم اور صنم کو بھی کمرے میں کھینچ لائی۔

"لیکن ماہم... اگر تمہیں وہ سوٹ دلا دیا تو پھر یہ دونوں تمہاری شادی میں کیا پہنیں گی۔ بہن کی شادی پر نئے کپڑے بنوانا ان کا حق نہیں ہے کیا؟" فریدہ بیگم کا تھکا تھکا سا لہجہ ان کی دلی تکلیف کی چغلی کھا رہا تھا۔

"تو پورے کریں نا ان کے ارمان میں نے کب منع کیا ہے۔ لیکن مجھے وہ ڈریس دلا دیں۔" ماہم کی وہی ایک رٹ تھی۔

"لیکن بیٹا' تم خود حساب کرلو' بالکل گنجائش نہیں ہے۔" فریدہ بیگم کا ستا ہوا لہجہ ان کی پریشانی کا غماز تھا۔

"یہ میرا مسئلہ نہیں ہے امی! میں نے ساری دنیا کا ٹھیکہ نہیں لے رکھا' مجھے بس وہ ڈریس خرید کر دیں۔" ماہم نے خود غرضی کی آخری حد کو چھوا۔

"نہیں ماہم! میں یہ نہیں کرسکتی۔ اپنی ایک اولاد کی خواہش پوری کرنے کے لیے باقی کی حق تلفی کردوں۔ انعم اور صنم کے کپڑے واقعی تمہارا مسئلہ نہیں ہمارا مسئلہ ہیں۔ لیکن یہ مت بھولو کہ والدین کے مال و اسباب پر ان کی ساری اولادوں کا برابر کا حق ہوتا ہے اور جب اولاد آپس میں ایک دوسرے کے حق پر ڈاکہ ڈالنے لگے تو والدین یہ بات برداشت نہیں کرسکتے۔ سمجھو اس بات کو اور دماغ مت خراب کرو میرا۔" فریدہ بیگم نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ لیکن ماہم پر کوئی اثر نہ ہوتا دیکھ کر جیسے تھک کر بیٹھ گئیں۔

"خود غرض۔" تیزی سے کمرے سے باہر نکلتی ہوئی انعم اور صنم نے آہستگی سے کہا جسے ماہم نے بخوبی سنا۔ لیکن اسے پروا کب تھی۔

☼ ☼ ☼

"ماجد صاحب! ماہم نے رات سے بھوک ہڑتال کر رکھی ہے۔ صبح ناشتا بھی نہیں کیا اور اب کھانا بھی نہیں کھا رہی ہے۔ آخر میں کیا کروں اس کا۔" فریدہ بیگم بے انتہا پریشان تھیں۔

"میں نے بہت کوشش کی لیکن پیسوں کا انتظام نہیں ہو پارہا۔ تم ماہم سے بات کرو۔ اگر وہ مانتی ہے تو ٹھیک ہے' ورنہ میں اپنی موٹر سائیکل بیچ دیتا ہوں۔" ماجد صاحب نے دائیں ہاتھ سے اپنی پیشانی مسلی۔

"امی! آپ ماہم باجی کو ان کی پسند کا ڈریس خرید دیں' ہم دونوں بارات پر وہی کپڑے پہن لیں گے جو

اسکول کے سالانہ فنکشن پر بنائے تھے۔ بس آپ اور ابو پریشان نہ ہوں۔" دعوت ناموں پر نام لکھتی انعم اور صنم نے فریدہ بیگم کے دائیں بائیں بیٹھتے ہوئے کہا۔

"جیتی رہو بیٹا!" فریدہ بیگم نے انعم اور صنم کو کھینچ کر اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ دو آنسو ان کی آنکھوں سے نکل کر دونوں کے بالوں میں جذب ہوگئے۔ ماجد صاحب نے فخر سے اپنی دونوں بیٹیوں کی طرف دیکھا۔

☼ ☼ ☼

"دیکھو انعم! میں کیسی لگ رہی ہوں۔" ماہم نے دائیں بائیں گھومتے ہوئے کہا۔

فریدہ بیگم وہ فراک لے آئی تھیں۔ لیکن وہ ماہم کو ساتھ نہیں لے گئی تھیں۔ اب اس کی کوئی فرمائش پوری کرنا ان کے بس میں نہیں تھا۔

"اچھی لگ رہی ہیں۔" انعم نے رکھائی سے کہا۔

"پتا تھا یہ ڈریس مجھے بہت سوٹ کرے گا اور اس کے ساتھ یہ سیٹ بھی۔" ماہم نے کانوں میں موجود جھمکوں کو چھوتے ہوئے کہا۔ جن کا سنہرا پن اس کے گالوں سے جھلک رہا تھا۔ اپنی خوشی میں گم وہ انعم اور صنم کے چہرے پر ابھرتے اس دکھ کو دیکھ ہی نہیں پارہی تھی' جو اس کے اترانے پر ان کے چہروں سے عیاں تھا۔

☼ ☼ ☼

"دیکھیں ماہم! میں ایک فیملی مین ہوں۔ میرے ماں' باپ' بہن' بھائی اور اب آپ' میری زندگی ان تمام رشتوں کے بغیر نامکمل ہے' لیکن ایک بات یاد رکھیے گا۔ آپ میرے لیے کتنی بھی اہم ہوں میرے والدین کا مقام میری نظروں میں بہت بلند ہے تو پلیز کوشش کیجیے گا کہ اپنے آپ کو کبھی ان کے مقابل نہ لائیں' کیونکہ اس صورت میں میرا جھکاؤ یقیناً" میرے والدین کی طرف ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ میری بات اچھی طرح سمجھ چکی ہوں گی۔ باقی رہی میری بات تو ان شاء اللہ میں کوشش کروں گا کہ آپ کو خوش رکھ سکوں۔" گمبھیر لہجے میں دھیرے دھیرے بولتا ہوا عارب ماہم کے سجے روپ کو اپنی آنکھوں میں سمو رہا تھا۔ ماہم کے چہرے پر بکھری حیا آلود مسکان عارب کے لیے اس کی پسندیدگی کو ظاہر کررہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"ارے امی آپ! آئیے۔" ماہم نے اپنی ساس اور نند کو دیکھ کر فوراً" صوفے سے اٹھتے ہوئے کہا۔ اپنی ساس اور نند کو اپنے کمرے میں اس وقت موجود پاکر وہ حیران تھی۔ ان کا خیال تھا کہ یہ وقت خالصتا" آرام کے لیے ہوتا ہے اور اس وقت کسی کی دخل اندازی انہیں پسند نہیں تھی اور نہ ہی وہ کسی اور کے آرام میں مخل ہوتی تھیں۔ لیکن آج وہ ماہم کے کمرے میں بہ نفس نفیس موجود تھیں جو ماہم کے لیے یقیناً" اچنبھے کا باعث تھا۔

"جیتی رہو بیٹا! سدا سہاگن رہو۔" دعائیں دیتے ہوئے وہ صوفے پر بیٹھ گئیں۔

"بہت خوب صورت لگ رہی ہو۔ اس سبز انگرکھے میں۔ ماشاء اللہ چشم بددور! اپنا صدقہ یاد سے دے دینا۔" عابدہ بیگم نے ماہم کی بلائیں لیں۔ "ویسے تمہاری بری کے جوڑے بڑی عرق ریزی سے تیار کروائے تھے میں نے اور مریم نے۔ ایک سے ایک خوب صورت اور مہنگا جوڑا تھا بری میں' تمہیں اندازہ ہو ہی گیا ہوگا کہ تمہاری بری کتنی شان دار ہے۔" عابدہ بیگم کا لہجہ فخریہ تھا۔

"جی امی! بری کے سب ہی جوڑے بہت عمدہ اور نفیس ہیں۔" ماہم نے خوش دلی سے جواب دیا۔ "لیکن جناب والا ابھی آپ نے میرا فراک نہیں دیکھا۔ اس کے سامنے تو یہ سارے جوڑے پانی بھرتے نظر آئیں گے۔" اگلی بات ماہم نے فقط دل میں ہی سوچی تھی۔

"ماہم بیٹا! شادی کو کافی دن گزر گئے ہیں لیکن ابھی بھی تمہارے کمرے میں اٹیچی کیس اور بیگز بکھرے ہوئے ہیں۔ میں آج اسی لیے مریم کو لے کر آئی تھی کہ وہ تمہارے سارے کپڑے الماری میں رکھوا دے۔ ویسے بھی مریم کے کالج میں فنکشن ہے اور یہ

مجھ سے کہہ رہی تھی کہ اسے نئے کپڑے بنادوں۔ تب ہی مجھے خیال آیا کہ ابھی اس نے تم سے "چٹی کھلوائی" بھی وصول کرنی ہے۔ ارے بھئی یہ تو نند کا نیگ ہوتا ہے۔ بھابھی کے جہیز کے کپڑوں میں سے نند کو ایک جوڑا گفٹ کیا جاتا ہے۔ یہ ہمارا بڑا پرانا رواج ہے۔ تمہیں شاید پتا ہوگا۔" عابدہ بیگم نے استفسار کیا۔

"جی امی! مجھے پتا ہے۔ میری امی نے مجھے بتایا تھا۔ آؤ مریم۔" ماہم نے سوٹ کیس کا کوڈ سیٹ کرتے ہوئے کہا۔ ٹک کی ہلکی سی آواز سے سوٹ کیس کھل گیا۔

"یہ لو مریم! تم پر بہت اچھے لگے گا۔ میں نے تمہارے لیے ہی خریدا تھا۔" ماہم نے سب سے اوپر رکھا ہوا فیروزی اور گرین کلر کا اسٹائلش سا سوٹ مریم کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

"تھینک یو بھابھی! یہ بہت پیارا ہے' دیکھیں بھائی اچھا ہے نا؟" مریم خوب پرجوش تھی۔ عارب نے مسکراتے ہوئے ایک نظر سوٹ کی طرف دیکھا اور سرہلاتے ہوئے دوبارہ ٹی وی پر چلتے ہوئے میچ کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"چلو مریم! اب بھابھی کے ساتھ مل کر اس کے سارے کپڑے الماری میں سیٹ کردو۔" عابدہ بیگم نے مسکراتے ہوئے ہدایت جاری کی۔

"لائیں بھابھی! آپ مجھے کپڑے پکڑاتی جائیں' میں الماری میں رکھتی جاتی ہوں۔" مریم نے الماری کا پٹ وا کرتے ہوئے کہا۔

جیسے جیسے ماہم کپڑے نکال رہی تھی ویسے ویسے مریم کے منہ سے ادا ہونے والے "واؤ۔ بیوٹی فل اور امیزنگ" جیسے الفاظ ماہم کے لیے فخر و انبساط کا باعث بن رہے تھے۔

"مائنڈ بلوئنگ بھابھی! واٹ آ ماسٹر پیس۔" ماہم کے سیاہ فراک کو دیکھ کر مریم بے ساختہ بول اٹھی۔

"بھابھی! آپ کا یہ سوٹ سب سے زیادہ پیارا ہے۔ امی! مجھے بھی ایسا ہی سوٹ چاہیے کالج کی پارٹی پر میں ایسا ہی سوٹ پہنوں گی۔ بھابھی! آپ نے یہ کہاں سے خریدا تھا۔" مریم کا لہجہ پُرشوق تھا۔

"وہ انار کلی میں سے۔"

"مریم! اگر تمہیں یہ والا سوٹ پسند ہے تو تم یہ لے لو۔ ویسے بھی چٹی کھلوائی کا سوٹ تو نند کی اپنی مرضی اور پسند کا ہی ہوتا ہے۔ کیوں عارب! میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔" ماہم کی پوری بات سنے بغیر ہی عابدہ بیگم نے حکم جاری کرتے ہوئے عارب سے تائید چاہی جو میچ کو چھوڑ کر ان کی طرف متوجہ ہوچکا تھا۔

"جی امی! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ ویسے بھی ماہم کے پاس تو ڈھیر سارے کپڑے ہیں۔ لڑکیوں کو شادی کا یہ ہی فائدہ تو ہوتا ہے۔ مریم یہ لے لے۔ مجھے نہیں لگتا کہ ماہم کو کوئی اعتراض ہوگا۔" عارب کا لہجہ انتہائی پریقین تھا۔

"جج۔۔۔۔ جی۔۔۔۔ اگر مریم کو یہ ڈریس پسند ہے تو وہ یہ لے لے۔ مجھے تو کوئی اعتراض نہیں۔" حیرت اور شدید غم کی ملی جلی کیفیت میں گھری ماہم نے بدقت خود کو سنبھالا۔ کیونکہ عارب کی نظروں میں گرنا اسے منظور نہ تھا۔

"تھینک یو سو مچ بھابھی!" خوشی کی شدت سے مریم' ماہم کے گلے جا لگی۔

"چلیں امی! مجھے یہ ڈریس فضا کو دکھانا ہے۔" فضا مریم کی کلاس فیلو تھی اور پڑوس میں ہی رہتی تھی۔ مریم نے عابدہ بیگم کو بازو سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا۔ عارب دوبارہ سے میچ دیکھنے میں منہمک ہوچکا تھا۔ دل پر چلتے ہوئے آرے اور بے بسی کے شدید احساس سے ماہم کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ جسے اس نے رخ موڑ کر چھپایا۔

"خود غرض۔۔۔۔"

مریم کے کمرے سے باہر جاتے ہی ماہم ہولے سے بڑبڑائی' لیکن اپنی آواز کی بازگشت اسے شرمندہ کرگئی۔ آج اسے اپنی بہنوں کا کرب بہت اچھی طرح محسوس ہوا تھا۔

☆

وجیہہ احمد

کمہاری کا گھر

"بہت برے ہو تم۔۔۔ بہت برے۔۔۔ بہت برے۔ کاش! تم ایسے نہ ہوتے۔ تم ویسے ہوتے جیسے سب ہوتے ہیں۔"

وہ دوپٹے میں منہ چھپائے روئے جا رہی تھی۔ دکھ ہی ایسا ملا تھا۔ زخم بھی گہرا تھا اور وار بھی کاری تھا اور جب مسیحا ہی زخم دے تو شکوہ کس سے کرتا۔ اپنے درد کو دباتے ہوئے ایک دم ہی اس نے خدا کو دل کی گہرائیوں سے پکارا۔

"یا اللہ! وہ اتنا برا کیوں نکلا؟" مگر کسی کا اچھا برا ہونا کس کے اختیار میں ہوتا ہے بھلا۔ وہ جو آسمانوں کی بلندیوں پر بیٹھا ہے' وہ جو چاہتا ہے جیسا چاہتا ہے بس وہ کر دیتا ہے۔

اے اللہ! تو وہ کر دے جو میں چاہتی ہوں۔ جب میں اپنا گھر توڑنا نہیں چاہتی تو وہ کیوں چاہتا ہے؟ تو اپنے کرداروں میں رد و بدل کر دے۔ میرے مالک! میرا کردار ایسا کر دے جیسا میں چاہتی ہوں اور میں یہ بھی جانتی ہوں محض میرے چاہنے سے کچھ نہیں ہو گا۔ ہو گا تو وہی جو تو چاہتا ہے۔"

اس کا ذہن مختلف حصوں میں بٹ گیا۔ ایک خیال آتا اور ایک جاتا۔ وہ دوپٹے میں منہ دیے روتی رہی۔ بے بی کاٹ میں پڑے نصیب نے بھی اپنی ماں کی بدنصیبی پر بین کرنے شروع کر دیے تھے۔ کھڑکی سے جھانکا

ناولٹ

چاند خاموشی کی ردا اوڑھے کمرے کی کھڑکی سے نظر آتا رہا۔

☆ ☆ ☆

اس کی بڑی بڑی بھوری آنکھوں میں حیرت چمکتی پر تھی۔ آج تو سب کچھ میچنگ کا تھا۔ پونی ٹیل اسکرٹ، ٹاپ۔ گورے گورے ہاتھوں میں کانچ کی چوڑیاں اور گلابی پیروں میں براؤن اسٹرپ۔ اس کی حیرت کی وجہ قطاروں میں بنے کمروں میں سب سے آخری کمرے کی کھڑکی کی چوکھٹ کے کنارے پر بنا چکنی مٹی کا ہلکی سی چھتری نما شکل کا ایک گھر تھا جو کہ حجم میں بھی کافی کم تھا۔ نازک انگلی کے پورے وہ جتنی بار اسے چھوتی حیرت کے سمندر میں ڈوب ڈوب جاتی۔۔۔

چھت پر کھیل تماشوں میں مگن ہمدان کی تیز اور شرارتی نگاہوں نے اس کے انہماک کو ہر ہر زاویے سے جانچا تھا۔ صحن چھت سے با آسانی دکھائی دیتا تھا۔ بقایا شریروں کو اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا۔ اسی اثنا میں اس گھر کی سب سے بزرگ خاتون کسی کام سے وہاں آئیں اور وہ تیزی سے

”دادی۔۔۔ دادی۔“ کہتی ان کی جانب بڑھی اور دامن پکڑ کر ان کو وہاں لے آئی۔

”کیا ہوا بیٹا موئے کہاں کھینچے لے جاوے ہے تو۔“

”دادی ہاں! وہ کیا ہے کھڑکی پر وہاں۔۔۔“

اس نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا۔ دادی نے اپنے موٹے شیشوں والے چشمے کو دوپٹے کے پلو سے صاف کر کے اس پہ نگاہ جمائی۔

”اے ہے لونڈیا! باولی! باولی ہوئی جاوے ہے۔“ وہ دوپٹے کو منہ پر رکھ کر ہنسنے لگیں وہ کچھ شرمندہ ہونے پر بولی۔

”بتائیں نا دادی! کیا ہے یہ؟“

”کمہاری کا گھر ہے یہ۔۔۔“

”کم۔۔۔ہاری۔۔۔ یہ کون ہوتی ہے دادی اماں؟“

”اری پگلی! یہ ایک کیڑا ہے جو چکنی مٹی کے بھوروں (ذروں) سے اپنے قد سے کئی گناہ بڑا گھر بناتی ہے۔ انڈے بچے دیتی ہے، تھوڑی گرہستن ہوتی ہے عورتوں کی طرح۔“

اس کے کچھ پلے نہ پڑا۔ دادی وضو کرنے چلی گئیں۔ اس نے ایک بار پھر گھر کو چھوا اور دل میں تہیہ کر لیا کہ میں بھی گھر بناؤں گی اور تب ہی ہمدان نے پیچھے سے آ کر اس کی پونی کھینچی۔ پونی ٹیل میں بندھے بال شانوں بکھر گئے۔ مگر ہمدان کی اس حرکت کی اسے مطلق پروا نہیں تھی۔ بلکہ وہ خوشی خوشی ہمدان کو بتانے لگی۔

”ہمدان! یہ دیکھو! کمہاری کا گھر۔“

اور وہ زمانے بھر کی شرارتیں آنکھوں میں سمو کر اس کے برابر میں آ کھڑا ہوا۔

”فنٹاسٹک!“

”ہمدی! میں بھی اپنا گھر بناؤں گی۔“

”او گڈ آئیڈیا!“

ہمدان کی آواز کے اتار چڑھاؤ سے وہ اس کی شرارت محسوس نہیں کر پائی۔

”میں ماما کو بلا کر لاتی ہوں۔“

وہ ہمدی کا جواب سنے بغیر کمرے کی قطاروں کو عبور کرتی مرکزی بیٹھک میں پہنچی اور فاخرہ کو کھینچتی جب کمہاری کے گھر تک لائی تو حیران رہ گئی۔۔۔ وہاں اب ۔۔۔ کمہاری کا گھر تھا نہ ہمدان کا۔

ریت کے ذروں سے بنے گھر کی دیواریں ڈھا دی گئی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے مٹی کے رنگ کے کیڑے بین کرتے چوکھٹ کی افقی سطح پر چڑھے جا رہے تھے اور اس کی بھوری موٹی موٹی آنکھوں میں موٹے موٹے نمکین شفاف موتی تھے۔ براؤن رنگ کی پونی اس کے پیروں میں پڑی تھی۔

کمہاری کا گھر ٹوٹ چکا تھا۔۔۔

☆ ☆ ☆

”اپنا سامان پیک کر لو۔ جو دل چاہے لے جاؤ۔ کل صبح تمہارے گھر چھوڑ آؤں گا۔“

کتنا سرد لہجہ تھا حسنین کا۔ اتنا سرد جیسے دسمبر اور

جنوری کی ساری ٹھنڈ اس کے لفظوں میں رکھ دی گئی ہو۔ اس کے ماتھے کے بلوں میں بھی اتنی کرختگی تھی کہ وہ ایک نگاہ ڈال کر رہ گئی تھی پھر بھی ہمت کر کے اس کے روبرو لرزتی پلکوں اور لرزتے ہونٹوں پہ التجا تھی۔

”میں۔۔۔ میں یہیں رہنا چاہتی ہوں حسنین۔۔۔“

اور وہ کڑکتے لہجے میں اس کے لفظوں کو کاٹ کر بولا تھا۔ ”اور میں تمہیں یہاں رکھنا نہیں چاہتا۔“

”میں آپ سے بہت محبت کرتی ہوں حسنین! میں نہیں رہ پاؤں گی آپ کے بغیر۔“ وہ ذرا نزدیک ہو کر منمنائی تھی، پر اس پر ذرا بھی اثر نہ ہوا۔

”محبت کرتیں تو رات کی تاریکی میں اپنا منہ کالا کر کے نہ آتیں۔“

”بہتان ہے، جھوٹ ہے۔ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا جو آپ سمجھ رہے ہیں۔“

”اور جو میں نے دیکھا۔۔۔ میں اب اس گندگی کی پوٹ کو مزید اپنے گھر میں اپنی زندگی میں تعفن پھیلانے کے لیے نہیں رکھ سکتا۔“

اس کا انداز دو ٹوک تھا۔ وہ حیران پریشان اسے تک رہی تھی۔ شادی کے ابتدائی دنوں میں ایک دن حسنین نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا تھا۔ ”تم میری زندگی کو مہکانے کے لیے آئی ہو۔ ایسے ہی مہکاتی رہنا۔“

”اور اب میں تعفن پھیلانے لگی۔“ اس نے سوچا۔

”میں کورٹ کے ذریعے تمہیں طلاق بھیج دوں گا۔ نصیب کا خرچا اور حق مہر کی رقم بھی تمہیں مل جائے گی۔“

حسنین نے بیڈ کی سائیڈ دراز کھولی اور براؤن رنگ کے لفافے سے لگ بھگ درجن بھر فوٹو گرافس نکال کر اس کے منہ پر دے ماریں۔ اس نے ایک دم آنکھیں بند کر کے ان سے بچنے کی غیر شعوری سعی کی تھی۔ تصاویر اس کے پیروں میں بکھر گئیں۔ اس نے ایک تصویر اٹھا کر دھندلائی نگاہوں سے دیکھی۔ کون تھا ان تصویروں میں۔ ایک وہ اور ایک اس کا جانی دشمن۔

ابھی تو اس نے حسنین کے سامنے خود کو ناکردہ گناہوں سے نکالنے کی سعی کی تھی اور اب یہ دوسرا تماشا شروع ہو گیا تھا اور حسنین سوچ رہا تھا کیا نہیں ہے ان تصویروں میں بے حیائی، بے وفائی، حسنین کے اعتماد کا خون۔

وہ پاگلوں کی طرح ایک ایک تصویر کو اٹھا کر دیکھتی اور پھینکتی۔ مختلف لباسوں والے جسم پر ایک چہرہ سجا تھا۔ اس عورت کے چہرے کو حسنین نے بے تحاشا چاہا تھا۔ دنیا کی ہر نعمت دی۔ وہ سائیں بنا۔ اسے سائبان دیا۔۔۔

”حس۔۔۔ نین۔۔۔ یہ جھوٹ۔۔۔ بکواس ہے یہ اس شاطر کا پھیلایا ہوا جال ہے۔ آپ۔۔۔ لن

تصویروں پر یقین کر بیٹھے ۔۔۔ یہ تو کسی بھی فوٹو شاپ کا

"شٹ اپ جسٹ شٹ اپ! یہ سب جھوٹ ہے تو اس رات جو میری نگاہوں نے تمہیں اس کی بانہوں میں دیکھا وہ کیا تھا؟"

"حسنین! بعض دفعہ ہم جو دیکھتے ہیں یا دکھائی دیتا ہے ویسا نہیں ہوتا۔ آپ مجھے صفائی کا موقع دیں۔"

"اپنی بچھے وار باتیں بند کرو۔ میں نے جو اپنی آنکھوں سے دیکھا وہ جھوٹ نہیں ہو سکتا اور تمہارے سیل کی ریکارڈنگ جو میں نے سنی وہ بھی جھوٹ نہیں ہو سکتی اور یہ فحش تصویریں ۔۔۔ جس کی بانہوں میں بانہیں ڈالے کھڑی ہو شادی بھی اس سے رچا لیتی تھی۔ میری زندگی میں آگ لگانے کیوں آئی تھیں تم ۔۔۔ کیوں ۔۔۔ دل تو چاہتا ہے تین لفظ بولوں اور فارغ کر دوں تمہیں ۔۔۔ پر یہ سارے ثبوت دکھاؤں گا اپنے والدین کو اور تمہارے چہیتے ننھیال کو جو تمہاری حمایت میں سب سے آگے ہیں۔" اسے لگا اب وہ کبھی اٹھ ہی نہ سکے گی۔

اس نے آخری کوشش کی اور حسنین کے پیروں کو تھام کر رونے لگی۔

"آپ کو نصیب کا واسطہ! مجھے رسوا مت کیجئے گا۔ اس جھوٹ کو میرے سر کا تاج مت بنائیں۔ میں کس کس کو وضاحتیں دوں گی۔"

وہ ایک جھٹکے سے پیر چھڑاتا باہر نکل گیا تھا۔ کمرے کی ہر ہر چیز سہمی ہوئی تھی۔

☆ ☆ ☆

آج وہ پھر ہمدان کے ننھیال آئی تھی۔

آمنہ کی لاڈلی تھی۔ سو جب بھی آمنہ میکے جاتیں اسے بھی اکثر ساتھ لے جاتیں۔

ساون کا مہینہ تھا۔ گھر کے پچھواڑے کافی وسیع صحن تھا۔ جہاں کئی موسمی پھلوں کے پیڑ پودے تھے۔ رات کی رانی بھی۔ اور وہ فطرت کی دلدادہ تھی۔ آتے ہی صحن کی طرف نکل جاتی۔ پھولوں سے باتیں کرتی ۔ رنگ برنگے پھولوں کو توڑتی اور پونی میں اڑس لیتی۔ تتلیوں کے پیچھے بھاگتی۔ چھوٹے تنے کے درختوں پر جا چڑھتی۔ بارش کے دنوں میں ٹڈیاں پکڑتی۔ گھر کے سب بچے اس کی آمد سے بہت خوش ہوتے۔ موسم نے سرمئی آنچل۔ اوڑھا اور گڑ گڑ بادل گرجے تو بچیاں بھاگم بھاگ تایا جان کو بلا لائیں۔ جو ہمدان کے سب سے بڑے ماموں تھے اور بچوں کے کاکا جان تھے۔ بچوں نے کاکا جان کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ اور کورس میں فرمائش کرنے لگیں۔

"کاکا جانی! جھولا ڈال کے دیں آم کے درخت پہ پلیز"

کاکا جانی فوراً" اسٹور سے رسیوں کا تھیلا نکال لائے۔ موٹے رسے سے درخت میں جھولا ڈالا اور بیٹھنے کے لیے ایک لکڑی کا تختہ پھنسا دیا۔ باری باری ساری بچیاں جھولے میں بیٹھنے لگیں۔ شرارتی لڑکوں کا ٹولہ گلی میں کرکٹ کھیلنے میں مشغول تھا۔ جلد ہی کسی مخبر نے انہیں خبر دے دی کہ درخت میں جھولا ڈالا گیا ہے۔ سب نے صحن میں دھاوا بول دیا۔

اور جب جھولے میں بیٹھنے کی اس کی باری آئی تو وہ سب اس کے سر پر پہنچ چکے تھے۔ سارے لڑکوں نے جھولے کے رسے کو پوری طاقت سے پیچھے کی جانب کھینچ کر اچانک چھوڑ دیا۔ وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ پائی دھڑام سے کیاری میں جا گری۔ جہاں بارش نے کیچڑ کی دلدل بنا رکھی تھی۔ اور جب گارے میں تر بتر روتی دھوتی ۔۔۔ وہ کیچڑ سے برآمد ہوئی تو سب سے زیادہ ہنسنے والا ہمدان تھا۔

"بھوتنی بھوتنی" وہ اسے چڑا رہا تھا۔ تب ہی کاکا جانی بچوں کا شور و غل سن کر وہاں آگئے اور سارے بچوں کو ڈانٹا۔

"اسے کسی نے بھی کچھ کہا تو میں سب کو سزا دوں گا۔"

"کیوں ماموں! اسے کچھ کہنا گناہ ہے کیا؟" یہ آواز ہمدان کی تھی اور وہ کاکا جانی کے گویا ہونے سے پہلے ہی پھر بول پڑا تھا۔

"ہاں میری ماما کہتی ہیں یتیم ہے بے چاری!"

اور سب نے اسے ہمدردی سے دیکھا تھا۔ کاکا جانی نے تنبیہی نگاہیں ہمدان پر ڈال کر اسے دیکھا تو اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تھے۔ یہ اس کی سات سالہ زندگی میں ہمدان کا دیا گیا دوسرا دکھ تھا۔

☆ ☆ ☆

آج اس کی آخری رات تھی اس گھر میں۔ اس نے کمرے کی ہر ہر چیز کو چھو کر دیکھا تھا۔ کتنے ارمانوں سے اس نے ایک ایک چیز خریدی تھی۔ کلر اسکیم سے لے کر وال ہینگنگ تک۔ حسنین نے اس کی پسند کو اولین ترجیح دی تھی اور اب کتنی آسانی سے اسے نکال کر پھینک رہا تھا اپنی زندگی سے۔ اپنے گھر سے۔ الماری میں ہینگ ہوئے حسنین کے کپڑوں سے لپٹ لپٹ کر روئی تھی وہ۔ "حسنین! میں کیسے رہوں گی آپ کے بن۔ اس خوشبو کے بغیر۔" اس نے کپڑوں میں بسی اس کے جسم کی مہک کو اپنے روح کی گہرائیوں میں اتارا تھا۔ پھر اس نے ہینگر سے اتار کر اس کی ایک شرٹ کی چھوٹی سے چھوٹی تہہ بنا کر اپنے ہینڈ بیگ میں رکھ لی۔ وہ مزید کیا رکھتی۔ اس کا لایا ہوا تو کچھ بھی نہیں تھا۔ سب کچھ حسنین کی عطائیں تھیں۔ وہ خالی ہاتھ آئی تھی۔ جاتے ہوئے اس کے کاندھے سے لگ کر گہری نیند سونا نصیب تھا اور بیگ میں حسنین کی گرے شرٹ تھی۔

☆ ☆ ☆

اس کی امی اپنے میکے میں رک گئی تھیں تو اسے بھی رکنا پڑا۔ رات بھر بارش برسی تھی۔ موسم کے پکوان تیار ہوئے تھے۔ ہمدان کی مامیوں نے صحن میں کڑاہی رکھی تھی۔ اس بھوری بھوری آنکھوں والی بچی کو سب کچھ بہت پرکشش لگا۔ ابھی ابھی ہمدان کی نانی نے اسے اپنے ہاتھوں سے نرم نرم پوری کے نوالے کھلائے تھے اور کاکا جانی نے آفس جانے سے پہلے ہمدان اور اسے پچاس پچاس روپے دیے تھے۔ ناشتے سے فارغ ہو کر اس نے صحن کی راہ لی تھی۔

رات بھر کی بارش سے ہر چیز نکھری نکھری تھی۔ رات کو جھولے سے گر جانے کے باوجود پھر جھولے پر چڑھی بیٹھی تھی۔ فوزی نے ایک کیری اس کے حوالے کی۔ وہ ہلکے ہلکے جھوٹے لیتی کیری کھاتی اور کھٹاس سے اپنی بھوری بھوری آنکھوں کو بند کر لیتی۔

کیاریوں کے اطراف میں چھت اور دیواروں سے بہہ کر آنے والی چکنی مٹی کا ڈھیر لگا تھا اور دھوپ کے نکلنے سے مٹی تھوڑی سخت بھی دکھائی دے رہی تھی۔

جب ہی ستارہ نے آئیڈیا دیا کہ اس مٹی سے برتن بناتے ہیں۔ روزی ایک مگ میں پانی بھر لائی۔ مٹی کو اکٹھا کر کے وہ لڑکیاں مٹی کو اس حالت میں لے آئیں کہ اس کو شکل دے کر برتنوں میں ڈھالا جا سکے۔ پھر سب بچیوں نے اپنی اپنی پسند کے برتن بنا لیے اور کیاریوں کی منڈیروں پر سوکھنے کے لیے رکھ دیے۔ سب سے منفرد جو چیز تھی وہ اس کا بغیر چھت کا بنایا ہوا گھر تھا اور جب ستارہ کے بھیا نے اس کا بغیر چھت کا گھر دیکھا تھا تو اپنی ذہنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ایک نرم شاخ سے لکڑی توڑ کر دیواروں میں ایسے پھنسائی تھی کہ گھر پر چھتری سی بن گئی۔ اب اس کا گھر مکمل ہو گیا تھا۔ پھر ستارہ کے بھیا نے جھاڑو کی تیلی کے پچھلے سرے سے اس پہ کندہ کیا۔

"پروا کا گھر"

☆ ☆ ☆

حسنین نے گاڑی اس کے گھر کے گیٹ پر لے جا کر روکی اور ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھول کر کہا۔ "اترو۔"

"مجھے ایک موقع صفائی کا دیا جانا چاہیے حسنین!"

وہ گاڑی سے اتر کر پلٹ کر بولی تھی۔ وہ گاڑی اڑا ۔۔۔ لے گیا بغیر کوئی جواب دیے۔ اس نے دھندلائی آنکھوں سے غبار اڑاتی گاڑی کو دیکھا۔ فضا میں گرد تھی اور اس کے اندر غبار تھا۔ سمندر کا غبار جو آنکھوں سے جگہ بناتا چہرے پر پھیل رہا تھا۔ اس نے مردہ ہاتھوں سے لوہے کے مضبوط گیٹ کو دھکیلا۔

"بڑے ماموں کچھ دیر پہلے ہی آفس کے لیے نکلے ہوں گے۔" اس نے سوچتے ہوئے پہلا قدم گھر کی دہلیز پر رکھا۔ "سب کے سب سوئے پڑے ہوں گے میں سیدھی ماما کے کمرے میں جاؤں گی وہ تسبیحات میں مشغول ہوں گی۔"

بے خیالی میں چل رہی تھی۔ اسی لمحے گھر کا مرکزی دروازہ کھلا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس کا جانی دشمن اس کے روبرو آن رکا۔ وہ ٹریکنگ سوٹ میں تھا۔ اس نے زمانے بھر کی نفرت لہجے میں سمو کر کچھ کہنے کو ہونٹ وا ہی کیے تھے کہ وہ زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولا۔

"وارم ویلکم ٹو کم بیک۔"

"تم بہت برے ہو۔ بہت برے۔ کاش! تم اتنے برے نہ ہوتے۔" اس نے دکھ سے کہا تو وہ بھی دوبدو بولا تھا۔

"تم بھی بہت بری ہو۔ بہت بری۔ کاش! تم اتنی بری نہ ہوتیں تو آج میری ہوتیں۔"

اس کے لہجے کی آگ سے وہ وہیں کھڑے کھڑے بھسم ہو گئی تھی اور وہ اسے اسی مقام پر چھوڑ کر چلا گیا۔ فضا میں زردیاں گھلی تھیں یا اس کے اندر خزاں کا موسم اترا تھا۔ ہر منظر دھواں دھواں تھا۔

☼ ☼ ☼

رات کو کاکا جانی آئے تو ساری بچیوں نے اپنے اپنے برتن دکھا کر انعام میں پیسے بٹورے تھے اور وہ آنکھوں میں جھجک لیے سب سے آخر میں اپنا گھر دکھانے لائی تھی۔

"کاکا جانی! یہ میں نے بنایا تھا۔"

"بہت خوب۔" ان کی آنکھوں میں ستائش تھی۔ جب ہی ستارہ کاکا جانی کے برابر آکر بولی۔

"چھت بھیا نے بنا کر دی ہے پروا کو۔"

کاکا جانی نے مسکراتے ہوئے اس کے ماتھے پر بوسہ دیا تھا اور سو کا نوٹ نکال کر اسے تھمایا۔

"بہت سلیقے سے گھر بنایا ہے پروا نے۔"

کاکا جانی کی تعریف نے اسے آسمانوں کی وسعتوں میں اڑا دیا تھا۔ اس رات وہ خوشی خوشی سوئی تھی۔ صبح بہت روشن تھی۔ اس نے آنکھ کھلتے ہی اس کمرے کی راہ لی، جہاں سب بچیوں نے کھلونے رکھے تھے۔ سب کچھ تھا۔ نہیں تھا تو بس اس کا گھر نہیں تھا اور وہ پاگلوں کی طرح ہر ہر بچے سے پوچھ رہی تھی۔

ستارہ نے اسے بتایا کہ وہ گھر تو ہمدان لے گیا تھا جب وہ سو گئی تھی اور — اس نے گلی کی راہ لی کہ وہ وہیں ہو گا شرارتوں میں مصروف۔ اور جب اس نے گلی میں پہلا قدم رکھا تو دیکھا۔ سامنے ہی اس کا گھر ٹوٹا پڑا تھا۔ اس نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر مٹی کے ٹھیکروں کو جمع کیا۔ گھر کی دیوار اس کے ہاتھ میں تھی۔ جس پر لکھا "پروا کا گھر" اس کی بھوری معلی آنکھوں میں ڈھیر سارے آنسو لے آیا تھا۔ اس کا گھر کئی حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا اور تقسیم کرنے والا ہمدان تھا۔ یہ ہمدان کا دیا گیا تیسرا بڑا دکھ تھا۔

☼ ☼ ☼

"ماما جانی! انہوں نے مجھے چھوڑ دیا۔ میں نے ان کے پیر بھی پکڑے مگر وہ نہیں مانے۔" وہ فاخرہ کے سینے میں چھپی سسکیوں سے روئے جا رہی تھی۔ فاخرہ — ڈپٹتے ہوئے بولیں۔

"پروا! پاگل مت بنو خاموش ہو جاؤ۔ بچہ بھی پریشان ہو رہا ہے۔"

"نہیں ہو سکتی میں خاموش۔ میرا گھر روئی کے گالوں کی طرح ہوا میں بکھرنے کو تیار ہے۔ آپ کہتی ہیں میں چپ ہو جاؤں... آپ کو اندازہ نہیں میں کتنی اذیت میں ہوں۔ اس شخص کے الزاموں نے میرے جسم کو ہر جوڑ سے توڑا ہے اور آپ کہتی ہیں میں خاموش......"

اس کی آواز آنسوؤں میں مدغم ہوئی تو وہ فقرہ مکمل نہ کر پائی۔ فاخرہ نے دونوں کاندھوں سے تھام کر اپنے دوپٹے کے پلو سے اس کے آنسو پونچھے۔

"میاں بیوی میں جھگڑے ہو جاتے ہیں۔ میں آج

فاروق بھائی سے بات کروں گی۔ حسنین کے پاس جائیں گے، سمجھائیں گے اسے۔ تم تسلی رکھو کچھ نہیں ہوگا اور جب ماں ہے تمہارے حصے کے بھی دکھ اٹھانے کے لیے، تو پھر تمہیں کیا ضرورت ہے پریشان ہونے کی۔"

وہ فاخرہ سے علیحدہ ہو کر تکیے میں منہ دے کر لیٹ گئی۔ "ماما! میں آپ کو کیسے بتاؤں کہ ان الزامات کی نوعیت کیا ہے۔" وہ اندر ہی اندر ڈھے گئی۔ فاخرہ روتے ہوئے نصیب کو کاندھے سے لگا کر صحن کی جانب چل دیں۔

☆ ☆ ☆

اور دیکھتے ہی دیکھتے بچپن، لڑکپن اور پھر جوانی میں ڈھل گیا۔ سب کچھ ویسا ہی تھا۔ وہی ہمدان کی نانی کا صحن۔ کاکا جانی کی بے لوث چاہت، ستارہ کی محبت اور اس کے بھیا کے لہجے کی نرماہٹ، ہمدان کی چاروں ماموں کا دوستانہ رویہ۔ معیز اور عمیر کے نکلتے قد اور اسکرٹ اور فراک سے دوپٹے کے احاطے میں آجانے والی پروا۔

ہمدان کی اذیت ناک شرارتیں اور پروا کو ستائے جانے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہ جانے دینے والی جنونی عادت پروا کا بے انتہا حسن۔ اس کے گلابی پاؤں مزید شفاف ہو گئے تھے۔ اس کی بھوری بھوری معصوم آنکھوں میں ویسے ہی معصوم خواب تھے۔ اس نے باپ کو نہیں دیکھا تھا مگر کئی شفیق چہرے باپ جیسے تھے۔ فاروق ماموں، عمر ماموں، کاکا جانی، رفیق ماموں، شہزاد ماموں، گلزار ماموں ڈھیر سارے ہمدان کے ننھیالی کزنز سب ہی تو اس کے دوست تھے۔ سب اچھے اور اس سے محبت کرتے تھے۔ ایک بس وہی تھا جو اسے رلاتا اور ستاتا تھا۔ ہمدان نے دو سال گیپ دے کر اس کے ساتھ یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے لیا تھا۔ اسے اکثر و بیشتر جان بوجھ کر چھوڑ کر یونیورسٹی چلا جاتا اور اکثر اسے یونیورسٹی چھوڑ کر گھر آجاتا۔ وہ پوائنٹس میں اسے کوستی گھر پہنچتی اور فاروق ماموں

سے شکایتوں کے ڈھیر لگا دیتی اور جب اس کو سخت سست سننے کو ملتیں تو وہ کہیں نہ کہیں اس سے بدلہ نکال لیتا۔

پروا نے ہر ہر رشتے سے محبتیں سمیٹی تھیں۔ فاخرہ بیوگی کی چادر اوڑھے بہت جلد چھ ماہ کی بچی کو گود میں لیے بھائیوں کے در پر آبیٹھی تھیں۔ سب کی کوششوں کے بعد بھی وہ گھر بسانے کے لیے دوبارہ رضامند نہ ہو پائیں۔ پروا کو ننھیال میں بے تحاشا چاہتیں ملی تھیں۔ فاروق کے ہاں ہمدان کے بعد کوئی اور اولاد نہ ہو پائی تھی۔ ہمدان کی ماں نے نہ صرف خود اسے بیٹیوں جیسا پیار دیا بلکہ اپنے میکے سے بھی اسے محبتیں دلائیں۔ آمنہ چار بھائیوں کی اکلوتی بہن تھیں۔ سو پروا کو ان کی بیٹی سمجھ کر بہت پیار دیا گیا تھا اور دوسری اہم بات اس کی بھولی صورت اور خوب صورتی سعادت مندی نے سب کے دل گرویدہ کر رکھے تھے۔ اسے ہمدان کے سارے کزنز میں سب سے زیادہ انسیت ستارہ سے تھی۔ سب سے بڑھ کر کاکا جانی کا نرم اور پُر شفیق رویہ۔

☆ ☆ ☆

"ہمدان!" اس نے ٹیرس سے نیچے بیٹھے ہمدان کو آواز لگائی تھی۔ مگر ہمدان کو آواز آتی تو کوئی جواب دیتا وہ تو ہینڈ فری لگائے اپنی گرل فرینڈ سے باتوں میں مشغول تھا۔ پروا کی طرف اس کی پشت تھی۔

"اف یہ اتنا بہرہ کیوں بن رہا ہے۔"

اس نے اضطرابی کیفیت میں اسے پھر آواز دی۔ پھر اسے غور کرنے پر اندازہ ہوا کہ وہ ہینڈز فری لگائے ہوئے ہے۔ پروا نیچے آئی اور آہستگی سے اس کے پیچھے آکر ایک کان سے ہینڈ فری نکال کر اپنے کان میں لگالی۔ دوسری جانب ترنم بھری آواز اپنا جادو جگا رہی تھی۔

"او ہمدی! تم اپنے گروپ کے سب سے ہینڈسم لڑکے ہو۔"

اس نے بس یہی سنا تھا کہ ہمدان نے ہینڈ فری جھپٹ کر اسے گھورا اور پھر جلدی سے اس لڑکی کو خدا

حافظ کہہ کر اس پر غرایا۔

"کیا بدتمیزی تھی یہ؟"

"یہ بدتمیزی ہے تو وہ کیا تھا جو میں اتنی دیر سے تمہیں آوازیں دے رہی تھی اور تم بہرے بن کر بیٹھے تھے۔"

"کوئی کام ہوگا یقیناً"۔

"تمہارے بھی بہت کیے ہیں۔" وہ فوراً بولی۔ "کوئی پرسنل کام کرو تو بندہ احسان بھی مانے۔"

"کیا کام ہے ایسا؟"

"ماہ جبین کے ساتھ ڈیٹ مارنی ہے۔"

"تو مارو، روکا کس نے ہے؟" وہ برجستہ بولی تو وہ اسے گھورنے لگا۔

"تم کبھی کام مت آنا۔"

"تو اس میں میرا کیا کام؟" وہ ابرو چڑھا کر بولی۔

"وہ اکیلے میں ڈرتی ہے۔"

"ڈرنا بھی چاہیے۔" پھر جواب حاضر۔

"پروا..." وہ دھاڑا تھا۔

"اچھا بولو بابا!"

"تم میرے ساتھ چلو گی تو وہ آنے پر راضی ہو جائے گی۔"

"میں فضول کباب میں ہڈی بنوں؟"

"اس کا مطلب ہے تم نہیں چل رہیں؟"

"میں نے یہ کب کہا؟" اس نے ڈرتے ہوئے کہا اگر میں نے منع کر دیا تو ستارہ کے گھر لے کر نہیں جائے گا یہ جنگلی۔

"مطلب راضی ہو؟" اس نے لاجواب کیا۔

"جانا کہاں ہے۔"

"آئس کریم پارلر۔"

"تم نے بھی ایک کام کرنا ہوگا۔"

"اپنے مطلب پہلے نکال لو تم۔ خیر بولو؟"

"مجھے ستارہ کے پاس جانا ہے۔"

"ٹھیک ہے تم بکس لے لینا پہلے۔ پھر واپسی میں پارلر چلیں گے۔"

"فون پر کون تھی؟"

"سینئر گروپ کی تھی شارقہ۔"

"اف!" وہ اسے وہیں چھوڑ تیار ہونے چل دی۔

☆ ☆ ☆

فاخرہ کے سارے گھر والے اس کے ارد گرد تھے۔ فاروق اور آمنہ کسی گہری سوچ میں سر جھکائے بیٹھے تھے۔

"کوئی وجہ تو بتائی ہوگی اس نے، کیوں چھوڑ گیا اچانک اس طرح۔" فاروق بھائی کے لہجے میں تفکر کی گہری پرچھائیاں تھیں۔

"کوئی خاص وجہ تو نہیں بتائی۔ بس روئے جا رہی ہے۔ کہتی ہے میرا گھر ٹوٹ گیا۔" فاخرہ نے دھیمی آواز میں کہا تو نعمان نے سیل فون پہ کوئی نمبر ملایا۔ لیکن حسنین کا سیل بند جا رہا تھا۔

"اب تو رات بھی کافی ہو گئی ہے۔ کل میں جلدی آجاؤں گا آفس سے تو تمہیں لے کر چلوں گا فاخرہ! روبرو زیادہ آرام سے بات ہو سکتی ہے۔ اتنا سمجھ دار بچہ ہے حسنین، سلجھی ہوئی طبیعت کا۔ اسے ہوا کیا ہے جو انتہائی اقدام اٹھا رہا ہے۔"

فاخرہ خاموش زمین پر نگاہ جمائے بیٹھی رہیں۔

☆ ☆ ☆

وہ دونوں ستارہ کے گھر پہنچے تو وہ انہیں گیٹ پر ہی مل گئی۔ ہمدان تو وائی جتاہی مچاتا ماموں کے کمرے میں جھانکنے لگا تھا۔ چھٹی کا دن تھا۔ دن چڑھے تک آدھے لوگ سوئے پڑے تھے۔ زیادہ چہل پہل نہیں تھی گھر میں اور ہمدان کو بھی کچھ زیادہ ہی جلدی تھی۔ ستارہ انہیں برآمدے میں بٹھا کر چائے کا اہتمام کرنے چلی گئی۔ پروا کی عادت سے سب واقف تھے کہ وہ پھول دیکھ کر انہیں توڑے بنا رہ نہیں پاتی۔ وہ پیڑ پر جھکی پھول توڑ کر دوپٹے کی جھولی میں بھرنے میں گم تھی۔ پیچھے سے کسی نے اس کے سر پر چپت لگائی تھی اور وہ بے ساختہ بولی۔

"ہمدان کے بچے اب میں تمہیں چھوڑوں گی نہیں

وہ ایک دم پلٹی اور گھبرا کر ایک دم دوپٹے کا آنچل چھوڑ دیا۔ سارے پھول سامنے کھڑے شخص کے قدموں میں بکھر گئے۔

"آ۔۔۔ آپ۔۔۔ میں سمجھی ہمدان ہے۔"

"دعا سلام کا رواج نہیں رہا کیا اب؟"

وہ بھی اپنی گھبراہٹ چھپا کر بولے تھے کیونکہ چپت تو انہوں نے بھی اسے ستارہ سمجھ کر لگائی۔۔۔ تھی۔ ان دونوں کے قد کاٹھ ایک جیسے تھے۔ دوسری وجہ پروا نے ستارہ جیسا سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ وہ سوٹ آمنہ نے دونوں کو ایک جیسا دلایا تھا۔ وہ ان کی بات پر مزید گڑبڑا گئی۔ جھٹ سلام جھاڑا۔

"وعلیکم السلام!" وہ جواب دے کر تھوڑا پیچھے ہٹے تو اس نے زمین پر پیروں کے بل بیٹھتے سارے پھول دوپٹے کے پلو میں دوبارہ جمع کر لیے۔ وہ جا کر کین کی کرسی پر براجمان ہو گئے اور جب وہ آہستگی سے چلتی ان کی جانب آ رہی تھی تو انہوں نے ایک نگاہ اس کے پیروں پر ڈالی اور نجانے کیوں نگاہ الجھ کر رہ گئی۔ آج بھی اس کے پیر اتنے ہی گلابی تھے، جتنے بچپن میں تھے۔ وہ سوچوں میں گم تھے۔ وہ سامنے والی کرسی پر ٹک گئی۔

"کس کے ساتھ آئی ہو اتنی صبح؟"

"ہمدان کے ساتھ۔ وہ اندر ہے ماموں کے پاس!"

اس نے دھیرے سے کہا۔ جب ہی ستارہ ٹرے اٹھائے اس کی جانب چلی آئی۔

"بھیا! آج آپ نے اتنی دیر کر دی جاگنگ سے آنے میں جوس رکھا ہے فریج میں، جا کر پی لیں۔"

"ارے فرقان لے گیا تھا مجھے اپنی طرف۔ گھنٹوں لگائے رکھتا ہے پھر۔ ویل! تم لوگ انجوائے کرو۔"

وہ اٹھ کر چلے گئے۔ ہمدان بھی آ گیا اور اس کا ہاتھ کھینچتا دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ ستارہ روکتی رہ گئی مگر وہ اسے تیزی سے بائیک پر بٹھا کر زن سے بائیک بھگا لے گیا۔

☼ ☼ ☼

فاروق بھائی جب آمنہ اور فاخرہ کو لے کر حسنین کے گھر پہنچے تو وہ گھر پر نہیں ملا۔ کسی ضروری کام سے ایک ہفتے کے ٹور پر اسلام آباد گیا تھا۔ یہ اطلاع گھر کے ملازمین نے ان لوگوں کو دی تھی اور جب ان لوگوں نے حسنین کے آبائی گھر جا کر معاملہ پیش کیا تو سب کے سب دم بخود رہ گئے۔

حسنین اور پروا کے درمیان ایسا بھی ہو سکتا ہے؟ پروا کی بے لوث محبت سے گھر کا ایک ایک فرد واقف تھا اور حسنین کتنا ہی کم گو سہی، پر بیوی کے لیے دل میں محبت کے خالص جذبات رکھتا تھا۔ ان کے کانوں میں بات پڑتے ہی سب پروا کی طرف دوڑے تھے کیونکہ حسنین کا سیل مستقل آف جا رہا تھا۔۔۔

☼ ☼ ☼

ہمدان اور وہ ایک ٹیبل پر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ ہمدان ماہ جبین کو میسج پر میسج کر رہا تھا پر نہ تو وہ فون اٹھا رہی تھی اور نہ ہی میسج کا جواب دے رہی تھی۔ ستارہ کے صحن سے توڑے سارے پھول اس نے میز پر رکھے تھے۔ وہ مسلسل دو گھنٹے انتظار سے اکتا گئی تھی اور اسے بار بار چلنے کا کہہ رہی تھی۔

"ہمدان جیسے تم انتہائی فضول اور احمق انسان ہو ویسے ہی تمہاری اول جلول فرینڈز ہیں۔ اس لڑکی کو اتنی بھی تمیز نہیں کہ ہم اس کے پیچھے خوار ہو رہے ہیں کم از کم کال ہی اٹینڈ کر لے۔ تم واپس چلو ورنہ میں رکشے سے چلی جاتی ہوں اور تم قیامت تک اس کا یہیں انتظار کرو۔ ستارہ کے پاس تو مجھے بیٹھنے نہیں دیا اور یہاں لا کر مجھے دو گھنٹوں سے خوار کر رکھا ہے۔"

پروا کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

"یار! اتنا غصہ مت کرو۔ تم بیٹھو میں باہر دیکھ کر آتا ہوں۔ وہ گاڑی وغیرہ میں ہوگی۔ اس لیے کال ریسیو نہیں کر رہی۔"

"بس میں دس منٹ اور دیکھ رہی ہوں۔ اتنی دیر سے لوگ ہمیں گھور گھور کر دیکھ رہے ہیں۔ ان پھولوں کی وجہ سے اور بھی مشکوک ہو رہی ہوں میں۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے میرا کوئی افیر ہے تم سے۔"

پروا کے آخری جملے سے ذو معنی سی مسکراہٹ نے اس کے بہت خوب صورت اور مسکراتے شرارتی ہونٹوں کے کناروں پر رقص کیا تھا حواسوں میں آنے کے بعد وہ خود اپنی بات پر استغفراللہ کی گردان کر رہی تھی۔

ہمدان کو گئے پانچ منٹ ہو گئے تھے۔ زیادہ رش نہیں تھا۔ پھر بھی وہ لوگوں کو کن انکھیوں سے دیکھ کر خود بخود دل میں چور محسوس کر رہی تھی۔ تب ہی دروازہ کھلا۔ اندر آنے والی شخصیت بھیا کی تھی۔ وہ پھولوں پر نظر جمائے ہوئے نجانے کتنے برے برے لفظوں سے ماہ جبین کو کوس رہی تھی اور بھیا کو اسے یہاں دیکھ کر حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔ وہ دو گھنٹے پہلے ان کے گھر سے نکلی تھی۔ انہیں بہت عجیب لگا تھا۔ ان کا آنا یہاں اتفاقیہ نہیں تھا انہیں یہاں کسی بروکر سے ملنا تھا کسی پلاٹ کے سلسلے میں وہ ان کا انتظار کر رہا اور اس کی ٹیبل ایسے زاویے پر تھی کہ وہ صاف دکھائی دے رہی تھی۔

دس منٹ گزر جانے کے بعد وہ غصے میں پھولوں کو وہیں چھوڑتی تنکتی ہوئی باہر نکل گئی تھی۔ بھیا پھولوں پر نگاہ جمائے اس منظر میں کھوئے رہے جب انہوں نے اسے پھول توڑتے دیکھا تھا۔ کافی فاصلہ ہونے کے باوجود وہ ان پھولوں کی مہک اپنے اندر اترتی محسوس کر رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

کتنی بوجھل سی صبح تھی۔ لگتا تھا ہر منظر پر اتنی ہی دھند اتری ہے جتنی دھندلی اس کی آنکھیں تھیں۔ اسے آئے چوتھا دن تھا اور چار دن سے وہ سب کے اصرار کے باوجود کمرے سے نہ نکلی تھی۔ سب سے زیادہ خوف تو اسے اپنے دشمن سے سامنا کرنے کا تھا۔ ابھی تو یہ راز ہی تھا نا کہ ان کے بیچ آیا کون؟ وہ خود اپنے منہ سے لوگوں کو بتا کر سنگ ان کے ہاتھوں میں کیوں دیتی؟ فاخرہ نے بیڈ کے کنارے بیٹھ کر اس کے ریشمی بالوں میں ہاتھ پھیر کر اٹھایا اس کی درد میں ڈوبی آواز کسی پاتال سے نکلتی محسوس ہوئی تھی۔

"ماما! حسنین نے سیل آن نہیں کیا؟"

"نہیں۔ آفس سے بھی پتا کیا ہے۔ وہ کسی آفیشل کام سے نہیں گیا۔ ایک ہفتے کی لیو پر ہے۔ اس کے گھر والے کوشش میں ہیں کہ رابطہ ہو جائے۔ تم ہی نہیں اس سے وابستہ ہر شخص عجب مخمصے میں پھنسا ہے کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ وہ آن لائن بھی نہیں ہوتا۔ سب نے اس کے لیے میسج چھوڑ دیا ہے کہ کونٹیکٹ کرے۔ فاروق بھائی روز ای میل کر رہے ہیں۔ تم فکر نہ کرو۔ غصہ ہے۔ اتر جائے گا تو خود ہی آ جائے گا۔ تم نے بھی تو ابھی تک کسی کو بھی ان الزامات کی نوعیت نہیں بتائی۔ جو بات بھی تھی کھل کر اس کے گھر والوں کو بتا دیتیں۔"

وہ ضبط کے کڑے امتحان سے گزر رہی تھی۔ ان کی بات کا کیا جواب دیتی۔ کیا بتاتی کہ کیسا زخم ہے جو دکھلانے پر اور بھی تکلیف دے گا۔ ابھی تو لوگ ہمدردی کر رہے ہیں۔ بات کھلے گی تو کچھ لوگ ایسے بھی ہیں، جو اسے اپنے ہاتھوں سے سنگسار کر دیں گے۔

☼ ☼ ☼

جیسے ہی دونوں گھروں کے بچے انٹرمیڈیٹ کے ایگزامز سے فارغ ہوئے سب نے پکنک کا شور مچا دیا۔ گرمیاں ہوں اور سمندر کی شکل نہ دیکھ پائے تو لعنت ہے ایسی چھٹیوں پر۔ پروگرام بھیا کے سامنے رکھا گیا۔ انہوں نے اگلا اتوار پکا کر دیا۔

ستارہ نے فوراً پروا کو فون کیا اور یوں یہ بات ہمدان تک بھی پہنچی اور اس نے بھی چٹکیوں میں سب کے ذہن بنائے اور مشترکہ طور پر ساحل پر سورج طلوع ہونے کا منظر بھی سب نے اکٹھے دیکھا۔ ناشتے کے بعد وہ بک کرائے گئے ہٹ کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی تو ہمدان ہٹ کی بالکونی میں کھڑا سورج پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ اس نے پروا کو دیکھ لیا تھا کہ وہ آ رہی ہے۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے اپنی جانب بلایا

تھا۔
"کیا ہوا جناب! کوئی روگ شوگ تو نہیں لگا لیا جو سورج کی پرستش میں لگے ہو تم۔"
"روگ لگتا ہے تو سورج کو دیکھا جاتا ہے؟" اس نے سوالیہ انداز میں اس کی جانب دیکھا۔
"عموماً" یہی سنا ہے میں نے کہ لوگ چاند، سورج، ستاروں میں الجھ جاتے ہیں۔" وہ بھی اس کی تقلید کرتی نارنجی تھال کو دیکھ رہی تھی جو آسمانوں کی وسعتوں میں بغیر کسی دھاگے سے ٹنگا تھا۔
"بہت فیسی نیٹ کرتی ہے فطرت مجھے۔"
"اچھا..... آ..... آ۔" اس نے کھینچ کر کہا۔ "تم جیسا ڈرامے باز اس روئے زمین پر نہیں ہوگا۔ یہ فلسفی باتیں چھوڑو اور ساحل پر آؤ۔ ریس لگائیں گے۔ جو جیتے گا اس کو کاکا جانی جہاز میں اپنے خرچے سے سیر کرائیں گے اکیلے۔ باقی سب لوگ ساحل پر رک کر جہاز کا دور سے نظارہ کریں گے۔"
"پھر تو یہ جیت میرے نام ہوگی مس پروا!"
"لیٹس سی..... ملاؤ ہاتھ۔"
پروا نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ اس نے تھام کر چیلنج جیسے قبول کیا۔ ساحل کی ریت پر بیٹھے بھیا کی نگاہ ان دونوں میں الجھی تھی۔ ہمدان نے بے ایمانی کرکے خود کو فاتح قرار دیا تھا سب کے احتجاج کرنے پر کاکا جانی نے اپنی آفر واپس لے لی تھی۔ یوں ہی آدھا دن ڈھل گیا تھا۔ اچھے بھلے خوب صورت چہرے "کالے بھوتوں" میں تبدیل ہوگئے تھے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد آدھے لوگ ہٹ میں ستا رہے تھے۔ وہ ستارہ کے ساتھ پانی میں کھڑی تھی۔ لہروں کا شور تھا اور پانی میں کافی تیزی تھی۔ وہ مزید آگے جانے سے ڈر رہی تھیں۔ ان سے آگے جاتے بھیا نے انہیں اشارہ کیا کہ آگے آجاؤ تو مگر ستارہ کی ہمت نہیں ہوئی۔ پروا نے ہمت پکڑی اور بھیا کی طرف بڑھی۔ بھیا سے دو گز کے فاصلے پر عمیر اور سمیر بھی تھے۔ وہ بھیا کے برابر آگئی۔ ستارہ اسے ساحل سے کھڑی دیکھ رہی تھی۔
ہٹ کی بالکونی سے ہمدان نے اسے اتنے گہرے پانی میں کھڑا دیکھا تو تیز تیز قدم بڑھاتا پانی کی جانب لپکا۔
"پروا! باہر آجاؤ۔ بہت تیز لہریں ہیں۔ تم نہیں سنبھل پاؤ گی۔"
پروا نے مڑ کر اسے دیکھا کہ وہ کچھ کہتا اور اشارے کرتا اس طرف آرہا ہے۔ مگر اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ وہ بھیا کی وجہ سے بہت حوصلے سے کھڑی تھی۔ وہ مڑ کر سیدھی بھی نہیں ہوئی تھی کہ تیزی سے ایک طاقتور لہر کا جھٹکا لگا اور اس کے حواس معطل ہوگئے۔ اس نے بھیا کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا اور وہ پانی میں غائب ہو چکی تھی اور جب پانی پوری طاقت سے ساحل سے ہر چیز کھینچتا واپس پیچھے کی جانب جا رہا تھا تو بھیا جو کہ ابھی تک مضبوطی سے قدم جمائے کھڑے تھے انہوں نے پانی کے زور سے بہتی پروا کو دیکھ لیا تھا۔
عمیر اور سمیر بھی اس کی جانب لپکے تھے۔ بھیا نے مضبوط قدموں سے چلتے اس کی جانب جاتے ہی اسے بازو سے پکڑ کر کھڑا کیا تھا۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئی تھیں اور چہرے پر ہوائیاں تھیں۔ بھیا نے اسے کھڑا کرکے بازو کے گھیرے میں لیا تھا۔ دونوں ہی سمجھنے سے قاصر تھے۔ قیامت گزر گئی تھی یا گزر رہی تھی۔ وہ کچھ حواس میں آئی تو خوف کی بنا پر ان کے شانے سے چمٹ گئی تھی۔ تب تک ہمدان بھی وہاں پہنچ گیا تھا۔
"ایسے چھوٹے حادثے ساحل پر ہوتے رہتے ہیں۔" بھیا نے اسے آہستگی سے خود سے علیحدہ کیا تھا۔
ڈھیر ساری شرم اس کی آنکھوں میں اتری تھی۔
ہمدان نے آتے ہی لتاڑا کہ وہ اتنے گہرے پانی میں آئی ہی کیوں۔" بھیا نے پریشان ہونے والے ہمدان کو ایک نگاہ مڑ کر دیکھا تھا۔
سب نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ وہ بچ گئی تھی۔
"اگر ستارہ کے بھیا نہ ہوتے تو میرا کیا ہوتا؟" اس نے ایک جھرجھری سی لی۔ "اف میں کیسے بے خیالی میں ان سے جا لگی۔ کیا سوچیں گے وہ اب میں ان کا سامنا کیسے کروں گی۔" وہ ان ہی سوچوں میں غلطاں تھی کہ ساری کزنز نے ہٹ میں دھاوا بول دیا تھا۔

"پروا یار! یہ کیا بکواس ہے۔ اک ذرا سی پانی میں ہی ڈر گئی تھیں تم۔ سوگ ایسا منا رہی ہو جیسے پتا نہیں کیا ہو گیا ہو۔"
زری کی بات پہ وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی پھر خود کو کمپوز کرتے بولی تھی۔
"نہیں یار! ایسی کوئی بات نہیں میں تھک گئی تھی۔ آرام کر رہی تھی۔ چلو چلتے ہیں۔" وہ سب ٹولے کی شکل میں ہٹ سے نکلیں۔ کچھ اونٹ پر سوار ہوگئیں اور کچھ پھر پانی میں جا گھسیں۔ وہ وہیں گیلی ریت پر بیٹھ گئی اور ساحل کی گیلی ریت پر گھروندہ بنانے لگی اور بھیا جو کہ ابھی تک پانی میں تھے۔ گاہے بگاہے اسے "تعمیراتی کام" کرتے دیکھ رہے تھے اور جب اس کا گھروندہ بن گیا تو دور جا کر اسے دیکھنے لگی۔ اسی وقت دائیں جانب سے تیزی سے گھڑ سواری کرتا ہمدان نمودار ہوا اور بے خیالی میں عین گھروندے پر لا کر گھوڑا روکا۔
"آؤ پروا! گھڑ سواری سکھاؤں تمہیں۔"
وہ رونا نہیں چاہ رہی تھی۔ نجانے کیوں ایک گھنٹے سے اس کے اندر جو کچھ بھی جمع ہوا تھا۔ خجالت، خفت یا شرمندگی اور گھروندہ ٹوٹ جانے کا معصوم سا دکھ۔ سب یک دم اس کی آنکھوں سے بہنے لگا تھا۔
گھوڑے کی سم سے گھروندہ پھر گیلی ریت بن گیا تھا۔ اس نے ہمدان کو نفی میں سر ہلا کر منع کیا۔ وہ آگے بڑھ گیا۔ اس کے رونے میں تیزی آگئی۔ وہ تاسف سے ٹوٹے ہوئے گھر کو دیکھتی رہی۔ بھیا نے اس کے ٹوٹے ہوئے گھروندے کو دیکھا تو پانی سے نکل کر اس کی جانب آئے تھے۔
"پروا! تم رو کیوں رہی ہو۔ کچی ریت پر بنے گھر تو ایسے ہی ٹوٹ جاتے ہیں۔ چلو تم ایسا کرو دوبارہ بنا لو۔ میں تمہیں گائیڈ کرتا ہوں۔ دیواریں موٹی رکھنا۔"
وہ بس اپنی ہی کہے جا رہے تھے اس کے جذبات سے بے خبر۔ وہ طوفانوں میں گھری تھی۔ دل تھا کہ حلق تک دھڑک دھڑک آتا تھا۔ دل کی ہستی میں شوریدہ سری تھی۔ آگہی کا لمحہ تھا۔ پروا کو لگا۔ اس کا دل ان کی قربت سے گھبراتا ہے۔ اور یہ محبت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔
وہ تھوڑا اور قریب آئے اور اس کے آنسوؤں کو انگلی کی پوروں سے صاف کرتے بولے۔
"پاگل لڑکی! کوئی ایسے بھی روتا ہے۔ میں پانی پی کر آتا ہوں۔ تم بنانا شروع کرو۔ شاباش۔"
ان کے جاتے قدموں سے اس کی بے خود نگاہیں جا لپٹیں اور جب وہ ہٹ کی سیڑھیاں اترتے واپس اس کی جانب آرہے تھے تو انہوں نے دیکھا۔ وہ بے خیالی میں سیدھے ہاتھ کی شہادت والی انگلی سے گیلی ریت پہ انگلش کے حرفوں سے کوئی نام لکھ رہی تھی اور جب وہ اس کی پشت پر پہنچے تو ایک تیز لہر اس سطح کو ہموار کر چکی تھی اسمیں دھندلا دھندلا سے صرف H.A لکھا دکھائی دیا تھا۔ H.A یعنی HAMDAN وہ اسے بغیر کچھ کہے تیز تیز قدموں سے چلتے واپس ہٹ کی جانب چل دیے تھے۔ شام ڈھلنے لگی تھی۔ پروا کی نگاہ غروب آفتاب پر پڑی تو اسے لگا اس کے پیروں میں کسی نے زنجیریں پہنا دی ہوں وہ دھیرے قدموں سے چلتی ہٹ کی بالکونی میں آگئی۔
اور دل کی ڈور جس سے جا الجھی تھی۔ وہ بہت آہستگی سے اس کے پیچھے آن کھڑا ہوا تھا۔ اس نے بھی ڈوبتے سورج کو دل تھام کر دیکھا تھا اور پھر اسے پکارا تھا۔ پروا کے ذہن میں روشنی کا جھماکا ہوا تھا آج صبح ہی تو اس نے طلوع آفتاب کا منظر ہمدان کے ساتھ دیکھا تھا اور غروب آفتاب تک یہ کیا ہوا تھا اتنا بوجھل اور اداس دل اور پھر پیچھے سے ان کی آہٹ اور پکار۔
اس نے زور سے آنکھوں کو بھینچا تھا۔ جب ہی ایک تیز لہر ہٹ کی سیڑھیوں سے آکر ٹکرائی تھی۔
"نہیں نہیں مجھے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنا مجھے پتھر کا نہیں بننا۔" انہوں نے ایک قدم بڑھا کر فاصلہ پاٹا اور پھر اسے پکارا۔
"پروا! سب گاڑی میں تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ چلنا نہیں کیا؟"
انہوں نے دیکھا کہ وہ بے حس و حرکت کھڑی ہے تو

اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ کرنٹ کھا کر مڑی۔ اس نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا۔

"جی آرہی ہوں آپ چلیں۔"

انہوں نے بغیر کچھ کہے اس کا ہاتھ تھاما۔ وہ روبوٹ کی مانند ان کے ساتھ ساتھ سیڑھیاں اترنے لگی۔ اس کا میکانکی انداز انہیں بھی چونکا گیا تھا۔

"سمندر بہت خطرناک ہو گیا ہے۔ پانی ہٹ تک آ رہا ہے۔ بہا کر لے جائے گا تمہیں اسی لیے تمہارا ہاتھ تھاما ہے۔"

"سمندر مجھے برباد کر چکا ہے۔" اس نے سوچا اور پھر ہر سیڑھی اترتے اس کا دل اس کے نام کی مالا جپتا رہا اور جس طرح اس نے ساحل پر انگلی سے لکھا تھا۔ انگلی کے اشارے سے ہر سیڑھی پر بھی ایک ہی نام لکھے جا رہی تھی۔

HASNAIN

☼ ☼ ☼

کافی دنوں کے بعد وہ کمرے سے باہر نکلی تھی۔ وقتاً فوقتاً" اس کے سسرال سے کوئی نہ کوئی ملنے آتا رہتا تھا۔ گول گوتھنے سے نعیب میں سب کی جان تھی۔ اتنا کچھ ہو جانے کے بعد بھی سب کو بہتری کی امید تھی۔ اس کے اندر بھی کوئی کرن پھوٹی تھی وہ دھیرے دھیرے قدموں سے کچن کی جانب گئی۔ اسے توقع نہیں تھی کہ وہ اسے کچن میں مل جائے گا۔ نفرت سے منہ پھیر کر وہ واپس پلٹی۔ مگر اس نے آگے بڑھ کر ــــ پروا کی طرف قدم بڑھایا اور ایک گھونٹ جوس کا بھرا۔ اس کے ــــ ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ وہ اسے دیکھ نہیں رہی تھی پھر بھی اسے معلوم تھا کہ وہ مسکرا رہا ہے۔

اس کے جانے کی راہیں مسدود کر دیں۔ اور بڑے پر سکون انداز میں بولا۔

"پروا جان! کہاں تک بھاگو گی مجھ سے۔ میں زندگی کی ہر گلی کو تمہارے لیے ہر طرف سے بند کر دوں گا اور بند گلی کا راستہ بس ایک گھر پر آکر کھلے گا اور وہ گھر ہو گا ہمدان فاروق کا گھر۔"

"میں خود کو ان تنگ گلیوں کی دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر مار لوں گی مگر تمہارے گھر کے دروازے پر کبھی دستک نہیں دوں گی ہمدان فاروق!"

اس کے لہجے میں زہر میں بجھے تیروں کی کاٹ تھی۔ وہ اپنا چہرہ اس کے چہرے کے قریب لایا اور اس کی بھوری آنکھوں سے اپنی بادامی رنگ کی آنکھیں ملاتا بولا۔

"تمہیں عرش سے فرش پر لا پٹخا ہے میں نے۔ اس شخص کے لیے اس شخص کو ٹھکرایا تھا تم نے دیکھا اسی شخص نے کتنی آسانی سے تمہیں "پروا کا گھر" سے باہر اٹھا پھینکا نا؟"

پروا کو لگا اب وہ کبھی زمین سے اٹھ نہیں پائے گی۔

"یہ جال بھی تمہارا پھیلایا ہوا تھا۔"

وہ ــــ جوس کا گھونٹ بھر کر مکارانہ انداز سے ہنسا۔ کچھ لمحے اس کے حسین سوگوار حسن کو دیکھتا رہا پھر بولا۔

"نہ ــ نہ ــ میری جان جال نہیں کہتے اسے کہانی تھی ایک چھوٹی سی۔ کچھ شکوک تو پہلے بھی اس شخص کے دل میں تھے کہ تم مجھ سے پیار کرتی ہو۔ جب ہی تو اس نے رشتے سے انکار کیا تھا یہ تو تمہاری "بدعقلی" تھی کہ گھر کی مرغی چھوڑ کر پڑوسی کی دال کھانے چل دی تھیں مس پروا۔" اس کے انداز پر وہ سلگتے ہوئے دھاڑی۔

"مسز پروا حسنین۔"

"اوچھا ــ مگر کب تک؟"

"میں کاکا جانی کے پاس جا کر ساری حقیقت بتا دوں گی۔ تم منہ دکھانے کے قابل نہیں رہو گے۔" وہ بولی تو وہ بھی ترنت بولا۔

"اور تم؟"

وہ خاموش رہ گئی۔

"میں نے سوچ لیا ہے۔ حسنین بھی تو حقیقت آشکار کریں گے ہی نا تو میں کیوں گھٹ گھٹ کر خود کو ماروں۔ جو بھی ہو گا دیکھا جائے گا۔ کم از کم وہاں تمہاری شکل تو دیکھنا نہیں پڑے گی اور تم اس زعم میں مت رہنا کہ مجھے اس چھت کے علاوہ کہیں پناہ نہیں ملے گی۔"

"میری پلاننگ بس یہیں تک نہیں ہیں پروا جان۔"

وہ اس پر جھکا تو وہ تیزی سے اسے دھکا دیتی باہر نکلی اور باہر کھڑے شخص کو دیکھ کر اسے لگا تھا کہ اب کبھی وہ ان سے آنکھ نہ ملا پائے گی۔ ہمدان نے توقف نہیں کیا تھا۔ وہ مسلسل بولتا اس کے پیچھے آ رہا تھا۔

"میں تمہیں زمین کی گہرائیوں اور آسمانوں کی بلندیوں سے بھی ڈھونڈ نکالوں گا۔ تم کہیں بھی چلی جاؤ بس میری رہو۔ ہمدان فاروقی کی ــــ جو اپنی چیزیں کسی کو نہیں دیا کرتا۔"

اور جب وہ اپنے حواس میں واپس آیا تو وہاں پروا نہیں تھی۔ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے سامنے فاروق کھڑے تھے۔ اس کے باپ جو اس کے چہرے کے ایک ایک تاثر اور جنبش سے اس کے دل کا حال جان لیا کرتے تھے۔

"تو کیا یہ ابھی تک اسی "ضد" میں ہے؟"

☼ ☼ ☼

پروا کو کاکا جانی اپنے گھر لے آئے تھے۔ کاکا جانی نے پروا کو کہہ دیا تھا کہ نعیب اور پروا اب یہیں رہیں گے چاہے حسنین کی عقل ٹھکانے آئے یا نہ آئے۔ پروا کے دل کو کچھ ڈھارس ملی تھی۔ وہ بے آسرا نہیں ہوئی تھی حسنین نے ایک گھر کے دروازے بند کیے تھے تو اللہ نے دوسری چھت کا انتظام بھی کر دیا تھا اور اس دن ہونے والے واقعے کے بعد وہ خود اس گھر سے چلے جانا چاہتی تھی۔ اسے اس بات کی بھی شرمندگی تھی کہ فاروق ماموں نے سب کچھ سن لیا تھا جو وہ سب سے چھپانے کی کوشش میں تھی۔ کتنے مان سے اس کی پرورش کی تھی ان دونوں میاں بیوی نے۔ سو اب بیٹے کے کرتوت بتا کر وہ انہیں خاندان میں رسوا کرنا نہیں چاہتی تھی۔

نعیب اس گھر کا پہلا اور لاڈلا بچہ تھا۔ سو سارا سارا دن وہ دادی پھوپھیوں کے پاس رہتا۔ کاکا جانی کا بے حد لاڈلا تھا۔ وہ آفس سے آتے گھنٹوں نعیب کے ساتھ لگا دیتے۔ اسے سینے سے لگا کر سلائے رکھتے۔

حسنین کے آفس سے پتا چلا تھا کہ اس نے مزید چھٹیوں کی درخواست دی ہے اور یہ کہ وہ اسلام آباد کی برانچ میں اپنا ٹرانسفر چاہتا ہے۔ کاکا جانی کو اس پر بے حد غصہ بھی تھا اور اس کی بے حد فکر بھی تھی۔ وہ بظاہر تو پروا کو تسلیاں دیتے مگر اندر سے خود بھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھے۔ انہوں نے اپنے لاڈلے فرماں بردار بیٹے کے لیے ایک بہترین لڑکی کا انتخاب کیا تھا اور شادی کے تین سالوں میں دونوں کو بے حد خوش دیکھ کر اپنے فیصلے پر فخر بھی محسوس کیا تھا۔ پر اب صورت حال یہ تھی کہ جب بھی پروا کے اداس چہرے پر ان کی نگاہ پڑتی تو ان کے دل پر ایک گھونسا پڑتا۔

پروا شادی ہو کر اس گھر میں آئی تھی اور جب کبھی بھی یہاں آتی تو اپنے ہی بیڈ روم میں قیام کرتی۔ اس نے شادی کے بعد دو سال اس گھر میں گزارے تھے۔

☼ ☼ ☼

حسنین نے بارہا اپنے گھر میں وہ قصہ سن رکھا تھا کہ جب اس نے کمہاری کے گھر جیسے گھر کی خواہش کی تھی اور اسے وہ بھی منظر یاد تھا جب اس نے چکنی مٹی سے گھر بنایا تھا اور اس کی چھت اس نے بنا کر دی تھی اور ساحل کی ریت سے بنا اس کا گھروندہ بھی حسنین کو

مسکرانے پر مجبور کرتا تھا اور وہ اکثر سوچتا تھا کہ کتنی فطری اور معصوم سی گھر بنانے کی خواہش اس لڑکی کے دل کے نہاں خانوں میں بچپن سے چھپی ہے۔ وہ اس سے عمر میں آٹھ سال بڑا تھا اور جب وہ یونیورسٹی کی اسٹوڈنٹ تھی' وہ ایک کامیاب انجینئر بن کر عملی زندگی میں کامیابی کا سفر طے کر رہا تھا۔ وہ کئی ملٹی نیشنل کمپنیوں کے ساتھ کام کر چکا تھا اور آج کل وہ ایک چائنیز کمپنی کے ساتھ ہاؤسنگ اسکیم پر کام کر رہا تھا۔ اس کے پاس اتنا بنک بیلنس تھا کہ شادی ہوتے ہی اپنی محبوبہ بیوی کے لیے ایک بے حد خوب صورت گھر کی تعمیر شروع کروا دی تھی۔ اس نے دل میں ٹھان لی تھی کہ پروا کے خواب کو حقیقت کے رنگوں سے رنگنا تھا۔ ایک بے حد منفرد تھری ڈی ایلیویشن تیار کر کے اس نے جب پروا کو دکھایا تھا تو اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئی تھیں۔

"حسنین! یہ تو ایسا ہی ہے جیسا کمہاری کا گھر ہوتا ہے۔"

اس کی آنکھوں میں ستائش تھی۔ حسنین کے ہونٹوں پہ جان دار مسکراہٹ تھی۔ اس نے اسے دونوں شانوں سے تھاما۔

"میں نے بڑی محنت اور جانفشانی سے نیچے سے قصدا" پتلے اور اوپر سے نسبتا" موٹے بیم دے کر ایسے جوائنٹ کیا ہے گھر کی افقی سطح دور سے چھتری سے مشابہ لگے گی۔ باہر کی ساری فنشنگ چائنیز موزائیک اور کاپر ماربل سے ہوگی۔ تم دیکھنا پروا تمہارے گھر کی دھوم مچ جائے گی۔

مجھے لگتا تھا پروا۔ تمہارے اور ہمدان کے بیچ کچھ ہے اور میری نظر میں ایسا کچھ ہو جانا غلط بھی نہیں۔ ساتھ رہنے سے بندہ ایک دوسرے سے مانوس ہو جاتا ہے اور یہ مانوسیت محبت میں بھی بدل جاتی ہے۔ مگر جب قسمت نے تمہیں مجھ سے ملا دیا تو میں نے اپنی زندگی کا اولین مقصد ہی بنا لیا کہ ایک گھر تمہیں ضرور بنا کر دوں گا۔ ماڈل تیار ہو گیا ہے اب ان شاء اللہ نیکسٹ منتھ سے کام شروع کرا دوں گا۔ اس گھر کی ہر ہر چیز تمہاری پسند کی ہوگی پروا! اور جب گھر تیار ہو جائے گا تو میں ٹاور کے وسط میں ایک اٹالین ماربل تختی پر ایک نام کندہ کر کے لگاؤں گا۔ "پروا کا گھر" اور تم اس گھر کی بلا شرکت غیرے مالک ہوگی۔"

اور پروا کی آنکھیں اس کی طویل بات پر پھیل کر حیرت کا پتا دیتی تھیں وہ سوچ رہی تھی۔ "خدا ایسے بھی نواز دیتا ہے" اس نے اپنے شانوں پہ رکھے حسنین کے ہاتھوں پہ اپنے ہاتھ رکھے۔

"حسنین! آپ کی ایسی شفاف محبت پر کہیں مجھ میں غرور نہ آجائے اور کہیں میں بلندی سے پستی میں نہ آ گروں۔ اپنا مان' اعتماد اور محبت ہمیشہ قائم رکھیے گا۔"

"میری شفاف اور خالص محبت تمہارے لیے ہے اور تمہارے ہی لیے رہے گی۔ بس خدا سے ایک دعا ہے کہ ہمیں کسی کی نظر نہ لگے۔"

اس نے حسنین کے ہاتھ اپنے چہرے سے لگا کر آسودگی سے آنکھیں بند کر لیں۔

☼ ☼ ☼

ستارہ کے پُر زور اصرار پر وہ ہمدان کے ساتھ کاکا جانی کے گھر آگئی۔ اور شام میں جب اس کا سامنا بھیا سے ہوا تو بظاہر تو کچھ نہیں ہوا تھا۔ مگر دل تھا کہ سینے کی حدوں کو پھلانگتا جاتا تھا۔ اس کے ادھ کِھلی سے کِھلے چہرے پر کون کافر تھا جو نگاہوں کو ہٹا پاتا۔ انہوں نے بھی دیکھا تو لفظ ہونٹوں کی سرحدوں پر آکر واپس پلٹنے لگے تھے۔ وہ سلام سے کلام کی ابتدا کر کے بھی ساکت تھی۔ وہ چلتے ہوئے اس کے روبرو آئے تھے۔ محبت کے فسوں نے اپنے پروں کو اس کے اطراف میں بڑے دھیرج سے پھیلایا تھا۔

"کب آئیں پروا؟"

"دوپہر کو ہمدی چھوڑ گیا تھا۔"

ہمدی کے نام پر ان کی آنکھوں کی جوت بجھی تھی۔ چہرے پر عود کر آتی مسکراہٹ مدھم پڑی تھی۔ وہ ہارے ہوئے جواری کی طرح ڈھیلے قدموں سے دروازہ بند کر گئے۔

پر دروازوں کا کیا ہے یہ تو سائل پر منحصر ہے
اس کی دستک میں کتنی تڑپ ہوتی ہے
جو بند دروازے کھلوا دیتی ہے

پروا نے اس شاندار شخص کے قدموں کو گنا تھا۔ زیادہ دور نہیں گیا تھا۔ وہ شخص صرف اس کے دل و دماغ میں ہی نہیں گھر کے در و دیوار میں بھی بستا تھا۔ کتنی یادیں وابستہ تھیں اس کی' پر وہ تو بدگمانی کے صحرا میں بھٹک رہا تھا۔

اس نے گھر میں پہلا قدم رکھا تھا سامنے سے آتا معیز حسنین کا روپ دھار بیٹھا تھا اور تخیل کی وادی میں پہنچنے میں دیر کتنی لگتی ہے۔ بالکل اسی رنگ کے لباس میں کئی بار اس نے حسنین کو ملبوس دیکھا تھا۔ وہ حسنین کے مشابہ ہی تھا۔ دل کی دھڑکن بے ترتیب ہی ہوئی تھی کہ معیز نے آکر اسے سلام کیا اور نصیب کو تھام لیا۔ وہ ایک سانس خارج کرتی اندر کی طرف بڑھی تھی کہ اندر سے آتے عمیر کی آواز نے اسے پھر دھوکا دیا۔ اس کی آواز بھی اسی کافر کی طرح تھی' جو محبت کو ایمان کہا کرتا تھا اور پھر منکر ہو گیا۔

"یا الٰہی! سارے دھوکے میرے ہی لیے ہیں کیا؟"

اس نے زور سے آنکھیں میچ کر سوچا۔

"سب کچھ تو ویسا ہی ہے۔ میرے مالک! پھر اس کا دل کیوں بدل گیا؟" اس نے آنکھوں کی نمی ستارہ کے دوپٹے پر چھوڑی اور اسے بھینچ کر سینے سے لگایا تھا۔

☼ ☼ ☼
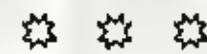
ستارہ کے گھر آئے اسے دوسرا دن تھا۔ وہ دونوں بیٹھی نیٹ پر اٹالین ڈشز سرچ کر رہی تھیں کہ کمپیوٹر کے پلگ میں دھماکا ہوا اور سسٹم ناکارہ ہو گیا ــــ وہ دونوں ــــ ایک دوسرے کی شکلیں دیکھنے لگیں۔ کل کاکا جانی کے کچھ دوستوں کو کھانے پر آنا تھا تو دونوں نے سوچا تھا کہ کچھ نئی اٹالین ڈشز بھی ٹرائی کریں گے۔ ستارہ کچھ سوچتے ہوئے گویا ہوئی۔

"چلو بھیا کے سسٹم پر سرچ کرتے ہیں ابھی۔"

دل کی شاخ پر چٹخ کر ایک کلی نے پھول کا روپ دھارا اور اس پھول نے اسے اندر باہر سے مہکا دیا تھا۔ وہ دونوں بھیا کے کمرے کے دروازے تک پہنچی تھیں کہ ڈور بیل ہوئی۔

"تم جاؤ اندر میں دیکھ کر آتی ہوں" کہتی ستارہ اسے وہیں چھوڑ کر باہر کی جانب چل دی تھی۔ گھر کے سارے ہی لوگ اتفاقاً کہیں نہ کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ آنے والے ستارہ کے ننھیالی عزیز تھے۔ ستارہ سب کو لیے ڈرائنگ روم میں جا بیٹھی۔

پروا نے بھیا کے کمرے کی راہ لی۔ دروازہ کھلتے ہی مختلف پرفیومز کی خوشبوؤں نے اس کا استقبال کیا تھا۔ وہ ان کے کمرے میں پہلے بھی ایک دو مرتبہ آچکی تھی مگر آج جو محبت کی آگہی نے دل کو نگاہ عطا کی تو ہر نظر میں محبوب کا چہرہ جھلملاتا دکھائی دے رہا تھا۔

کمرے کے وسط میں جہازی سائز کا بیڈ تھا۔ دونوں سرہانوں کے وسط میں میرون مخمل کے کشن تھے۔ کھڑکیوں پر دبیز پردے تھے۔ انتہائی نرم ایرانی قالین تھا۔ دروازے کے دائیں جانب سسٹم رکھا تھا۔ دل آویز وال ہینگنگز۔ انتہائی آراستہ کمرا تھا۔ جو مکین کے ذوق کا پتا دیتا تھا۔ کچھ مہینوں پہلے ہی اس نے سنا تھا کہ اسلام آباد سے بھیا کا دوست جو کہ ایک معروف انٹیریر ڈیکوریٹر ہے آیا ہے اور ان کا کمرا ڈیکوریٹ کر رہا ہے۔

پروا کو آنے کا اتفاق آج ہوا تھا۔ بھیا کا روم سب سے الگ بنا ہوا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر کھڑکیوں سے پردے سمیٹ دیے۔ سرمئی شام رات کا آنچل اوڑھے کھڑکیوں سے جھانکنے لگی۔ کمرے میں ملگجا سا اندھیرا تھا۔ اس نے لائٹ آن کر دی۔ کمرا مدھم روشنیوں سے منور ہو گیا۔ اس سوئچ کا کنکشن فینسی لائٹس اور نائٹ بلب سے تھا۔ فینسی لائٹس انتہائی خوب صورت اور منفرد اسٹائل کی تھیں جو بھیا چائنا سے واپسی پر لائے تھے۔ اس نے دوسرا سوئچ آن کیا۔ چھت کے انڈر گراؤنڈ ورجنوں بلب کمرے کو چاند سا روشن کر بیٹھے۔ اس نے انتہائی توجہ سے ہر ہر چیز کو نگاہ جما کر دیکھا۔

سب سے حسین اور توجہ کھینچ لے جانے والی چیز ..... وہ سلور اور اینٹک ایک بے حد حسین گھر تھا۔ وہ اس کے سامنے جا بیٹھی۔ اس کی پشت دروازے کی جانب تھی۔ بے حد حسین ریشم جیسے بال کمر پر بکھرے پڑے تھے۔ اس نے احتیاط سے وہ گھر اٹھایا۔ حیرت و شوق سے اسے جانچنے لگی۔ دل نما دروازوں پر ہاتھ رکھ کر اس نے ہلکے سے اندر کی جانب دبایا تو دروازے کلک کے ساتھ باہر کی جانب کھل گئے۔ گھر کے اندر مدھم سی روشنی پھیل گئی اور ہلکا ہلکا چائنیز میوزک بجنے لگا۔ گھر کے اندر ڈانسنگ کپل تھا۔ جو کہ چائنا کے روایتی عروسی لباس میں تھا۔

گھر کا اوپری حصہ کرسٹل کا تھا۔ پروا کو وہ شوپیس بے حد پسند آیا۔ دل چاہ رہا تھا کہ اٹھا کر بھاگ جائے۔ وہ اس میں اتنی مگن ہوئی کہ اسے ستارہ کا نہ آنا بھی یاد نہ رہا۔ آدھا گھنٹہ وہ اسی کھیل میں لگی رہی۔ وہ گھر چارج ایبل تھا اور اس کی چارجنگ بھی فل تھی۔

کھڑکیوں سے آتی نومبر کی خنک ہوا اور شام ڈھلتے ہی گہرا ہوتا اندھیرا بھی اس مگن لڑکی کو تکتے تھے۔ وقت گزرنے کا احساس ہوا تو وہ اس گھر کے دروازے بند کر کے کھڑی ہوئی تھی۔ اسی وقت زور سے دروازہ کھلا۔ آنے والے بھیا تھا۔ وہ یوں انہیں اچانک دیکھ کر دل والے دروازوں کو پھر دبا بیٹھی گھر میں پھر لائٹس جگمگ کرنے لگیں اور وہ کپل تھرکنے لگا۔ پروا کو لگا جیسے وہ کوئی چوری کرتی پکڑی گئی ہو۔ بھیا خود اسے اپنے کمرے میں اکیلا دیکھ کر اور پورے کمرے کی لائٹس جلتی دیکھ کر حیرت میں ڈوبے کھڑے تھے۔ پروا نے جلدی سے دروازے واپس پریس کیے اور گھر کو ٹیبل پر رکھ دیا۔ اس کے ایک ایک فعل سے گھبراہٹ مترشح تھی۔ پھر بھیا نے ہی سنبھل کر بات شروع کی۔

"خیریت؟ آج میرے غریب خانہ کو کیسے رونق بخشی آپ نے۔ میرا کمرا تو شاید علاقہ غیر ہے آپ کے لیے۔"

پروا کو لگا کمرے کی ساری جھلملاہٹ اس وجیہہ شخص کی آنکھوں میں اتر آئی ہے اور ایسا بھی ہو سکتا تھا کہ اتنی روشنی میں وہ اس کے دل کی کتاب پڑھ لیتے۔ اس نے وہاں سے بھاگ جانے میں عافیت جانی تھی۔

"نن..... نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں اوپر آنا ہی نہیں ہوتا۔ ستارہ کا سسٹم خراب ہو گیا۔ اس نے کہا۔ بھیا کا سسٹم یوز کر لیتے ہیں۔ کچھ سرچ کرنا تھا ہمیں۔" وہ ان کے سائیڈ سے نکلتے ہوئے بولی تھی۔

"اچھا تو اب جا کہاں رہی ہو۔ میں لیپ ٹاپ دے دیتا ہوں۔ ستارہ تو ویسے گیسٹس کے ساتھ بزی ہے نیچے۔"

"میں اس کی ہیلپ کرتی ہوں۔ فری ہو کر آپ کا لیپ ٹاپ لے لیں گے۔"

"اوکے ایز یو وش۔ ستارہ تو بزی ہے پلیز ایک کپ کافی بنا دو تم اور کاکا جانی کے لیے بھی بنا دینا۔ ہم دونوں اکٹھے ہی آئے ہیں۔"

"میں بنا دیتی ہوں۔"

وہ جھپاک سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ پروا نے کچن میں آ کر دو کپ کافی کے بنائے۔ ایک کپ اٹھا کر وہ کاکا جانی کے کمرے میں گئی۔ کاکا جانی بیڈ پر دراز تھے۔

"بہت بہت شکریہ بیٹا۔ بہت طلب ہو رہی تھی چائے یا کافی کی۔"

"شکریہ کی کیا بات ہے کاکا جانی۔ میں بھی تو آپ کی بیٹی ہوں۔"

اس نے شگفتگی سے جواب دیا تو انہوں نے بھی دعا دی "اللہ خوش رکھے۔"

کاکا جانی کے کمرے سے نکل کر اس نے جز بز ہوتے اوپر کی راہ لی۔ مجبوری یہ تھی کہ اور کوئی تھا بھی نہیں کہ وہ کافی بھجوا دیتی۔ اس نے ہلکے سے دروازے پر دستک کی۔ بھیا کی آواز آئی "آجاؤ"

اس نے کمرے میں قدم رکھا کمرے کے سفید بتیاں گل ہو چکی تھیں۔ صرف فینسی لائٹس کی سنہری ڈل خوابیدہ سے روشنیاں جل رہی تھیں۔ کھڑکیوں پر پردے برابر ہو چکے تھے۔ وہ سائیڈ ٹیبل کے نزدیک بیڈ پر بیٹھے تھے۔ چائنا کا خوابیدہ سا گھر ان کے ہاتھوں میں تھا۔ وہ ان کے قریب آئی تو وہ اٹھ

کھڑے ہوئے۔ کپ اس کے ہاتھ سے لے کر ٹیبل پر رکھا۔ وہ جانے کے لیے پر تول رہی تھی۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے رکنے کو کہا۔ اس خوابیدہ سے ماحول میں وہ پتھر کی بن گئی تھی۔

"پروا!"

اس کے ہونٹ خاموش تھے۔ پر اس کا رواں رواں کان بن بیٹھا تھا۔ محبت بادلوں کی صورت اسے گھیر بیٹھی تھی اور محبت برسنے کو تیار بیٹھی تھی۔ کچھ نامانوس سے لمحے ایسے ہی بیتے۔ وہ کچھ کہنے کو تھے اور وہ سننے کو بے چین۔ ان کا آنچ دیتا لہجہ تھا۔ پر وہ خود کو کنٹرول کرنا جانتے تھے۔

"پروا! جب میں نے چائنا سے یہ گھر خریدا تھا تو پتا ہے کس کا تصور تھا میرے ذہن میں؟"

"کس کا؟" اس کے بے جان ہونٹوں میں زندگی کی رمق آئی۔ "تمہارا۔"

اس نے زور سے آنکھوں کو میچا تھا۔ یاالٰہی کہیں یہ خواب نہ ہو۔ انہوں نے دھیرے سے اس کے ہاتھ کو تھام کر اسے وہ گھر تھمایا۔

"تم یہ ڈیزرو کرتی ہو۔ بس میرے دل نے کہا اور میں نے لے لیا۔ تمہیں دیا یوں نہیں تھا کہ کبھی میرے کمرے میں آؤ گی تو دوں گا۔ سو یہ آج تمہارا ہوا۔"

اسے لگا تھا کہ وہ کسی ایسی بستی میں جا پہنچی ہے جہاں پھول برستے ہیں۔

اس نے گھر کو بڑی چاہت سے تھاما تھا۔ بھیا نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ بے حد خوش ہے۔

"تھینک یو سو مچ؟"

وہ تیزی سے نیچے کی جانب چل دی تھی۔

☼ ☼ ☼

"ہمدان!" فاروق نے اخبار کا مطالعہ کرتے ہوئے اسے آواز دی۔ نزدیک ہی آمنہ بیٹھی دوپٹے میں کروشیہ کر رہی تھیں۔ وہ ان کے سامنے آ بیٹھا۔ فاروق نے چشمہ اتار کر اس سے بات شروع کی۔

"کل رات طارق کا فون آیا تھا۔ وہ چاہتا ہے تم اس کے پاس آسٹریلیا چلے جاؤ۔ اس کا بہت بڑا بزنس ہے۔ کوئی بیٹا نہیں وہ چاہتا ہے تم اس کا بزنس سنبھال لو۔ ویسے بھی تم جاب لیس ہو۔ وہاں جاؤ گے تو سیٹ ہو جائے گی لائف اور تمہیں تو ویسے بھی بہت شوق تھا باہر جانے کا۔ سمجھو تمہاری لاٹری نکل آئی۔ اس کی دو بیٹیاں ہیں۔ اگر سمجھ میں آئیں تو کسی کا انتخاب کر لینا۔ ویسے اس نے ایسا کوئی ذکر کیا نہیں' بس یہی کہا پارٹنر کی ضرورت ہے۔ میرے خیال میں اس کے دل میں یہی خیال ہے۔"

"شادی دادی کے جھنجھٹ میں نہیں پڑنا مجھے۔ ویسے میں وہاں جانے کے لیے دل و جان سے راضی ہوں۔ آپ انویسٹ کریں۔ میں طارق انکل سے پارٹنر شپ کر لیتا ہوں۔" اس نے پہلو بدلتے ہوئے کہا تو فاروق کہنے لگے۔

"تم پہلے جانے کی تیاری کرو۔ وہاں جا کر بزنس کا جائزہ لو۔ تمہیں سرمایہ فراہم کر دوں گا۔ منسٹری آف فارن افیئرز آفس میں سجان ہوتا ہے۔ وہاں جا کر اس سے ملو۔ ارجنٹ سارے کام کراؤ۔ طارق کو کال کر کے کنفرم کرو کہ تم آ رہے ہو وہاں۔"

وہ بردباری سے اسے سمجھا رہے تھے۔ وہ اوکے کہتا ہوا فون کی جانب چل دیا۔ اس کا بچپن کا خواب تھا۔ باہر جانے کا اور خواب کی تعبیر پوری ہونے کو تھی۔

☼ ☼ ☼

دوسرے دن ہی وہ پروا کو لینے جا پہنچا۔

"تم یہاں آ کر بیٹھ گئی ہو۔ میری پیکنگ کون کرے گا بھئی۔" وہ دروازے سے دیکھتے ہی اسے جوش سے بولا۔ سیڑھیاں اترتے بھیا نے بخوبی اس کی آواز سنی تھی۔

"کہاں جا رہے ہو تم؟"

وہ اچنبھے سے پوچھنے لگی۔ ابھی دو چار روز پہلے تو وہ یہاں آئی تھی۔ اتنے سے دن میں ایسا کیا ہو گیا تھا۔

"آسٹریلیا میرے خوابوں کی جنت۔ جہاں

آسائشات ہیں دولت ہے۔ حسن ہے۔" اس نے مزے لے لے کر بتایا۔ وہ اندر تک سلگ کر رہ گئی اور تنک کے بولی۔

"یہ بولو نا کہ حسن ہی حسن ہے۔"

وہ قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔ اسی اثناء میں بھیا اس سے ہاتھ ملا کر اس کے ساتھ بیٹھ چکے تھے۔ وہ بھیا کے ہاتھ پر ہاتھ مارتا آنکھ دبا تا گویا ہوا۔

"دیکھیں بھیا! کیسے جل رہی ہے میرے جانے سے۔"

"کہاں جا رہے ہو تم شہزادے؟" بھیا نے لاڈ سے پوچھا تھا۔ دل میں لیکن ہلکی سی خلش عود کر آئی تھی۔ وہ انہیں مختصراً "جانے کا بتا کر پروا سے پوچھنے لگا۔

"سب کام چھوڑو۔ تم اپنا بتاؤ تم رہ لوگی؟"

"آمنہ مامی کیسے رہیں گی تمہارے بغیر؟"

"مجھے پاپا اور ماما نے پرمیشن دی ہے تب ہی جا رہا ہوں بہتر مستقبل کے لیے۔"

"مت جاؤ ہدی پلیز۔" اس نے دکھ بھرے لہجے میں منت کی۔ بھیا کے انگ انگ میں بے چینی پھیلنے لگی۔ وہ بڑی عجیب سی ہاری ہوئی نگاہوں سے اسے تکنے لگے۔ جو ہدی کے جانے کا سنتے ہی دکھوں میں گھر گئی تھی۔ ستارہ نے چائے دی اور ہدی سے گپ شپ کرنے لگی۔ موضوع بدل گیا۔ پر پروا کی سوئی وہیں اٹکی رہی۔

"ہدی! تم چلے جاؤ گے تو مجھے ستارہ کے گھر کون لے کے آئے گا؟"

"تم چھوڑو چاند ستارہ کا گھر، میرے ساتھ چلو۔ وہاں میرا کمرا کون سمیٹا کرے گا۔" اس نے شرارت سے ستارہ کو دیکھتے کہا۔

بھیا کو لگا تھا اس سے زیادہ تلخ چائے انہوں نے کبھی نہیں پی ــــ وہ اٹھ کر باقی لوگوں سے ملنے چلا گیا اور سب اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے۔ بھیا نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ ان کی آواز کسی گہری کھائی سے آتی محسوس ہوئی تھی۔

"اتنا دکھ مت کرو پروا۔ وہ کہہ رہا ہے نا تمہیں بلوا لے گا۔"

وہ حیرت سے انہیں دیکھتے کچھ کہنے لگی کہ ہدی شور مچاتا آیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کے کھینچتا دروازے کی جانب بڑھا اور گردن گھما کر بتانے لگا۔ "ماما نے بلوایا ہے اور کہا تھا جس حال میں بھی ہو اٹھا کر لے آنا۔"

"ہدی سلیپر تو پہن لینے دو۔ میرا سامان بھی ہے۔"

اتنی دیر میں ستارہ بھاگتی اس کا ہینڈ بیگ اٹھا لائی تھی۔ بھیا ہونٹوں کو دانتوں سے کاٹتے ٹی وی ٹرالی کے سائیڈ میں سجے "گھر" کو دیکھتے رہے جسے بڑی شوق سے اس کے لیے خریدا تھا۔ گھر کے بیرونی دروازے سے آتی ہدی، ستارہ اور پروا کی آوازیں ان کی سماعت میں خلط ملط ہونے لگیں۔

☆ ☆ ☆

پروا کے جانے کو سب نے محسوس کیا تھا اور سب سے زیادہ کاکا جانی نے اپنے کمرے میں وہ اپنی بیوی سے یہی بات کر رہے تھے۔ ان کی بات چیت نے ایک نیا روپ دھالیا۔ انہوں نے بھیا کو بلوا بھیجا۔

"بیٹا! تم اپنی عملی زندگی میں آچکے ہو۔ اب تم گھر بسالو تا کہ ہم بھی اپنی زندگی میں تمہارے بچوں کو دیکھ لیں۔"

ان کی گردن جھک گئی۔

"ہم نے تمہارے لیے ایک لڑکی کا انتخاب کیا ہے، جو سب کی دیکھی بھالی بہت معصوم لڑکی ہے۔" بھیا کا دل، دل کی اداس بستی میں ڈوب کر ابھرا تھا۔

"کون پاپا؟" کاکا جانی نے بیگم کی جانب یقین سے دیکھتے اس کا نام لیا تھا۔

"پروا!"

"نہیں بابا! وہ تو کافی چھوٹی ہے۔ ہماری مینٹلی انڈر اسٹینڈنگ نہیں ہو پائے گی اور دوسری بات یہ کہ شاید وہ میرے لیے رضامند نہ ہو۔ آپ کوئی اور لڑکی دیکھ کر میری مرضی معلوم کیے بنا بھی فائنل کر سکتے ہو۔ پر پروا نہیں بابا۔"

پھر کاکا جانی نے انہیں بہت قائل کرنے کی کوشش کی پر ان کا جواب دو ٹوک ہی رہا۔ پھر وہ تھکے تھکے قدموں سے اپنے کمرے کی جانب چل دیے اور جاتے ہوئے ٹرالی سے وہ گھر بھی لے گئے تھے۔ جس کو لے جانے کا خیال بھی اس کے دل میں نہیں آیا تھا۔

☆ ☆ ☆

ستارہ کو پتا چلا کہ ایسا سلسلہ بھی گھر میں چلا ہے، جس سے اس کی پیاری دوست اسی گھر کا حصہ بن سکتی تھی مگر بھیا کے انکار سے کہانی الٹ ہو گئی اور جب اسے وجوہات پتا چلیں تو اس نے دونوں فریقین سے بات کرنے کی ٹھانی۔ پہلے تو اس نے بھیا سے بات کی اور انہیں قائل کرنے کی ہزار کوشش کی پر ان کی نہ ہاں میں نہ بدلی، اس نے پوچھا جب آپ کے دل میں ایسی بات نہیں تھی تو آپ اتنی دور سے اس کے لیے یہ تحفہ کیوں لائے۔ انہوں نے ستارہ کو یہ کہہ کر لاجواب کر دیا کہ گفٹ تو میں تمہارے لیے بھی لایا تھا۔ وہ تھکی ہوئی پروا کو فون ملا بیٹھی۔

"پروا! تم آج کل میں گھر آجاؤ یار! تمہارا سامان پڑا ہے۔ آکر لے جاؤ۔"

"میں کافی بزی ہوں۔ ہدی شاپنگ کر رہا ہے تو مجھے بھی ساتھ لے جاتا ہے۔"

"تم ہدی سے کہو ایک گھنٹے کے لیے تمہیں چھوڑ دے یہاں۔"

"ستارہ! میں پرسوں ہی تو آئی ہوں وہاں سے ہدی بہت طعنے مارے گا۔"

"بند کرو یہ ہدان نامہ۔ تمہارا کزن ہے تو میرا بھی کزن ہے وہ۔ اور جتنا ایڈیٹ وہ ہے۔ میں جانتی ہوں۔ میں اسے کال کر کے کہوں گی تو لے آئے گا تمہیں۔"

وہ جھنجلا کر بولی تو پروا ہنسنے لگی۔ "ٹھیک ہے وہ لائے گا تو میں آجاؤں گی۔"

تیسرے دن وہ اسے وہاں چھوڑ گیا تھا۔ وہ سب سے مل کر اپنا چھوٹا موٹا سا اکٹھا کرنے لگی۔

پروا نے جب وہاں گھر نہیں دیکھا تو جھجکتے ہوئے ستارہ سے استفسار کیا۔

"ستارہ ـــ وہ گھر میں نے رکھا تھا وہاں اب نہیں ہے۔"

ستارہ نے سنک میں برتن کھنگالتے اسے مڑ کر بڑی کھوجتی نگاہوں سے دیکھتے بتایا تھا۔

"بھیا لے گئے تھے واپس۔ انہی کے کمرے میں ہے۔ جاؤ لے آؤ۔ بھیا اوپر ہی ہیں۔" وہ کچھ جز بز ہوئی ستارہ کو دیکھتی رہی۔ ستارہ اس کی ہچکچاہٹ دیکھتے پھر گویا ہوئی۔

"ارے جاؤ نا۔ بھیا حفاظت کے پیش نظر لے گئے ہوں گے۔ تم جا کر مانگو گی تو دے دیں گے۔ منع تھوڑی کریں گے جو تم کنفیوژ ہو رہی ہو۔"

"جاتی ہوں۔ تم جلدی کام نپٹالو۔ ہدی آجائے گا تو بیٹھنے نہیں دے گا اور تمہاری ضروری بات پھر بیچ میں رہ جائے گی۔"

وہ دھیرے قدموں سے مختلف سوچوں کے دھارے میں گھری ان کے دروازے پر جا پہنچی تھی۔ اس نے دستک دی تو "کم ان" کی آواز آئی۔ اس نے ہلکے سے دروازہ کھول کر کمرے میں قدم رکھا۔ وہ لیپ ٹاپ پر جھکے کسی کام میں مصروف تھے۔

پروا نے دھیرے سے سلام کیا تو ان کا چونکنا فطری تھا۔ وہ اضطرابی کیفیت میں ہاتھوں کی انگلیاں مروڑ رہی تھی۔

"وہ میں ـــ گھر لینے آئی تھی اس دن ہدی نے ـــ"

بھیا نے بات کاٹ دی۔

"ہاں ہاں ضرورت ہو تو لے جاؤ وہ رکھا۔" انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے اس کی نشاندہی کی۔ پر وہ ضرورت پر اٹک گئی تھی۔

"ضرورت۔"

پروا کا لہجہ سپاٹ تھا۔ کچھ چھن سے ٹوٹا تھا دل کی آباد بستی میں۔ اتنی جلدی بدل گئے یہ۔ کیسا انجان سا لہجہ ہے ان کا آج۔

"مجھے لگا تحفے ضرورت کے تحت ہی دیے اور لیے

جاتے ہیں۔"

انہوں نے کہا تو وہ بغیر کچھ کہے کمرے سے نکل گئی۔ انہیں لگا شکست کا دھواں اس انتہائی خوب صورت کمرے میں اتنی تیزی سے پھیلا تھا کہ آنکھیں جن کے احساس سے سرخ ہونے لگی تھیں۔

☼ ☼ ☼

ستارہ جب کام نپٹا کر اپنے کمرے میں آئی تو وہ چپکے چپکے آنسوؤں کو پیتی بیٹھی انجانی سوچوں میں غلطاں تھی۔ ستارہ کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ رو رہی ہے۔ اس نے محبت سے اس کے پاس بیٹھ کر اس کے ہاتھوں کو تھامتے پوچھا تھا۔

"کیا ہوا پروا!؟ بھیا نے گھر نہیں دیا؟"

اس کے رونے میں تیزی آ گئی۔ ستارہ پریشان ہو کر اس کے آنسو پونچھنے لگی تھی۔

"پھر..."

"بھیا نے میرے ساتھ بہت روڈلی بیہو کیا۔ ہمدی مجھے زبردستی لے گیا تو پھر یہیں رہ گیا تھا۔ میں جان بوجھ کر تو چھوڑ کر نہیں گئی تھی نا۔ بھیا سمجھ رہے ہیں، مجھے اس کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔ بھلا تحفے بھی کبھی ضرورتوں کے تحت لیے اور دیے جاتے ہیں۔ حالانکہ مجھ سے زیادہ گھر کی ضرورت کس کی ہو گی؟ زندگی نے مجھے سب کچھ دیا سب کچھ۔ پر مجھے جو چیز فیسی نیٹ کرتی ہے وہ ایک چھت ہے اور جب انہوں نے مجھے گھر دیا تھا تو میرے دل نے کہا تھا وہ گھر نہیں ایک چھت دینا چاہتے ہیں مجھے۔ پر میں اپنی ضرورت کے لیے ان کے آگے کیوں ہاتھ پھیلاؤں؟ جب انہیں ہی میری فیلنگز کی کوئی قدر نہیں۔"

اس کے سارے فلسفے پر بس فیلنگز پہ آ کر ستارہ چونکی۔

"کیا فیلنگز ہیں تمہاری بھیا کے لیے؟"

پروا کو لگا اس کی چوری پکڑی گئی ہے۔ وہ ہونقوں کی طرح ستارہ کو دیکھنے لگی۔ گلابی گلابی نم آنکھوں پر گھنی پلکوں کی جھالر اسے اتنا دلکش بنا رہی تھی کہ ستارہ بھی اسے ایک ٹک دیکھے ہی گئی۔ دانتوں سے ہونٹوں کو کترنے لگی۔

"تم بھیا کو پسند کرنے لگی ہو کیا؟" ستارہ کے کھوجتے لہجے پر وہ گردن اثبات میں ہلا بیٹھی۔ پروا کے اقرار نے بھیا کے سارے خدشات پر پانی پھیرا اور وہ "ہرے" کا نعرہ لگاتی بھیا کے روم کی جانب دوڑی تھی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ اتنی آسانی سے مسئلہ حل ہو جائے گا۔ وہ بھیا کے کمرے میں پہنچی تو دونوں ہاتھوں کو سر کے نیچے پھنسائے کسی اور دنیا میں گم تھے۔ وہ بہت پرجوش ہوئی کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

"بھیا! انقلاب آ گیا ہے اور آپ نجانے کہاں گم ہیں۔ آپ نے پروا کو گھر کیوں نہیں دیا۔ ویسے اچھا کیا۔ اس طرح سے مسئلہ خود ہی حل ہو گیا۔" وہ بے ربط بول رہی تھی۔ اس کی تو دلی خواہش پوری ہونے کو تھی۔ بھیا تعجب سے اٹھ بیٹھے تھے۔

"کیا ہو گیا۔ کیوں پاگل ہوئے جا رہی ہو؟"

"بھیا! پروا نے اپنی فیلنگز مجھ سے شیئر کی ہیں، وہ آپ کے لیے کچھ خاص فیلنگز رکھتی ہے۔" اس نے خاص کو بڑی معنی خیزی سے کھینچ کر بولا تھا بھیا کے دل میں کچھ ——— ہونے لگا تھا۔ وہ انجان بن کر پوچھنے لگے۔

"کیسی فیلنگز؟"

"وہ آپ کو پسند کرتی ہے۔"

بھیا بے یقینی سے اسے دیکھنے لگے۔ دل کی بستی میں کالی گھٹائیں چھائیں اور ٹوٹ کر مینہ برسا۔ ستارہ انہیں پروا کا لفظ بہ لفظ بتانے لگی۔ بھیا نے خود کو نارمل ظاہر کر کے ستارہ کو کہا۔

"جاؤ۔ اس پاگل لڑکی کو یہ گھر دو اور اسے کہنا گھر ہی نہیں گھر والا بھی اس کا ہے۔"

کھڑکی سے جھانکتا سولہویں رات کا چاند اپنی کرنوں کو محبت کی صورت اوڑھے ان کے کمرے میں اتر آیا تھا۔

☼ ☼ ☼

بہت جلد ہی ہمدی کا سارا کام مکمل ہو گیا۔ اور وہ ہنستا ہنساتا آسٹریلیا چلا گیا۔ طارق انکل کی دونوں بیٹیاں بے حد حسین تھیں وہ جلد ہی ان کے ہاں ایڈجسٹ ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد ایک بھیگی سی شام کو ستارہ نے اپنی پوری فیملی کے ساتھ ہلا بول دیا تھا۔ پروا کو ڈھیروں شرم نے آن گھیرا اور اس نے خود کو کمرے میں قید کر لیا۔

سب سے بڑا دھچکا فاروق ماموں اور آمنہ مامی کو لگا تھا۔ ان کے دل کی خواہش لبوں پر آنے سے پہلے دم توڑ گئی۔ فاروق ماموں کی اولین خواہش تھی کہ بیٹی جیسی بھانجی بہو کے روپ میں سدا اسی گھر میں رہ جاتی۔

ستارہ نے ڈھکے چھپے لفظوں میں سب کے سامنے دونوں کی فیلنگز کو بیان کر دیا۔ فاروق ماموں کے پاس کوئی جواز ہی نہیں رہا تھا کہ وہ ایک لفظ بھی منہ سے نکالتے۔ پھر کاکا جانی کا احترام کہ وہ اتنی شفقت سے یتیم بچی کے سر پہ ہاتھ رکھ رہے تھے اور انہیں یہ بھی اندازہ تھا کہ ان کا بیٹا زمانے بھر کی لڑکیوں میں الجھا رہتا ہے اور باہر جانے کی خواہش کے پیچھے بھی یہ ہی مقصد تھا کہ وہ کسی یورپی شہریت والی لڑکی سے شادی کر کے باہر سیٹ ہو جائے۔ اسی لیے انہوں نے طارق کی بیٹیوں کو بھی دیکھ لینے کا کہا تھا۔ سو اسی دن یہ رشتہ پکا ہو گیا۔ ستارہ نے اسے بھینچ کر مبارک باد دی تھی۔

"بھیا سے نہیں ملو گی؟" اس کا لہجہ شرارتی تھا۔ اس کے چہرے پر دھنک برسنے لگی تھی۔

"نن... نہیں پلیز..."

"اور ہاں اب انہیں بھیا کہنا چھوڑ دو نام لیا کرو۔"

"ستارہ!" اس نے سرزنش کی۔ وہ شرارت سے پروا کو چھیڑنے لگی۔

"ستارہ نام نہیں ہے میرے بھیا کا حسنین ہے حسنین۔ سمجھیں پروا حسنین!"

پروا نے اسے تکیہ اٹھا کر مارا تھا۔ زندگی اتنی حسین بھی ہو سکتی ہے۔ اس نے کبھی سوچا نہیں تھا۔ در و دیوار مسکرانے لگے تھے۔

☼ ☼ ☼

ہمدی وہاں جا کر کچھ تو بزنس میں بزی ہو گیا کچھ مصروفیت طارق کی بڑی بیٹی ریجا تھی۔ ریجا ایک نڈر اور بے باک لڑکی تھی۔ اسے پروا کے منسوب ہونے کی خبر نہ ہو سکی تھی اور پھر اچانک یوں ہوا کہ فاخرہ کو انجائنا کا ——— اٹیک ہو گیا۔ انہوں نے ڈسچارج ہوتے ہی پروا کے نکاح کی رٹ لگا دی۔

دوسرے ہی دن کاکا جانی سے مشورہ کے بعد وہ حسنین سے نکاح کے بندھن میں بندھ گئی۔ کاکا جانی تو رخصتی بھی چاہتے تھے۔ پر فاخرہ کے کچھ ارمان تھے، سو رخصتی موخر کر دی گئی اور وہ سرخ جوڑے میں بغیر کسی میک اپ کے جب اپنے کمرے میں پہنچی تھی اس کے سیل پر آنے والی کال ہمدی کی تھی۔ اس کے انگ انگ میں سرخوشی تھی۔ محبت کو پا لیا تھا، کوئی عام بات تو نہ تھی نا! اس نے سانسوں کو برابر کرتے کال ریسیو کی تھی۔

"ہمدی ایڈیٹ! تم کہاں مرے ہوئے تھے اتنے دنوں سے۔ نہ مجھے کال تک نہ کی تم نے اور نہ ہی تم آن لائن ہوئے۔ بہت کچھ ہے تمہیں بتانے کو۔"

"کون سا انقلاب آ گیا وہاں میرے یہاں آتے ہی۔ جو خوشی سے مری جا رہی ہو تم۔" وہ اسے تپانے کو کہہ رہا تھا۔ آج تو اس کی ہر بری بھلی بات پر اسے دل کھول کر ہنسنا تھا۔

"ہمدی! آج میرا نکاح ہو گیا اچانک۔ مجھے تو خود یقین نہیں آ رہا کہ میں کسی کی منسوب ہو چکی ہوں۔"

"مذاق کر رہی ہو؟" اس کی سنجیدہ آواز ابھری۔ "اگر تمہیں یقین نہیں آ رہا تو فاروق ماموں سے پوچھ لو۔ لینڈ لائن پر کال ملاؤ تم۔ وہ فون کے نزدیک ہی ہیں۔"

دوسری جانب خاموشی چھا گئی۔ وہ لائن کاٹ کر لینڈ لائن پر کال ملا چکا تھا۔ کال فاروق ماموں نے اٹینڈ کی تھی۔

"پاپا! مجھے جو کچھ پروا نے بتایا کیا وہ سچ ہے؟"

"اس نے تمہیں نکاح کا بتایا ہو گا، ہاں آج اس کا

نکاح ہوگیا ہے۔ تم۔۔۔" ان کا جملہ ابھی مکمل نہیں ہوا تھا۔ وہ کال کاٹ کر دوبارہ پروا کو کال ملا بیٹھا۔

"کون ہے وہ؟" اس کا لہجہ ابھی تک ہنوز ویسا ہی تھا۔ سپاٹ اکھڑا اکھڑا۔

"ہمدی! محبت کر کے محبت کو پالینا کتنا فسوں خیز ہوتا ہے۔ یہ بیان نہیں کیا جاسکتا ہے۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی یہ سب اتنا آسان ہوگا۔" اس کی اکھڑی سی آواز پھر سیل فون سے نکلی۔

"کس سے محبت ہوگئی ہے تمہیں؟"

"ستارہ کے بھیا سے۔ مجھے ستارہ نے بتایا تھا کہ وہ بھی مجھے پسند کرتے ہیں۔ پر جب کاکا جانی نے رشتے کی بات کی تو پتا ہے انہوں نے انکار کر دیا تھا اور تم سنو گے تو بہت ہنسو گے' ان کے انکار کی وجہ سن کر۔" دوسری جانب سانسوں کا جوار بھاٹا تھا۔ وہ اپنی ہی کہے جارہی تھی۔ اس نے ذرا توقف کے بعد دوبارہ کہا۔

"انہوں نے یعنی۔۔۔ حس۔۔۔ حسنین نے یہ کہہ کر انکار کیا تھا میں اور تم ایک دوسرے میں۔۔۔"

وہ حسنین کے نام پر ذرا سی اٹکی اور آخر میں ہنسنے لگی۔

"کیسی عجیب ریزن دی انہوں نے میں اور تم آپس میں انٹرسٹڈ! ہاؤ اسٹرینج بھلا ایسا بھی ہوسکتا ہے۔ تمہیں تو مشرقی لڑکیوں میں کبھی کوئی چارم نظر ہی نہیں آیا۔ میں نے ستارہ کو بتا دیا تھا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے اور یہ کہ میرا دل جسٹ اس کے بھیا کے لیے دھڑکتا ہے۔ پھر کہیں جا کر وہ راضی ہوئے اور آج اتنی اچانک یہ سب کچھ ہوگیا کہ مجھے سمجھ میں نہیں آرہا' میں کیا کروں۔"

پروا کو تھوڑی دیر بعد احساس ہوا تھا۔ دوسری جانب اس کی خوشی کو شیئر کرنے کے لیے کوئی نہیں ہے۔

☼ ☼ ☼

ہمدی کو لگا تھا ہر طرف آگ ہی آگ ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ وہ ان دیکھی آگ میں کیوں جھلس رہا ہے۔

ہمدان فاروق تو اپنی چیزیں کسی کو نہیں دیا کرتا۔ اوہ میرے خدا میں نے یہاں آنے میں کتنی جلدی کی۔ کتنی سفاکی سے اس نے مجھے کہا کہ میرے اور اس کے درمیان بھلا کچھ ہوسکتا ہے۔ میرے اندر ایسی کیا کمی ہے' جو اسے محبت کرنے کے لیے میں نظر ہی نہیں آیا۔

اس کی ذہنی رو بہکنے لگی تھی۔ آج تو اس کا کہیں بھی دل نہیں لگ رہا تھا۔ نہ حسین و جمیل ریجا میں' نہ سٹڈنی کے پرفسوں ماحول میں۔ وہ ریجا کو اگنور کرتا سٹڈنی برج پر جا پہنچا تھا۔ ہر طرف دھند تھی اور وہی دھند اس کے اندر بھی سرائیت کرنے لگی۔

"پروا۔۔۔ تم میری ہو۔۔۔ دنیا کی کوئی طاقت۔۔۔ تمہیں مجھ سے علیحدہ نہیں کرسکتی۔"

پھر جنوں کچھ اور بڑھا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"مجھے اسے لے کر آنا چاہیے تھا۔"

☼ ☼ ☼

دوسرے دن سلگتی سوچوں میں گھرے اس نے فاروق کو فون ملایا تھا۔

وہ باپ تھے۔ اس کے تو لہجے کی کھنک سے پہچان لیا کرتے تھے کہ وہ کس ترنگ میں ہے۔

"نہیں لگ رہا میرا دل یہاں۔ یہ کیا کر دیا آپ لوگوں نے میرے ساتھ۔"

اس کی آواز کسی کھائی سے آتی محسوس ہوئی تھی۔

"آپ نے میری زندگی چھین لی۔"

"ہمدان! کھل کر بات کرو بیٹا! کیا بات ہے؟"

"آپ نے پروا کو اٹھا کر حسنین کے حوالے کر دیا۔ آپ نے ایک دفعہ بھی مجھ سے پوچھنا گوارا نہیں کیا۔ میرے جاتے ہی اتنے بڑے بڑے فیصلے ہونے لگے۔"

"اگر تمہاری دلچسپی ہوتی تو تم جانے سے پہلے ہمارے کانوں میں بات ڈال کر جاتے۔ ہمارے دل کی بھی یہی خواہش تھی۔ مگر تم نے کبھی کسی کو سیریس لیا ہی نہیں۔ ہم کیسے اسے تمہارے لیے مانگ لیتے۔ تمہاری دلچسپیوں سے پورا خاندان آگاہ ہے۔ تم تو خوشی خوشی چلے گئے۔ تمہیں یہ فکر ہوتی کہ تمہارے بعد وہ کسی اور کی نہ ہوجائے تو خود کو کسی بندھن میں باندھ کر جاتے اور ساری بات یہاں ختم کرو۔ یہ رشتہ پروا اور حسنین کی رضا سے ہوا ہے۔ تمہارے کاکا جان سوالی بن کر آئے تو انہیں کیسے واپس لوٹا دیتے؟"

فاروق کی کسی ایک بات نے بھی اس کے سلگتے وجود پر پانی نہیں ڈالا تھا۔

"وہ معصوم ہے بابا! اسے حسنین نے بہکا لیا ہے۔ وہ حسنین کی باتوں میں آگئی۔ ورنہ وہ تو میرے بغیر ایک قدم بھی نہیں چل سکتی۔"

ہمدان کی آواز بھیگنے لگی' پر فاروق کے اندر ایک دراڑ بھی نہ آئی۔

"دنیا میں لڑکیوں کی کمی نہیں ہے ہمدان! اور تمہارے لیے تو بالکل بھی نہیں۔ میں طارق سے ابھی بات کرلیتا ہوں ریجا کے لیے۔ تم فضول خود کو الجھا رہے ہو۔ پروا اور تمہاری کوئی انڈر اسٹینڈنگ ہوتی تو پروا خود اس رشتے سے انکار کر دیتی۔ اسے تم میں دلچسپی ہی نہیں تھی۔"

"آپ اس نکاح کو ختم کرا دیں۔ ابھی کچھ نہیں بگڑا اور اگر آپ نے ایسا نہیں کیا تو۔۔۔" اس نے سب کچھ بہت چبا چبا کر کہا تھا۔ فاروق ایک دم جلال میں آگئے تھے۔

"دماغ تو خراب نہیں ہوگیا تمہارا؟ تمہارے کہنے پر میں اپنی بھانجی کا گھر بسنے سے پہلے ہی اجاڑ دوں؟ تم جیسی ناہنجار اولاد سے بہتر تھا میں بے اولاد ہی رہتا اور جب تک تمہارا دماغ درست نہ ہو یہاں فون مت کرنا۔"

وہ ان کے غصے کو کسی خاطر میں لائے بغیر گویا ہوا تھا۔

"پروا میری ضد ہے۔ اس نے مجھے چھوڑ کر کسی اور کا ہاتھ تھاما ہے۔ اسے تو میں خود دیکھ لوں گا۔ اسے دنیا کی کوئی طاقت مجھ سے جدا نہیں کرسکتی یاد رکھیے گا۔"

اس نے غصے میں فون رکھ دیا اور یہ اس کی آخری کال تھی۔

☼ ☼ ☼

دوسری ہی بیل پر کال ریسیو کرلی گئی۔ وہ سیل فون ہاتھ میں لیے ہی بیٹھی تھی۔

"کیسے ہو ہمدی؟ اب تو میری یاد تمہیں بڑی جلدی جلدی آنے لگی ہے۔ ورنہ تم تو مجھے وہاں جا کر بھول ہی گئے تھے۔"

ہمدی کو لگا کہ وہ اس سے زیادہ خوش کبھی ہوئی ہی نہیں تھی۔ اس کی آواز کے اتار چڑھاؤ میں ایک سرور کی کیفیت تھی۔

"کچھ بولنے کا موقع دو گی مجھے؟"

وہ بے ساختہ ہنسی تھی۔ ہمدی کو لگا جیسے بہت ساری کانچ کی چوڑیاں کھنکی ہوں۔ پھر وہ اسی کھنکتی ہوئی آواز میں بولی۔

"کیا ہوا ہمدی! ناراض ہو؟"

اس نے ایک گہری سانس لی۔

"بات یہ ہے پروا کہ یہ میرا پاگل دل ہر چمکتی چیز کو سونا سمجھ کر اس کی جانب لپک جاتا تھا' پر میری منزل میرے اتنے قریب تھی اور مجھ پر کبھی ادراک ہی نہ ہوا۔ مجھے جس نام سے خوشی مل سکتی تھی میں نے دل کو کھوجا ہی نہیں کبھی اور جب سب چیزوں سے دل بھر گیا تو خیال آیا اپنی سب سے قیمتی چیز تو میں پاکستان ہی چھوڑ آیا۔ مجھے لگتا تھا اگر تم میرے دل میں ہو تو ہمدان فاروق بھی تو تمہارے دل میں ہوگا۔ میں مانتا ہوں میں نے ہر لڑکی میں دلچسپی لی۔ مگر وہ صرف میرا پڑاؤ تھا' میری منزل تم تھیں مگر تم نے اتنی آسانی سے حسنین کی باتوں میں آکر۔۔۔ تم نے میرا انتظار بھی نہ کیا؟"

"اس ساری بکواس کا کیا مطلب ہے ہمدان!"

"بکواس نہیں میری فیلنگز ہیں یہ۔ تم اس نام نہاد نکاح کو ختم کرو۔ میں آرہا ہوں نیکسٹ ویک۔ پھر ہم

شادی کرلیں گے اور تمہیں مجھ سے کوئی طاقت چھین نہ پائے گی۔"

وہ ایک دم پھٹ پڑی "حسنین میری زندگی ہیں' میں ان کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ اللہ نہ کرے کہ یہ نکاح کبھی ختم ہو' تمہیں تو پرانی عادت ہے میری خوشیوں کو آگ لگانے کی۔ میں لعنت بھیجتی ہوں تمہاری شکل پر۔ آئندہ مجھے کال مت کرنا میں حسنین کی ہوں اور مرتے دم تک ان ہی کی رہوں گی۔ اپنے آنگن میں چنبیلی سا لگایا ہے مجھے حسنین نے اور مجھے اپنے پورے جذبوں کے ساتھ ان ہی کے گھر میں مہکنا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے تم میرا ساتھ نہیں دو گی؟"

پروا نے بغیر جواب دیے فون بند کر دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

دو ماہ ایسے گزرے جیسے رات کے پیچھے دن لگا ہو۔ ان دو ماہ میں ہمدی کی کہی گئی ساری بکواس پروا کے اندر آہستہ آہستہ جھاگ کی مانند بیٹھ گئی اور اس کا دوبارہ کسی بھی قسم کا رابطہ نہ کرنے پر وہ یہی سمجھی کہ اس نے وہ ساری بکواس ایسے ہی کی "جو وہ عادتاً" کرتا تھا۔ ان ہی بھاگتے دوڑتے دنوں کے درمیان اس کی رخصتی طے پا گئی۔

فاروق نے آمنہ کو اس کی باتیں بتا دی تھیں۔ انہوں نے خود اسے کال کی تھی۔ وہ انہیں نارمل لگا تھا۔ پروا کی رخصتی کو بھی اس نے معمول کی خبر جتنا لیا تھا۔ اس نے بتایا وہ اپنا پورا ٹائم بزنس کو دے رہا ہے اور یہ کہ وہ اپنے بزنس کو مزید پھیلا کر خود کو جلد از جلد سیٹ کرنا چاہتا ہے۔

رخصتی کی تاریخ طے ہو جانے کے بعد وہ کون سا خواب تھا جو اس نے آنکھوں میں نہ سجایا ہو۔ وہ چاند کی تمنائی تھی اور چاند آنگن میں اترنے کو تھا۔

پھر ایک جھلملاتی ستاروں سے بھری شب تھی اور خوشبو میں ہر سمت رقص کرتی تھیں۔ چاند بھی اس کی صبیح پیشانی پر بوسہ دینے کے لیے اسی کمرے کی کھڑکی سے اتر آیا تھا جہاں وہ محبت دوپٹے کے پلو میں باندھے مسہری کے عین وسط میں بیٹھی اپنے محبوب کی راہ تکتی تھی۔ کیسا غضب ڈھایا تھا سرخ انگارہ سے شرارے کے سوٹ میں اس نے۔ حسنین نے اس کے پاس بیٹھ کر دھیرے سے اس کا ہاتھ تھاما اور ایک ہیرے کی انگوٹھی اس کی مخروطی انگلی میں پہنا دی۔ حسن کے نظارے سے ایک جان لیوا فسوں سے کمرا بھر گیا۔ اس کے آنچل سے سارے جگنو نکل کر حسنین کی آنکھوں میں جھلملانے لگے تھے۔ اتنی مکمل جوڑی کو دیکھ کر چاند کو بھی حیا آئی اور وہ بادلوں کی اوٹ میں جا چھپا۔ پروا کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ دل دھڑک رہا ہے یا پورا وجود دل بن کر دھڑک رہا ہے۔ حسنین نے کچھ اور آگے بڑھ کر اس کے دلنشین چہرے کو چھوتے کہا تھا۔

"آج بھی چپ رہو گی کیا؟" اس نے دونوں ہاتھوں سے چہرے کو ڈھانپ لیا تھا۔ حسنین مسکرا اٹھا اور کھڑکی پر پردے برابر کر دیے تھے۔ اسے یہ بات بھی گوارا نہیں تھی کہ اس کے اور پروا کے بیچ یہ ضرر سا چاند بھی آجائے۔

حسنین نے اس سے گھر کے بدلے وفا مانگی تھی۔

☆ ☆ ☆

پورے تین سال بعد اس نے سرزمین پاکستان پر قدم رکھا تھا۔ ان گزشتہ سالوں میں وہ کہاں سے کہاں جا پہنچا تھا' سب باخبر تھے۔ طارق کی شدید خواہش کہ وہ ان کا داماد بنے' پر اس نے سہولت سے معذرت کرلی تھی اور جتنا چارمنگ اور ہٹ کھٹ جواں دل سجا کو وہ شروع میں لگا تھا۔ اب وہ اسے گرم جوش نہیں دکھتا تھا۔ اس نے آہستہ آہستہ سب کچھ چھوڑ دیا تھا۔ پر سکون کہیں نہیں مل پاتا تھا۔

اس کا یوں آجانا اچانک نہیں تھا۔ اس کی پلاننگ کا ایک حصہ تھا۔ اسے معلوم ہو گیا تھا وہ حسنین کے بیٹے کی ماں بن گئی ہے۔

☆ ☆ ☆

اس نے گاڑی "پروا کا گھر" والی نیم پلیٹ کے سامنے جا روکی۔ کروفر سے چلتا اندر کی جانب بڑھا تھا۔ چوکیدار کا کا جانی کا پرانا ملازم تھا۔ سو وہ ہمدان کو دیکھتے ہی پہچان گیا تھا۔ اس نے بڑی عزت سے اسے ڈرائنگ روم تک پہنچا کر پروا کو اطلاع دی تھی۔ اس نے اپنے خوب صورت بالوں کو کیچر میں جکڑا اور نصیب کو گود میں اٹھاتی وہ ڈرائنگ روم میں پہنچی اس کا دل عجیب احساس میں گھرا تھا۔

حسنین کے آنے کا ٹائم بھی ہو گیا تھا۔ اس کے دروازے میں قدم رکھتے ہی وہ سیدھا کھڑا ہو گیا تھا۔ تین سال اس کی آنکھیں ترسی تھیں اس چہرے کو دیکھنے کے لیے۔ اس نے معیز اور عبیو کی آئی ڈی پر اس کی شادی کی تصویریں دیکھ رکھی تھیں۔ ہر روز وہ اپنے دل میں سلگتے انگاروں کو اس کی تصویروں سے ہوا دیا کرتا تھا اور ہر رات تجدید عہد کیا کرتا تھا کہ وہ بس اس کی ہے۔ اب اسے روبرو دیکھ کر اسے لگا تھا کہ وہ جسم اور چہرے میں کچھ بھر گئی ہے اور اس کا بیٹا بھی ہو' بہو اس جیسا ہی تھا۔

اس نے آگے بڑھ کر نصیب کو اس سے لے کر اپنے سلگتے ہونٹوں کو اس کی پیشانی پر ثبت کیا تو پروا کے سر اٹھاتے خدشات ٹھنڈے پڑ گئے اور وہ بہت خوش اخلاقی سے اس کا حال احوال دریافت کرنے لگی۔ وہ بھی اسے آسٹریلیا کی چھوٹی چھوٹی باتیں بتانے لگا تھا۔ اسی اثنا میں حسنین بھی آگیا اور اس سے بڑے تپاک سے ملا۔

"بھیا! کون سی چکی کا آٹا کھلاتے ہیں اسے کتنا بھر گیا ہے اس کا جسم۔"

اس نے بسکٹ منہ میں رکھتے ہوئے سوال داغا' جو ٹھاہ کر کے حسنین کے سینے میں لگا تھا۔ وہ سنبھل کر بولا۔

"بچے کے بعد' چینجنگ تو۔۔ ہی جاتی ہیں۔ تم سناؤ کب کر رہے ہو شادی؟"

"شادی ہی تو کرنے آیا ہوں یہاں۔"

اس نے گہری نگاہ پروا پر ڈالتے کہا تھا۔ پروا نصیب کو چپس کھلانے میں مگن تھی۔

"ویری گڈ۔۔۔ پھپھو بھی اکیلے پن سے اکتا گئی ہیں۔ تمہارے بچوں کو کھلائیں گی تو ان کے لیے بھی دل لگی کا ساماں پیدا ہو گا۔"

وہ ان کی بات پر سر ہلا کر رہ گیا۔ پھر اٹھتے ہوئے اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک مخملی ڈبیا نکال کر پروا کو تھمائی۔

"تمہاری شادی کا گفٹ ہے۔ تم نے تو شادی میں جھوٹے منہ بھی نہ بلایا۔ پر میں اپنا فرض سمجھتے ہوئے وہیں سے خرید کر لایا ہوں۔"

پروا نے ایک نگاہ حسنین پر ڈالتے ہوئے ڈبیا کھولی ایک قیمتی لاکٹ سیٹ تھا جو کہ H کی شکل میں قیمتی نگینوں سے مزین تھا۔ پروا نے شکریہ کہتے وہ ڈبیا حسنین کی طرف بڑھا دی۔ حسنین نے "خوب صورت ہے" کہتے ہوئے اسے واپس تھما دی۔

"شادی میں یوں نہیں بلایا کہ تمہیں گئے ہوئے تین' چار ماہ ہی تو ہوئے تھے۔ تمہارا نیا نیا بزنس سیٹ ہوا تھا نا۔" اس کا لہجہ سمجھاتا سا تھا۔

"بس رہنے دو' بھیا! آپ کو یاد ہے نا جب میں جا رہا تھا تو کیسے بچوں کی طرح مجھے روک رہی تھی۔ مت جاؤ ہمدی! میں تمہارے بن تنہا ہو جاؤں گی اور میرے روانہ ہوتے ہی گھر بسا لیا۔"

حسنین کا دل چاہا تھا کہ بس وہ چپ ہو جائے۔ پروا نے رات کے کھانے کے لیے روکا تھا اسے' پر وہ پھر کبھی آنے کا کہہ کر چل دیا۔ حسنین غیر شعوری طور پر اس کے جانے کے بعد بھی اس کی باتیں سوچتا رہا۔

☆ ☆ ☆

ہمدی سے دو' تین ملاقاتوں کے بعد ہی وہ پہلے کی طرح نارمل ہو گئی تھی۔ اسی طرح گھل مل کر باتیں کرنے لگی تھی۔ جیسے پہلے کرتی تھی۔ اسے لگا تھا سب کچھ ویسا ہی ہے جیسے پہلے تھا اور آج بھی گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ نصیب کو وہ ماما کے کمرے میں سلا چکی تھی۔ کھانے سے فارغ ہو کر سب سٹنگ روم میں

بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ جب وہ پروا کے برابر میں لیپ ٹاپ سمیت آکر بیٹھا تھا۔ وہ اسے مختلف تصاویر دکھا رہا تھا۔ انتہائی بولڈ ڈریسنگ میں کچھ تصویریں ریجا کی بھی تھیں۔ تصویریں بھی کسی کلب کی دکھتی تھیں۔ وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگی۔

"بہت مزے کیے ہیں تم نے وہاں۔"

"نہیں وہاں نہیں کیے' یہاں کروں گا۔"

اس کا جواب برجستہ تھا اور اتنی ہی برجستہ حسنین کی نگاہیں تھیں' جو ایک دم اس کی جانب اٹھی تھیں۔

"ہاں تو کرو نا' روکا کس نے ہے۔ شادی کرو تاکہ ہم بھی انجوائے سنٹ کریں۔" پروا نے اس کی جانب دیکھتے کہا تھا۔ ہمدی اس کے کان میں سرگوشی کرنے لگا اور اسی لمحے حسنین نے ان دونوں پر دوبارہ نگاہ ڈالی تھی۔ "شادی ہی تو کرنے آیا ہوں' لڑکی تو مان جائے پہلے۔"

اس کے لفظ سلگتے ہوئے تھے یا اس کا قرب۔ وہ سمجھنے سے قاصر رہی تھی۔ پھر وہ تھوڑا دور ہوتے بولی تھی۔

"مجھے بتاؤ کون ہے وہ' میں چٹکی بجاتے ہی راضی کرلوں گی۔"

"بتادوں گا وقت انتہائی قریب ہے۔" اس کا لہجہ گمبھیر تھا۔ وہ اوکے کہتی حسنین کو چلنے کا کہنے لگی۔

☼ ☼ ☼

گزشتہ بیس دنوں میں کوئی ایک بھی دن ایسا نہیں گزرا تھا کہ وہ اسے ایک دن بھی بنا دیکھے رہ پایا ہو۔ یا تو وہ کوئی آوٹنگ رکھ لیتا سب کو ساتھ لیے لیے پھرتا تو پروا کے لیے بھی آسانی سے جگہ نکل آتی۔ یا گھر پر ہی کوئی کھانے پینے کا پروگرام رکھ لیتا اور سب اسی لیے شامل ہوجاتے کہ وہ کئی برس بعد وطن لوٹا ہے۔ دوسرا یہ کہ وہ فاروق کا اکلوتا لاڈلا بیٹا تھا۔

اس مصروفیت میں پروا کو بہت جلد ہی محسوس ہوگیا کہ حسنین بہت چپ سا ہے۔ اور وہ غیر شعوری طور پر نظر انداز ہو رہا ہے تو اس نے اپنے آپ کو گھر تک محدود کرلیا اور بڑی سہولت سے ہمدی کی تفریحی اسکیم سے معذرت کرنے لگی۔ اسے بھی دوسرے رستے آتے تھے۔ وہ اس سے بچنے لگی تو وہ اس کے گھر آنے لگا اور وہ عموماً" وہ اس وقت آتا جب حسنین گھر پر نہ ہوتا۔ ویسے تو وہ بالکل نارمل بات کیا کرتا تھا۔ مگر پروا ہچکچاہٹ کا شکار رہنے لگی۔ وہ روز نہ تو گھر رہنے جا سکتی تھی اور نہ ہی کاکا جانی کی طرف۔ حسنین اسے ایک رات بھی کہیں نہیں چھوڑتا تھا۔ سو وہ ہمدان کی روز آمد کو برداشت کرنے پر مجبور تھی۔

وہ آتا تو نصیب سے لگا رہتا یا پروا سے فرمائش کرکے کچھ نا کچھ بنواتا رہتا۔ عموماً" وہ ڈیجیٹل کیمرہ لیے ہوتا اور نصیب کی فوٹو گرافس بناتا رہتا اور عین کیپچر کرتے وقت اسے بھی کسی نہ کسی بہانے نصیب کے ساتھ الجھائے رکھتا اور خود بھی اس کے قریب ہونے کی کوشش کرتا۔

اس نے ڈھکے چھپے لفظوں میں فاخرہ سے بھی کہا کہ ہمدی کا اس طرح روز' روز ان کے گھر آنا ٹھیک نہیں' پر فاخرہ نے اسے یہی کہا کہ وہ بچپن سے تمہارے ساتھ پلا بڑھا ہے۔ اسی محبت میں آجاتا ہے اور دوسرا یہ کہ میرا اکلوتا بھتیجا ہے' میں کیسے روک سکتی ہوں اسے وہاں آنے سے اور حسنین بھی کوئی غیر نہیں اس کا کزن ہے۔ ماں کی بات سن کر وہ چپ ہوگئی۔ اور ہمدی نے بھی بظاہر ایسا کچھ نہیں کہا تھا کہ وہ اس کی آمد کو خود پر سوار کرلیتی۔

☼ ☼ ☼

"بھیا! پروا میرے ساتھ ہے۔ میں زمزمہ سے ہوتا ہوا اسے گھر لے جاؤں گا۔ پھپھو نے بلوایا ہے۔ اسے میرے ساتھ آنے کی اتنی خوشی تھی کہ سیل گھر ہی بھول آئی۔ اب آپ کے خوف سے تھر تھر کانپ رہی ہے گاڑی میں۔ میں نے سوچا میں ہی انفارم کردوں آپ کو۔ پھپھو ڈاکٹر صدیقی کو چیک اپ کرائیں گی۔ نصیب کو جو اسکن پرابلم ہو رہی ہے۔ اسی وجہ سے آپ پریشان مت ہوئیے گا۔ میں ہی شوفر ہوں آج رات تک کے لیے۔ ڈراپ بھی کرجاؤں گا۔ ٹھیک ہے نا۔"

ہمدی نے پروا کو ایک ہاتھ سے پرے کرتے آخری جملہ بول کر حسنین کو بولنے کا موقع دیا تھا۔ "ہمدی فون دو" کی گردان کرتی پروا عجیب الجھن میں پھنسی اس سے سیل لے کر خود بات کرنے کے چکر میں تھی۔

ہمدی نے جیسے ہی برف سے سرد حسنین کی آواز سے ادا ہوتے "ٹھیک ہے" کے الفاظ سنے اس کے اندر سلگتے انگاروں پر چھینٹے پڑے تھے۔ حسنین کو بتائی ہوئی کچھ باتوں میں مبالغہ آرائی بھی کی تھی۔ فاخرہ کے بلاوے سے جیسے ہی وہ تیار ہوکر اندر کسی کام سے گئی تھی' ہمدان نے اس کا سیل فون بڑی سرعت سے اس کے بیگ سے نکال کر دراز میں ڈال دیا تھا۔ سائیلنٹ موڈ پر لگا کر۔ وہ بے خبری میں بیگ اٹھا کر اس کے ساتھ ہولی۔

واپسی پر بھی وہ اسے لمبے لمبے روٹ سے گھماتا ایک جگہ نصیب کو آئس کریم کے بہانے سے رکتا جان بوجھ کر دیر سے گھر لے کر پہنچا تھا اور وہ اس لمحے کو کوس رہی تھی' جب وہ دن میں اس کے ساتھ گھر گئی تھی۔ رات بھیگ رہی تھی۔ اوس کے سارے قطرے اس کے اندر اتر رہے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ حسنین کو بہت ناگوار گزرے گا۔ اس نے اپنے آپ سے عہد کیا کہ آئندہ وہ بغیر اجازت نہیں جائے گی۔

ہمدی گاڑی لے گیا تو وہ پژمردہ قدموں سے سرخ پتھریلی روش پر چل رہی تھی۔ جب اس کی نگاہ ٹیرس پر کھڑے حسنین پر پڑی تھی۔ وہ ایک عمیق گہری اندھیری سوچ میں غلطاں اسے نگاہ جمائے دیکھ رہا تھا۔ پروا کے قدم اتنے وزنی کبھی نہ ہوئے تھے۔

☼ ☼ ☼

"پہلی ضرب ہے میری جان جو آج تمہارے گھر پر میں نے لگائی۔" اس نے کوکین کا ایک گھونٹ بھرتے خود سے کہا۔ ڈل گولڈن نائٹ ڈریس میں اس کی شخصیت کے اسرار پر پھیلائے کسی آسیبی مندر کی طرح دکھتے تھے۔ پھر اس نے کلک سے سسٹم پر "سویٹ ہارٹ" کا فولڈر اوپن کیا اور اس کی تصویروں کو سلائیڈ شو پر لگا دیا۔

بڑی محنت اور جانفشانی سے اس نے پروا کی تصویروں کو اپنی مرضی کا لبادہ پہنایا تھا۔ وہ ان تصویروں میں اس کے اتنے قریب تھی کہ کبھی زندگی میں خود سے وہ حسنین کے بھی قریب نہ گئی ہوگی۔ حسنین کو ہمیشہ خود پیش رفت کرنا پڑی تھی۔ آج پروا کو گھر ڈراپ کرتے ہوئے وہ حسنین کو تیوریاں ڈالے دیکھ چکا۔ پھر اس نے ایک میل ٹائپ کی جس میں پروا کے کردار کو داغ دار کیا اور اپنی جعلی آئی ڈی سے حسنین کے ای میل ایڈریس پر بھیج دی۔

☼ ☼ ☼

بہت خوب صورتی سے ہمدی نے شک کا بیج حسنین کے دل میں بو دیا تھا اور اس کے دل کی زمین بڑی زرخیز ثابت ہوئی تھی۔ جلد ہی ایک پودا بھی نکل آیا۔ وہ اس سے کٹا کٹا رہنے لگا۔ شادی سے پہلے کے وہ تمام مناظر جن میں پروا اور ہمدی کو ساتھ دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں گاہے بگاہے چلتے رہتے۔ وہ پھولوں سمیت آئس کریم پارلر میں تھی۔ کبھی وہ ہمدان کے ساتھ بائیک پر ہوتی اور کبھی اس کے جانے پر افسردہ دکھائی دیتی۔ وہ سسٹم پر تھا اور اس انجانے ایڈریس سے آنے والی ای میل کو بار' بار پڑھ رہا تھا۔

"کون ہو تم میری بیوی پر الزامات لگانے والے؟" انہوں نے جواب دیا۔

اس نے تکیے کا سہارا لیا۔ مگر رات کو ہی اس کی دوسری میل موجود تھی۔

"الزامات کیسے جناب! اپنی آنکھوں سے محبت کی پٹی کو کھول پھینکیں۔ سماعتوں پر پہرے بٹھا کر دیکھیں۔ دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہوجائے گا۔ وہ کس طرح چھپ چھپ کر ملتی ہے اس سے آپ کو اطلاع دے دی جائے گی۔"

حسنین سے تنکا چھوٹ گیا اور وہ بے یقینی کے

بھنور میں ڈوبنے لگا۔

☼ ☼ ☼

پانچویں بیل پر کال ریسیو ہو گئی مگر وہ پُراسرار سے لیے خاموش تھا۔ وہ کچھ دیر ہیلو ہیلو کرتی رہی، پھر جھنجلا کر بولی۔

"کال کی ہے بات تو کرو ہمدی!"

"وہ میں۔۔۔ حسنین سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔"

پروا کو کبھی کرنٹ نہیں لگا تھا۔ مگر ایک لمحے میں وہ کسی برقی جھٹکے کے زیر اثر آ گئی تھی۔

"حسنین؟ تم نے تو کبھی ان کا نام نہیں لیا۔ آج۔۔۔"

"میں حسنین سے بات کرنے سے پہلے تم سے ملنا چاہتا ہوں۔" اس نے اس کے استعجاب کو کوئی اہمیت ہی نہ دی۔

"کیوں ملنا ہے تمہیں؟ اور حسنین سے کیا بات کرنی ہے یہ بتاؤ۔"

ہمدان کو لگا تھا اس کی آواز بھیگ رہی ہے۔ پر اس پر متعلق اثر نہ ہوا۔

"میں حسنین کو تمہاری اور اپنی انڈر اسٹینڈنگ کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں۔ ویسے اگر تم کل رات مجھ سے مل کر کچھ ڈسکس کر لو تو شاید میں اپنے فیصلے پر نظرثانی کر لوں۔ اگر تمہارا جواب ہاں میں ہو تو کل دن میں مجھے کال کر لینا، بائے ڈیر۔۔۔"

وہ سن ہوتے حواسوں سمیت خالی خالی نگاہوں سے گھر کی در و دیوار کو تکنے لگی۔ اسے لگا تھا طوفان اس کے دروازے پر دستک دے رہا ہے۔

سارے کام ہی بے ربط ہوئے۔ چولہے کے سامنے ہوتے ہوئے بھی سارا دودھ ابل گیا۔ مائیکرو ویو میں کباب رکھے گرم کرنے کے لیے، کچن دھوئیں سے بھرنے لگا۔ جلد بازی میں بغیر گلف پہنے پلیٹر کو ہاتھ لگا بیٹھی۔ اندر کا غبار آنسوؤں کی صورت بہنے لگا۔

"یہ میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہا ہے مالک؟ وہ تو سب کچھ بھول گیا تھا۔ کتنا نارمل ہو کر واپس آیا تھا۔"

اسے کچن میں زیادہ ٹائم لگ گیا تو بے خیالی میں کاؤچ پر بیٹھے حسنین نے اس کا سیل اٹھا لیا۔ آخری کال ہمدی کی ہی اٹینڈ کی گئی تھی۔ اس کے دماغ میں کلک ہوا اس نے چپ چاپ کال ریکارڈنگ پر لگا دی۔ جب اس نے نیبل لگائی تو حسنین کو ابھی ابھی دو جو سے بہت دور لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

"مگر میں اس سے ملنے نہ گئی تو وہ حسنین کو ضرور کچھ الٹا سیدھا بول دے گا۔ اور ہو سکتا ہو وہ جسٹ انجوائے منٹ کے لیے مجھے تنگ کر رہا ہو۔ ایسی کوئی بات ہی نہ ہو۔ میں تو محض اندازے ہی لگا رہی ہوں۔ میرے خیال میں اس سے مل لیتی ہوں کوئی ایسا بڑا ایشو تو نہیں۔ میرا کزن ہے وہ۔ کال کر کے کہہ دیتی ہوں کہ میں آ جاؤں گی۔"

اس نے ادھیڑبن میں آخر فیصلہ کر ہی لیا۔ نمبر ملایا۔ دوسری بیل پر کال ریسیو کر لی گئی۔

"میں ملنے کے لیے تیار ہوں۔ کہاں آؤں؟" پروا کو لگا تھا جیسے وہ مسکرایا ہو۔

"کل رات نو بجے کاکا جانی کے گھر آ جانا جیسا کہ تمہیں پتا ہی ہے۔ وہ سب حیدر آباد جا چکے ہیں آج۔ اور گھر کی چابی بھی تمہارے ہی پاس ہو گی۔ کیونکہ جب بھی سب کہیں جاتے ہیں تو چابی تم کو ہی دے کر جاتے ہیں۔ ہمیں ملنے میں آسانی رہے گی۔ میں تمہیں دروازے کے سامنے ہی ملوں گا۔"

پروا کو زمین پیروں تلے کھسکتی لگی تھی۔ آج ہی پوری فیملی حیدر آباد گئی تھی۔

"ہم گاڑی میں بات کر لیتے ہیں۔"

"ٹھیک نو بجے کاکا جانی کے گھر کے سامنے میں تمہارا انتظار کروں گا۔ اگر تم نہ پہنچ پائیں تو ٹھیک آدھے گھنٹے بعد میں حسنین کا نمبر ملا کر ایک انکشاف کر چکا ہوں گا۔ بائے۔"

بچپن میں وہ نئے تعمیر ہونے والے گھروں کے سامنے باریک چھنی ہوئی بجری میں پیر دھنسا کر بیٹھا

کرتی تھی۔ اور اسے اب لگا تھا پیر کیسے "دھنستے" جاتے ہیں۔۔۔

☼ ☼ ☼

ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے وہ نصیب کو ایک نوکرانی کے حوالے کر کے ایک گھنٹے میں واپس آنے کا کہہ کر رکشے سے کاکا جانی کے گھر جا پہنچی۔ وہ اسے گاڑی میں بیٹھا نظر آ گیا تھا۔ اس نے آہستگی سے دروازہ کھولا تو وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے چلا آیا۔ اس نے لائٹس آن کیں اور جا کر ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئی۔ گھبراہٹ سے اس کے چہرے پر پسینہ آنے لگا تھا۔ ہمدی بڑی معنی خیز مسکراہٹ لیے اس کے قریب جا بیٹھا تھا۔ وہ منمنانے لگی۔

"کیا چاہتے ہو؟"

"تمہیں چاہتا ہوں بچپن سے۔"

"یہ ضد چھوڑ دو ہمدان! میں کسی کی بیوی ہوں، ایک بیٹے کی ماں ہوں۔"

"مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم میری تھیں اور میری ہو۔"

اس نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھاما تھا۔ وہ کرنٹ کھا کر پیچھے ہوئی۔ ہمدی نے کھڑی ہوئی پروا کو شانوں سے تھاما تھا۔ وہ اس کے ہاتھوں سے خود کو چھڑاتی پیچھے ہٹی۔

"میں تمہیں اللہ کا واسطہ دیتی ہوں۔ پلیز میرا پیچھا چھوڑ دو۔ میرا گھر مت اجاڑو۔"

وہ سسک کر رونے لگی۔ ہمدی نے اپنے مضبوط بازوؤں میں بھر کر اسے کھڑا کیا تھا۔ وہ باوفا عورت تھی اور ساری کی ساری حسنین کی تھی۔ یہاں تو وہ صرف گھر بچانے آئی تھی کہ شاید کوئی راستہ نکل آئے۔ رستے تو نکل ہی آئے۔ وفا کے رستے آسان تو ہیں پر کہیں کہیں ہیبت ناک گھاٹیاں بھی تو آ جاتی ہیں۔ اور وہ گھاٹیوں کے درمیان پھنسی تھی۔ دونوں طرف بظاہر موت دکھائی دیتی تھی مگر شعور کا رستہ بھی قریب ہی تھا۔

"اور تم نے جو چھ فٹ کے مرد کو اجاڑ ڈالا؟"

اس نے اپنی آنکھوں کا اس کی آنکھوں سے فاصلہ کم کرتے ہوئے کہا۔ وہ کسمسائی۔۔۔ پر اس نے گرفت ڈھیلی نہیں کی تھی۔ پروا کو لگا کسی کے قدموں کی چاپ ہے۔ ہلکی ہلکی آہٹ ایک بے حد ہیبت ناک روپ دھارے اس کی نگاہوں کے سامنے تھی۔ اس نے پتھر کا بن جانے کا بچپن میں سنا تھا۔ بچپن کی ساری باتیں جوانی میں سچ ہو جائیں گی اسے خبر نہیں تھی۔

ہمدی نے اسے جس طرح شکنجے میں جکڑنا چاہا تھا وہ ہر طرح سے کامیاب رہا تھا۔ پروا کی کال آنے کے "فوراً" بعد ہی اس نے حسنین کو میل کر دی تھی۔ وہ "فوراً" آ گیا۔ گھر کے سب دروازے کھلے تھے۔ اس کے دل کے سب دروازے بند ہونے لگے تھے۔ شہر دل کی گلیوں میں آگ سی دہکتی تھی اور بس اک نگاہ میں قیامت کا منظر تھا جو اس نے دیکھا تھا۔ وہ الٹے قدموں واپس پلٹا۔

کبھی کبھی جو ہمیں دکھتا ہے ویسا نہیں ہوتا بلکہ جو ہم دیکھنا چاہتے ہیں وہی دکھ رہا ہوتا ہے۔ اسے یقین تھا کہ وہ اسے وہاں دیکھے گا، سو دیکھ لیا۔ اس کا آنسوؤں سے لبریز چہرہ اور اس کا دفاعی انداز نہ دیکھ پایا۔ پروا ہمدی کو دھکا دیتی باہر بھاگی تھی حسنین کے پیچھے مگر وہ جا چکا تھا۔ اس کا ہینڈ بیگ بھی اندر ہی رہ گیا تھا۔ وہ مین گیٹ سے پشت لگائے کھڑی تھی۔ دوپٹا شانے سے ایک طرف پڑا تھا۔

ہمدی کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ حسنین اسے اسی حالت میں بغیر ایک لفظ کہے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ خالی گھر کے سناٹے اس کے اندر اترنے لگے۔

وہ مرے مرے قدموں سے اندر گئی۔

"میں انہیں بتاؤں گی وہ سب جھوٹ تھا دھوکا تھا۔" وہ یہی گردان کرتی اندر تک گئی۔ سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا چھوڑ کر گئی تھی کچھ گھنٹوں قبل۔ مگر حسنین کہیں نہ تھا۔ اس نے نوکروں سے پوچھا تو پتا چلا وہ تو گھر ہی نہیں آیا۔ اس نے کئی بار اس کا نمبر ڈائل کیا مگر فون بند جا رہا تھا۔ تھک ہار کر وہ کارپٹ پر بیٹھ کر

صوفے پر سر رکھے پوری رات اس کے لوٹ آنے کا انتظار کرتی رہی۔

دن ڈھلا اور رات آگئی۔ اور حسنین بھی آگیا۔ انہوں نے سائیڈ دراز میں ایک براؤن لفافہ رکھا اور دراز کو لاک کردیا۔ انہوں نے خود کو گیسٹ روم میں قید کرلیا۔ دوسرا دن بھی گزرا وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ اور پھر رات آگئی۔ فیصلے کی رات۔

اس نے بہت سوچ سمجھ کر اسے طلاق دینے کا فیصلہ کیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے کہا۔

"اپنا سامان پیک کرلو۔ جو دل چاہے لے جاؤ۔ کل صبح میں تمہارے گھر چھوڑ آؤں گا۔"

☆ ☆ ☆

فاروق ماموں اس سے ملنے آئے تھے۔

"بیٹا! آج سات بجے کی فلائٹ سے اسلام آباد جارہا ہوں۔ حسنین کو ساری حقیقت سے آگاہ کرنے میں تمہارا احسان مند ہوں کہ تم نے میری عزت رکھی میں تم پر کوئی آنچ آنے نہیں دوں گا۔ اتنی آسانی سے کوئی تمہارا گھر تباہ نہیں کرسکتا چاہے وہ میرا لخت جگر ہی کیوں نہ ہو۔ مجھے اندازہ ہوچکا تھا کہ تم دونوں میاں بیوی کی چپقلش کے پیچھے ہمدی کا ہاتھ ہے۔ مگر تم مجھے جاؤ کہ ایسا کیا ہوا تھا جو حسنین اتنا ہرٹ ہوا اور وہاں جا بیٹھا ہے۔ ساری بات میرے علم میں ہوگی تو میں حسنین کو سب کچھ بتا کر تمہاری پوزیشن صاف کردوں گا۔"

وہ غیرت سے زمین میں نگاہیں گاڑھے مہر بہ لب تھی۔ آنسوؤں نے اس کا چہرہ بھگو دیا۔ فاروق ماموں نے پھر اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر مسیحائی کی۔

پھر اس نے نکاح کے بعد کی گئی ہمدان کی کال سے لے کر کاکا جانی کے گھر والی ملاقات اور حسنین کی آمد تک کا سب بتادیا۔ فاروق ماموں کچھ دیر تک تو اس سے آنکھ نہیں ملا پارہے تھے۔ پھر وہ اسے تسلی دیتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"تم فکر مت کرو ان شاء اللہ جلد ہی سب کچھ پہلے کی طرح ہوجائے گا۔"

"پہلی پاسبل فلائٹ سے تم آسٹریلیا جارہے ہو یہ میرا حکم ہے۔ اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو میں تمہیں عاق کردوں گا۔ زندگی بھر تمہاری شکل نہیں دیکھوں گا۔ اور وصیت کرکے مروں گا کہ میری اور میری بیوی کی شکل تمہیں نہ دکھائی جائے۔"

"اتنے غصے میں کیوں ہیں پاپا! کیا ہوگیا ہے؟"

"پروا کا گھر برباد کردیا تم نے۔ اور پوچھتے ہو کیا ہوگیا ہے۔ سب بتادیا ہے اس نے مجھے۔ وہ تو حسنین کی عقل پر پتھر پڑگئے ہیں جو تمہاری باتوں میں آگیا وہ۔ میں آج جارہا ہوں اور تب ہی واپس آؤں گا جب تم یہاں سے چلے جاؤ گے۔ اگر تم نہیں گئے تو میرے قدم اس گھر میں دوبارہ کبھی نہیں پڑیں گے یاد رکھنا تم! میری عزت و ناموس کو مٹی میں ملانے والے ہو تم۔ تم جیسی اولاد سے تو میں بے اولاد ہی رہتا تو بہتر تھا۔"

وہ خاموشی سے دوپٹے سے آنسو پونچھتی ماں کو دیکھنے لگا۔

"چھوڑ دیے اپنی ضد۔ ہمیں زمانے کے سامنے ایسے رسوا مت کریں میں کیا منہ دکھاؤں گی تیرے کاکا جانی کو۔ میرے باپ جیسے بھائی ہیں وہ۔ جینا مرنا ختم ہوجائے گا ہمارا۔ اکلوتی بہن ہوں ان کی۔ کچھ رحم کھا مجھ پر۔"

وہ بغیر ایک لفظ بھی بولے کمرے سے نکل گیا۔ ماں کے رونے سے در و دیوار رونے لگتے ہیں۔ خون تو اس کی رگوں میں شریفوں کا تھا۔ چاہے وہ خود کو شیطان کے لبادوں میں کتنا بھی چھپالیتا۔

حسنین سے رستے سے کھانے کی ٹیبل تک بڑی فارمل سی باتیں ہوتی رہیں۔ چائے کے فوراً" بعد وہ اصل بات پر آگئے تھے۔

"حسنین میرے بیٹے! تمہیں جب یہ لگا تھا کہ پروا اور ہمدان کے بیچ کچھ ہورہا ہے تو کم از کم ہمدان کے باپ ہونے کی حیثیت سے مجھے تو بتایا ہوتا۔ یوں سب سے دور آکر بیٹھ جانے سے بھی کبھی مسئلے ہوتے ہیں؟"

"نکل! میں نے مسئلہ کا حل ڈھونڈ لیا ہے۔ میں نے طلاق کے کاغذات بنوالیے ہیں۔ ہر انسان کو اس کی مرضی سے جینے کا حق ہے۔ وہ ہمدان میں انٹرسٹڈ ہے تو اسی سے کرلے شادی۔ نصیب کو چاہے تو مجھے دے دے یا خود رکھ لے۔"

"اف میرے خدایا! اتنا آگے تک کا سوچ لیا تم نے۔ جو کچھ تم سمجھ رہے ہو ویسا کچھ بھی نہیں ہے۔ مجھے انتہائی شرمندگی سے کہنا پڑرہا ہے کہ یہ سب سازش میرے بیٹے کی ہے۔

پروا کی اس نالائق میں ذرا بھر بھی دلچسپی نہیں تھی تم یقین رکھو اس پر۔ تمہارے اور پروا کے اچانک نکاح پر اس کی انا پر چوٹ پڑی۔ نکاح کے دوسرے ہی دن اس نے مجھے کال کرکے نکاح ختم کرانے کا کہا جیسے وہ کسی جیتے جاگتے انسانوں کا نہ بلکہ گڑیا گڈے کی شادی کا کھیل تماشا ہو۔ میں نے اسے سخت سست سنائیں تو وہ دو تین سال خاموشی سے بیٹھا رہا۔ مجھے پتا ہوتا کہ یہ آتے ہی ایسے تماشے کرے گا تو میں تم کو اعتماد میں لے کر سب بتادیتا۔

دوسری غلطی پروا سے بھی یہی ہوئی کہ مجھ کو یا تمہیں اعتماد میں لینے کے بجائے وہ اسکے ہاتھوں بلیک میل ہوتی رہی۔ اور تم نے اپنے کاکا جانی والے گھر میں اسے ہمدان کے ساتھ دیکھ لیا۔ حالانکہ وہ صرف اس ڈر سے گئی تھی کہ وہ اسے بلیک میل کررہا تھا۔ میرے بیٹے شک کو دل سے نکال پھینکو۔ پروا بہت اچھی بچی ہے۔ اس سارے واقع میں اس کا کوئی قصور نہیں۔ وہ شروع سے بزدل تھی۔ اس لیے ہمدان کی حرکتیں چپ چاپ برداشت کرتی رہی۔ تم۔ تم یقین کرو یہ سب ہمدان کی سازش ہے۔ میری بات کا یقین کرو۔ کیا کوئی باپ اپنے بیٹے پر الزام لگا سکتا ہے؟"

وہ ہونٹوں کو بھینچے کھڑکی سے نظر آتے چاند کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اسے لگا تھا چاند رو رہا ہے۔ موسم بھیگ رہا تھا۔ ہر طرف روتے چاند نے پروا کی شکل اختیار کرلی تو وہ چاند سے نظریں چراتا فاروق کی طرف دیکھ کر بولا۔

"میری سمجھ میں نہیں آرہا کیا کروں۔"

فاروق نے آگے بڑھ کر اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ دھیرج سے بولے۔

"میرے ساتھ چلو جو کچھ ہوا اسے بھلا دو۔ میں تمہیں سب حقیقت بتاچکا ہوں۔ وہ تمہارا انتظار کررہی ہے۔"

حسنین کو لگا جیسے کہنے کو اب کچھ بھی نہ ہو۔ شہر دل کی بند گلیوں کے دروازے کھلنے کو تھے۔

پروا اپنی جنت کے سبزلان میں بیٹھی کمہاری کے گھر سے مشابہ چھتری نما ٹاور پر نگاہیں جمائے بیٹھی تھی۔ نصیب اس کی کرسی کی پشت کو تھامے کھڑا تھا۔ فاروق ماموں نے اسے بتادیا تھا کہ وہ حسنین کو لے کر آرہے ہیں۔ وہ محو انتظار تھی۔ اس نے بڑے دکھ سے اپنے اور کمہاری کے گھر کا موازنہ کیا تھا۔

"عورت اور کمہاری کے گھر میں کوئی فرق نہیں۔ بڑی جان توڑ کوششوں سے بڑی عرق ریزی سے یہ اپنا گھر بناتی ہیں۔ ایک سائبان اور ایک چھت کے لیے۔ مگر بعض دفعہ سرد گرم موسم ان کے گھروں پر یوں بھی اثر انداز ہوتا ہے کہ گھر بکھر جاتا ہے اور پھر اس ملبے میں عورت "قبر" بن جاتی ہے جہاں پھول تو چڑھائے جاسکتے ہیں مگر مردہ عورت کو زندہ عورت میں تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔"

اس نے ایک گہرا سانس لے کر زندگی رہ جانے پر خدا کا شکر ادا کیا۔

وہ سوچوں کے سمندر سے نکلی تو حسنین کی گاڑی کار پورچ میں آکر رک چکی تھی۔ اس نے نصیب کو گود میں اٹھا کر پہلا قدم اس کی جانب بڑھایا اور دوسرا قدم حسنین نے۔ یوں فاصلے سمٹتے گئے وہ اس کے شانے سے سر لگا کر رونے لگی۔ حسنین نے اس کے آنسو صاف کرکے اشارے سے چھتری نما ٹاور پر اس کی توجہ مرکوز کروائی۔ جہاں دو پرندے چونچ سے چونچ ملائے بیٹھے انہیں دیکھ رہے تھے۔ وہ بھیگی آنکھوں سے مسکرائی تھی۔

☆

سمیرا عثمان گل

زینی لڈو کا ڈبا ہاتھ میں تھامے سیڑھیوں پہ بیٹھی تھی۔ اس ڈبے کا رنگ گہرا سبز تھا اور اس پر سنہری بیل بوٹے بنے ہوئے تھے۔ کوٹھی والوں کے گھر بیٹے کی شادی ہوئی تھی۔ یہ اس کے مکلاوے کا لڈو تھا۔ پہلے وہ سمجھی مٹھائی کا ڈبا ہے۔ بناوٹ ہی ایسی تھی مگر جب کھول کر دیکھا تو ایک منفرد سی پیکنگ میں گول مٹول سوجی کا لڈو رکھا ہوا تھا۔

یہ نیا اور منفرد ڈیزائن اسے بہت پسند آیا تھا۔

اب وہ ڈبا کھولے لڈو کا جائزہ لے رہی تھی' خشک میووں سے بھرا لڈو اس کے منہ میں پانی آنے لگا۔

"خالہ دیکھو تو' کیسا منفرد ڈیزائن کا ڈبا ہے۔" پالک کاٹتی خالہ بھی کن انکھیوں سے لڈو کا ہی جائزہ لے رہی تھیں اور دل ہی دل میں متاثر بھی ہو چکی تھیں۔

"خالہ! ہم بھی اسد کی شادی میں ایسے ہی ڈبوں میں لڈو بانٹیں گے۔"

ڈبے پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ بڑی محبت سے بولی تھی۔ اسد کی شادی کا اسے بڑا ارمان تھا۔ وہ اس کی شادی کے ہر فنکشن کو بڑے الگ اور منفرد انداز میں کروانا چاہتی تھی اور اس کے لیے وہ اکثر ہی خالہ سے الٹی سیدھی فرمائشیں کرتی رہتی تھی۔

سیڑھیاں اترتے اسد کے پہلے کان کھڑے ہوئے اور پھر حلق تک کڑوا ہو گیا۔

"اسٹینڈرڈ تو دیکھو اس لڑکی کا' ایک لڈو کے ڈبے پہ اس قدر فریفتہ ہو رہی ہے۔" بڑبڑاہٹ پر زینی نے سر اٹھایا۔ جواباً" اسے جن نظروں سے گھورا گیا' وہ جو اس کا حال احوال دریافت کرنے والی تھی' لب بستہ رہ گئی۔

"اٹھ گیا میرا چاند! زینی' اسد کے لیے ناشتا بنا لاؤ۔" محبت پاش نظروں سے گبھرو جوان بیٹے کو دیکھتے ہوئے خالہ نے زینی کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔

"مجھے نہیں کرنا کوئی ناشتہ واشتہ۔" اس کا مزاج سوا نیزے پر تھا۔ زینی اٹھتے اٹھتے واپس بیٹھ گئی۔

وہ واش بیسن کے سامنے کھڑا بال سنوارنے لگا۔

"ارے کھانے سے کیا دشمنی ہے۔" اماں کی آواز شد آگیں تھی۔ انہوں نے ایک بار پھر زینی کو اٹھنے کا اشارہ کیا تھا' وہ اٹھ کر کچن میں چلی گئی تو وہ دندناتا ہوا اس کے سر پہ آن کھڑا ہوا۔

"تمہیں اپنے گھر میں کوئی کام نہیں ہوتا۔ سونے سے قبل تم ادھر تھیں اب اٹھنے سے پہلے پھر حاضر ہو۔ ہر وقت تمہاری ہی شکل دیکھتے رہو۔ بندہ اپنے گھر میں بھی آرام سے نہیں رہ سکتا اور مجھے نہیں پسند تمہارے ہاتھ کا ناشتہ' اس زحمت کی بھی ضرورت نہیں۔"

سارا غصہ' بیزاری اور کھولن اس پر الٹ کر وہ جا چکا تھا اور وہ ہکا بکا دروازے میں منہ کھولے کھڑی کی کھڑی رہ گئی تھی۔

"اسے کیا ہوا۔" خالہ نے اس سے پوچھا تھا۔ لب کاٹتے' آنسو ضبط کرتے وہ محض شانے اچکا کر رہ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ گھر سے نہیں نکلا تھا۔ بلکہ گاڑی میں بیٹھ کر لاہور

آگیا تھا اور اب صبح سے کمرا بند کیے پڑا تھا۔ نہ بھوک لگ رہی تھی۔ نہ نیند آرہی تھی۔

دو روز قبل اماں نے اسے فون کر کے گھر آنے کے لیے کہا تھا۔ کل وہ گھر پہنچا تو رات کھانے کے بعد ابا نے اسے اپنے کمرے میں بلوایا تھا۔ گفتگو کا آغاز اماں نے ہی کیا۔

"دیکھو' بیٹا تمہاری تعلیم مکمل ہونے والی ہے نوکری بھی مل جائے گی ہمارا خیال ہے اب تمہاری شادی کر دیں۔" اور وہ اماں کے خیال پر نہال ہو گیا تھا مگر۔

"زینی گھر کی لڑکی ہے۔ سمجھ دار' سلیقہ مند' میری بھانجی ہونے کے ساتھ ساتھ تمہارے ابا کی بھتیجی بھی ہے' ہمیں تو اس سے زیادہ کوئی عزیز نہیں۔ تم ذرا خود کو ذہنی طور پر تیار کرلو۔" اماں کا آخری فیصلہ۔ اس کی شکل پر زمانے بھر کی مسکینیت اتر آئی تھی۔ ابا کو ذرا ترس آیا۔

"اگر تمہارا کہیں اور خیال ہے تو بتا دو۔ ویسے ہماری خوشی تو زینی میں ہے۔"

"ارے میرا بیٹا بڑا فرمانبردار ہے۔" اماں تو بدک ہی اٹھی تھیں۔ "اس کا کیوں ہونے لگا کہیں اور خیال اور اگر ہوا بھی تو وہ ضرور ہماری خواہش کا احترام کرے گا۔"

چلو جی قصہ ختم۔ بیٹا محض منہ دیکھ کر رہ گیا تھا۔ فرمانبرداری کے کیبل میں چھپا مان اب کیسے توڑتا۔

زینی اچھی لڑکی تھی۔ بچپن سے ساتھ تھی۔ وہ اسے پسند بھی کرتا تھا مگر برا ہوا اس انجینئرنگ کالج کا جہاں آکر اسے اسٹینڈرڈ کی لت لگ گئی تھی۔

کچھ دوست بھی ذرا ہائی سوسائٹی کے مل گئے تو اسے بھی اپنے خیالات روشن کرنے میں دیر نہیں لگی۔

اب پڑھی لکھی' خوب صورت' الٹرا ماڈرن لڑکی جو فر فر انگریزی بھی بولتی ہو' اس کا آئیڈیل بن چکی تھی اور وہ آئیڈیل ایک روز فزا کی شکل میں اس سے ٹکرا بھی گیا۔

پہلے دوستی' پھر محبت اور اب تو دھواں دھار عشق کے چرچے سارے کالج میں تھے۔ دوست انہیں لو برڈ کہنے لگے۔

دو روز قبل اس نے فزا کو پرپوز بھی کیا تھا اور اس خوشی میں سارے دوستوں نے اس سے پارٹی لی تھی۔

وہ گھر جاکر فزا کے متعلق بات کرنے والا تھا۔ جب زینی بیچ میں ٹپک پڑی تھی۔

دوسری جانب اماں کو صبح سے ہول اٹھ رہے تھے۔ وہ صبح سے نکلا گھر واپس نہیں آیا تھا۔ سارے گاؤں میں اس کی ڈھنڈیا مچی ہوئی تھی۔ فون اس کا صبح سے بند تھا۔

بالآخر ابا کو لاہور روانہ کیا گیا۔

✡ ✡ ✡

دروازے پہ بڑی زور کی دستک ہوئی تھی۔ اس سے قبل کہ وہ اٹھنے کی زحمت کرتا وہ بگڑے تیوروں سمیت اس کے سر پہ آن کھڑی ہوئی تھی۔

"یہ کیا 1970ء کے غمگین ہیرو کی طرح صبح سے حجلہ نشین ہوئے بیٹھے ہو' اس پر فون بھی بند کر رکھا ہے صبح سے تمہیں ڈھونڈتی پھر رہی ہوں۔"

تیز تیز بولتے ہوئے اس نے پہلے لائٹ جلائی پھر کھڑکی کے پردے ہٹائے اور اس کے بعد ایک عدد کشن سے اس کی ٹھکائی کی تھی اور اب اس کے سر پہ کھڑی مسلسل اسے گھورے جارہی تھی۔

"میری طبیعت اچھی نہیں ہے۔" غمگین لہجے میں کہتے ہوئے اس نے آنکھوں پہ بازو رکھ لیا تھا۔

"کیا ہوا ہے طبیعت کو۔" اب کی بار ذرا فکر مندی سے اس نے آنکھوں پہ رکھے بازو پر ہاتھ رکھا تھا اسد نے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔

کیا نہیں تھا اس کی آنکھوں میں۔ بے چارگی' حسرت' ملال۔

"تم تو گھر گئے تھے وہاں سب خیریت ہے نا' انکل آنٹی ٹھیک ہیں۔" وہ کس قدر فکر مندی سے پوچھ رہی تھی۔ اسد کو اس کا اپنے گھر والوں کے لیے یوں پریشان ہونا اچھا لگا تھا۔

وہ سوچ رہا تھا' اس لڑکی سے زیادہ کوئی اس کے اماں ابا کا خیال رکھ سکتا تھا بھلا' اسے اپنی ماں سے بڑی محبت تھی اور آج اسے اپنے انتخاب پر فخر ہو رہا تھا کہ وہ لڑکی اتنے اچھے دل کی مالک تھی کہ اس سے وابستہ ہر چیز سے محبت کرتی تھی۔

زینی میں جانے کون سے سرخاب کے پر لگے تھے جو اماں اس کے علاوہ کسی اور کے لیے سوچنے تک کے لیے آمادہ نہیں تھیں۔

"کیا ہو رہا ہے یہاں۔" ابا اچانک کمرے میں داخل ہوئے تھے اور سامنے چلتا سین ان کے لیے قطعاً "غیر متوقع تھا۔

وہ اپنی جگہ حیرت کا بت بن چکے تھے اور اسد اس اچانک افتاد پر اچھل کر بستر سے نیچے اترا تھا۔ فزا یونہی اپنی جگہ کھڑی رہی تھی۔

"سامان باندھو اور گھر چلو۔" حکم صادر کرتے وہ باہر نکل گئے تھے۔

"اسد۔" فزا نے خوف زدہ نظروں سے اسد کو دیکھا تھا۔

"گھبراؤ مت' سب ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ اسے تسلی دے رہا تھا اور خود کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔

اب جانے کیا ہونے والا تھا۔

✡ ✡ ✡

تمام راستے وہ خاموش رہے تھے۔ گھر جاکر بھی انہوں نے کوئی بات نہیں کی۔ وہ ساری رات بے چین رہا تھا' فزا کے ساتھ گزارا ہر پل نظروں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ کیسے وہ پہلی بار اس سے ملا تھا' نوٹس کے بہانے سے باتیں کرنا' پروفیسر کے سامنے ایک دوسرے کی کھنچائی' کینٹین میں گول گپوں کی شرط' لائبریری میں سونا اور بیت بازی کے مقابلے۔ دونوں میں دوستی' کیا کچھ نہیں تھا جو یاد آرہا تھا۔

وہ اس کی مشام جان سے بھی قریب ہو چکی تھی وہ اسے کھونے کا تصور تو کسی صورت بھی نہیں کر سکتا تھا دوسری جانب زینی تھی۔ جس کے ساتھ سارا بچپن گزرا تھا۔ وہ اچھی شکل کی تھی سلیقہ مند' سمجھ دار مگر وہ فزا تو نہیں تھی نا۔

اگلی صبح وہ خود ابا کے سامنے حاضر ہوا تھا۔ وہ حقہ گڑگڑا رہے تھے گہری سوچوں میں مستغرق۔ اسے دیکھ کر بھی ان دیکھا کر دیا تھا۔

"ابا جی مجھے آپ سے بات کرنا تھی۔" اس نے گلا کھنکھارا' وہ ہنوز حقہ گڑگڑاتے رہے۔ آخر اس نے خود ہی ہمت کی۔

"ابا جی! وہ لڑکی۔۔۔"

"وہ لڑکی جو کوئی بھی تھی' ہاسٹل میں رہ گئی۔ مجھے اس کا ذکر بھی گوارا نہیں' کل میں اور تیری ماں زینی کے ساتھ بات پکی کرنے جارہے ہیں بس۔" انہوں نے آخری فیصلہ سنا دیا تھا۔

اب کون تھا جو پتھر پہ لکھی لکیر مٹا سکتا' باہر کھڑی زینی کی ٹانگیں کانپنے لگی تھیں۔ اسد ایک جھٹکے سے اٹھ کر باہر نکل آیا۔

زینی نے اس کا لال بھبھوکا چہرہ دیکھ لیا تھا۔

وہ خاموشی سے لب کاٹتی دوپٹہ مروڑتی رہی۔

"تمہاری وجہ سے ہو رہا ہے یہ سب' لیکن میں ہرگز کسی بھی صورت تم سے شادی نہیں کروں گا۔ اس سے تو اچھا ہے میں زہر کھالوں۔" اس کے ماتھے کو انگلی سے پیچھے ہٹاتا اس پر ایک قہر آلود نگاہ ڈالنے کے بعد تن فن کرتا سیڑھیاں چڑھ گیا تھا۔ وہ وہیں کھڑے کھڑے سر تا پا پتھر میں ڈھل گئی۔

اتنی تذلیل' اتنی توہین۔

اور پھر جانے کس طرح اس نے منا لیا تھا تایا ابا کو۔ اماں ہنوز اس سے ناراض تھیں' ساری خریداری زینی نے ہی کی۔ دو روز بعد وہ فزا کو منگنی کی انگوٹھی پہنانے آئے تھے۔

✡ ✡ ✡

زینی آئینے کے سامنے کھڑی اپنے چہرے کے نقوش کھوج رہی تھی۔

"کیا میں اتنی بری تھی جو تم نے اتنی حقارت سے مجھے ٹھکرا دیا۔ تم تو میرے بچپن کے دوست تھے' ایک بار کہہ دیتے' زینی! تم انکار کر دو تو ایک لمحہ کی تاخیر کیے بغیر انکار کر دیتی' کم از کم میری عزت نفس' میری انا میری خودداری تو سلامت رہتی۔ اتنا سا تو احسان کر دیتے۔"

وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگی۔

حالانکہ بعد میں اسد نے اس سے اپنے رویّے کی معذرت بھی کرلی تھی مگر اس کا ملال کم نہیں ہو رہا تھا۔

وہ اس کی نفرت، اس کی حقارت اور وہ توہین آمیز الفاظ نہیں بھول پا رہی تھی۔

اسد خوش تھا بہت خوش، آخر اس نے جو چاہا وہ پالیا تھا۔ مگر اماں نے شاید اس بات کا زیادہ ہی صدمہ لے لیا تھا انہیں فالج کا حملہ ہوا تھا اور وہ اپاہج ہو چکی تھیں۔

مہینہ بھر اسپتال رہ کر گھر آئی تھیں۔ ان دنوں زیبی نے رات دن کا فرق بھلا کر ان کا خیال رکھا تھا۔

وہ جتنا بھی اس کا مشکور ہوتا کم تھا۔

لیکن ان مشکل اور صبر آزما لمحوں میں دل فزا کا ساتھ مانگ رہا تھا اس نے سوچا، وہ جلد ہی شادی کرلے گا۔

یہی سوچ کر وہ بہت دنوں بعد کالج آیا تھا۔

☼ ☼ ☼

کلاس روم جانے سے قبل ہی فزا اسے لان میں بیٹھی دکھائی دے گئی تھی وہ راہداری سے ہوتا ہوا جونہی اس کے قریب پہنچا لاشعوری طور پر رک گیا۔

"فزا! تم اتنا بڑا فیصلہ بے وقوفی میں کر رہی ہو اسد بہت محبت کرتا ہے تم سے، کل نہیں تو پرسوں اس کی اماں ٹھیک ہو جائیں گی۔" یہ انعم تھی اس کی دوست۔

"اور اگر نہ ہوئیں تو میں زندگی بھر ان کی خدمت گار بنی رہوں گی۔ اسد کی حد تک ٹھیک تھا لیکن اس کے پیرنٹس کے ساتھ گاؤں جا کر نہیں رہوں گی میں۔ اسد آجائے تو اس سے دوٹوک بات کرتی ہوں، جانے کیسی اسٹوپڈ سی توقعات مجھ سے وابستہ کر کے بیٹھا ہے۔"

"اور اگر وہ نہ مانا تو؟"

"تو ٹھیک ہے پھر اپنی انگوٹھی واپس لے جائے۔" لاپروائی سے شانے اچکاتے ہوئے اس نے کتنی بڑی بات کس آسانی سے کہہ دی تھی۔

اور ایک وہ تھا جو اس کی خاطر مرا جا رہا تھا ایک دم ہی گھٹن بڑھ گئی تھی، وہ کالج کے عقبی لان میں چلا آیا تھا۔ اسے زیبی کی بے لوث خدمت، محبت یاد آ رہی تھی۔

"میرا بیٹا بڑا فرمانبردار ہے، وہ ضرور ہماری خواہش کا احترام کرے گا۔" دور کہیں سے اماں کی آواز آئی تھی۔

اماں کی خواہش کا احترام نہ کرنا الگ بات تھی۔ مگر کیا وہ فزا کی خاطر اپنی ماں کو چھوڑ پائے گا۔

اسے بھلے ہی فزا جیسی لڑکی پسند ہو مگر اس کے گھر کو زیبی جیسی لڑکی کی ضرورت تھی۔

وہ ایک فیصلہ کر کے اٹھا تھا۔

"اسد تم کب آئے۔" فزا اسے دیکھ کر بے حد خوش ہوئی تھی۔

"فزا میں تم سے شادی نہیں کر سکتا۔ مجھے تم نہیں زیبی پسند ہے اور میں زیبی سے ہی شادی کروں گا۔" فزا کا ہاتھ تھام کر اس نے اپنی پہنائی ہوئی انگوٹھی خود اتار لی تھی۔

اور پھر بغیر اس کی سمت دیکھے واپس پلٹ آیا تھا۔

فزا کو زیبی بنانا مشکل تھا مگر زیبی کو وہ فزا جیسا بنا سکتا تھا۔

تھوڑا سا ماڈرن، تھوڑا سا فیشن ایبل اور بہت سارا من پسند۔

سدرۃ المنتہیٰ

کوئی امید کا ستارہ ہے

انسانی زندگی کا کوئی ایک سیاہ دن ہوتا ہے جو اس کی پوری زندگی میں سیاہیاں بھر دیتا ہے۔
اس کی زندگی کا وہ سیاہ دن کون سا تھا جسے زندگی کے کیلنڈر سے خارج کر کے وہ تمام سیاہیوں کو پالش کر کے روشنی میں تبدیل کر سکتی تھی۔ اسے سوچنے کے لیے وقت درکار تھا' جو اس کے پاس نہیں تھا۔
اور حل کرنے کے لیے بھی وقت چاہیے تھا جو گزر

ناولٹ

چکا تھا اور اس وقت اسے ہر جگہ دھندلاہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ شدید تھکن کے باعث اس کے اندر کا اشتعال کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ صبح ساڑھے پانچ کے درمیان اسے نیند آ گئی تھی آنکھ کھلی تو ساڑھے دس بج چکے تھے اور اس کی آنکھیں ایک دفعہ پھر بند ہونے کو تھیں مگر وہ پھرتی سے اٹھی' کپڑے نکالے اور نہا کر آنے کے بعد اسے لگا کہ کچھ تھکن ہلکی ہوئی ہے۔ اس نے گاڑی کی چابیاں اٹھائیں' بیگ لیا' گیلے بال سلجھائے بغیر کیچر میں جکڑے اور تیزی سے سیڑھیاں اترتی ہوئی نیچے آ گئی۔ وہ عین سامنے بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے جن میں فہد بھی تھا۔

"ثانیہ! اٹھ گئی میری بچی۔ آ جاؤ تمہارا ہی انتظار ہو رہا تھا۔ آؤ ناشتہ کر لو بیٹا۔" وہ اسے فریش محسوس کر کے چہکی تھیں۔

"مجھے ناشتہ نہیں کرنا۔ کون سے ہسپتال میں بھیجا ہے اسے ابو! ایڈریس چاہیے۔"

"تم بیٹھو بچے! ناشتہ تو کر لو پہلے۔" ابو اس کے چہرے پر چھائی بے چینی سے گھبرائے تھے۔

"پلیز بتا دیں۔ کون سے پاگل خانے میں ڈالا ہے اسے۔ کس کے حوالے کر آئے ہیں بتائیں مجھے' جانا ہے ابھی۔"

"ثانیہ! بیٹھ کر ناشتہ کر لو پھر بات کرتے ہیں بیٹا۔"

"ابو! وہ یتیم اور لاوارث ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسے جہاں چاہے پھینک دیا جائے۔ انسان ہے وہ' مجھے اگر کوئی اس طرح پاگل خانے میں ڈال دے تو آپ کو کیسا لگے گا؟"

"ثانیہ! آرام سے بیٹھو' جوس پی لو پھر بات کرتے ہیں۔ تم اس وقت اپنے ہوش میں نہیں ہو۔" امی کو اب غصہ آرہا تھا۔ اسے بٹھاتے ہوئے بولیں۔

"ہوش میں نہیں ہوں تو مجھے بھی ڈال دیں اس کے ساتھ پاگل خانے میں' یہی حل ہوتا ہے نا آپ لوگوں کے پاس۔" وہ اپنا بازو چھڑاتے ہوئے چیخی تھی۔

"ہم نے جو بھی کیا تمہاری بھلائی کے لیے کیا ہے بیٹا! اس کا وہاں علاج ہوگا۔ وہ ٹھیک ہو سکتا ہے۔ بیٹھ جاؤ شاباش' کچھ کھالو پھر چلتے ہیں۔" وہ اٹھ کر اس کے قریب آئے اور سمجھانے لگے۔

"مجھے کچھ نہیں کھانا ابو! آپ پلیز چلیں ابھی اسی وقت پلیز۔" عجیب بے بسی اور لاچاری تھی اس کے چہرے پر۔

"اچھا چلو' چلتے ہیں۔" وہ اس کا سر تھپک کر بولے۔

"احسان! اسے بٹھائیں ناشتہ کروائیں آپ اسے پاگل خانے لے جا رہے ہیں۔ وہاں جا کر یہ اور پاگل ہو جائے گی۔" وہ غصے سے اٹھی تھیں۔

"میں بھی وہیں رہوں گی۔ اب سن لیں۔"

"ثانیہ ریلیکس بیٹا' اچھا چلو چلتے ہیں۔" وہ اسے ساتھ لگاتے ہوئے باہر نکلے تھے۔

"ہم اسے اپنے گھر لے آئیں گے ابو۔"

"اوکے دیکھتے ہیں کول ڈاؤن۔" وہ چابی اس سے لیتے ہوئے آگے بڑھے۔

"یہ بھی پاگل ہو گئے ہیں۔ پہلے بیٹی کی زندگی داؤ پر لگا دی۔ اسے پاگل کر کے چھوڑیں گے۔" وہ غصے سے بڑبڑاتے ہوئے بیٹھ گئیں۔

"میرا خیال ہے میرے یہاں آنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ آپ نے مجھے بلا کر ایک اور غلطی کر لی ہے۔"

اس نے دیکھا تھا کہ اتنی دیر میں ثانیہ نے ایک لمحے کے لیے بھی اس کی طرف دیکھا تھا' نہ بات کی تھی۔ وہ جب سے یہاں آیا تھا اس کا رویہ اسے تکلیف دے رہا تھا اور اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ وہی ثانیہ ہے' جسے وہ کچھ سال پہلے چھوڑ گیا تھا۔ وہ بظاہر ویسی ہی تھی مگر اندر سے پوری کی پوری بدل چکی تھی۔ مگر وہ کہاں جانتا تھا کہ اس بدلنے میں اسے کتنی اذیتوں سے گزرنا پڑا تھا۔ وہ اگر بدلی تھی تو کیوں بدلی تھی۔

"یہ وہ ثانیہ نہیں ہے۔ ثانیہ بدل چکی ہے۔" اس نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے ان کی طرف دیکھ کر افسوس اور جتانے والے انداز میں کہا تھا۔

"وہ ٹھیک ہو جائے گی..... وہ شادی کے بعد بھی تمہیں یاد کرتی رہی' تمہارا انتظار کرتی رہی۔ کاش تم تب لوٹ آتے۔ مگر اب بھی سب کچھ پہلے جیسا ہو سکتا ہے۔ اگر تم کوشش کرو۔ اگر تم چاہو تو تم اسے پھر بدل سکتے ہو فہد! تم لوگ ایک نئی زندگی شروع کر سکتے ہو۔ وہ ابھی شدید دباؤ میں ہے' اسے وقت دو پلیز۔"

"وہ اپنے پاگل شوہر کے لیے رو رہی ہے' شور مچا رہی ہے' اسے واپس لانے کی بات کر رہی ہے اور آپ کہتی ہیں' وہ میرے ساتھ ایک نئی زندگی شروع کرے گی۔"

"تم نے دیکھا نہیں اس نے انگلی میں اب تک تمہارے نام کی انگوٹھی پہنی ہوئی ہے تم نہیں جانتے میں جانتی ہوں اس نے تمہارا کتنا انتظار کیا۔ اب وہ خفا تو ہوگی ہی۔ تم اسے وقت دو۔ پرانی باتیں یاد دلاؤ اسے۔ وہ مدثر سے ملے گی تو اس کے پاگل ہونے کا یقین آجائے گا اسے۔ اس کے پاس تمہارے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں ہے۔"

"بہت مشکل ہے یہ سب۔" اس نے کپ خالی کر کے میز پر رکھا تھا۔

"مگر نا ممکن نہیں ہے۔" وہ اسے ذہنی طور پر تیار کر رہی تھیں۔

"پتا نہیں کیا ہوگا آنٹی۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔"

"وہی ہوگا جو ہم چاہتے ہیں..... ہم اس سے طلاق کے پیپرز سائن کروا لیں بس پھر کچھ ہی مہینوں بعد تم شادی کر کے ثانیہ کو اپنے ساتھ لے جانا۔"

"دکھنا بہت آسان ہے۔ مگر بعض اوقات سب کچھ ویسا نہیں ہوتا جیسا ہم سوچتے ہیں۔"

"تم ثانیہ سے محبت نہیں کرتے فہد! کیا اسے اپنانا نہیں چاہتے؟"

"کرتا ہوں تب ہی تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آیا ہوں۔"

"تو پھر انتظار کرو اور اس مشکل گھڑی میں اس کا ساتھ دو۔ جیسے ہمیشہ اس کے ساتھ ہوتے تھے۔"

"میں اس کے ساتھ ہوں۔ مگر کاش وہ بھی یہ سمجھ پائے۔"

"سمجھ جائے گی فہد! سب سمجھ جائے گی بس تم عقل سے کام لو۔"

"محبت اور عقل کا آپس میں کوئی تعلق نہیں۔ اگر عقل سے کام لیتا تو یہاں اس وقت آپ کے ساتھ نہ بیٹھا ہوتا" اس کی بے رخی کے شکوے کرتا وہ استہزائیہ ہنسا تھا۔

"یہ تو بہرحال سچ ہے۔" وہ اس کی بات پر بے ساختہ ہنسی تھیں اور پھر دونوں ذہن اپنے اپنے منصوبے اپنے طریقے سے ترتیب دے رہے تھے اور ڈائننگ ٹیبل کے اطراف مکمل خاموشی تھی۔ گہری سوچوں والی خاموشی۔

☆ ☆ ☆

مینٹل اسپتال وارڈ تھری میں دور ایک بیڈ پر گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا وہ مدثر احمد تھا' جسے لوگ ہمیشہ سے پاگل کہتے تھے۔ جسے وہ بھی ہمیشہ پاگل کہتی تھی' جسے ڈاکٹر بھی پاگل کہتے تھے اور پھر اس کے گھر والوں نے اس پاگل کو پاگل خانے پہنچا کر ہی دم لیا تھا..... وہ لاکھوں بیگانے چہروں میں ایک اسی اپنے چہرے کو دیکھنے کے لیے لوہے کی گرل کے پاس رکی ہوئی تھی۔

"اسے آپ نے اتنے لوگوں کے بیچ رکھا ہوا ہے۔ یہ سارے مل کر اسے مزید پاگل کر دیں گے ڈاکٹر صاحب!"

احسان صاحب کچھ فاصلے پر کھڑے ڈاکٹر سے بات

کر رہے تھے۔ جب وہ لوہے کی گرل سے ہٹ کر ان تک آئی۔
"ان کو اکیلا رکھنا ان کے لیے مزید خطرے کا باعث ہے محترمہ!"
"میں اس کو یہاں سے لے جانا چاہتی ہوں۔ پلیز آپ اسے باہر نکالیں یہاں سے۔" اس کا بس نہیں چل رہا تھا لوہے کی گرل توڑ کر اسے باہر لے آئے۔
"فی الحال یہ بہت مشکل ہے محترمہ! انہیں علاج کی ضرورت ہے۔"
"یہ کب تک ٹھیک ہو جائے گا..... میں اسے کب لے جا سکوں گی۔"
"دیکھیں، کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ ان کی ذہنی حالت بہت خراب ہے۔"
میں جانا چاہتی ہوں۔ ابھی اور اسی وقت۔"
"محترمہ! پھر تو آپ ان کی دشمن ہوئیں کہ اس حالت میں آپ انہیں گھر لے جائیں گی۔ یہ ٹھیک تو نہیں ہوں گے البتہ آپ کا اور اپنا نقصان ضرور کر بیٹھیں گے۔"
"یہ یہاں اور پاگل ہو جائے گا ڈاکٹر صاحب! کیسے رہ پائے گا یہ یہاں۔"
"دیکھیں محترمہ! پاگل خانے لوگوں کو ٹھیک کرنے کے لیے ہوتے ہیں نا کہ مزید پاگل کرنے کے لیے۔"
"اگر ایسا ہوتا تو یہ کھچا کھچ بھرے نہ ہوتے۔ مجھے بتائیں کتنے لوگ ہیں یہاں سے جو ٹھیک ہو کر گھر گئے ہوں گے۔"
"ثانیہ بیٹا! فضول بحث کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہ لوگ علاج کریں گے اس کا، ان کو اپنا کام کرنے دو پلیز۔" وہ بہت دیر سے چپ تھے۔ مگر اب لگ رہا تھا اسے سمجھا کر چپ کرانا ضروری تھا۔
"آپ کو ٹرسٹ کرنا چاہیے محترمہ! یہاں سے بہت لوگ صحت یاب ہو کر جاتے ہیں، قصور آپ لوگوں کا ہے جو ہمیشہ تب مریض کو لاتے ہیں جب وہ سارے حواس کھو چکا ہوتا ہے۔ اب کچھ وقت تو لگے گا ہی کیا ڈاکٹرز نے نہیں کہا تھا کہ انہیں مینٹل اسپتال پہنچائیں۔ مگر آپ لوگ انہیں اب لائے ہیں جبکہ علاج بہت مشکل ہو چکا ہے ان کا اور اس حالت میں کہہ رہی ہیں کہ انہیں آپ لے جائیں گی۔ اور ہم کیا دشمن ہیں جو ان کا علاج نہیں کریں گے اور یہ مزید پاگل ہو جائیں گے۔ کمال کرتی ہیں آپ۔"
"ڈاکٹر ٹھیک کہہ رہے ہیں ثانیہ! اس کا علاج ہونے دو۔"
"مجھے اس سے ملنا ہے ابھی۔"
"ابھی نہیں مل سکتیں۔ ابھی ان کی حالت اچھی نہیں ہے۔"
"مجھے اس سے ملنا ہے ابھی..... مجھے ملوائیں میں کچھ نہیں جانتی۔"
"مجھے تو آپ بھی سائیکو لگ رہی ہیں معاف کیجئے آپ اس طرح بات کر رہی ہیں مجھ سے جیسے میں نے لاک اپ میں ڈالا ہے آپ کے شوہر کو؟"
"لاک اپ میں ہی تو ڈالا ہوا ہے آپ نے..... دیکھیں کیسے پڑا ہے قیدیوں کی طرح۔"
"یہاں بہت سارے لوگ ہیں اکیلے یہ نہیں ہیں مس۔"
"ڈاکٹر صاحب! آپ اسے ایک بار ملوا دیں پلیز۔"
"احسان صاحب! آپ تو اچھے خاصے سمجھ دار آدمی ہیں۔"
"جی ڈاکٹر صاحب! مگر آپ اس کی حالت دیکھیں۔ اسے ایک بار ملنے دیں۔ اسے یقین نہیں آتا ہم میں سے کسی پر بھی۔ یہ سمجھتی ہے ہم نے غلط کیا ہے اسے یہاں لا کر۔ آپ اسے دکھا دیں اس کی جو حالت ہے۔"
"میں نے دیکھی ہوئی ہے ساری حالت، پھر بھی میں کہوں گی کہ آپ لوگوں نے ظلم کیا ہے اسے یہاں لا کر۔"
"احسان صاحب مجھے تو یہ بھی بہت ڈسٹرب لگ رہی ہیں۔ چلیں بہر حال میں آپ کی ضد پر ملوا دیتا ہوں ـــ مگر۔" ڈاکٹر اس کی ضد کے آگے بے بس ہو کر اسے لے آیا۔ دروازے کے پاس تالا کھولنے لگا۔ اس سے پہلے اس نے اسٹاف میں سے ایک دو آدمیوں کو

آواز دے کر بلایا تھا اپنے ساتھ اندر لے جانے کے لیے۔
اندر داخل ہوتے ہی ایک پاگل ان کی طرف جھپٹا تھا جسے ایک آدمی نے قابو کر لیا۔ ایک شخص ان کو دیکھ کر ــــ قہقہے لگانے لگا اور کچھ الٹی سیدھی حرکتیں کر رہے تھے۔
وہ ڈرے ڈرے انداز میں مدثر کے پاس اسے لے آئے جہاں وہ دنیا جہان سے اجنبی بنا گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھا تھا۔ اس کی قمیص کا کالر اکھڑا ہوا تھا اور آستین کے کف پھٹے ہوئے تھے۔ اس نے چہرہ اوپر اٹھایا تو اس کے چہرے پر کھرونچوں کے کچھ نشان تھے۔
"مدثر..... یہ کیا ہوا ہے چہرے پر۔ کس نے زخمی کیا ہے۔" وہ بے ساختہ بڑھی تھی اس کی طرف۔
"میڈم! ذرا فاصلے پر۔" آدمی نے اسے خبردار کیا۔
"مدثر! مجھ سے بات کرو۔" وہ ارد گرد حواس باختہ انداز میں دیکھ رہا تھا جیسے کچھ نہیں سن رہا۔
"مدثر! میری طرف دیکھو۔ مجھ سے بات کرو۔" اس نے بازو ہلایا اس کا۔
"مت مارو مجھے، چھوڑ دو۔" وہ چیخا تھا بازو چھڑا کر۔
"مدثر! میں ثانیہ ہوں۔ میری طرف دیکھو۔"
"پھر میں تمہیں بہت ماروں گا۔ میرے کھلونے چرا لیتے ہو۔ مجھے مارتے ہو۔ کھڑکی سے گرا دوں گا تمہیں۔" وہ بچوں کی طرح چیخ رہا تھا۔
"اسے کیا ہوا ہے۔ یہ ایسا کیوں کہہ رہا ہے ابو!" وہ بے بسی سے کہنے لگی۔
"بیٹا! اس کی حالت ٹھیک نہیں۔ یہ اس وقت بھی ایسی باتیں کر رہا تھا۔ اس نے گھر کی چیزیں توڑ دی تھیں۔ یہ ٹھیک نہیں ہے۔"
"مدثر! مجھ سے بات کرو اور میری بات سنو! میں ثانیہ ہوں تم سے ملنے آئی ہوں۔ گھر چلو گے تم بتاؤ۔"
وہ اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ وہ اجنبی سے انداز میں اسے دیکھنے لگا۔
"میں ثانیہ ہوں مودی ..... تمہیں لینے آئی ہوں۔"
"مجھے درد ہوتا ہے..... سب مارتے ہیں..... ڈیڈی نے مارا۔ میں تو ڈاکٹر بنوں گا..... بہت بڑا ڈاکٹر۔" وہ بہت دنوں بعد بولا تھا۔
"اچھا پھر تم گھر چلو گے....." اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔
"پہلے میں تمہیں ماروں گا۔ تم نے میری فٹ بال کھڑکی سے نیچے پھینک دی تھی نا۔" اس نے ثانیہ کو ایک زوردار تھپڑ جڑ دیا۔
"ارے روکیے اسے ڈاکٹر صاحب! اٹھو ثانی۔" انہوں نے فوراً اسے اپنی طرف کھینچا۔ جب تک آدمی اور ڈاکٹر نے اسے تھام لیا۔
"یہ ایسا کیوں کر رہا ہے؟" وہ ان سے لگ کر بچوں کی طرح رو دی تھی۔
"مس ثانیہ! باہر چلیں پلیز۔"
"یہ اپنے بال کیوں نوچ رہا ہے کیوں مار رہا ہے یہ خود کو" وہ اب اپنے بال نوچتے ہوئے چیخ رہا تھا۔ اس نے خود اپنے ناخنوں سے اپنا چہرہ کھرچا ہوا تھا۔
"چلو شاباش باہر چلو بیٹا۔" وہ اسے باہر لے آئے اور دروازہ فوراً "بند کر دیا گیا۔ وہ ابھی تک چیخ رہا تھا اور کچھ آدمی اس کے ساتھ چیخنے لگے تو کچھ بے ہنگم قہقہے لگا کر ہنس رہے تھے۔ وہ بے بسی سے لوہے کی گرل کے پاس کھڑی رو رہی تھی۔
"ریلیکس ثانیہ! بیٹا گھر چلو۔"
"انہیں رو لینے دیں احسان صاحب! اس کے بعد نیند کی گولی کھلا کر سلا دیجئے گا۔ بہتر محسوس کریں گی۔" ڈاکٹر کہتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا اور وہ کتنی دیر تک وہاں کھڑی روتی رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ جب سے گھر آئی تھی، چپ چپ بیٹھی تھی۔ دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا نہ ناشتہ کیا تھا۔ ابھی بھی انہوں نے اسے زبردستی چند لقمے کھلائے تھے۔ وہ کوئی بات نہیں کر رہی تھی۔ اس کی اپنی کیفیت پاگلوں جیسی ہو رہی تھی۔ نیند کی گولی لینے کے باوجود وہ سو نہ سکی اور

اب اس کا دماغ شائیں شائیں کر رہا تھا۔
"ثانیہ اب ٹھیک ہے انکل۔" وہ پورے دن میں اب آیا تھا اس کے پاس۔
"وہ بہت اپ سیٹ ہے فہد۔ بات نہیں کر رہی ہے۔ بمشکل چند لقمے لیے ہیں۔ تم جاؤ کوشش کرو اس سے بات کرنے کی۔ اگر تم سے وہ کچھ بات کرلے گی تو اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔"
"جی میں کوشش کرتا ہوں۔۔۔ آپ فکر نہ کریں انکل۔"
"او کے بیٹا۔۔۔ شکریہ تم ہی اسے سنبھال سکتے ہو ابھی۔"
"جی میں سمجھ سکتا ہوں۔" وہ ان کے جانے کے بعد اندر آیا۔
"کیا حال ہیں میڈم! کیا ہو رہا ہے؟" وہ کشن لے کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔
"مجھے نیند آرہی ہے۔" وہ بہت تھکے ہوئے انداز میں بال باندھنے لگی۔
"تمہیں یاد ہے مجھ سے بات کرتے ہوئے تمہاری نیند اڑ جاتی تھی۔"
"اتنی پرانی باتیں مجھے یاد نہیں رہتیں!" اس کا لہجہ خالی سا تھا۔
"ثانی تم مجھ سے خفا ہو؟"
"میں بہت تھکی ہوئی ہوں سونا چاہتی ہوں۔" وہ فوراً اٹھی۔
"مجھے پتا ہے تم پریشان ہو مگر دیکھو پریشان ہونے سے کچھ نہیں ہوتا۔ ہم مل کر کوئی حل نکال لیتے ہیں۔"
"کیا حل ہے تمہارے پاس میرے مسائل کا۔ بولو؟" وہ تھکے تھکے انداز میں پھر بیٹھ گئی۔
"سب ٹھیک ہو جائے گا۔۔۔ میں لوٹ آیا ہوں۔ ہم اس سے پیپرز سائن کروالیں گے۔ اس کے بعد ہم شادی کر کے یہاں سے بہت دور چلے جائیں گے۔ اپنی نئی زندگی شروع کریں گے اور خوش رہیں گے۔ سب بھول جاؤ تم۔"
"تم اپنی بیوی کو چھوڑ سکتے ہو؟"
"چھوڑ دوں گا تمہارے لیے۔"
"مگر میں اپنے شوہر کو نہیں چھوڑ سکتی۔ وہ بھی اس حالت میں۔"
"تم پاگل ہو گیا؟ ایک پاگل کے ساتھ کیسے زندگی گزارو گی تم۔"
"پاگل ہوں تب ہی ایک پاگل کے ساتھ رہنے کی خواہش ہے۔ میرے پاس کوئی احساس کوئی جذبہ باقی نہیں بچا۔ کسی کے لیے بھی۔ میں بس ایک بے سہارا آدمی کو مزید بے سہارا نہیں کر سکتی۔"
"تم اپنی پوری زندگی داؤ پر نہیں لگا سکتیں ثانیہ۔"
"میری زندگی داؤ پر لگ چکی ہے آج سے ڈھائی سال پہلے۔ اس وقت کہاں تھے تم۔۔۔؟"
"ثانی! میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا میری کیا مجبوری تھی۔ سب ٹھیک ہو سکتا ہے۔ دیکھو ہم دونوں کو قدرت نے ایک موقع دیا ہے پھر سے ملنے کا۔ ہم ایک نئی لائف شروع کریں گے۔ بھول جاؤ سب۔ ہمارے سارے خواب پورے ہوں گے۔"
"اس ڈھائی سال کے مشکل ترین سفر نے میری آنکھوں سے سارے خواب نوچ لیے ہیں فہد! اب میرے پاس کسی خواب کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ایک تپتے ہوئے صحرا میں تنہا کھڑی ہوں جسے اکیلے پار کرنا میرا مقدر ہے۔"
"زندگی بہت مشکل ہے ثانی اور بہت لمبی بھی۔ اسے اکیلے گزارنا آسان نہیں۔ ہم مل کر سب کچھ ٹھیک کرلیں گے۔"
"میں نے کہا نا کہ خواب دیکھنے کی عمر گزر گئی۔ تم چلے جاؤ واپس۔"
"ثانی۔۔۔ اچھا بتاؤ کیا کرو گی اگر میں واپس چلا جاؤں تو؟"
"وہی جو میرا نصیب ہے۔ انتظار۔"
"اور اگر وہ پاگل ٹھیک نہیں ہوا تو؟"
"اسے پاگل مت کہو۔" اسے بہت برا لگا۔
"پوری دنیا کہتی ہے۔ کس کس کو روکو گی۔ وہ پاگل

خانے میں پڑا ہے اور تم کہتی ہو اسے پاگل مت کہو۔"
"ٹھیک ہے وہ پاگل ہے مان لیا تو... ہے تو میری زندگی کا حصہ میری ذمہ داری۔"
"کچھ نہیں ملے گا تمہیں یہ سب کرکے۔ وہ وہاں سے کبھی واپس نہیں آئے گا۔ اس کی میموری ختم ہو چکی ہے اس کا ذہنی توازن بگڑ چکا ہے۔ وہ اتنی جلدی ٹھیک نہیں ہونے والا ثانیہ!"
"تب بھی یہ میرا نصیب ہے۔"
"ثانی! بے وقوفی مت کرو... تمہاری زندگی ضائع ہونے کے لیے نہیں ہے۔"
"میری زندگی ضائع ہو چکی ہے... تم کیا سمجھتے ہو۔ آسان ہوتا ہے یہ سب۔ میرے لیے اس سے شادی کرنا جتنا مشکل تھا اتنا ہی مشکل اسے چھوڑنا ہے۔ ایک انسان جو میرے آسرے پر پڑا ہے۔ اسے میں بے یار و مددگار چھوڑ کر دوسری شادی کرلوں گی... یہ کہنے میں آسان لگتا ہے مگر کرنے میں بہت مشکل ہے۔"
"مگر یہ ممکن نہیں ہے ثانی!"
"مر چکی ہوں میں۔ بار بار مت مارو مجھے... چلے جاؤ فہد... اپنا وقت برباد مت کرو۔ میں جس حال میں بھی ہوں یہ میرا نصیب ہے۔"
"میں تمہیں ایک پاگل کے حوالے کردوں جس کے ساتھ رہ کر تم بھی پاگل ہو جاؤ۔ میں نے تمہیں کھویا ضرور تھا ایک بار مگر اب نہیں۔"
"زندگی مذاق نہیں۔ نہ ہی بلیک بورڈ پر لکھی ہوئی تاریخ ہے جسے ڈسٹر اٹھا کر صاف کرلیا جائے۔" ایک لمحے کے توقف سے دوبارہ بولی۔
"میں بہت تھک چکی ہوں... مجھے سونا ہے تاکہ میں کچھ نارمل ہوسکوں۔"
"میں یہیں ہوں۔ تمہارے فیصلے کا انتظار کروں گا۔"
"میرا فیصلہ کل بھی یہی ہوگا۔"
"میں پھر بھی انتظار کروں گا۔"
"تم اپنا وقت برباد کروگے۔"

"ثانی!" وہ دکھ سے اسے دیکھتا رہ گیا۔
"لائٹ بند کردینا پلیز جاتے ہوئے۔" وہ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔
"کیا سب اتنی آسانی سے ختم ہوسکتا ہے۔"
"آسانی سے ختم ہو چکا ہے... آج نہیں تین سال پہلے۔"
"میں تلافی کرنے آیا ہوں ثانی۔"
"تم وقت ضائع کرنے آئے ہو۔" اس نے آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔
"تم میرے جانے کے بعد پچھتاؤگی۔ ایسا نہ ہو کہ پھر مجھے آواز دو۔"
"آواز دے کر دیکھ چکی ہوں، دوبارہ قطعی ایسا نہیں کروں گی۔"
"تم اپنی زندگی مشکل کر رہی ہو ثانیہ!" وہ اب بھی دروازے کے پاس رکا تھا۔
"میں پچھلے ڈھائی سال سے اس مشکل سے گزر رہی ہوں۔ اب عادت ہو چکی ہے۔"
"تمہیں نہیں لگتا کہ تم بھی پاگل ہو گئی ہو اس نفسیاتی کے ساتھ رہ رہ کر۔"
"شکر ہے تم نے اب کی بار اسے پاگل نہیں کہا۔"
"ایک ہی بات ہے۔ مگر تمہارا دماغ ٹھیک نہیں ہے۔ پھر بات ہوگی۔"
"میرے پاس اتنا اسٹیمنا نہیں ہے کہ ایک محبت کو بار بار دہراؤں۔"
"ثانی! میری کوئی حیثیت نہیں ہے تمہارے نزدیک۔ جو تمہارے لیے وہاں سے چل کر آیا ہے۔ اتنی دور سے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر۔ بکواس کر رہا ہوں اتنی دیر سے میں کیا۔ پتھروں سے سر پھوڑ رہا ہوں۔" اسے آخر کار غصہ آگیا۔
"بکواس کررہے ہو اور پتھر سے سر پھوڑ رہے ہو۔"
"بھاڑ میں جاؤ تم۔ مرو اس کے ساتھ پاگل خانے میں۔"
"شکریہ بتی بند کرکے جانا پلیز۔" اس کے چہرے پر تھکی ہوئی عجیب مسکراہٹ تھی۔

"معاف نہیں کروں گا تمہیں میں۔ سن لو۔ خوش نہیں رہ پاؤگی کبھی۔"
"میں نے بھی تمہیں معاف نہیں کیا تھا۔ تم اگر خوش نہیں رہ پائے تو۔"
"ٹھیک ہے... خوشی سے برباد کرو اپنی زندگی تم اسی ضد میں رہو۔"
"بہت بار کہہ چکی ہوں بتی بند کردینا اور دروازہ بند۔" اس نے کہتے ہوئے ٹانگیں سیدھی کرلیں اس نے زور سے دروازہ بند کیا تھا۔
ادھر گھپ اندھیرے میں دو آنسو ٹوٹ کر گرے اور چہرہ بھگو گئے۔

☼ ☼ ☼

"تم جا رہے ہو فہد!" وہ پیکنگ کر رہا تھا، جب وہ اندر آئیں اس کے کمرے میں۔
"جی ہاں! میں نے سوچا مزید وقت برباد کرنے کی حماقت نہیں کرنی چاہیے۔"
"تم اسے اس حال میں چھوڑ کر جاؤگے فہد! جب اسے تمہاری شدید ضرورت ہے۔"
"اسے کوئی میری ضرورت نہیں ہے۔ یہ سب بہلاوے ہیں۔ میں مزید یہاں رک کر تماشا نہیں بن سکتا۔"
"اور وہ جو تماشا بن گئی ہے۔ اس کا خیال نہیں ہے تمہیں۔"
"وہ خود بنی ہے اس میں کس کا قصور ہے بھلا۔"
"تمہارا فہد! تمہارا قصور ہے اس میں۔ تم اگر اسے چھوڑ کر نہ جاتے تو وہ یہ فیصلہ کبھی نہ کرتی۔"
"تو اسے پورا جہاں چھوڑ کر اس پاگل سے ہی شادی کرنی تھی؟"
"یہ شادی اس کے باپ کی پسند سے ہوئی تھی۔ تمہیں پتا تو ہے اس نے بس سمجھوتا کرلیا تھا کیوں کہ اس کے پاس کوئی اور راستہ نہیں تھا۔"
"جو بھی ہے، پر اب میں اس کے لیے سب کچھ چھوڑ آیا تھا اور وہ نہیں مان رہی تو میں کیا کرسکتا ہوں بھلا۔" وہ بیگ کی زپ بند کرکے سوٹ کیس نیچے اتار کر ان کی طرف مڑا۔
"وہ تم سے محبت کرتی تھی فہد! اسے مت چھوڑو۔"
"کرتی تھی مگر کرتی نہیں ہے۔ اس کا گھر بس چکا ہے وہ بدل گئی ہے آنٹی۔"
"فہد! اسے وقت دو پلیز۔"
"آنٹی! پچھلے تین ماہ سے پاگلوں کی طرح یہاں اس کے پیچھے خوار ہو رہا ہوں۔ کچھ نہیں ملا مجھے۔ سب کچھ داؤ پر لگا ہے میرا گھر میرا کاروبار سب کچھ... پوری زندگی داؤ پر لگا آیا ہوں اس کے لیے جس کے پاس مجھ سے بات کرنے کے لیے وقت نہیں، میں برداشت نہیں کرسکتا زیادہ۔ بس بہت ہو چکا ہے۔"
"تم اس کی زندگی کی آخری امید ہو۔"
"کیسے سمجھاؤں میں آپ کو کہ جو کچھ آپ سوچتی ہیں ویسا نہیں ہوتا ہے۔ وہ اسے چھوڑنے کو تیار نہیں ہے۔"
"وہ چھوڑ دے گی بے زار آجائے گی اس سے۔ کتنا بھاگے گی اس کے پیچھے۔"
"ٹکٹ بک کرالی ہے ہوٹل جا رہا ہوں۔ وہاں سے چلا جاؤں گا۔"
"فہد! کچھ دن اور رک جاؤ۔"
"اب نہیں پلیز... اب میں خود بہت اپ سیٹ ہوں۔ مگر مجھے لگتا ہے میرا یہاں رکنا میرے اور اس کے لیے کوئی فائدہ نہیں دے سکتا۔"
"اگر وہ خود تمہیں روکے۔"
"ناممکن ہے۔" وہ بیگ لے کر کمرے سے باہر نکلا۔
"اگر ایسا ہو جائے تو کیا تم رک جاؤگے فہد؟" وہ پھر کسی امید کو لے کر اس کے پیچھے آئی تھیں۔
"تو میں رک جاؤں گا۔ مگر مجھے پتا ہے ایسا نہیں ہوگا۔" وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے جا رہا تھا۔
وہ تیزی سے ثانیہ کے کمرے کی طرف بڑھیں۔
"ثانی! وہ جا رہا ہے اسے روک لو۔ پلیز! اسے روک

لو۔ تم اس سے محبت کرتی ہو نا۔ لڑتی تھیں تم اس کے لیے۔ کئی کئی دن کھانا نہیں کھاتی تھیں۔ وہ تمہارے لیے لوٹا ہے اسے روک لو اپنے لیے۔"

"وہ سب ختم۔ ختم ہو چکا ہے؟" وہ پتھر کے بت کی طرح کھڑی تھی۔

"کچھ ختم نہیں ہوا۔ جاؤ اسے روک لو۔ اس کے پیچھے جاؤ خدا کے لیے۔ وہ چلا جائے گا ثانی! وہ تمہاری آخری امید ہے۔ اسے روک لو! دیکھو تم نے ابھی تک اس کی دی ہوئی انگوٹھی پہن رکھی ہے۔ تم نے اس کی چیزیں سنبھال کر رکھی ہوئی ہیں۔ ثانیہ بیٹا تمہیں پھر سے موقع ملا ہے اپنی زندگی بنانے کا۔ جاؤ ثانیہ جاؤ۔"

وہ اسے پاگلوں کی طرح جھنجوڑ رہی تھیں۔

"امی! چھوڑیں مجھے۔ سن چکی ہوں یہ سب۔"

"ثانیہ تمہیں میری قسم جاؤ۔ پلیز جاؤ۔ اسے روک لو۔"

"امی۔" وہ صدمے سے انہیں دیکھتی رہ گئی۔

"اٹھو ثانیہ جاؤ۔" وہ اسے تقریباً" گھسیٹتے ہوئے دروازے تک لے آئیں۔

"امی! ایسا مت کریں۔" وہ تکلیف سے انہیں دیکھے گئی۔

"ثانیہ! جاؤ میں نہیں چاہتی اب وہ جائے۔ اسے روک لو۔" وہ بے بسی سے دو منٹ تک دیکھتی رہی، پھر تیز تیز قدم سیڑھیوں سے اترنے لگی۔

وہ ٹھنڈی سانس بھر کر آہستہ آہستہ نیچے اتریں اور گلاس وال کے نزدیک رک گئیں۔

وہ اپنی گاڑی کا دروازہ کھولے کھڑا تھا جب ثانیہ اس کے پاس پہنچی۔

وہ حیران ہوتے ہوئے مڑا تھا اور پھر اس کا ہاتھ دروازے کو بند کرنے کے لیے بڑھا تھا۔ وہ دور سے اس کے چہرے کا اطمینان دیکھ سکتی تھیں۔ ثانیہ کی پشت تھی اس طرف مگر وہ اندازہ لگا سکتی تھیں۔ ثانیہ اور فہد رک کر رسان سے بات کر رہے تھے۔ وہ مسکرا رہا تھا یہ دیکھ کر ان کے ہونٹوں پر آسودہ سی مسکراہٹ آگئی۔ وہ مسکراہٹ اطمینان بھری تھی، جو تب انسان کے چہرے پر بکھرتی ہے جب اس کی کوئی بڑی خواہش پوری ہوتی ہے۔

سب کچھ جیسے ٹھیک ہو گیا تھا۔

مگر سب کچھ صحیح کے درمیان کبھی کبھی کچھ گڑبڑ بھی ہو جاتی ہے۔ کبھی کوئی ایک کھوٹ رہ جاتا ہے جو انسان کے ذہین ترین دماغ سے بھی چوک جاتا ہے۔

☼ ☼ ☼

میں تجھے دل سے پیار کرتا ہوں
تو مجھے زندگی سے پیارا ہے

گاڑی نے رفتار پکڑی تھی اور اس کا ہاتھ پلیئر پر رک گیا تھا

"یہ کیا لگا دیا ہے ثانی! میں تو سو رہا ہوں۔ اسٹیئرنگ سنبھالو۔" اس نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

"چپ کر کے سنو۔ یہ سب تم میرے لیے کہہ رہے ہو یہ سمجھو۔"

"میں کبھی بھی اتنا بے سرا نہیں گا سکتا۔ بھول کر بھی نہیں۔"

"دیکو مت۔ تم کبھی بھی اتنا سریلا نہیں گا سکتے۔ مگر مجھے سننے دو۔"

چھوڑ دوں میں پکڑ کر ہاتھ تیرا
بھول کر بھی نہ ایسی بھول کروں

اسد امانت علی کی گائیکی تھی، جو دل کے اندر اتری جاتی تھی

"ثانی! ہم گاڑی میں بیٹھے بیٹھے بوڑھے ہو چکے ہیں ستر سال کے۔"

وہ ایک آنکھ دبا کر گردن ڈھلکا کر بولا۔

جو ملی ہے خوشی تجھے پا کر
موتیوں میں ہے نہ ہیروں میں
نام تیرا غزل سے لکھا ہے
تیرے ہاتھوں کو ان لکیروں میں
دیکھ میں نے کس محبت سے
دھڑکنوں میں تجھے پکارا ہے
میں تجھے دل سے پیار کرتا ہوں

تو مجھے زندگی سے پیارا ہے

"میں تمہیں بیس سال بعد یہ گانا ضرور گا کر سناؤں گا ثانی! مگر ابھی یہ جبر نہیں کرو۔"

"بیس سال بعد بھی نہ تم اتنے باذوق ہو گے نہ ہی سریلے۔ اس لیے رہنے دو۔ یہ گانا میں اکیلے میں ہی سن سن کر خوش ہوتی رہوں گی۔" اس نے بے دلی سے پلیئر بند کیا۔

"چلو میں تمہیں اک اور گانا سناتا ہوں۔"

"میں نے کان بند کر لیے ہیں۔" اس نے کانوں پر ہاتھ رکھ دیے۔

"دیوانہ تھا میں...... دیوانہ یہ نہ جانا۔ میں نے یہ نہ جانا۔

بن جائے گا پھر افسانہ۔
یہ نہ جانا، میں نے یہ نہ جانا۔

وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر گا رہا تھا۔

"خدا کے لیے بس کر دو فہد۔۔۔ علی عظمت بے چارہ رو رہا ہو گا۔" اس نے ہاتھ ہٹا کر ہنس کر کہا تھا۔

"وہ پہلے کون سا خوشی خوشی گاتا ہے رو رو کر اور چیخ چیخ کر تو روتا ہے گاتا ہے۔"

"وہ تو گاتے وقت چیختا ہے۔ تم تو بلاوجہ چیختے ہو۔"

"تمہیں میرے چیخنے پر بھی اعتراض ہے۔ میرے گانے پر بھی، میرے اٹھنے بیٹھنے پر بھی۔۔۔ ہر اک بات پہ۔۔۔ میں کہتا ہوں لڑکی اک بار سوچ لو اپنے فیصلے پر۔"

"سوچنے کا وقت اب کہاں؟ انگوٹھی پہن لی، ایگریمنٹ کر لیا۔ بس اب دستخط باقی رہتے ہیں۔"

"کہو تو وہ بھی ابھی کروا لوں تمہارے بدلنے کی کوئی گارنٹی نہیں ہے۔"

"رہنے دو۔ خود تو جا رہے ہو سیر سپاٹے کرنے۔۔۔ دستخط کروا دوں۔"

"سیر سپاٹے کرنے۔ ثانی! خدا کو مانو۔ پڑھنے جا رہا ہوں وہ بھی اسکالر شپ جیسی نعمت پر۔ اب ٹھکرا کر ناشکری کروں کیا۔"

"نہیں نہیں تم تو بہت شکر گزار بندے ہو رب کے میرے ملنے پر کتنے نفل پڑھے تھے بتاؤ۔"

"تم جب پوری طرح مل جاؤ گی دستخط کر کے تو سو پڑھ لوں گا۔"

"ہاں وحید مراد کی طرح جھوٹ موٹ کے دکھاوے کے۔"

"پرانی فلمیں ذرا کم ہی دیکھا کرو اچھا! بہت اثر ہو جاتا ہے تم پر پرانے گانوں فلموں کا۔"

"میں نے سوچا ہے ہم شادی کے بعد روز ایک زیبا محمد علی کی فلم دیکھیں گے مل کر۔" وہ پھر اسے چڑانے کے لیے کہنے لگی۔

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لانگ ڈرائیو پر جائیں گے۔ روز سیر سپاٹے کریں گے۔ رات دیر تک سڑکوں پر پھرتے رہیں گے۔"

"دماغ خراب ہے تمہارا۔ آوارہ گردی کی زندگی گزارو گے شادی کے بعد بھی۔"

"پرانی سڑی ہوئی فلمیں دیکھنے سے تو یہی بہتر ہے۔۔۔ میں تمہیں بتا رہا ہوں، اپنی سی ڈیز کا ڈھیر، اپنی کتابیں، کہانیاں، غزلیں وزلیں سب وہیں پھینک کر آنا، میں نہیں برداشت کروں گا۔ جان نکال دینے والے سر اور موٹی موٹی کتابیں، جن کی وجہ سے ابھی سے چشمہ لگ گیا ہے تمہیں۔"

"کتنے سخت قسم کے آدمی ہو تم کسی کی ذاتی دلچسپیوں پر حملہ آور ہوتے ہو۔ تم تو جینا حرام کر دو گے میرا۔ یہ نہ کرو یہ کرو۔ وہ نہ کرو وہ کرو اف۔ کتنی مشکل زندگی ہے شادی کی۔"

"اور میں یہ سوچ سوچ کر ختم ہو رہا ہوں کہ اتنی سڑیل، بدمزاج بور خاتون کے ساتھ مجھے پوری زندگی گزارنی ہے۔ ختم ہو گیا میں تو۔" اس نے مصنوعی افسوس سے کہا۔

"تو پھر ابھی سے سوچ لو۔ بلکہ کوئی فیصلہ کر کے ہی جاؤ۔"

"بلکہ ابھی کیوں نہیں۔ یہ لو اپنی پیتل کی انگوٹھی۔" اس نے انگوٹھی اتارتے ہوئے کہا۔

"خبردار! جو اسے اتارنے کا کبھی سوچا بھی۔ سمجھ لینا اس دن فہد مر گیا۔"

”اللہ نہ کرے ایسا کیوں کہہ رہے ہو۔“
”تم جو مجھے یہ اتار کردے رہی ہو۔“
”پہن لیتی ہوں۔ ماؤں کی طرح بلیک میل مت کیا کرو۔“
”اور ہاں بار بار پیتل کی مت کہا کرو۔ سونے کی ہے یہ۔“ اس کا اشارہ انگوٹھی کی طرف تھا۔
”اچھا چھوڑو نا کوئی اور بات کرو۔ بہت بولتے ہو۔“
”اوکے! آپ کہیئے۔“
”آئس کریم کھلا دو۔“
”ریکارڈ خراب مت کروانا۔“
”فہد!“ اس نے ایک مکا جڑ دیا اسے۔

☼ ☼ ☼

اس کے ہاتھ سے شیشہ گر کر ٹوٹا تھا' اور سب سے پہلا تھپڑ اسے تب پڑا تھا۔۔۔ پھر مار دھاڑ کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا۔۔۔ وہ اس کا سوتیلا نہیں سگا باپ تھا۔ پہلے پہل وہ اسے ڈانٹتا تھا۔ نہ پڑھنے پر' اچھا ہوم ورک نہ کرنے پر پھر وہ اسے مارنے لگا۔ ہر چھوٹی سے چھوٹی بات پر۔

اور اس کی سوتیلی ماں نے کبھی بڑھ کر اسے چھڑایا نہیں۔ کبھی اس کی حمایت نہیں کی۔ کبھی اس پر رحم نہیں کھایا۔ حالانکہ وہ خود اسے نہ مارتی تھی' نہ جھڑکتی تھی۔ وہ اس کے ساتھ اجنبیوں کا سا سلوک کرتی تھی۔ نہ محبت نہ نفرت' اس نے کبھی شکایت لگاتے ہوئے بھی نہیں سنا اسے نہ بھڑکاتے ہوئے۔ وہ بس اپنے بچوں کی تعریفیں کرتی تھی۔ ان کے گن گاتی رہتی تھی۔ ذیشان اور ٹینا واقعی خوب صورت تھے اور خوب صورتی میں اپنی ماں پر گئے تھے۔ وہ ذہین بھی تھے۔ اچھا پڑھتے تھے اور اس کا باپ اس کے بہن بھائیوں کے لیے اچھے اچھے کھلونے لاتا تھا۔ اک آدھ اس کے لیے بھی لے آتا۔ وہ سنٹ آرام سے بات کر لیتا۔ مگر وہ بیٹھ کر اس سے اس کے مسائل نہیں پوچھتا تھا۔ ضروریات پوری کر دیتا۔ کھانا پینا دے کر اپنا فرض پورا کر لیتا اپنے تئیں۔ اس کا ہوم ورک چیک کرنے کے لیے آتا تھا' اور ہر بار خراب کارکردگی دیکھ کر اسے ڈانٹ کر کتابیں اس کے منہ پر مار کر چلا جاتا۔ اسے یہ احساس نہیں تھا کہ کچھ کام مار سے نہیں پیار سے ہوتے ہیں۔

اس نے بہت دفعہ کوشش کی اچھا پڑھنے کی۔ مگر اس کا حافظہ کمزور تھا اسے چیزیں یاد مشکل سے ہوتی تھیں۔ وہ مکمل طور پر نکما اور نالائق نہیں تھا۔ بس اسے سبق یاد کرنے میں مشکل ہوتی تھی۔ وہ اس لیے شاید کہ سبق کے علاوہ اس کے ذہن میں کئی سوچیں ہوتی تھیں۔ دن میں ہر جگہ اپنی ماں کو ڈھونڈتے رہنا اور رات میں نیند سے اٹھ کر ڈر جانا۔ کئی بار وہ چیخیں مار کر اٹھتا تھا۔ اس کی چیخوں پر صرف ایک بار اس کا باپ آیا تھا۔ اسے خوب ڈانٹا اور چلا گیا۔ پھر اس کی چیخوں پر کوئی نہیں آتا تھا۔ وہ چیخ کر کمبل سے منہ چھپا کر روتا رہتا۔ ہر رات خواب آتا۔ کوئی اس کی ماں کو اس سے چھین رہا ہے۔ وہ دس سال کا تھا جب اس کی ماں مر گئی تھی اچانک ہی ہنستے بولتے بات چیت کرکے وہ اس کے ساتھ آکر لیٹی تھی اور رات میں اچانک اسے درد اٹھا اور وہ چیختے چیختے مر گئی۔ اس وقت گھر پر کوئی نہیں تھا۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ اکیلا رہتا تھا۔ اس کی ماں اس کے باپ کی ناپسندیدہ بیوی تھی۔

اور تب ہی اس کے باپ نے ایک شادی اپنی پسند سے کی تھی۔ دونوں بیویوں کو ایک الگ الگ گھر میں رکھا۔

جب اس کی پیدائش ہوتی تب بھی اس کا باپ نہیں آیا تھا۔ اس وقت اس کی چہیتی بیوی کی بھی طبیعت خراب تھی اور ٹھیک ایک ماہ بعد اس کا بھائی ذیشان پیدا ہوا۔ جس کے پیدا ہونے پر مٹھائیاں بانٹی گئیں۔ خوشیاں منائی گئیں۔

اس کا باپ کبھی کبھار جب خرچے کے پیسے دینے آتا تو اسے ایک نظر دیکھ لیتا تھا۔ اس سے کوئی ذاتی دلچسپی وابستہ نہیں تھی۔ بس وہ ضروریات پوری کر دیتا تھا۔

پھر اس کی ماں نے جاب شروع کر دی۔ وہ چار سال کا تھا۔ وہ اسے اسکول چھوڑ کر جاب پر جاتی واپسی میں اسے لیتی ہوئی آتی۔ اس کی ماں نے اس کے باپ سے خرچہ لینا چھوڑ دیا تھا۔ ملنا جلنا ویسے ہی کم تھا اور بات چیت نہ ہونے کے برابر تھی۔

اسی طرح چھ سال گزر گئے۔ اس نے دو ڈھائی سال سے اپنے باپ کی شکل تک نہیں دیکھی تھی۔ وہ عنقریب اس برائے نام باپ کو بھول ہی جاتا اگر اچانک اس کی ماں اس دنیا سے نہ چلی جاتی۔

وہ کچھ عرصہ اپنے ننھیال میں رہا پھر ان لوگوں نے اس کے باپ کو بلوایا اور اسے اس کے حوالے کر دیا۔ اس کا باپ اسے بے دلی سے گھر لے آیا۔ ایک بار سینے سے لگا کر پیار بھی کیا۔ اس کے لیے کھلونے بھی لایا۔ مگر اس کے دوسرے بچے اس کی توجہ کھینچ لیتے تھے۔ آہستہ آہستہ پھر سے اس کا باپ اسے ایک کمرے میں چھوڑ کر بیگانہ ہو گیا تھا۔ وہ اسے چیزیں' کپڑے' کتابیں لا دیتا تھا مگر اس کے ساتھ وقت نہیں گزارتا تھا۔

ماں کی وفات باپ کی لاپروائی کے بعد ہی وہ ذہین پیارا سا بچہ۔۔۔ احساس کمتری کا شکار ہوتا گیا اور اس کا اثر اس کی ذہنی جسمانی صحت پر پڑتا گیا۔ وہ کمزور ہوتا گیا۔ سبق نہ یاد کر سکتا' رات میں اٹھ کر چیختا۔ چپ رہنا اور ہاتھ سے چیزیں گر کر ٹوٹنا اس کا معمول بنتا گیا' مدثر احمد بارہ سال کی عمر سے ان کیفیات میں مبتلا ہوتا گیا۔ اور تب اس کا علاج نہ دوا سے ہوا نہ محبت سے۔

☼ ☼ ☼

اس کے لوٹتے لوٹتے رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ وہ کرسی پر بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ مگر اس کے آتے ہی پھرتی سے آنکھیں کھول کر آرام کرسی روک کر اسے دیکھنے لگے۔

”السلام علیکم ابو۔۔۔ کیا بات ہے طبیعت ٹھیک ہے آپ ابھی تک جاگ رہے ہیں۔“ وہ فکر مندی ان کی طرف بڑھی۔

”میں ٹھیک ہوں۔ تمہارا انتظار کر رہا تھا میں۔ اتنی دیر کیوں ہو گئی تمہیں گیارہ بج رہے ہیں۔“ ان کے لہجے میں خفگی تھی۔

”وہ ابو! دراصل ہم باتیں کرتے کرتے کافی دور نکل گئے تھے۔ واپسی میں دیر ہو گئی۔“
”کس وقت گئی تھیں تم۔“
”آٹھ بجے شاید۔“
”اس وقت جانے کی کیا ضرورت تھی۔“
”آپ کو میرا جانا برا لگا یا فہد کے ساتھ جانا۔“
”نہ جانا' نہ فہد کے ساتھ جانا' بے وقت جانا اور بے وقت لوٹنا برا لگا' صرف برا کیا بلکہ افسوس ہوا۔۔۔ دکھ بھی کہہ سکتے ہیں۔“ ان کا لہجہ ہلکا تھا مگر دکھی اور بے بس سا۔

”فہد میرا منگیتر ہے ابو! بہت شریف انسان ہے مجھے بھروسا ہے اس پر۔ آپ کو بھی ہونا چاہیے مجھ سمیت اس پر۔“

”گھومنے پھرنے کے مواقع شادی کے بعد بھی مل سکتے ہیں۔ مجھے اعتماد ہے مگر یہ سب زیب نہیں دیتا اس وقت۔“

”وہ دو چار دن میں باہر جا رہا ہے۔ بتایا تو تھا کہ اس کے ساتھ جا رہی ہوں' آپ کو برا لگا تھا تو منع کر دیتے میں نہیں جاتی۔“

”آئس کریم کھانے کی بات کی تھی بیٹا! میں نے سوچا گھنٹے بھر میں واپسی ہو جائے گی پھر فہد کے سامنے انکار کرنا مناسب نہیں لگا۔ اچھا ہوتا تم خود منع کر دیتیں۔“

”مجھے کیا معلوم کہ آپ مجھ سے کیا توقع کر رہے ہیں۔ آپ نے نہیں روکا تو میں چلی گئی۔ مجھے خود احساس نہیں تھا کہ دیر ہو جائے گی اتنی۔“
”باتیں گھر پر بیٹھ کر بھی ہو سکتی ہیں۔“ ان کا لہجہ ملامت کرنے والا ہو گیا تھا۔
”مجھ سے غلطی ہو گئی۔“ اس نے بیزاری سے کہا تھا۔
”آئندہ نہیں ہونی چاہیے۔“ ان کا رخ اب دوسری جانب تھا۔ وہ سگریٹ سلگا رہے تھے۔
”نہیں ہوگی۔ کیونکہ وہ دو دن بعد جا ہی رہا ہے۔“

کوشش کروں گی کہ اسے سی آف کرنے نہ جاؤں۔"

"ازیووش۔" وہ سگریٹ کے کش لینے لگے۔

"مجھے پتا ہے وہ آپ کو اچھا نہیں لگتا مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ اسے اتنا برا اور غلط سمجھیں۔"

"میں نے اسے کچھ نہیں سمجھا نہ کہا اور وہ مجھے اچھا لگے یا نہ لگے، تمہیں لگتا ہے تمہاری ماں کو لگتا ہے۔ کافی ہے۔"

"مجھے آپ کی ان باتوں سے تکلیف ہوتی ہے ابو!"

"مجھے بھی تمہارے رویے اور لاپروائی سے تکلیف ہوتی ہے۔"

"آپ مجھ پر بھروسا نہیں کرتے۔" اس کی آنکھیں گیلی ہوگئیں۔

"تم میری کوئی بات نہیں مانتیں۔ نہ سنتی ہو نہ سمجھتی ہو۔"

"آپ کو مجھ سے ہمیشہ یہ شکایتیں رہیں گی؟"

"تم اگر میری کوئی بات سمجھو تو شکایتیں مٹ بھی سکتی ہیں۔"

"مجھے لگتا ہے میں آپ کو کبھی خوش نہیں کرپاؤں گی۔" وہ سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اوپر چلی گئی۔

"مجھے بھی یہی لگتا ہے۔" وہ سگریٹ کے کش لگاتے ہوئے بڑبڑائے تھے۔ ان کی آنکھوں میں کوئی کیفیت نہیں تھی مگر دل بے حد ڈرا ہوا بے چین تھا۔

☆ ☆ ☆

اس کے ساتھ سوتیلوں جیسا سلوک ہوتا تھا مگر بہتر تھا کہ اس کے چند حقوق پورے ہو رہے تھے۔ کچھ ضرورتیں پوری ہو جاتی تھیں۔ اچھے نمبر نہ لانے پر بھی اسے اچھے اسکول میں ہی رکھا گیا۔ اسے کھانا پینا مل رہا تھا۔ پہننا اوڑھنا۔ بس جو نہ تھا وہ احساس نہ تھا محبت اور شفقت کا۔ وہ کسی کی گود میں سر رکھ کر لیٹ نہیں سکتا تھا۔ وہ کسی سے اپنی سوچیں نہیں شیئر کر سکتا تھا۔ وہ جب راتوں کو چیختا تھا تو کوئی اسے چپ کرانے کے لیے نہیں آتا تھا۔ وہ روتا تو کوئی اس کے آنسو نہیں صاف کرتا تھا۔ آہستہ آہستہ اس نے رونا بند کر دیا اور سارا سمندر اس کے اندر جمع ہوتا گیا آنسوؤں کا۔

اسے یاد تھا ایک بار اس نے بھی زیشان کی دیکھا دیکھی کہا تھا کہ میں بھی ڈاکٹر بنوں گا۔ اصل میں اس کے پاس زندگی کا کوئی واضح مقصد نہیں تھا۔ اس کی ماں نہیں تھی جو رات کو سلاتے وقت اسے خواب دکھاتی بڑا آدمی یا ڈاکٹر انجینئر بننے کا اس نے بھی سوچ لیا۔ کئی دنوں تک سوچتا رہا پھر جب میٹرک کلیئر کرلیا تو اس کے باپ نے پوچھا اور اس نے کہا ڈاکٹر بنوں گا۔

پہلی بار اس کی سوتیلی ماں نے رد عمل کیا تھا۔ وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

"احمد! اس کا اتنا دماغ ہے کہ ڈاکٹر بن سکے۔ نمبر دیکھے ہیں آپ نے۔ پرسینٹ ایج دیکھی ہے۔ اس کے لیے بہت دماغ اور بہت پیسہ چاہیے بچے۔ آپ کے ابا کے پاس اتنا پیسہ نہیں ہے۔ زیشان ڈاکٹر بنے گا۔ آپ انجینئرنگ پڑھ لو۔ اس کا بھی تو بہت اسکوپ ہے۔ اب اگر ڈاکٹر نہ بن سکے تو سارا پیسہ پانی میں گیا۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔ تم بی ای کرلو یا آئی ٹی پڑھ لو۔ کوئی مناسب ملازمت مل جائے گی۔ ویسے بھی یہ فلیٹ تو میں نے تمہارے نام کر دیا ہے۔" اس کے باپ کا رویہ ٹھنڈا تھا۔

"احمد! آپ نے کب ایسا کیا۔ مجھے بتائے بغیر۔" وہ اچانک بپھری تھی۔

"زیشان اور ٹینا کے نام وہ دونوں پلاٹ ہیں اور رقم بھی تو رکھی ہوئی ہے۔ سونا بھی تم نے جمع کیا ہے۔ یہ بھی میرا بیٹا ہے اس کے لیے بھی مجھے کرنا ہے کچھ نہ کچھ۔"

"اتنا کچھ تو ہو رہا ہے اس کے لیے۔ کسی چیز کی کمی ہے اسے۔ پوچھ لیں سب کچھ تو میں دیتی ہوں اسے۔ میں نے سمجھا آپ نے یہ فلیٹ میرے نام کیا ہوگا۔ میرا سب کچھ بھی تو آپ کے بچوں کا ہے۔"

"دیکھو تو یہ سب کچھ تو تم لوگوں کا ہے۔ اب ایک فلیٹ ہی کیا ہے اس کے نام۔ شرعی حق ہے اس کا۔ پھر میرے اور بچے ذہین ہیں وہ اپنی محنت سے کچھ نہ کچھ حاصل کرلیں گے۔ یہ اگر اچھا نہ پڑھ سکا اور اسے اچھی ملازمت نہ مل سکی تو کم از کم اس کے پاس ٹھکانہ تو اپنا ہونا چاہیے۔"

پہلی بار اس نے باپ کے چہرے پر اپنے لیے فکر مندی دیکھی تھی۔ پہلی بار اسے لگا وہ اسی کا باپ ہے۔ وہ جیسا بھی ہے اسے پیار نہیں کرتا مگر سوچتا ضرور ہے اس کے لیے۔ پہلی بار وہ خوش اور مطمئن تھا۔

اس نے اپنے باپ سے کچھ نہ کہا۔ وہ بڑھ کر ان سے لپٹ جانا چاہتا تھا مگر وہ یہ نہ کرسکا۔ البتہ اس کا دل کچھ صاف ضرور ہو گیا تھا باپ کی طرف سے۔ اس نے سوچا آہستہ آہستہ وہ باپ سے قریب ہو جائے گا۔ وہ بااوجہ ڈرائنگ روم میں جا کر بیٹھتا تھا تاکہ کسی بہانے وہ اس سے بات کریں۔ مگر ان کے دوسرے بچے کہاں یہ موقع دیتے تھے۔ وہ انہیں گھیر لیتے تھے۔ وہ چپ چاپ اٹھ آتا اپنے کمرے میں۔ غیر محسوس انداز میں ایک کونے میں پڑا رہتا۔

مگر اسے چھوٹی سی تسلی تھی ضرور کہ اس کا کوئی تو ہے جو اس کے لیے اچھا سوچتا ہے۔ اس خوشی اور سکون میں وہ انہیں خوش کرنے کے لیے پڑھتا رہا مگر یہاں اسے ذہن میں رکھنے میں پرابلم ہوتی تھی۔ وہ پڑھتے پڑھتے کہیں کھو جاتا تھا۔ وہ ٹھیک طرح سے کام نہیں کرپاتا تھا۔ مگر اب اس کی کارکردگی کچھ کچھ بہتر ہو رہی تھی۔ وہ یونیورسٹی میں آگیا تھا۔

پھر اس کیفیت کو اس حادثے نے اور بڑھا دیا۔ اس کے سر سے نام نہاد باپ کا سایہ بھی چھن گیا۔ اس کا باپ حادثاتی موت کی نذر ہو گیا اور وہ بھرے سے بھرے جہاں میں اکیلا، بالکل اکیلا رہ گیا۔ اس کے بہن بھائیوں کے ساتھ ان کی ماں تھی۔ اس کی سوتیلی ماں کے پاس ان کے بچے تھے۔ مگر ایک وہ تھا جس کے پاس نہ اپنے سگے بہن بھائی تھے نہ ماں تھی اور نہ اب باپ تھا۔

☆ ☆ ☆

"کیا بات ہے۔ فہد کے فون آرہے ہیں تم اس سے بات کیوں نہیں کر رہیں؟" وہ کمپیوٹر پر بے دلی سے کوئی ویڈیو دیکھ رہی تھی جب وہ اندر آئی تھیں۔

"دل نہیں چاہ رہا۔"

"ثانیہ..... کیا مسئلہ ہے کوئی لڑائی ہوئی ہے اس کے ساتھ کیا؟"

"امی! کوئی مسئلہ نہیں ہے۔" اس نے بیزاری سے کہا۔

"ثانیہ! سیدھی طرح بتاؤ۔ ادھر منگنی ہوئی ہے ادھر مسائل شروع۔"

"امی! وہ ملنے کے لیے ضد کرتا ہے اور میں نہیں مل سکتی۔"

"اس دن تو گئے تھے تم لوگ ڈرائیو پر۔"

"ابو کو اچھا نہیں لگتا میرا اس سے ملنا۔"

"کیوں اچھا نہیں لگتا۔ وہ منگیتر ہے تمہارا۔ کل کو شادی ہوگی۔"

"وہ ہماری اس شادی سے خوش نہیں ہیں۔"

"نہیں چھوڑو۔ تم تو خوش ہو نا بس کافی ہے۔"

"امی! ابو کو مجھ پر بھروسا نہیں ہے۔ وہ مجھے اتنا امیچور اور لاپروا کیوں سمجھتے ہیں۔ کیوں وہ میرے بارے میں اتنے تنگ نظر ہو جاتے ہیں کبھی کبھار۔"

"ان کا کوئی قصور نہیں بیٹا! وہ جس کلاس سے اٹھ کر آیا ہے وہاں یہی سب ہوتا ہے۔ شادی کے شروع شروع میں اس کا میرے ساتھ بھی یہی رویہ تھا۔ بڑی مشکل سے اس کا دماغ درست کیا۔ اب تمہیں کیوں پریشان کرتا ہے۔ میں بات کروں گی اس سے۔"

"نہیں امی پلیز! وہ مجھ سے ناراض ہو جائیں گے۔"

"تمہیں یہ فکر نہیں ہونی چاہیے، نہیں ناراض ہوگا۔"

"امی! وہ میرے باپ ہیں۔ مجھے پروا ہے۔ میں نے منگنی کرتے ہوئے بھی دس بار ان سے پوچھا۔ ان کو منایا، مگر وہ کب اچھا سوچیں گے۔ ان کے اندر جیسے کوئی ڈر سا بیٹھا ہوا ہے۔ وہ بچپن سے ایسا کرتے ہیں۔ یہاں نہیں جانا۔ یہ نہیں کرنا۔ اس سے بات نہیں

کرنی۔ لڑکوں سے دوستی نہیں کرنی وغیرہ۔"
"وہ بوڑھا ہو گیا ہے' پر سدھرا نہیں۔ خوف کا اثر ہے۔"
"آپ پلیز انہیں کچھ نہ کہیے گا۔ وہ اپ سیٹ ہو جاتے ہیں۔"
"تم رہنے دو۔ بات کرو فہد کے ساتھ۔ کل تو جا رہا ہے وہ۔ مل لو شام کے وقت یا پھر سی آف کرنے چلی جانا۔"
"ہم سب مل کر جائیں گے۔ ابو کو بھی لے جائیں گے۔ میں چاہتی ہوں وہ یہ نہ سوچیں کہ میں ان کی کوئی بات نہیں مانتی۔"
"اوکے....." وہ لمبی سانس لے کر کمرے سے باہر چلی گئیں۔

✡ ✡ ✡

"احسان! تم نے ثانیہ سے کیا کہا ہے؟" وہ بڑے غصے میں کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔
"اس نے کوئی شکایت لگائی تم سے...." وہ کتابوں کے ریک میں اپنا چشمہ ڈھونڈ رہے تھے۔
"احسان! میں سمجھتی تھی کہ وقت کے ساتھ ساتھ تم بدل جاؤ گے' پر ایسا نہیں ہوا۔ تم ہمیشہ وہی رہو گے کنویں کے مینڈک۔"
"میں بھی تمہارے بارے میں یہی سوچتا تھا کہ وقت کے ساتھ ساتھ تم میں بردباری' سنجیدگی اور فہم آجائے گا مگر شاید ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ غلط توقعات رکھتے آئے ہیں ابھی تک۔"
"مجھے ان بے کار کی باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں ہے ...جو پوچھا ہے اس کا جواب دو۔"
"اسی کا تو جواب دے رہا ہوں۔" انہیں ایک کتاب کے نزدیک اپنا چشمہ مل گیا تھا' وہ کتاب ریک سے نکال کر چشمہ پہن کر کرسی پر آبیٹھے۔
"کیوں اپنی اولاد پر بے جا پابندیاں لگا رہے ہو اور ان کی زندگی خراب کر رہے ہو تم۔"
"رخسانہ! زندگی بنا رہا ہوں اپنی بچی کی.... خراب نہیں کر رہا.... دیکھو وہ بچی ہے۔ بیس بائیس سال کچھ بڑی عمر نہیں ہوتی ہے۔ میں اس ایج میں بچے بہت خواب دیکھتے ہیں۔ سب کچھ حسین اور آسان لگتا ہے۔ یقین کرو میں اس کی یہ حسین دنیا فہم و فکر اور پریشانی کی نذر نہیں کرنا چاہتا۔ جب ہی جہاں اس نے کہا میں نے منگنی کروا دی۔ اب تک سب کچھ اس کی مرضی سے ہوا ہے اور ہو گا۔ مگر کچھ دائرے' کچھ لمٹس مقرر ہوتے ہیں زندگی کے اور رشتوں کے۔"
"احسان! یہ ہمارا دور نہیں ہے۔ اکیسویں صدی ہے۔ چیزیں بدل گئی ہیں۔ ہمارے بچے ایسا نہیں سوچتے۔ ان پر بے جا پابندیاں مت لگایا کرو۔ کب سمجھو گے تم۔ اب یہ مت کہنا کہ ہم ہمیشہ ایک دوسرے کو سمجھاتے رہیں گے۔"
وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔
"کچھ نہیں کہتا.... دیکھو میں نے جو کہا اسے ٹھیک کہا' مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں کوئی اس پر پابندیاں لگا رہا ہوں یا پھر میں اس پر بھروسا نہیں کرتا۔ ایسا کچھ نہیں ہے رخسانہ بیگم! اگر پھر بھی اسے شکایت ہے تو میں بات کرلوں گا۔"
"کیا بات کرو گے تم اس سے' وہ تو اس فکر میں ہلکی ہو رہی ہے کہ میرا باپ مجھ سے خفا ہے۔ اسے یہ رشتہ پسند نہیں۔ اسے میرے ملنے پر اعتراض ہے۔ میں فہد کو سی آف کرنے نہیں جاؤں گی وغیرہ۔ تم نے اتنا کنفیوزڈ اور پریشان کر دیا ہے بچی کو۔"
"وہ یہ کہہ رہی ہے؟" چشمے کے پار ان کی آنکھیں بھی مسکرائی تھیں۔
"ہاں اور اب تم اس خوشی میں رہو کہ تم کامیاب ہو گئے اسے ہراساں کرنے میں۔"
"میں مطمئن ہوں کہ اسے پروا ہے۔ وہ لاپروا نہیں ہے بس تھوڑی سی کم عقل ہے۔ مگر ٹھیک ہو جائے گا سب کچھ... میں مل لیتا ہوں اسے۔ کہاں ہے کمرے میں؟" وہ کتاب بند کر کے اٹھے۔
"کوئی ضرورت نہیں ابھی جائے گی۔ فہد سے بات کر رہی ہو گی کل سے فون نہیں اٹھا رہی تھی اس کا

میں کہہ کر آئی ہوں۔"
"تم جو ہو نا رخسانہ بیگم! تم میری ساری محنت اور تربیت پر پانی پھیر دینا اچھا۔" وہ نہ چاہتے ہوئے پھر بیٹھ گئے۔
وہ اٹھ کر باہر چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد وہ اٹھے کتاب رکھی۔ دروازے کے پار جھانکا۔ وہ کہیں نظر نہ آئیں تو چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے اس کے کمرے تک چلے آئے جہاں وہ سیل فون ہاتھ میں لیے افسردہ سے انداز میں بیٹھی تھی۔
"کیا میں نے اپنے بچے کو ڈسٹرب کیا۔" وہ دروازے کے پاس ہی کھڑے تھے۔
"بالکل نہیں' آپ آجائیں اندر۔"
"فہد کیسا ہے۔ کیا بات ہوئی۔ اس نے سی آف کرنے کے لیے کہا ہو گا۔"
"جی مگر کہا سب آجائیں۔"
"یہ تم نے کہا ہو گا۔ میں جانتا ہوں۔ بیٹا! میں سوری کروں تو کیا خیال ہے۔"
"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ آپ سوری کریں۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔"
"تم مجھے خوش کر سکتی ہو۔ اس رات تم نے غلط کہا تھا کہ میں آپ کو خوش نہیں کر سکتی۔"
"میں آپ کو خوش کر سکتی ہوں۔"
"ہاں بالکل میں کوئی دنیا کا مشکل ترین بندہ نہیں جسے خوش کرنا اتنا مشکل ہو۔ بہرحال یہ بتاؤ کل چلنا ہے اسے چھوڑنے؟"
"ہم سب جا رہے ہیں' آپ کو کوئی اعتراض؟"
"نہیں کوئی اعتراض نہیں ہے' چلیں گے۔ وہ پورے چار سال کے لیے جا رہا ہے۔ تب تک تم پڑھائی مکمل کرلو گی۔ باقی کے دو سال کیا کرو گی۔"
"کوئی جاب کرلوں گی' گھر کے کام کاج سیکھ لوں گی۔"
"اچھا خیال ہے۔ سارے کام آنے چاہئیں۔ میری بیٹی بہت سمجھ دار ہے نا۔"
وہ ہنسی تھی ان کی بات پر۔
"کل ہم فہد کے لیے تحفہ خریدیں گے۔ پھر ایئر پورٹ پر جائیں گے اس سے ملنے کے لیے۔"
"پھول آپ لے لیجیے۔ تحفہ میں دے دوں گی۔"
"میں کوئی اس عمر میں پھول دیتا اچھا لگوں گا۔" وہ شرارت سے مسکرائے۔ پھر دونوں ہنس دیے اور بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔
پھر شام میں وہ اسے بازار لے کر گئے۔ تحفہ لیا اور صبح اس کی طرف جاتے ہوئے پھول لیے۔ اسے بہت اچھی طرح سی آف کیا تھا اور شام کو گھومتے پھرتے گھر آگئے۔

✡ ✡ ✡

رات سوتے وقت اسے احساس ہوا۔ وہ فہد کو بہت مس کرے گی۔ پورے چار سال اس انتظار میں گزارنے تھے۔ حالانکہ اس روز کے بعد وہ روز اس سے بات کرتی تھی۔ آہستہ آہستہ اس کی روٹین سیٹ ہوتی گئی۔
اور پھر دو سال کچھ مشکل سے مگر گزر ہی گئے تھے وہ اب گھر کے کام سیکھ رہی تھی اور ساتھ ساتھ جاب ڈھونڈ رہی تھی۔ اسے کسی طور یہ دو سال گزارنے تھے۔ بہت مصروف رہ کر' تاکہ وہ اسے کم کم یاد آئے اور اسے دو سال گزارنے کا احساس نہ ہو۔
مگر ایسا نہیں ہوا تھا یہ دو سال پچھلے دو سال کی طرح نہیں گزرنے تھے۔
اس دن اس کی سالگرہ تھی جب فہد اسے پہلی بار وش کرنا بھول گیا۔ وہ پورا دن انتظار کرتی رہی۔ وہ اس سے بات چیت بھی کم کرنے لگا تھا۔ وہ اس کی مصروفیت جانتی تھی۔ وہ وہاں اپنے چچا کے بزنس میں حصہ لے رہا تھا۔ پڑھ رہا تھا اور بہت کچھ سیکھ رہا تھا۔ اسے اس کی مصروفیتوں کا اندازہ تھا۔ وہ اس سے بار بار شکایت کر کے پریشان کرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ بہت میچور اور کم گو ہوتی جا رہی تھی۔ اس میں تھوڑا بہت صبر آگیا تھا۔
مگر اتنا نہیں کہ وہ اتنی بڑی بات سہ جاتی۔ اتنی

آسانی سے وہ بھی۔ اس نے فون کیا تھا اور اتفاق سے کسی خاتون نے اٹھایا تھا جو خود کو فہد کی بیوی بتا رہی تھی۔ اس کے کتنی دیر تک وہ کچھ بھی کہنے سننے کے قابل نہ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

باپ کے جانے کے بعد اس کی زندگی اور بھی مشکل ہوگئی تھی۔ جیسے تیسے پڑھائی مکمل کی اور جاب کی تلاش میں لگ گیا۔ ذیشان مزید پڑھنے کے لیے باہر چلا گیا تھا۔ ثنا کی شادی ہوگئی تھی اور اس کی سوتیلی ماں بھی اپنی بہن کے پاس باہر چلی گئی۔ اب اکیلا رہ گیا وہ جو پہلے سے ہی اکیلا تھا۔ مگر آج سے پہلے روزگار اور کھانے پینے کی اتنی ٹینشن نہ ہوئی تھی جتنی اب ہو رہی تھی۔ اس کا بیلنس زیرو تک پہنچ گیا تھا۔ جو پیسہ باپ نے اس کے لیے جمع کیا تھا وہ سارا اس کی پڑھائی' کھانے پینے کے اخراجات کی نذر ہوگیا تھا۔ اب مزدوری بھی مل جاتی تو اسے کرنا تھی۔

اس نے گھر کی اور اپنی چھوٹی چھوٹی چیزیں بیچنا شروع کردیں۔ خوراک کی مقدار گھٹادی تھی۔ کبھی کھاتا' تو کبھی بغیر کھائے سو جاتا' ماہانہ بل کی الگ ٹینشن تھی۔ اس نے اس دوران ایک بار بھی اے سی نہیں چلایا۔ نہ گیس زیادہ استعمال کی۔ اچھے درجے سے وہ زندگی کے نچلے درجے تک پہنچ گیا تھا۔ بس ایک آسرا تھا کہ گھر اپنا تھا' جہاں سے کوئی اسے نکال نہیں سکتا تھا۔ ڈگری لے کر دفتروں کے دھکے کھانا معمول سا بن گیا تھا۔ مگر کہتے ہیں خدا کبھی کسی کو اس کی برداشت سے زیادہ نہیں آزماتا۔ اس کا نروس بریک ڈاؤن ہوجاتا اس دن اگر احسان صاحب اسے اس دفتر میں انٹرویو کے دوران نہ ملتے۔

وہ احمد کے یونیورسٹی فیلو رہ چکے تھے اور اچھے دوست بھی۔ اس کے پورے تعارف کے بعد وہ بہت دیر تک اسے ساتھ لگائے باتیں کرتے رہے' پھر اس کے ساتھ اس کے فلیٹ پر بھی آئے۔ آخری مرتبہ وہ احمد کی وفات پر آئے تھے احمد کے آبائی گھر۔ تب ہی وہ بھی آج احسان صاحب کو پہچان گیا۔ انہیں اس کی یہ حالت دیکھ کر بہت دکھ ہوا تھا اور ٹھیک دو دن کے بعد وہ اس کے لیے نوکری کا بندوبست کرچکے تھے اپنے دفتر میں۔

پھر جاب کے دوران اس کی محنت اور ایمان داری سے وہ بہت متاثر ہوگئے تھے۔ البتہ اس کا کام کرتے ہوئے گم ہوجانا ذہنی پریشانی اور اضطراب کو وہ محسوس کرگئے تھے۔ انہیں اندازہ تھا کہ اس ساری کیفیت کا سبب اس کی تنہائی ہی ہے۔ وہ کئی بار اسے شادی کا مشورہ دے چکے تھے اور وہ ہر بار آسانی سے ٹال دیتا۔ اس حوالے سے نہ کبھی اس نے سوچا تھا' نہ سوچنا چاہا' نہ اسے کوئی لڑکی پسند تھی' نہ ہی کسی لڑکی نے اسے پسند کیا تھا۔ البتہ انہوں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کے لیے کوئی لڑکی ضرور ڈھونڈیں گے اور ایک دن تو انہوں نے اسے یہ کہہ کر حیران ہی کردیا کہ۔۔۔۔

"مدثر احمد۔۔۔ میری بیٹی ثانیہ سے شادی کروگے؟"

اور وہ حیرانی سے انہیں دیکھتا رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

فہد نے کئی بار کال کی' شاید اپنی صفائی دینے کے لیے یا پھر مجبوریاں بتانے کے لیے۔۔۔ مگر اس نے ایک کال بھی ریسیو نہیں کی تھی۔ اس کے پاس کہنے سننے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ پورے چار ماہ اس نے جیسے سکتے کی حالت میں گزارے' اسے اس دھوکے کو یقین کرنے میں بہت وقت چاہیے تھا۔ آہستہ آہستہ وہ نارمل ہوگئی۔ مگر دل جیسے بجھ گیا۔ ہر طرف سے اعتبار اٹھ گیا۔ ایسے میں اس کے باپ نے ایک بار اسے پاس بٹھا کر ایک عجیب فرمائش کردی۔ شادی کرنے کی۔ وہ بھی ان کی چوائس پر۔ اس نے انکار کردیا' مگر ان کا اترا ہوا چہرہ اور فکرمندی' محبت دیکھ کر اسے سوچنا پڑا۔ پہلے اس کے باپ نے اس کی مانی تھی۔ اب باری اس کی تھی' حالانکہ اس کا ارادہ اب شادی کرنے کا نہیں تھا۔ مگر باپ کی خواہش پر تیار ہوگئی۔

وہ جو کوئی بھی تھا' جیسا بھی تھا' اسے اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ وہ بس اپنے باپ کی خواہش پر مان گئی۔ حالانکہ انہوں نے اس پر دباؤ نہیں ڈالا تھا۔ صرف درخواست کی تھی۔ خواہش کا اظہار کیا تھا اور بس۔ وہ چاہتی تو سہولت سے منع کردیتی۔ اس کی ماں اس کے ساتھ تھی۔ جو اس رشتے کے سخت خلاف تھی اور اس کے پاس انکار کے مناسب دلائل بھی تھے۔ نہ لڑکے کی جاب اتنی اچھی تھی' نہ کوئی کاروبار تھا۔ وہ ایک درمیانے درجے کا درمیانی کمائی والا عام سی شکل صورت کا لڑکا تھا۔ اس کی ماں نے بہت شور مچایا۔ اسے سمجھایا کہ وہ خوش نہیں رہ پائے گی وہاں دو کمروں کے ایک معمولی سے فلیٹ میں ایک معمولی آدمی کے ساتھ جس کی آمدنی بھی معمولی ہے۔ مگر اس کا باپ کہتا تھا خوشی کا تعلق پیسوں سے نہیں انسان کے ساتھ ہوتا ہے۔ سکون شرافت میں ہے' خودداری میں ہے۔

اور وہ ابھی تک صرف یہ جان پائی تھی کہ خوشی کا تعلق صرف اور صرف دل کے ساتھ ہوتا ہے' جو ابھی خاموش تھا۔

اور پھر ثانیہ احسان اور مدثر احمد ایک دوسرے کی زندگی میں آگئے۔

ثانیہ سے زیادہ تو وہ شرما رہا تھا۔ ثانیہ کے دل کی عجیب حالت ہو رہی تھی۔ وہ بہت ڈری ہوئی تھی' مگر اس کا گھبرایا ہوا انداز دیکھ کر وہ خود حیران رہ گئی تھی۔

"یہ۔۔۔ وہ۔۔۔ میری امی کی تھی۔ ان کی کچھ چیزیں مجھے دادی نے دی تھیں' ان میں سے یہ انگوٹھی خالص گولڈ کی ہے۔" وہ انگوٹھی ہاتھ میں لیے بجائے اس کی تعریف کرنے کے انگوٹھی کی خصوصیات بتا رہا تھا۔

"میں آپ کو پہنا دوں؟" پتا نہیں کیسے جھجک کر اس نے کہہ ہی دیا۔

"میں خود پہن لوں گی۔" اس نے رکھائی سے کہا۔

"بہت اچھا۔" اس نے خوشی خوشی انگوٹھی کی ڈبیا اس کے حوالے کردی' جو اس نے لے کر سائیڈ ٹیبل کی دراز میں رکھ دی۔

"یہاں سے گم تو نہیں ہوگی؟" وہ اچانک بولا۔

"یہاں اور کون کون رہتا ہے؟"

"کوئی نہیں' صرف میں اکیلا۔"

"آپ اسے گم کریں گے؟"

"نہیں تو۔"

"پھر کیسے گم ہوگی؟" اس پر بےزاری سوار تھی۔

"پھر واقعی نہیں ہوگی۔" وہ اس کے اکھڑے اکھڑے رویہ کی وجہ سے سہم سا گیا تھا۔

"میں چینج کرلوں۔" وہ پوچھ نہیں رہی تھی' بتا رہی تھی۔

"ٹھیک ہے۔" وہ بلاوجہ مسکرایا۔ سمجھ نہیں آرہا تھا کیا کہے۔ وہ بھاری شرارہ سنبھالتے ہوئے اٹھی اور کپڑے نکال کر واش روم میں گھس گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آئی تو وہ جوں کا توں بیٹھا ہوا تھا۔ اسی پوزیشن میں۔

اس نے چہرہ صاف کیا۔ کریم لگائی بال باندھے' شرارہ ہینگ کرکے رکھا۔ وہ بغیر کوئی حرکت کیے وہیں بیٹھا یہ سارا تماشا دیکھتا رہا۔

اسے عجیب الجھن ہونے لگی۔ "کیسا آدمی ہے" وہ بڑبڑائی اور اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

"چینج نہیں کرنا کیا؟" شادی کی پہلی رات وہ ایسے پُراعتماد تھی جیسے عموماً" آدمی ہوتے ہیں۔

"کرنے ہیں۔" وہ جیسے خواب سے جاگا تھا۔

"تو پھر جایئے۔"

"کہاں؟"

"کپڑے لے کر واش روم میں۔۔۔"

"وہ ہاں۔۔۔" وہ کتنی دیر تک واش بیسن کے سامنے کھڑا اپنی شکل دیکھتے ہوئے عجیب غریب سوچوں میں گم رہا۔

وہ کتنی دیر تک بیٹھی رہی' پھر خیال آیا کہ اس نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ اس نے اٹھ کر کمرے میں ادھر ادھر دیکھا' پھر باہر نکل آئی' کچن میں رکھے فریج سے دودھ کا ڈبا نکالا۔۔۔ دودھ گرم کیا اور بریڈ لیے وہ کمرے میں چلی آئی۔ پورا گھنٹہ ہونے کو آیا تھا اور وہ بندہ ابھی تک واش روم میں تھا۔ اسے کچھ فکر سی ہونے لگی۔ وہ کھانے سے پہلے اٹھی' دروازہ ہلکا سا بجایا۔

"جی..." دوچار مرتبہ کھٹکھٹانے پر اندر سے ہلکی سی آواز آئی۔

"سب خیریت ہے؟" اس نے مسکراہٹ دباتے ہوئے پوچھا۔

"جی... جی..." وہی سہما ہوا لہجہ۔

"ٹھیک ہے۔" وہ مطمئن ہو کر صوفے پر آ بیٹھی اور دودھ کے ساتھ بریڈ لینے لگی۔ وہ دوچار منٹ بعد باہر آگیا۔ چہرہ تھپتھپا کر ہلکی کنگھی کی اور اس کی طرف دیکھا۔

"کیا کھا رہی ہیں۔" اسے کچھ اور تو نہیں سوجھا' یہ پوچھ لیا۔

"پی رہی ہوں۔ وہ بھی نظر آرہا ہوگا گلاس سے۔"

"جی... بھوک لگی ہے؟"

"ظاہر ہے۔" وہ لاپروائی سے پورا گلاس خالی کر کے اٹھی۔

"اور لادوں؟" عجیب معصومیت تھی۔

"نہیں بس ٹھیک ہے' میں رات کو اتنا نہیں کھاتی۔"

"اچھی بات ہے۔" وہ مسکرایا۔ بلکہ مسکرانے کی کوشش کی۔

"نیند آرہی ہے۔ بتی بند ہو سکتی ہے؟"

"جی بالکل۔" وہ اٹھا اور لائٹ بجھادی۔

اس نے لیٹ کر چادر تان لی اور وہ بیٹھا رہا۔

"مسٹر مدثر!" اسے عجیب غصہ آرہا تھا اس آدمی پر۔ بات نہ کرتا' مگر ایسے غائب الدماغی سے کیوں بیٹھا تھا۔

"جی ثانیہ جی۔" وہی لہجہ۔

"آپ کو سونا ہے یا ساری رات بیٹھے رہیں گے۔"

"میں سوجاؤں یہیں۔" عجیب الجھن۔

"مرضی ہے آپ کی' مگر بہرحال سوجایئے۔" وہ ہنس پڑی تھی بے ساختہ۔

"کیا ہوا۔" وہ اور پریشان ہوگیا اس کے ہنسنے پر۔

"کچھ نہیں۔ روز آپ اسی طرح سوتے ہیں' کسی کے کہنے پر۔"

"نہیں تو' خود بخود سوجاتا ہوں۔"

"تو آج بھی خود بخود ہی سوجائیں۔" وہ بے وجہ ہنس دی۔

"جی... میں آپ سے ڈر رہا تھا۔"

"کیوں... میں چڑیل لگ رہی ہوں کیا۔"

"نہیں تو آپ چڑیل نہیں لگ رہی ہیں۔"

"پھر اچھی لگ رہی ہوں کیا۔" اسے خوامخواہ میں مذاق سوجھا۔

"جی یہ تو ہے... آپ اچھی لگ رہی ہیں۔"

"تعریف کا شکریہ۔" وہ کچھ فاصلے پر لیٹی ہوئی تھی۔ وہ جھجکتے ہوئے بیڈ کے کنارے پر لیٹ گیا۔

شادی اتنی بھی بھیانک نہیں' جتنا لوگ کہتے ہیں۔ کچھ مرد تو بالکل بے چارے ہوتے ہیں۔ ویسے اچھا ہی ہے وہ کروٹ بدلے لیٹے لیٹے سوچ رہی تھی۔

اور وہ تو عجیب سوچوں میں غرق تھا' جب اس نے تھوڑی دیر بعد ثانیہ کو بے خبر سوتے دیکھا۔

یہ تھی مدثر احمد کی شادی کی پہلی رات۔

پہلی عجیب رات۔

☼ ☼ ☼

وہ ولیمہ کا دن تھا' جب وہ تیار ہو کر بیٹھی تھی امی کے انتظار میں۔ وہ آئیں تو اکٹھے جاتے ہال میں۔ وہ چینج کر کے کرسی پر آ بیٹھا تھا۔ اسی طرح چپ چپ سا' کتنی دیر تک اس کی طرف دیکھتا رہا۔

"کیا ہوا؟" وہ سیل فون پر نمبر پچ کرتے ہوئے رک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"کچھ نہیں۔" وہ بلاوجہ ہی گھبرا گیا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"اچھی لگ رہی ہوں کیا؟" وہ کل سے اس کا امتحان لے رہی تھی۔

"ہم..." وہ ہونٹ چباتے ہوئے اسی انداز میں بیٹھا رہا۔

"شکریہ۔" وہ ہنستے ہوئے نمبر ملانے لگی۔

"جی امی... آجائیں میں تیار ہوں۔ اچھا پہنچنے والے ہیں' ٹھیک ہے۔"

"وہ لوگ پانچ منٹ میں پہنچنے والے ہیں' گیٹ کھول دیجئے جاکر۔"

"اچھا..." وہ روبوٹ کی طرح اشارے پر اٹھ کر باہر چلا گیا اور وہ حیرت سے اسے جاتے دیکھ کر سوچتی رہی کہ یہ ہمیشہ سے ایسا ہے یا اس کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے۔ شاید یہ بھی میری طرح شادی سے خوش نہیں ہوگا' کسی اور کو پسند کرتا ہوگا۔ اس کے ساتھ زبردستی ہوئی ہے۔ مگر کس نے کی یہ زبردستی' اس کے والدین تو نہیں ہیں۔ شاید لڑکی نے ہی انکار کردیا ہو۔ ذہنی صدمہ لگتا ہے۔ وہ مزید کچھ سوچتی اس سے پہلے وہ لوگ آگئے تھے۔

"کیا حال ہیں بچے؟" سب سے پہلے ابو کمرے میں آئے تھے۔

"ابو جی..." وہ اٹھ کر ان سے لپٹ گئی۔ "بہت برے ہیں آپ بیٹی کو رخصت کر کے بھول گئے' فون بھی نہ کیا مجھے۔"

"ارے بھئی یاد ہی نہیں رہا۔"

"کیسے یاد نہیں رہا' پوری رات جاگتے رہے ہیں تمہیں یاد کر کر کے۔ بچوں کی طرح روئے تھے رخصتی کے بعد۔" امی مدثر کے ساتھ اندر آئی تھیں۔

"رخسانہ بیگم۔" وہ انہیں ٹوکنے لگے۔ "اچھا چھوڑو چلو اب دیر ہو رہی ہے۔ ہال میں مہمان تو پہنچ گئے۔ میزبان مہمانوں کی طرح لیٹ ہیں۔"

"تم پارلر نہیں گئیں ثانی۔" امی اس کی تیاری کا جائزہ لیتے ہوئے بولیں۔

"نہیں تو... کیوں ٹھیک سے تیار نہیں ہوئی؟"

"کتنا ہلکا میک اپ کیا ہے' مجھے بتا دیتیں میں صبح آکر لے جاتی۔"

"اف امی... اتنے بھاری زیور اور کپڑوں کے ساتھ ٹھیک ہے میک اپ کیوں ابو صحیح ہے نا۔"

"ہاں بھئی بالکل ٹھیک ہے ہماری گڑیا تو بہت پیاری لگ رہی ہے۔"

"تم آج بھی لاپروائی کر گئیں۔"

"امی! اب ٹینشن نہ دیں پلیز۔ ورنہ مجھے فکر ہونے لگے گی۔"

"کیوں بچی کو پریشان کر رہی ہو۔ پیاری تو لگ رہی ہے۔ چلو بیٹا کچھ نہیں' کوئی کمی بیشی نہیں ہے۔ شاباش جلدی چلو' دیر ہوگئی ہے۔"

"ہاں اب کیا ہو سکتا ہے چلو... مگر... روم کچھ چھوٹا نہیں... فرنیچر ڈلوانے کے بعد جیسے سکڑ گیا ہو۔"

وہ اب اس سے ہٹ کر کمرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔

"فلیٹ کے روم اور کتنے بڑے ہوتے ہیں امی..." وہ بے زاری سے اٹھی' پتا تھا اب وہ ہر ایک چیز پر نظر ڈال کر تنقید کرنے لگیں گی۔

"گھٹن نہیں ہوتی تمہیں۔ ویسے تو بڑا واویلا مچاتی تھیں۔ تنگ کمرا نہیں چاہیے۔ کھڑکی بڑی ہو' زیادہ سامان نہیں ڈلوائیں میرے روم میں' کھلا کھلا پسند ہے۔ گھٹن ہوتی ہے۔" وہ سوچ کر پریشان ہو رہی تھیں۔

"امی! ہمیں دیر ہو رہی ہے۔" وہ دیکھ رہی تھی ان کے ایسا کہنے سے مدثر بری طرح شرمندہ ہو رہا ہے۔

"چلو بھئی ان باتوں کے لیے زندگی پڑی ہے۔ چلو بیٹا ہم تو چلیں۔" وہ مدثر کی طرف آئے۔ اس کی گھبراہٹ انہوں نے بھی محسوس کی تھی۔

"بھئی تمہاری ساس بہت مشکل خاتون ہیں۔ ان سے کوئی اچھی امید مت رکھنا۔ البتہ جو کہتی رہیں چپ چاپ سنتے رہنا۔ ہم سے پوچھو کتنا مشکل وقت گزارا ہے۔" وہ آہستگی سے اس کے ساتھ باہر آتے ہوئے بولے تو وہ مسکرادیا۔

"کوئی پرابلم ہو کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھ سے کہہ دینا۔ باپ کی طرح ہوں' بلکہ باپ ہی ہوں اب تو... کیوں؟"

"جی بہتر۔"

"مدثر... خوش ہو نا تم بیٹا؟" وہ اسے جانچتے ہوئے پوچھنے لگے۔

"جی... بہت..." اس کی مسکراہٹ مصنوعی تھی۔

"ثانیہ اچھی ہے۔ بس کبھی کبھار ضدی ہوجاتی ہے۔ مگر کیئرنگ بہت ہے۔ دیکھو وہ بڑے گھر سے آئی

ہے۔ اسے یہاں کوئی مسئلہ ہو تو آرام سے سمجھا دینا۔ برا مت ماننا اس کی کسی بات کا۔"

"جی۔۔۔"

"مدثر بیٹا! ایک بات یاد رکھو۔ سچائی اور محبت سے زیادہ اس دنیا میں کوئی چیز اتنی طاقت نہیں رکھتی پیسہ بھی آنی جانی چیز ہے۔ کل کو تم محنت کرو گے تو پیسہ بھی آجائے گا۔ تمہارا باپ بہت محنتی اور ذہین آدمی تھا۔ اس نے تین' تین گھر چلائے ایک وقت میں۔ ماں' باپ کے گھر خرچا بھیجتا تھا۔ وہ گھر اپنے مین مین رکھتا تھا۔ بہت ڈسپلن تھا اس میں۔" وہ بڑی خاموشی سے باپ کی تعریفیں سنتا رہا۔

کیا کہتا کہ ڈسپلن کے چکر میں وہ پیسہ تو دیتا رہا سب کو' مگر اپنا آپ نہ دے سکا۔ اس کے ماں' باپ اس کی شکل دیکھنے کے لیے ترستے تھے۔ اس کا سگا بیٹا ایک گھر میں رہتے ہوئے باپ کی محبت سے محروم رہا۔ اگر یہ خلا پر ہو تا رہتا تو آج مدثر احمد کی شخصیت میں اتنا بڑا خلا نہ پیدا ہوتا۔

☼ ☼ ☼

"ثانی! میں تمہاری اس شادی سے بہت ناخوش ہوں۔" وہ واپسی پر گھر لے آئے تھے اسے۔ مدثر نیچے احسان صاحب کے ساتھ تھا اور وہ امی کے کمرے میں آکر لیٹ گئی۔

"میں نے بھی یہ شادی خوش رہنے کے لیے نہیں کی ہے۔"

"تم کیسے رہو گی اس فلیٹ میں۔ مجھے تو سوچ سوچ کر گھٹن ہو رہی ہے۔"

"امی پلیز! اب آپ مجھے مزید ڈسٹرب نہ کریں ایسی باتیں کر کے۔"

"تمہارے باپ نے بہت جلد بازی سے کام لیا ہے۔ وہ تو موقع کی تلاش میں تھا۔ میں تو چاہ رہی تھی ایک دفعہ پھر فہد سے بات کرلی جائے۔"

"کیا بات کرلی جائے۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی' تعجب سے انہیں دیکھتے ہوئے۔

"دیکھو اس نے مجبوری میں ایسا کیا۔"

"میں کسی مجبوری کو نہیں مانتی۔" اس نے بیچ میں ہی انہیں ٹوک دیا۔

"وہ معافی مانگ رہا تھا' واپس آنے کی بات کررہا تھا۔"

"امی! وہ آپ کا بھانجا ہے' مگر میں آپ کی بیٹی ہوں۔ آپ میری حالت نہیں دیکھ رہیں' اس کی طرف داری کررہی ہیں۔ اس کی وجہ سے میں یہاں تک پہنچی ہوں۔ اسے نہیں کرنی تھی شادی۔ اگر اتنا ہی مرعوب تھا وہ اپنے چچا کی فیملی سے تو اس نے منگنی کیوں کی میرے ساتھ۔ مجبور تھا تو مجھے اتنے خواب دکھانے نہیں چاہیے تھے۔ میں اسے دھوکے کے علاوہ اور کیا کہوں گی۔"

"یہ سب ٹھیک ہے۔ مگر دیکھو اس شخص سے تو بہتر وہی تھا۔ بھلے سیکنڈ میرج کرلیتا۔ ہو سکتا ہے وہ اسے چھوڑ دیتا تمہارے لیے۔"

"معذرت کے ساتھ امی۔۔۔ اسے اگر چھوڑنا ہوتا تو شادی ہی نہ کرتا۔"

"بیٹا! وہ بہت مجبور تھا۔ اس نے یہ سب اپنے فیوچر کو بہتر کرنے اور چچا سے باپ کا حصہ لینے کے لیے کیا ہے۔ اس کے سر پر باپ نہیں' اسے اپنے اور اپنی ماں کے لیے کچھ تو کرنا تھا۔ پھر وہ تمہارے لیے بہت پیسہ بنانا چاہ رہا تھا۔"

"مجھے پیسہ نہیں چاہیے تھا۔ اسے یہ پتا تھا۔ میں نے ابو کی خواہش پر ایک کنگلے آدمی سے شادی کرلی تو کیا اپنی پسند پر میں سمجھوتا نہ کرتی۔"

"بہر حال جو ہوا بہت غلط ہوا۔ میں تو تمہارے لیے سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی ہوں۔۔۔ ثانی۔۔۔ تم اگر وہاں سیٹ نہ ہو سکو تو گھر آجانا۔" کچھ سوچ کر انہوں نے اتنی بڑی بات کہہ دی۔

"امی۔۔۔ آپ اپنی بیٹی کے ولیمہ کے دن اس سے کہہ رہی ہیں کہ سیٹ نہ ہو تو گھر واپس آجانا؟؟" اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا تھا۔

"آپ کو تو چاہیے کہ مجھے حوصلہ دیں'

سمجھا میں۔"

"میں تم پر جبر نہیں کرنا چاہتی۔ اس سب کے لیے تمہارا باپ کافی ہے۔"

"گھر واپس آنے کا مطلب تو سمجھتی ہیں نا آپ۔" اسے بہر حال بہت برا لگا تھا۔

"مجھے صرف تمہاری خوشی عزیز ہے۔"

"بہر حال آپ کو یہ نہیں کہنا چاہیے تھا۔" وہ واقعی ڈسٹرب ہوگئی تھی۔

"اچھا چلو موڈ ٹھیک کرلو اپنا۔ باہر چلیں۔"

"نہیں امی۔۔۔ مجھے جانا ہے ابھی گھر۔"

"گھر۔۔۔ اب سے پہلے تو تمہارا یہی گھر تھا۔ کیا گھر گھر کی رٹ لگا رکھی ہے۔"

وہ نیچے اتر کر سامان پیک کرنے لگی ہے۔

"اچھا ایک بات سنو۔۔۔ فہد تم سے بات کرنا چاہتا تھا۔ وہ فکر مند ہے تمہارے لیے۔ اس سے ایک دفعہ بات کرلو بیٹا۔"

"امی! آئندہ آپ اس کا نام بھی نہیں لیں گی میرے سامنے۔ میں یہ چیپٹر بند کرچکی ہوں۔"

وہ ساری چیزیں وہیں چھوڑ کر چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

"آج وہ اس کے نزدیک بیٹھا اس سے کچھ باتیں کرنا چاہ رہا تھا۔ احسان صاحب سے بہت بات چیت کرکے اس کے اندر کچھ اعتماد سا آگیا تھا اور وہ ذہنی طور پر مطمئن بھی ہو گیا تھا۔ جب ہی صوفے پر اس سے کچھ فاصلے پر آکر بیٹھ گیا تھا۔

"ثانیہ۔۔۔" اس نے آہستگی سے اسے پکارا۔

وہ گم تھی اپنی سوچوں میں' جب اس نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا اور وہ چونک گئی۔ وہ اس کے اس طرح چونکنے پر عجیب احمق پن سے مسکرایا تھا۔

"انگوٹھی کیسی لگی۔"

"کون سی۔" وہ نا سمجھنے والے انداز میں اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ وہ خاصا فریش لگ رہا تھا۔

"جو میں نے دی تھی۔ پسند نہیں آئی کیا پہنی نہیں؟" وہ پہلی بار اعتماد سے بات کررہا تھا۔

"اچھی تھی۔۔۔ یاد نہیں رہا۔ پہن لوں گی۔" اس نے لاشعوری طور پر اپنا ہاتھ کھسکا لیا۔

"یہ انگوٹھی زیادہ اچھی ہے۔" وہ اس کے ہاتھ کی طرف اشارہ کرکے بولا جو شہادت کی انگلی میں پہنی ہوئی تھی۔

یہ فہد والی انگوٹھی تھی' اس نے سوچا اس نے اتاری کیوں نہیں۔

"آپ ہر وقت اسے دیکھتی رہتی ہیں۔"

"اچھا۔" اسے حیرت سی ہوئی' یہ تو خود اس نے بھی نہیں نوٹ کیا تھا۔

"ہاں کسی دوست نے دی تھی گفٹ میں۔" وہ اب بھی دیکھ رہی تھی۔ اسے یاد آیا یہ اس نے اپنی پسند سے لی تھی فہد کے ساتھ۔

"وہ آئی تھی شادی میں۔"

"کون؟"

"دوست آپ کی۔"

"نہیں۔۔۔ اس لیے کہ مجھ سے پہلے اس کی شادی ہوچکی ہے۔ باہر ہے وہ' آ نہیں سکتی تھی۔"

"او اچھا۔۔۔ پھر بات چیت ہوتی ہے اس کے ساتھ۔" اسے بس بات کرنے کا بہانہ چاہیے تھا۔

"نہیں ہوتی۔"

"کیوں ناراضی ہے۔"

"ہاں۔۔۔"

"صلح کرلینی چاہیے دوستوں سے۔"

"ضرورت نہیں۔" اس کا لہجہ رکھائی لیے ہوئے تھا۔

"دوستوں کی ضرورت نہیں؟؟" وہ خاصا حیران تھا۔

"ہاں۔۔۔ کسی کی بھی ضرورت نہیں۔"

اور وہ وہیں بیٹھے کا بیٹھا رہ گیا۔ کہنا چاہتا تھا۔ میری بھی نہیں؟ مگر کہہ نہ سکا۔ اس کے بعد وہ جب بھی اس سے بات کرنا چاہتا وہ بیزار ہو کر اٹھ جاتی۔ اسے بات کرنے کا ڈھنگ جو نہیں تھا۔ وہ اس کی باتوں سے بے زار آجاتی تھی۔ بہت ٹائم لگا ان لوگوں کو سیٹ ہونے

میں، وہ اب اس کی بے زاری اور لاپروائی کا عادی ہو چکا تھا اور وہ اس کی حرکتوں اور باتوں کی۔ بہت مشکل سے ان کے درمیان یکسوئی پیدا ہوئی، تعلق بن پایا، مگر سب کچھ بے دلی سے۔ کوئی مطمئن نہیں تھا۔ مگر اس اچھی تبدیلی سے وہ زندگی کی طرف لوٹ رہا تھا۔ اسے ثانیہ سے محبت ہونے لگی تھی۔ وہ اس کا خیال بھی رکھنے لگا تھا۔ بس اسے دل ہی دل میں شکایت تھی کہ وہ اسے وہ اہمیت نہیں دیتی۔ وہ محبت نہیں دیتی کچھ مانگتی نہیں، کوئی فرمائش نہیں کرتی، حق نہیں جتاتی احساس نہیں دلاتی، جیسے اسے اس کی ضرورت نہ ہو، جیسے وہ بس گزارا کر رہی ہو۔ یہ سب سچ تھا۔ مگر یہ بھی سچ تھا کہ اسے ثانیہ کی بہت ضرورت تھی۔ وہ اس کے بغیر رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

وہ جب میکے جاتی تو وہ لمحہ لمحہ گن گن کر گزارتا۔ مگر اسے اظہار کا سلیقہ نہیں تھا۔ وہ چاہتا تھا وہ سب کچھ خود سمجھ جائے اور اس سے اسی طرح محبت کرنے لگے جیسے وہ کرتا ہے۔ کیونکہ اسے پتا تھا کہ وہ اگر محبت کرے گی تو برملا بھی کرے گی۔ وہ اظہار بھی کرے گی، اسے خوش بھی رکھے گی۔ اسے انتظار تھا کسی دن وہ اس کے ساتھ ایسا برتاؤ کرے جیسے بیویاں شوہروں کے ساتھ کرتی ہیں، وہی ناز نخرے، فرمائشیں، انتظار، کھانے پینے کا خیال رکھنا، وہ دفتر جائے تو فون کر کے پوچھنا، وہ ایسا کچھ نہیں کرتی تھی۔

وہ ہر دفعہ سوچ سوچ کر بجھ جاتا اور پریشان ہو جاتا۔ وہ تھک جاتا تھا۔ اس سے کہنا چاہتا پر کہتا نہیں تھا۔ وہ اسی بات پر خوش ہو جاتا کہ وہ کبھی کبھار ٹائم دیتی ہے۔ مختصری آمدنی میں گزارا کر رہی ہے۔

وہ اسے خوش رکھنے کی کوشش کرتا رہتا تھا، پھر بھی وہ مطمئن نہیں تھی۔ کبھی پوچھنا چاہتا تھا کہ تمہارے دل میں کیا ہے۔ تم کیوں ناخوش ہو۔ مجھ میں کیا کمی ہے۔ تاکہ میں دور کرنے کی کوشش کروں۔ مگر نجانے کیوں وہ ہر بار کہتے کہتے رک جاتا۔ بات بدل جاتی۔ وہ ہر بار گھر کے لیے چند ضروریات لکھ کر لسٹ پکڑا دیتی تھی اور اپنے لیے کچھ نہ منگواتی، یا کبھی بے زاری سے اسے جھڑک دیتی۔

وہ چپ ہو جاتا۔ سارا اعتماد رفوچکر ہو جاتا۔ احساس کمتری اور بڑھ جاتا۔ مگر ایسے میں بھی ایک محبت کا احساس تھا جو اسے کسی قدر خوش رکھے ہوئے تھا اور وہ یہ کہ وہ کسی سے محبت کرنے لگا تھا اور اس کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ بہت دنوں سے بیمار تھی۔ وہ اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانا چاہ رہا تھا۔ مگر وہ میکے چلی گئی اور وہیں سے اسے کچھ دنوں بعد خبر ملی کہ وہ امید سے ہے۔ اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ وہ فوراً گیا اور اصرار کر کے اسے گھر لے آیا تھا۔ پہلی بار اس نے پیار سے اصرار کیا تھا۔ اس لیے وہ چلی آئی۔ وہ اس کا خیال رکھنے لگا تھا مگر پھر بھی کہاں لاپروائی ہوئی تھی کہ کچھ غلط ہو گیا۔ اس کا مس کیرج ہو گیا تھا۔ وہ بہت دن بیمار رہی، پھر ماں آکر لے گئی تھی۔ وہ روز فون کرتا۔ کوئی دسویں بیل پر جا کر وہ اس کا فون اٹھاتی تو بے زاری اس کے لہجے سے جھلک رہی ہوتی۔ وہ گھر گیا اس سے ملنے کے لیے اور اس کے بجائے اس کی ماں سے ملاقات ہو گئی۔ وہ اوپر اپنے کمرے میں سو رہی تھی۔ احسان صاحب گھر پر نہیں تھے۔ ورنہ وہ اسے ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے۔ مگر آج اس کی ساس نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا اور پوری کسر نکال دی تھی۔

وہ مجرم بنا سر جھکائے کھڑا رہا تھا اور اس کے کھاتے میں کردہ ناکردہ گناہ درج کر دیے گئے تھے۔ اس کی ماں نے صاف صاف کہا کہ وہ اب گھر نہیں لوٹے گی۔ وہ بھول جائے کہ ثانیہ سے اس کا کوئی رشتہ بھی ہے، بلکہ انہوں نے تو علیحدگی تک کی بات کر دی اور وہ سن ہو گیا۔ اس نے بہت چاہا کہ اس سے مل لے۔ یہ ساری باتیں خود اس سے سن لے، تاکہ یقین آ جائے مگر اس کی ماں کے سامنے وہ کچھ نہ بول سکا۔ نہ اسے بولنے اور صفائی دینے کا موقع دیا گیا۔ وہ مجرم بن کر لوٹ آیا۔ احسان صاحب سے بات کی۔ وہ خود حیران ہو گئے

اسے تسلی دی کہ گھر جا کر ثانیہ سے بات کریں گے اور ثانیہ کو خود گھر چھوڑ آئیں گے۔

پھر "یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے تم ماں، بیٹی نے۔ کوئی طریقہ ہوتا ہے بات چیت کا۔ مدثر آیا تھا کس طرح سے بات کی ہے تم لوگوں نے۔"

"وہ آیا تھا؟" ثانیہ کچھ حیرت سے ماں کی طرف دیکھنے لگی۔ "آپ نے بتایا نہیں امی؟"

"تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہا تھا۔ بچے میں نے بات کر لی تھی اس سے۔"

"اور بات کیا کی یہ بھی بتا دیں۔" وہ تھک کر کرسی پر آبیٹھے۔

"یہی کہ ثانیہ اب اس کے ساتھ نہیں جائے گی۔"

"مگر کیوں۔۔۔ ثانی یہ تم نے کہا تھا۔" وہ اس سے سننا چاہ رہے تھے۔

"اوہ۔۔۔ مجھے کچھ ٹائم چاہیے۔ میں نے یہ کہا تھا، میں فی الحال نہیں جا رہی۔"

"اور تمہاری ماں نے تو علیحدگی تک کی بات کر لی۔"

"کیوں امی۔۔۔ آپ نے ایسا کیوں کہا۔" وہ قدرے حیران تھی۔

"تم نے جو کہا تھا کہ اس کٹھ پتلی کے ساتھ رہ رہ کر بے زار آ گئی ہوں۔ مجھے نہیں جانا اس گھر میں۔"

"کہا تھا، پر ہمیشہ کے لیے نہیں۔ اب شادی کی ہے تو جانا پڑے گا۔ مگر فی الحال نہیں جانا چاہتی میں۔"

"بہتر تھا کہ تم مدثر کو ثانیہ سے ملنے دیتیں رخسانہ! خود اپنی جانب سے کیا کچھ کہہ دیا۔ بچہ ساری رات پریشانی میں سو نہ سکا۔"

"دوسروں کے بچوں کی بہت فکریں ہیں آپ کو، اپنی بچی کی کوئی فکر نہیں ہے، جس کی اٹھا کر زندگی برباد کر دی آپ نے۔"

"تم خوش نہیں ہو ثانی!" وہ اس کے پاس آکر بیٹھ گئے۔

"میں ٹھیک ہوں ابو۔" وہ پھیکا سا مسکرائی۔

"جھوٹ بول رہی ہے، یہ مجھ سے کہہ رہی تھی کہ زندگی گزارنے کی کوشش کر رہی ہوں اس کے ساتھ۔"

"ثانی کوئی شکایت ہے تو بیٹا شیئر کرو ابو سے۔ مجھ سے کیوں نہیں کہتیں۔"

"ابو۔۔۔ بس وہ ذرا مشکل آدمی ہے۔ اس کے ساتھ رہنا بہت مشکل ہے۔ وہ عجیب سا آدمی ہے۔"

"بیٹا وہ اکیلا رہا ہے۔ ماں، باپ کے بغیر۔ چھوٹی عمر میں اس نے بڑے صدمے سہے ہیں۔ وہ سہا ہوا ہے اسے محبت دو، اپنائیت کا احساس دلاؤ۔ وہ ٹھیک ہو جائے گا۔"

"ابو۔۔۔ میں نے بہت کوشش کی ہے۔۔۔ مگر۔۔۔ بس میں اتنا چاہتی ہوں کہ میں کچھ وقت اکیلے رہوں سکون کے ساتھ۔ آپ پلیز مجھے ذرا موقع دے دیں۔ میں علیحدگی کی بات نہیں کر رہی، مگر دیکھیں میں کچھ عرصہ غور کرنا چاہتی ہوں۔"

"اس دوران اگر کچھ بگڑ گیا تو۔" وہ ڈرے ہوئے تھے۔

"ابو! میں بگڑی ہوئی ہوں۔ بکھری ہوئی ہوں۔ فی الحال مجھ میں حوصلہ نہیں ہے۔ تھوڑا ریلیف دے دیں۔"

"بیٹا تم اس سے بات تو کر لو۔ کہہ دو بعد میں آ جاؤ گی۔ ابھی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ تمہارا شوہر ہے وہ۔"

"او کے۔۔۔ میں دیکھتی ہوں، مگر پلیز آپ فی الحال مجھے فورس نہ کریں۔"

"او کے بچے۔۔۔ مگر دھیان سے۔۔۔ دیکھو گھر روز روز نہیں بنتے بچے۔ پھر وہ بے چارہ ڈرا ہوا ہے۔ تمہاری بہت پروا ہے اسے۔ بغیر ماں، باپ کے بچہ ہے۔ اس کے ساتھ اتنی سختی نہ برتا کرو۔"

"احسان صاحب! ہم نے کوئی محبت اور قربانی کا خیراتی ہاؤس نہیں کھول رکھا ہوا کہ ہر کسی کو خیرات میں قربانیاں دیتے پھریں۔ آپ کو اپنی بچی کی کوئی پروا نہیں ہے، حد ہے۔"

"وہ کوئی اور نہیں تمہارا داماد اور اس کا شوہر ہے رخسانہ بیگم!"

"ہاں شوہر بھی آپ نے سر پر سوار کیا ہے اس کے۔ میں تو شروع سے خلاف تھی اس شادی کے۔"

"امی پلیز بس کردیں۔"

"ثانی کیا واقعی میں نے زیادتی کردی بچے۔"

"پتا نہیں ابو۔۔۔ مگر آپ ٹینشن نہ لیں۔ میں بس اتنا سمجھتی ہوں اگر میں ابھی وہاں گئی تو مزید باغی ہو کر آجاؤں گی۔ اس لیے فی الحال میں ٹھنڈے دماغ سے کچھ سوچنا چاہتی ہوں اور بات کروں گی ایک دو دن میں' آپ فکر نہ کریں۔ ابھی اگر بات ہوئی تو بات بگڑ بھی سکتی ہے۔"

"اچھا۔۔۔ ٹھیک ہے جیسے تم ٹھیک سمجھو۔ میں فی الحال اسے منع کر دیتا ہوں کہ وہ تمہیں تنگ نہ کرے۔" وہ بہت مایوس ہو کر اٹھے تھے وہاں سے۔

ثانیہ خود سر پکڑ کر بیٹھ گئی کہ کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے' بس دل بوجھل سا تھا۔ اسے لگ رہا تھا وہ نہیں رہ پائے گی اس کے ساتھ اور فہد کو بھلا نہیں پائے گی شاید۔۔۔ دو چیزیں آپس میں گڈمڈ ہو گئی تھیں۔ وہ ذہنی طور پر بہت اپ سیٹ تھی' اس لیے اس سے کوئی ایسی ویسی بات کر کے اسے بھی مزید پریشان کرنا نہیں چاہ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

احسان صاحب نے اسے سہولت سے سمجھا دیا کہ کال مت کرے اور وہ ۔۔۔ لمحہ لمحہ انتظار کرتا رہا کہ وہ کال کرے گی' مگر اس نے ایک دن بھی بھولے سے خبر نہ لی اس کی' اس نے خود ہی ایک دن فون کھڑکایا۔ ایک' دو' تین" چار' چھ بیل ہوئیں۔ وہ پھر فون ملانے لگا تو دوسری بیل پر ریسیو کر لیا گیا۔ اس نے فون بھی کسی اور نمبر سے کیا تھا' تاکہ وہ اس کا نمبر دیکھ کر پک نہ کرے۔

"ہیلو جی' فرمائیں۔" یہ وہی آواز تھی۔ اس کی ثانی کی۔

"ہیلو۔۔۔" وہ مشکل سے بول سکا۔

"جی بولیں' کون؟ کس سے بات کرنی ہے؟"

"ثانیہ سے۔۔۔" وہ بمشکل کہہ پایا۔

"جی بول رہی ہوں' مگر آپ کون ہیں۔" کمال ہے وہ اس کی آواز نہیں پہچان رہی تھی۔ اس کی بیوی پورے نو ماہ اس کے ساتھ رہی۔ اس کی آواز بن کر اس سے بات کی۔

"مدثر بول رہا ہوں ثانیہ!" اس کے گلے سے آواز تھکی ہوئی نکلی۔

"اوہ۔۔۔ مدثر۔۔۔ کیا حال ہیں آپ کے۔" اس کا لہجہ اجنبی بیجہ کیوں تھا۔

"تم کیسی ہو؟" اپنائیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔

"ٹھیک ہوں۔"

"طبیعت ٹھیک ہے۔" فکر مندی سی تھی۔

"ہاں ٹھیک ہوں۔"

"میں ملنے آجاؤں؟" بے تابی جھلکی۔

"فی الحال نہیں پلیز۔"

"کب آؤ گی۔"

"پتا نہیں۔" رکھائی سے کہا گیا۔

"ثانی۔۔۔" آخری فقرہ ٹوٹ گیا۔ "میں کال نہیں کروں گا اب۔" آنسو لفظوں میں آگئے تھے۔

ادھر سے لائن ساکت تھی۔ الوداعیہ کلمات بھی نہیں' نہ کوئی معذرت۔۔۔ نہ کوئی دعا۔۔۔ نہ کوئی درخواست۔۔۔ نہ بات۔ بس سلسلہ ختم۔۔۔ اس دن ثانیہ خود اپنے سفاک طرز عمل پر افسردہ تھی۔

مگر وہ صرف افسردہ تھی' جبکہ مدثر احمد بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہا تھا اور اس دن کے بعد واقعی اس نے کبھی فون نہیں کیا۔ ان کی بات نہیں ہوئی پورے چھ ماہ بیت گئے۔ ان کی شادی کی سالگرہ گزر گئی۔ جیسے سب کچھ راکھ کا ڈھیر بنتا جا رہا تھا۔ خود مدثر احمد بھی اور اندر سے ثانیہ بھی۔ مگر وہ پچھلے سات ماہ سے خود کو بھی سزا دے رہی تھی اور اسے بھی۔۔۔ یہ سزا بہت لمبی ہو گئی تھی' عنقریب جان لیوا ثابت ہو سکتی تھی۔

☼ ☼ ☼

یہ ساڑھے آٹھ ماہ ثانیہ کے تو ہوا بن کر اڑ گئے تھے

مگر مدثر احمد پر بجلی بن کر برسے اور پہاڑ بن کر ٹوٹے تھے۔

ثانیہ کو دو ماہ بعد ہی جاب مل گئی تھی۔ وہ پورے چھ ماہ اپنی جاب' اپنے کام میں مگن رہی' پوری طرح سے جیسے بھول گئی یا بھولنے کی کوشش کرتی رہی کہ اس کا کوئی گھر تھا' کوئی شوہر بھی تھا' کوئی نکاح کے کاغذات پر معاہدہ کیا تھا۔۔۔ اس کا مقصد تو یہی تھا کہ جاب کر کے اپنا کچھ بنا لے تو پھر چلی جائے گی۔ اس پر بار نہیں ہو گی' اپنا خرچا خود اٹھائے گی۔ اس نے یہ نو ماہ جس تنگی سے گزارے تھے' سے ہی بیتا تھا۔ وہ اس پر اضافی خرچا ڈالنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اس کی ہمدرد بھی تھی۔ بس ایک غلطی اس سے ہو گئی کہ جو معاہدہ کیا اس پر پوری نہ اتر سکی۔ اس سے تعلق ہی ختم کر دیا۔ رابطہ ہی توڑ دیا۔ اتنی سفاکی' اتنی بے رحمی پر اسے کبھی کبھار دکھ ہوتا تھا' مگر عجیب مرحلہ تھا کہ ہر معاملے میں خود کو بے بس پایا تھا۔

ابھی بھی تو وہ بے بس ہو گئی تھی جب احسان صاحب نے ناشتے پر افسوس کے ساتھ اس کا حال سنایا تھا۔

"مدثر کو چار ماہ پہلے نوکری سے نکال دیا گیا ہے۔"

"مگر کیوں۔" وہ چونک گئی تھی۔

"وہ ٹھیک کام نہیں کر پا رہا تھا۔"

"یہ شخص کسی قابل نہیں ہے۔" اس کی ماں کا فرمان تھا۔

"وہ ذہنی دباؤ کے سبب کام سنبھال نہیں پا رہا تھا۔ پچھلے چار ماہ سے اس کی عجیب حالت ہے۔ کل گیا تھا اس کی خیریت پوچھنے۔"

"آپ کو کیا ضرورت تھی جانے کی وہاں۔" رخسانہ بیگم برہم ہوئیں۔

"ابو۔۔۔ وہ کیسا ہے۔" اس نے ناشتا چھوڑ دیا تھا۔

"اسے اس حالت میں کیسا ہونا چاہیے۔ جب اس کا کوئی نہیں۔ کاش میں اس کی شادی کسی مڈل کلاس فیملی کی لڑکی سے ہی کرا دیتا۔ وہ اسے چھوڑ کر تو نہ جاتی۔۔۔ وہ بھی خوش رہتا۔۔۔ تمہارے ساتھ بھی زیادتی نہ ہوتی۔" انہوں نے چائے کا ادھورا کپ چھوڑ دیا تھا۔

"زیادتی تو آپ نے خوب کی۔۔۔ مگر اپنی بیٹی کا نہیں' پھر بھی اسی کا افسوس کھائے جا رہا ہے آپ کو۔" وہ کیوں خاموش رہتیں بھلا۔

"ابو ٹھہریں۔۔۔ میں چلتی ہوں۔۔۔ مجھے وہاں ڈراپ کر دیجیے گا۔"

"کہاں۔۔۔ تم پاگل ہو گیا ثانی! کہاں جا رہی ہو۔" وہ تیز ہوئیں۔

"وہ بہت برا سہی۔۔۔ مگر وہ شوہر ہے میرا۔ اس حال میں تو مجھے جانا چاہیے' اس کی خیریت معلوم کرنا چاہیے۔"

"ثانی! تم اپنا فیصلہ آٹھ ماہ بعد بدل رہی ہو۔ پھر پچھتاؤ گی' مت جاؤ' پھنس جاؤ گی وہاں جا کر۔"

"مجھے جانا چاہیے امی۔۔۔ ابو آپ ٹھہریں' میں ذرا بیگ اور سیل فون وغیرہ لے آؤں۔

میں اپنی گاڑی میں جاتی ہوں۔ ہو سکتا ہے مجھے وہاں رکنا پڑ جائے کچھ دیر۔" وہ نیچے آ کر ان سے پوچھنے لگی۔

"ہاں۔۔۔ یہ ٹھیک ہے' مجھے ویسے بھی دفتر سے دیر ہو جائے گی' تم اپنی گاڑی میں چلی جاؤ۔ میں فون کر کے تم سے پوچھ لوں گا پھر۔"

"اوکے بہتر ہے۔" وہ ان کے ساتھ باہر نکلی۔

"ثانی شام سے پہلے لوٹ آنا۔"

وہ فکر مندی سے کہتے ہوئے بیٹھ گئیں سر پکڑ کر۔ وہ تیزی سے گاڑی گیراج سے نکالنے لگی اور وہ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اسے دیکھتے رہے۔

"اللہ کرے اب تم اپنے فیصلے پر قائم رہو۔" انہوں نے دل میں دعا کی تھی اور ڈرائیور کو چلنے کا اشارہ کیا۔ ان کی گاڑی کے پیچھے پیچھے ثانیہ کی گاڑی تھی۔ انہوں نے ٹھنڈی سانس بھر کر مڑ میں سے اسے مسکرا کر دیکھا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ اندر آئی تو گھر کی عجیب حالت تھی۔ ہر جگہ چیزیں

بکھری ہوئی تھیں۔ اور کمرے تک آکر وہ ٹھٹک گئی بیڈ کے پاس وہ اوندھے منہ بے سدھ پڑا ہوا تھا۔ اس کے سر سے خون بھی نکلا ہوا تھا۔

وہ دہل گئی۔۔۔ اسے جھنجوڑا آوازیں دیں۔ مگر وہ شاید بے ہوش تھا۔ سر سے کافی خون بہہ چکا تھا۔ خون فرش پر سوکھ بھی چکا تھا۔ گویا وہ رات سے یا کافی دیر پہلے سے گرا ہوا تھا۔

اس نے عجلت میں باہر نکلتے ہوئے پڑوسیوں کو آواز دی۔ ایک، دو آدمی باہر آئے ان کی مدد سے اسے گاڑی میں ڈالا۔ وہ دونوں آدمی اس کے ساتھ تھے۔ ایک نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ وہ پیچھے مدثر کا سر گود میں لیے بیٹھی تھی اور اسی ٹائم ابو کو کال ملائی۔

"ابو۔۔۔ ابو! مدثر بے ہوش تھا، میں اسے اپنے پڑوسیوں کے ساتھ ہاسپٹل لے جا رہی ہوں، آپ پلیز وہاں آجائیں۔"

وہ بس اتنا کہہ سکی تھی، اس کا سر تھامے اس کی عجیب کیفیت ہو رہی تھی۔ آنسو بے اختیار ہو کر امڈ آئے تھے۔ اسے یقین نہیں آیا خود پر بھی کہ وہ وہی تھی جو آٹھ ماہ اس سے دور رہی تھی۔ اس کی خبر بھی نہ لی اور اب اتنے عرصے بعد وہ اس کی حالت پر یوں سب کے سامنے رو رہی تھی۔ ان کے اسپتال پہنچتے ہی احسان صاحب بھی پہنچ گئے تھے۔ اسے فوراً" ٹریٹمنٹ دی جانے لگی۔ وہ ویٹنگ لاؤنج میں پریشان بیٹھی تھی۔ شام تک اسے ہوش آگیا تھا۔ وہ احسان صاحب کے ساتھ اس کے سرہانے کھڑی تھی۔ ڈاکٹر نے اسے جانے کی اجازت دے دی تھی۔ اس کے دماغ پر اثر تو ہوا تھا کچھ، مگر وہ جسمانی طور پر ٹھیک تھا ۔زخم پر پٹی کر کے دوا دے دی گئی۔ ڈاکٹر نے انہیں کسی دماغی اسپتال لے جانے کو کہا تھا۔ مگر وہ ضد کر کے اسے گھر لے آئی تھی۔ احسان صاحب کو اس کے پاس بٹھا کر وہ گھر گئی اور اپنی ساری چیزیں، کپڑے سمیٹ کر گھر لے آئی، جب تک وہ مدثر کے پاس بیٹھے رہے ۔اس نے اپنی نگرانی میں گھر سے جو ملازم لائی تھی اس سے ساری صفائی کروائی اور میلے کپڑے لانڈری بھجوائے۔ اس کے لیے کھانا بنا کر وہ اندر آئی تو وہ کچھ حواسوں میں تھا۔ احسان صاحب نے زبردستی اسے کھانا کھلایا۔ خود ثانیہ کے ساتھ کھایا تھا اور رات گئے وہ گھر لوٹے اسے پوری طرح سے سیٹ کر کے۔ گھر آتے ہی رخسانہ بیگم ان پر برس پڑی تھیں، مگر وہ کتنے دنوں بعد آج چین کی نیند سوئے تھے۔ تھکن بھی تھی اور طمانیت بھی۔

اس کے بعد ایک لمحے کے لیے بھی اس نے اسے اکیلا نہیں چھوڑا تھا۔ کچھ دن چھٹی لے لی تھی۔ پھر وہ جسمانی طور پر بالکل ٹھیک ہو گیا اور کچھ ذہنی طور پر تو وہ وہیں سے جاب پر جانے لگی۔

وہ پوری کی پوری بدل چکی تھی۔ وہ پاگلوں کی طرح اس کا خیال رکھتی تھی۔ وہ کچھ نارمل تھا۔ مگر بیٹھے بیٹھے کھو جاتا تھا۔ کبھی کبھار عجیب حرکتیں کرنے لگ جاتا۔ بیٹھے بیٹھے گلاس اٹھا کر پٹخ دیتا۔ فرش پر ڈرے ڈرے سے انداز میں بیٹھ جاتا۔

کبھی سخت گرمی میں جیکٹ پہن لیتا اور کہتا مجھے سردی لگ رہی ہے۔

اور کبھی سردی آئی تو بنیان میں پھرتا تھا۔ وہ لاکھ کہتی، مگر کچھ نہیں پہنتا۔ پہلے کی نسبت گزارا اب مشکل تھا، بلکہ ناممکن تھا، مگر وہ چاہ رہی تھی تو کر رہی تھی۔

شام کا وقت تھا جب وہ گھر آئی راشن لے کر تو دروازہ اندر سے بند تھا، اس نے بہت بیل دی، کھٹکھٹایا، مگر نہیں کھلا۔ کمرے کی کھڑکی کھلی تھی پوری، اس نے ایک پائپ کا سہارا لے کر پہلے سارا سامان اندر پھینکا، پھر کوشش کر کے خود کھڑکی سے کود کر اندر آئی۔ وہ کمرے میں نہیں تھا۔ سامان پھینکنے کے سبب بری طرح بکھر گیا تھا۔ سیب تھیلے سے نکل کر فٹ بال کی طرح کوئی بیڈ کے نیچے، کوئی کرسی کے نیچے، کوئی دروازے کے کونے سے آ لگا۔ یہی حال دیگر چیزوں کا تھا۔ مگر سب کچھ سمیٹنے سے پہلے وہ اسے دیکھ کر اطمینان کر لینا چاہ رہی تھی کہ وہ ٹھیک ہے۔ وہ کچن کے قریب ڈائننگ ٹیبل کے ساتھ کرسی پر گم صم بیٹھا تھا۔

"مدثر۔۔۔ ٹھیک ہو نا۔۔۔ سب ٹھیک ہے۔ سردی نہیں لگ رہی؟" وہ بنیان اور ٹراؤزر میں گم سم بیٹھا تھا۔ اسے دیکھنے لگا، مگر بولا کچھ نہیں۔

"مسعودی! طبیعت ٹھیک ہے نا۔" اس نے اپنے دوپٹے سے اس کے چہرے کا پسینہ صاف کیا۔ اتنی سردی میں بھی اسے پسینہ آ رہا تھا۔

وہ بچوں کی طرح غائب دماغی سے اسے دیکھنے لگا۔

"مدثر! کیا ہوا۔ ایسے کیوں دیکھ رہے ہو۔" آج تیسرا ہفتہ تھا، مگر اس کی ذہنی حالت ویسی کی ویسی تھی۔ کبھی کبھار وہ یوں ہی غائب دماغ ہو جاتا جیسے اسے پہچان نہیں پا رہا ہو یا کچھ کہنے کی کوشش تو کر رہا ہو، مگر کہہ نہیں پا رہا ہو۔

"مدثر بولو نا۔۔۔ کچھ تو بولو۔۔۔ اچھا کچھ کھایا ہے۔" وہ اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر بولی۔

پچھلے تین ماہ سے وہ اسے بچوں کی طرح ٹریٹ کر رہی تھی، یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ وہ ایک بچے کے ساتھ پوری ذمہ داری کے ساتھ رہ رہی تھی۔ نیند میں اٹھ اٹھ کر اسے دیکھنا کہ کہیں وہ کمرے سے باہر تو نہیں نکل گیا۔ کہیں وہ باہر جاتے ہوئے گر تو نہیں گیا۔ اسے چوٹ تو نہیں لگی۔ خون تو نہیں بہہ رہا، درد تو نہیں ہو رہا۔

کبھی کبھار وہ نیند میں چیخنے لگتا اور وہ اسے بچوں کی طرح بہلاتی۔ بے بسی اتنی کہ وہ خود اس کے ساتھ رو پڑتی۔ اسے سنبھالتے سنبھالتے وہ خود آدھی پاگل تو ہو گئی تھی۔ کتنے ڈاکٹروں کے چکر لگا آئی۔ آج بھی وہ اسے اپنے ساتھ نفسیات کے ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔ اس کا مشورہ تھا کہ اسے مینٹل اسپتال داخل کرایا جائے، مگر اس نے کوئی اور حل چاہا تو یہی کہا کہ جگہ تبدیل کریں۔ اسے بہت سارے لوگوں کے ساتھ بٹھائیں۔ تاکہ وہ لوگوں کو دیکھ کر بات کر کے مل کر کچھ بہتر ہو۔ وہ اس کا اور اپنا سامان پیک کر کے اسے اپنے گھر لے آئی کہ اسے احسان صاحب وقت دیں گے۔ جگہ بدلے گی۔ ملازم ہوں گے، ہو سکتا ہے اس کے اندر بہتری آ ہی جائے۔ مگر اسے کیا پتا کہ یہ سودا اور بھی مہنگا پڑے گا۔ وہ اسے لے تو آئی، مگر پھر بہت پچھتائی۔

اس کی غیر موجودگی میں اس کی ماں اس آدھے پاگل کے ساتھ عجیب عجیب باتیں کر کے اور اسے برا بھلا کہہ کر اسے اور ذہنی مسائل میں الجھانے لگی۔ اس پر سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ فہد پاکستان آگیا ان کے گھر۔ اس نے تو ایک منٹ رک کر اس سے بات تک نہ کی تھی۔ مگر رزلٹ بہت جلد سامنے آیا۔ ایک دن مدثر نے کوئی چیز توڑ دی گھر کی، چیخنے لگا اور اس کی ماں اور فہد اسے پکڑ کر مینٹل اسپتال لے آئے۔ وہ جب گھر پہنچی رات کو تو اسے نہ پا کر پاگل سی ہو گئی تھی۔ پھر پتا چلا کہ وہ اسے پاگل خانے چھوڑ کر آئے ہیں تو دماغ گھوم گیا۔ وہ ساری رات ان سے لڑتی رہی، روتی رہی اور صبح سویرے پاگل خانے پہنچی تو وہ اپنے آپے میں ہی نہیں تھا۔ گویا کہ اس کے علاوہ اب کوئی اور حل نہ تھا۔

وہ تھک کر گھر آئی تو ایک اور جنگ چھڑ گئی، اس کی ماں اور فہد کا نیا پلان۔۔۔ وہ چکرا کر رہ گئی۔

دو دن تک اسے ذہنی طور پر تیار کیا گیا تھا۔ اسے پتا تھا کہ مدثر کا بہتر ہونا بہت مشکل ہے۔ بلکہ ناممکن کے قریب ہے اور کوئی امید بھی نہیں ہے۔ مگر وہ اسے اکیلے چھوڑ کر نئی زندگی کیسے شروع کر سکتی تھی۔ پہلے یہ سب آسان تھا۔ وہ اپنے پیروں پر کھڑا تھا۔ اب وہ محتاج تھا، اکیلا تھا، ایک پاگل آدمی کو اس حالت میں چھوڑ کر اس سے طلاق لے کر اپنا الگ گھر بسانا بہت مشکل، بلکہ ناممکن تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ اس کے پیچھے ضرور گئی تھی، مگر اسے روکنے نہیں۔ انگوٹھی واپس کرنے۔ اس کے بعد وہ رکا ضرور تھا۔ ان کے درمیان بات ضرور ہوئی تھی، مگر وہ اپنی طرف سے صفائیاں دے رہا تھا اور معافی مانگ رہا تھا۔ ثانیہ کی آنکھیں نم ضرور ہوئی تھیں۔ ایک بار سوچا اسے روک لے، مگر دل نے ساتھ نہیں دیا، اب باری ثانیہ کی تھی، اسے نباہنا تھا۔ کسی کی زندگی پوری کی

پوری اس پر انحصار کر رہی تھی اور اسے اپنی تمام خوشیاں اس پر قربان کر دیتی تھیں۔ فہد جب گاڑی میں بیٹھا اور جب وہ اسے اللہ حافظ کہہ کر واپس آ رہی تھی' اس کی چال میں عجیب مضبوطی تھی اور رخسانہ بیگم جنہوں نے کچھ دیر پہلے سکون کا سانس لیا تھا' وہ حیرانی سے اسے دیکھے گئیں۔

اور ثانیہ تیزی سے اپنے کمرے کی طرف سیڑھیاں چڑھ گئی اس نے بال سمیٹنے تھے' کپڑے تبدیل کرنے تھے۔ ناشتا کرنا تھا اور پھر خود کو مضبوط کر کے اس سے ملنے جانا تھا اور اب کی بار رونا بھی نہیں تھا۔ آنسوؤں کو چھپا لیتا تھا۔ یہ سوچ کر اس کے اندر صبر سا آ رہا تھا۔ اصل مقصد تو اس کا اب شروع ہوا تھا اور آج سے اس کی ڈیوٹی کا پہلا دن تھا۔

☼ ☼ ☼

یہ زندگی کا ایک صبر آزما مرحلہ تھا۔ وہ دل پر جبر کر کے اس سے ملنے جاتی۔ اس کی حالت دیکھ کر ہر بار دل ڈوب جاتا تھا' وہ پہلے پہل اسی طرح اسے دیکھ کر چیخنے لگتا تھا۔ پھر کچھ دن بعد اس نے چپ سادھ لی' کبھی کبھار اشتعال میں آ کر اسے کچھ دے مارتا۔ ایک بار اسے دیکھ کر منہ چھپا لیا۔ وہ ڈاکٹرز سے ملنے' مشورے کرنے لگی' اس دوران اس نے کئی نفسیات کی کتابیں پڑھ ڈالیں' کئی نفسیاتی معالجوں سے ملی تھی۔ اسے ہینڈل کرنے کے طریقے سیکھے' پھر اسے اپنے طور پر ہینڈل کرنے لگی۔

وہ اسے اب کلینک میں ملتی تھی۔ ڈاکٹر روم میں اسے لے آتے۔ وہ باتیں کرتی رہتی۔ وہ غائب دماغی سے سنتا رہتا۔ کچھ نہیں کہتا اور کبھی الٹی سیدھی باتیں کرنے لگتا۔ ہر بار اپنی شکست پر دل ٹوٹ جاتا' ڈوب جاتا۔ مگر ہر دوسرے دن وہ اک نیا حوصلہ جمع کرتی۔ خود کو جوڑتی اور اس سے ملنے جاتی۔ وہ اب اسے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتی تھی۔ اس سے باتیں کرتی۔

"مدثر! تمہیں یاد ہے تم ایک دفعہ میرے لیے گجرے لائے تھے۔"

"تمہیں یاد ہے میری ڈیٹ آف برتھ پر تم رات بارہ بجے کیک لائے تھے اور میں سو رہی تھی۔ تمہیں یاد ہے نا مدثر۔" وہ نوالہ اس کے منہ میں ڈالتے ہوئے کہنے لگی۔ وہ برا سا منہ بنا کر نوالہ چبانے لگا۔

"تم چلی گئی تھیں نا۔" اس نے بہت دیر بعد سوچنے کے بعد کہا تھا۔

"تم نے مجھے یاد کیا تھا؟" اس کی آنکھوں میں پانی تیرنے لگا' جس میں اس کا چہرہ دھندلانے لگا تھا۔

اس نے غائب دماغی سے نفی میں سر ہلایا تھا۔

"تم نے مجھے کال کی تھی۔"

وہ پھر نفی میں سر ہلانے لگا۔

"اچھا میں نے نا۔ فرنیچر کی سیٹنگ چینج کی ہے۔" وہ اس کے منہ میں دوسرا نوالہ ڈالنے لگی' جب اس نے ہاتھ روک دیا۔

"کیا ہوا پیٹ بھر گیا؟"

"یہ تم کھا لو۔" وہ بچوں کی طرح بولا۔

وہ خود کھا کر مسکرانے لگی۔ "تم بہت اچھے ہو کیا میں بھی اچھی ہوں۔" اس نے بچوں کی طرح اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"پھر تم مجھے میرے گھر لے جاؤ گی۔"

"ہاں تم ٹھیک ہو جاؤ تو میں تمہیں گھر لے جاؤں گی۔"

"وہاں نہیں لے جانا۔"

"وہاں کہاں؟"

"وہ جہاں سب ڈانٹتے ہیں۔ وہ تمہارا گھر ہے نا۔"

"ہم اب وہاں نہیں جائیں گے مدثر۔ ہم اب اپنے گھر جائیں گے۔"

"تم بھی چلو گی کیا؟"

"ہاں۔ ہم دونوں چلیں گے۔" وہ ٹفن بند کرنے لگی۔

"کب چلیں گے۔"

"جلدی چلیں گے۔" وہ اسے دوا دینے لگی۔

"مجھے نہیں کھانی یہ گولی۔ کڑوی ہوتی ہے۔ یہ زہر ہے نا۔"

"نہیں مدثر! یہ زہر نہیں ہے' یہ دوائی ہے' اسے کھا کر تم ٹھیک ہو جاؤ گے' پھر میں تمہیں گھر لے جاؤں گی۔"

"تم ثانیہ ہو نا۔" وہ گولی نگلتے ہوئے بولا۔

"ہاں میں ثانیہ ہوں۔ کیوں تم مجھے نہیں پہچانتے؟"

"پہچانتا ہوں۔"

"پھر بتاؤ ثانیہ کون ہے؟"

"میرے گھر میں رہتی تھی' پھر چلی گئی۔"

"پھر لوٹ بھی تو آئی تھی نا مدثر!"

"نہیں آئی' فون نہیں اٹھاتی تھی۔ بہت بری تھی۔" وہ تھوڑی کھجلاتے ہوئے بولا۔ اس کی آنکھیں دوائی کے زیر اثر اب بند ہو رہی تھیں۔

"مجھے نیند آرہی ہے۔" وہ وہیں بیڈ پر لیٹ گیا۔ اس کے سوتے ہی وہ ڈاکٹر کے پاس آگئی۔

"اس کے ذہن پر آپ کے چلے جانے والا صدمہ ابھی تک ہے۔"

"ہاں میں جانتی ہوں۔"

"مگر یہ اب بہتر ہونے لگے ہیں۔ انہیں سب یاد آرہا ہے۔ یہ کبھی نیند میں آپ کو آواز دیتے ہیں۔"

"مجھے اس دن کا انتظار ہے ڈاکٹر صاحب! جب میں اسے اپنے گھر لے جاؤں گی اور وہ بالکل نارمل ہو جائے گا۔"

"ان شاء اللہ مس ثانیہ! وہ دن ضرور آئے گا۔ آپ بہت محنت کر رہی ہیں۔ آپ کے صبر کا پھل میٹھا ہی ہو گا۔ آپ کو پتا ہے یہاں بہت سے مریض مکمل طور پر صحت یاب ہو کر اس لیے گھر نہیں جاتے کہ ان کے گھر والے ان سے تعاون نہیں کرتے۔ وہ لوگ ہمیشہ کے لیے انہیں یہاں چھوڑ جاتے ہیں۔ مسٹر مدثر کی صحت یابی میں اسی فیصد آپ کا ہاتھ ہے' باقی علاج کا۔"

"اس کے پاگل ہونے میں بھی اسی فیصد میرا ہی ہاتھ تھا' بیس فیصد تو وہ پہلے تھا' باقی کی کسر میں نے پوری کر دی تھی۔"

"مگر آپ ان کی زندگی کی پہلی اور آخری امید ہیں مس ثانیہ۔"

"اور یہ امید میری زندگی کی آخری امید ہے ڈاکٹر صاحب!" وہ کوریڈور سے گزرتے ہوئے جا رہی تھی گیٹ کے پاس۔ جب مدثر بستر پر گہری نیند سو رہا تھا اور اس نے تب تک گہری نیند نہیں سونا تھا جب تک مدثر کو مکمل طور پر بیداری نہیں مل جاتی تھی۔

☼ ☼ ☼

ساڑھے پانچ سال بعد......

مشکل وقت بہت مشکل سے گزرتا ہے' مگر اس کی ایک اچھی بات ہے' گزر جاتا ہے۔ ساڑھے پانچ سال بہت مشکل تھے مگر گزر گئے تھے۔

صبح نے ہر چیز کو روشن کر رکھا تھا۔ جب وہ آنکھیں موندے لیٹی ہوئی تھی اور مدثر کی پکار پر اٹھی تھی۔ وہ جب منہ دھو کر باہر آئی تو وہ ٹیبل پر ناشتا لگا چکا تھا۔ سیب' پھل' جوس' چائے' بریڈ اور محسن کے لیے دلیہ تیار تھا۔

"مدثر... مجھے کیوں نہیں اٹھایا' بری بات ہے۔"

"تم رات بہت دیر سے سوئی تھیں ثانی... اچھا اب جلدی آؤ ناشتا کر لو۔ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں اور ہاں اپنے بیٹے کو خود آکر کھلاؤ' یہ میرے ہاتھ سے نہیں کھاتا۔" وہ محسن کو اس کی گود میں تھماتے ہوئے بولا۔

وہ اسے گود میں لے کر بیٹھ گئی اور اسے بھی کھلانے لگی خود بھی کھانے لگی۔ مدثر ہر چیز نکال کر اسے دے رہا تھا اور کھانے کا اصرار کر رہا تھا۔ جبھی وہ اسے کھلانے میں مگن ہوتی' تو وہ خود نوالہ توڑ کر اس کے منہ میں ڈالتا۔

"توبہ مدثر! بچی تھوڑی ہوں میں' کھا لوں گی۔" وہ ہنس دیتی۔

وہ دونوں ایک دفتر میں جاب کرتے تھے جہاں احسان صاحب ہوا کرتے تھے۔ شام کو واپسی پر تقریباً" ایک چکر وہاں کا لگتا تھا اور گھر آتے آتے مغرب ہو جاتی۔

آج اتوار کا دن تھا اور دن بھی بڑا نکھرا ہوا تھا' بلکہ نکھری ہوئی شام تھی' جب احسان صاحب اپنے نواسے کے ساتھ لان میں فٹ بال کھیل رہے تھے۔

اور وہ گلاس وال کے پاس کھڑا مسکراتے ہوئے باہر کا منظر دیکھ رہا تھا۔

"یہاں کیوں کھڑے ہو مدثر!" وہ اس کے پاس آئی اور اس کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔

"محسن کو دیکھ رہا ہوں۔ دیکھو وہ بالکل ٹھیک بال پکڑ رہا ہے' وہ کھیل کو سمجھ رہا ہے' وہ کتنی تیزی سے دوڑ بھی رہا ہے۔"

"ہاں تو ماشاء اللہ ڈھائی سال کا ہو گیا ہے۔" وہ مسکرائی اس کی بات پر۔

"ہاں... مگر دیکھو اس میں کوئی کمی نہیں ہے نا۔ قوت مدافعت ٹھیک ہے' ذہن بھی ٹھیک ہے نا۔ میں رات کو اٹھ کر اسے بار بار دیکھتا ہوں' کہیں وہ چیخیں تو نہیں مار رہا ہے۔ ڈاکٹر نے اس کی پیدائش سے پہلے کہا تھا کہ ان کی ذہنی حالت کا اثر بچے پر پڑ سکتا ہے۔

صرف ماں نہیں باپ کی فطرت اور ذہنی حالت کا اثر بھی پڑتا ہے۔ مگر خوش نصیبی سے ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ محسن بالکل ٹھیک اور نارمل پیدا ہوا تھا اور اس کی ہر ایکٹیویٹی نارمل بچے جیسی تھی' بلکہ وہ خاصا صحت مند تھا۔ ان کے زیادہ خیال رکھنے کی وجہ سے آج اس کا شمار آج کے ذہین بچوں میں ہوتا تھا۔

"ہم اسے چار سال سے پہلے اسکول میں داخل کروا دیں گے۔" وہ اسے دیکھتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔

"ٹو جمپ ڈلوا دیں۔" وہ بھی گلاس وال سے باہر ہی دیکھ رہی تھی۔ جہاں نانا سے نواسا بال چھین کر بھاگ رہا تھا۔

"نہیں اب اتنی بھی جلدی نہیں۔" وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرایا۔

وہ ہنسا تھا اور اس کی ہنسی میں ثانیہ شامل تھی۔ نانا سے نواسا جیت گیا تھا۔

اور گلاس وال کے اس طرف کھڑے بچے کے ماں' باپ نے تالیاں بجائی تھیں۔ جواب ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جسے دیکھ دیکھ کر مدثر احمد اور ثانیہ مدثر جیتے تھے۔ یہ ان کا محسن تھا' ان کی امید تھا' اور اسی امید پر زندگی کا احساس خوب صورت تھا۔

☼

امایہ خان

ناولٹ

جو سچ پوچھو تو ہم تم زندگی بھر ہارنے آئے
ہمیشہ بے یقینی کے خطرے کانپتے آئے
ہمیشہ خوف کے پیراہنوں سے اپنے پیکر ڈھانپتے
آئے
ہمیشہ دوسروں کے سائے میں اک دوسرے کو

چھٹی اور آخری قسط

چاہتے آئے
برا کیا ہے اگر اس کوہ کے دامن میں چھپ جائیں
جہاں پر جا کے پھر کوئی کبھی... واپس نہیں آتا
چلو اس کوہ پر...

بند آنکھوں کے کناروں پر نمکین سیال کے قطرے اسی انتظار میں تھے کہ وہ پلکیں اٹھائے تو انہیں رہائی نصیب ہو۔ وہ اس نظم کو گا نہیں رہی تھی، محسوس بھی کر رہی تھی۔ نظم ختم ہوئی اور اس نے آہستگی سے ایر فون ہاتھ سے پکڑ کر نیچے کھینچ دیے۔ اب وہ تھوڑی شرمندہ ہو رہی تھی۔ اپنے سامنے میز پر فرائیڈ فش اور چپس کی پلیٹ سے آگے مہرز کی کلائی پہ بندھی گھڑی کا ڈائل چمکتا نظر آ رہا تھا۔ معلوم نہیں وہ کب سے بیٹھا تھا۔ رامین نظر اٹھا نہ سکی۔ وہ خود اپنے لیے گایا کرتی تھی اور ابھی یہ سوچ کر اسے گھبراہٹ ہو رہی تھی کہ مہرز نے اسے گاتے ہوئے سن لیا ہے۔ اس نے بنا اس کی طرف دیکھے خاموشی سے کولڈ ڈرنک کا گلاس اٹھا کر لبوں سے لگا لیا۔

مہرز بغور اس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس نے پڑھا تھا کہیں... کہ جو لوگ چھوٹی چھوٹی بے وقوفانہ باتوں پر دل کھول کر ہنستے چلے جاتے ہیں وہ اندر سے بہت دکھی ہوتے ہیں اور آج رامین کو دیکھ کر... اس طرح دکھی دیکھ کر وہ بے چین تھا اور... مضطرب بھی۔

کیوں بھر آتی ہیں اس کی آنکھیں یوں بار بار؟ کیا دکھ ہے اسے... جو اپنے آنسوؤں کو ہر دم قہقہوں کے پیچھے چھپانے کی کوشش کرتی رہتی ہے؟ وہ مہرز کے سامنے اتنی دیر تک ہنستی رہی۔ خوش ہوتی رہی اور اب... اس کی پلکوں پر ٹھہرے آنسوؤں کے قطرے... چمک کر اپنی موجودگی کا احساس دلا گئے'

وگرنہ اس نے تو بظاہر چھپانے کی بہت کوشش کی تھی۔ کچھ دیر یوں ہی دونوں خاموش بیٹھے رہے اپنی اپنی سوچوں میں غرق۔

"تم اداس کیوں ہو؟ مجھے بتاؤ پلیز۔" رامین نے ایک نظر مہرز کے تفکر مند چہرے کو دیکھا اور فوراً" ہی نظریں ہٹالیں۔ وہ کافی حد تک خود کو سنبھال چکی تھی۔ اس کے پرانے زخم پر جو کھرنڈ جمنے لگا تھا' وہ انہیں کھرچنا نہیں چاہتی تھی۔ اب اسے اپنی زندگی سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ وہ خوش رہنا چاہتی تھی۔

مگر اس کے باوجود۔ اسے اپنی حساس طبیعت پر اختیار نہیں تھا۔ کوئی بھی خوشی یا درد کا پہلو ہوتا' وہ اسے دل کی گہرائیوں سے محسوس کرنے میں بالکل بے بس ہوجاتی۔ اسے رونا کیوں آیا تھا؟ معلوم نہیں' اور اسے کوئی بہانہ نہیں سوجھ رہا تھا کہ اپنی حالت کی کیا توجیہہ پیش کرے کہ مہرز کو مطمئن کرسکے۔ اس نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے سامنے سے ایک فرنچ فرائز اٹھایا۔ اس کا کنارہ کترتے ہوئے پہلے خوامخواہ ادھر ادھر دیکھتی رہی اور پھر اچانک ہی۔۔۔ اس نے مہرز کی شرٹ کی طرف انگلی اٹھائی اور کہا۔

"تم اس نیوی بلیو شرٹ میں بہت اچھے لگ رہے ہو۔" مہرز کو اپنے سوال کے جواب میں اپنی تعریف سننے کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ اس نے جن نظروں سے رامین کو دیکھا اس سے رامین کو اندازہ ہوگیا کہ دھیان بٹانے کی یہ کوشش رائیگاں ہی گئی ہے۔ وہ پھر بھی اڑی رہی۔

"تمہاری تصویر کھینچوں؟" وہ ہاتھ میں کیمرا اٹھا کر بولی تھی۔ مہرز نے ہلکے سے مسکرا کر شعر پڑھا۔

اس کی عادت وہی ہر بات ادھوری کرنا
اور پھر بات کا مفہوم بدلتے رہنا

اور پھر رامین کے ہاتھ سے کیمرا لے کر میز پر رکھ دیا۔ ایک تو ایسا حسب حال شعر' اوپر سے فرار کی کوئی راہ نہ پا کر رامین کا موڈ یکدم آف ہوگیا تھا۔ وہ نروٹھے انداز میں مہرز کو گھورتی ہوئی کرسی سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

جانے کس عمر میں جائے گی یہ عادت اس کی
روٹھنا خود سے تو اوروں سے الجھتے رہنا

مہرز کے شعر پڑھنے سے رامین حیران ہوتی دوبارہ سیدھی ہوکر بیٹھ گئی' کچھ دیر اسے یوں ہی تکتی رہی اور پھر ہنس پڑی۔ مہرز بھی کھل کے مسکرا رہا تھا۔

"کہاں سے یاد کیے یہ اشعار؟" اس کا موڈ بہت اچھا ہوگیا تھا۔

"سوچا کبھی تم ملیں تو سناؤں گا تمہیں۔"

"ریئلی۔"

"تمہیں شاعری سے دلچسپی ہے؟" اب وہ فنگر فش اٹھا کر اسے ساس میں ڈبو رہی تھی۔ "میں حیران ہوں تم GiKi میں مکینیکل انجینئرنگ کررہے تھے یا اردو ادب میں ایم اے۔"

مہرز نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ چونک کر وہیں خاموش ہوگیا۔ جہاں تک اسے یاد پڑتا تھا' ابھی تک اس نے رامین سے ایسا کوئی تذکرہ نہیں کیا تھا۔ اسکول کے بعد وہ کہاں رہا؟ کیا کیا؟ اس نے اپنے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔ پھر وہ کیسے جانتی تھی کہ مہرز نے Giki سے گریجویشن کیا ہے۔ وہ حیرانی سے رامین کو دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر اتنی حیرت دیکھ کر وہ بھی پوچھ بیٹھی۔

"کیا ہوا۔۔۔ تم Giki کے ففتھ بیچ میں ہی تھے نا۔"

"ہاں۔۔۔ لیکن تمہیں کیسے معلوم ہوا؟" اس کا سوال سن کر رامین اطمینان سے مسکرائی اور ٹشو پیپر سے اپنے ہاتھ صاف کرتے ہوئے بولی۔

"اس میں میرا کوئی کمال نہیں ہے۔ تم ہی اتنے پاپولر ہو کہ جب گوگل سرچ پر میں نے تمہارا نام ٹائپ کیا تو Giki کا پیج کھل گیا اور ففتھ بیچ میں تم مل گئے تھے۔"

وہ ہاتھ جھاڑتی اٹھ کھڑی ہوئی اور مہرز کے لیے یہ وضاحت ایک اور دھچکا ثابت ہوئی کہ رامین نے اسے تلاشنا چاہا تھا کیوں؟ اس کے ساتھ چلتے وہ مسلسل یہی سوچتا رہا۔"

☼ ☼ ☼

بس لاٹ میں شٹل کے انتظار میں دونوں بینچ پر بیٹھ گئے۔

دس' بیس۔۔۔ حتیٰ کہ تیس سیکنڈز بعد مہرز نے سر اٹھایا تو وہ اسی کو دیکھے جارہی تھی۔ ٹانگ پہ ٹانگ رکھ کر گھٹنے پر اپنی کہنی ٹکائے۔ ہاتھ کی اوک میں چہرے کو تھامے ہوئے' نہایت محویت سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

"تم ہمیشہ اسی طرح مسکراتے ہو۔ بالکل بھی نہیں بدلے۔۔۔ ابھی تک ویسے ہی ہو۔"

"اچھا؟ یعنی کیسا ہوں میں؟" مہرز نے دلچسپی سے پوچھا۔

"تم بہت اچھے ہو مہرز۔۔۔ بہت اچھے۔۔۔" اس کے سنجیدہ لہجے میں ملنے والے جواب پر وہ مسکرانا بھول کر حیرانی سے اسے دیکھنے لگا' مگر وہ کہتی رہی۔

"تمہارے لیے دوسروں کو معاف کردینا کتنا آسان ہے۔ ہر ایک کا گناہ بھول جاتے ہو اور اپنی ذرا سی کوتاہی بھی یاد رکھتے ہو۔" وہ اسے دیانت داری سے سراہ رہی تھی۔

"ورنہ جو کچھ میں نے تمہارے ساتھ کیا تھا' تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو میری شکل دیکھنا بھی پسند نہ کرتا۔۔۔ اور ایک تم ہو کہ سب کچھ بھلا کر اپنی دوستی نبھانے پہنچ جاتے ہو' تمہیں غصہ نہیں آتا مجھ پر۔۔۔"

"نہیں۔۔۔" وہ بس اتنا ہی کہہ سکا۔ یہ اس کی بے بسی کا اعتراف تھا۔ جس سے محبت کرتے ہیں اس کی ہر بری بات بھی اچھی لگنے لگتی ہے تو پھر ناراضی کیسی؟ لیکن رامین اسے مہرز کی فراخ دلی سمجھ رہی تھی۔

"اسکول ختم ہونے کے بعد۔۔۔ میں نے کئی بار تمہیں خواب میں دیکھا مہرز۔۔۔ لیکن۔۔۔ تم نے کبھی مجھ سے بات نہیں کی۔۔۔ کبھی بھی نہیں۔۔۔ تم ہمیشہ مجھے دور' دور ہی نظر آئے۔۔۔ تب مجھے احساس ہوا کہ ضرور تم مجھ سے خفا ہو۔۔۔ میں نے تمہارا دل دکھایا تھا نا؟"

"تم نے ایسا کچھ نہیں کیا تھا جس کے لیے تمہیں شرمندہ ہونا پڑے۔۔۔ غلطی میری تھی' مجھے تمہاری بک سنبھال کر رکھنی چاہیے تھی۔" وہ ہمیشہ کی طرح اسے ہر خلش سے آزاد کرنے کے لیے ایسی باتیں کررہا تھا اور کسی حد تک کامیاب بھی رہا تھا۔ رامین کے سر سے کچھ بوجھ تو ندامت کا سرک ہی گیا۔

اسی وقت بس آگئی اور دونوں اس میں سوار ہوگئے۔

واؤنا ہوٹل کے پاس شٹل نے انہیں اتار دیا۔ آہستہ آہستہ چلتے وہ دونوں لاجز کی طرف جارہے تھے۔ رامین کا پاؤں پہلے سے بہتر ہوگیا تھا کیونکہ وہ چلتی رہی تھی۔ اب اس نے مہرز کا ہاتھ نہیں پکڑا تھا۔ لیکن مہرز کو اس کی وجہ سے اپنی رفتار کم رکھنی پڑ رہی تھی۔ پھر آدھے گھنٹے بعد وہ کیبن تک پہنچ گئے۔ لاج کی سیڑھیاں ریلنگ کے سہارے چڑھتی جب وہ ڈیک پر پہنچی تو مہرز اس کے ساتھ چلتا ہوا گلاس ڈور تک آیا۔ اس کی توجہ رامین کے پیر کی جانب تھی جو بظاہر ٹھیک نظر آرہا تھا۔ تب ہی رامین کی آواز پر مہرز نے چونک کر سامنے دیکھا۔

"یہ کیا ہورہا ہے؟" اس کی آواز میں حیرت تھی اور حیرانی تو مہرز کو بھی ہوئی جب اس نے لاؤنج میں تمام لوگوں کے بیچ رضا کو لیلیٰ کے سامنے گھٹنے ٹیکے فرش پر بیٹھا دیکھا۔

☼ ☼ ☼

احسان تیرا ہوگا مجھ پر دل چاہتا ہے وہ کہنے دو
مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے' مجھے پلکوں کی چھاؤں میں رہنے دو

لیلیٰ کو تعجب ہوا تھا۔ تیز میوزک کی آواز گونج رہی تھی۔ وہ دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ لاؤنج میں رضا کے سب دوست کھڑے ہوئے تھے۔ سب لوگوں کے چہروں پر عجیب پُراسراری مسکراہٹ تھی۔ اس نے باری باری سب کی طرف دیکھا۔ پھر شیشے کے پار ڈیک پر موجود کرسیوں اور میز کو خالی دیکھ کر وہ کرسی کی جانب بڑھ گئی۔ اس نے اوپن کچن میں اپنا پہلا قدم رکھا ہی تھا

کہ میوزک بند ہوگیا۔ اس نے چونک کر پیچھے دیکھا تو سامنے رضا ہاتھوں میں ایک خوب صورت نازک سی کلی تھامے کھڑا تھا اور وہیں پس منظر میں اس کی اور رضا کی فیملی بھی کھڑی تھی۔ لیلیٰ نے الجھ کر، تھوڑا گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ میوزک بند ہوتے ہی یکدم چھا جانے والی خاموشی بے حد معنی خیز محسوس ہو رہی تھی۔ ہر کوئی چپ چاپ کھڑا ان ہی کی طرف متوجہ تھا اور پھر۔۔۔ رضا اس کے سامنے گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گیا۔

" Will you marry me "

لیلیٰ کا سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے ہی رہ گیا۔ کیسی فلمی صورت حال تھی۔ رامین اور مہریز بھی حیران تھے۔ وہاں تمام لوگ لیلیٰ کے جواب کے منتظر تھے اور لیلیٰ گونگوں کی طرح کھڑی تھی۔ رضا نے دوبارہ پوچھا۔ "لیلیٰ! مجھ سے شادی کرو گی؟"

لیلیٰ نے اپنے سامنے زمین پر گھٹنے ٹیکے رضا کو نظر بھر کر دیکھا۔

"لیلیٰ! جلدی جواب دو پلیز۔۔۔ میرے گھٹنے دکھنے لگے ہیں۔" رضا نے بڑی تکلیف دہ شکل بنا کر اسے کچھ بولنے پر اکسانا چاہا۔

لیلیٰ نے تابندہ کو اجازت طلب نظروں سے دیکھا تھا۔۔۔ تابندہ اور حیدر دونوں نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔۔۔ ان کے چہرے خوشی سے تمتما رہے تھے اور یہی حال رضا کے والدین کا بھی تھا۔ لیلیٰ نے ادھر سے سگنل ملتے ہی رضا کے ہاتھ سے پھول لے کر " Yes " کہہ دیا سب لوگ تالیاں بجا کر انہیں مبارک باد دینے لگے۔

رضا اٹھ کر کھڑا ہوا اور اپنے دوستوں کی ہوٹنگ سن کر عجیب سی شکل بناتے ہوئے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ رامین نے آگے بڑھ کر لیلیٰ کو گلے لگا لیا اور مہریز نے رضا سے ہاتھ ملا کر مبارک باد دی۔ پھر دونوں اپنے والدین کے سامنے جا کر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے باری باری دونوں کو لپٹا کر خوب پیار کیا۔ سب لوگ بہت خوش تھے اور اپنی خوشی کا کھل کر اظہار بھی کر رہے تھے۔ حتیٰ کہ فرقان جو ہمیشہ بن سے

لڑتا رہتا تھا۔ اس وقت خوشی سے چہلا نگیں لگا رہا تھا۔ یہاں آنے سے پہلے کسی کو اندازہ نہیں تھا کہ چار دن کا ٹرپ ایک سیلیبریشن پر اختتام پذیر ہوگا۔

☼ ☼ ☼

اس نے لاؤنج میں رکھے بڑے صوفے پر ٹیک لگا کر اپنے پاؤں بھی اوپر اٹھا لیے تھے۔ اپنی شال کو ٹخنوں تک ڈال کر رامین نے سکون بھری سانس لی اور مہریز کی طرف دیکھا، جو ٹی وی کا ریموٹ ہاتھ میں لیے نہایت انہماک سے خبریں سن رہا تھا۔

"ویسے میں نے فیس بک پر بھی ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی تمہیں۔۔۔ لیکن تم ملے ہی نہیں۔۔۔ کیا تم نے فیس بک جوائن نہیں کیا ہے؟"

"جوائن تو کیا ہے۔۔۔ لیکن مجھے صرف فرینڈز ہی ڈھونڈ سکتے ہیں۔ میری سیٹنگ ہی ایسی ہے۔" اس کی نظریں ٹی وی سے ہٹی نہیں تھیں۔

"اپنی سیٹنگ کرو۔ پھر ایڈ کرنا مجھے۔۔۔ ویسے تم میرا نام ٹائپ کر کے دیکھنا۔۔۔ میں مل جاؤں گی تمہیں۔" وہ تھوڑی دیر سیدھا لیٹ کر پھر سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ "آئی ایم شیور تم نے مجھے کبھی ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی ہوگی۔ تمہیں تو سرے سے یاد ہی نہیں ہوگا کہ اس دنیا میں رامین نام کی کوئی مخلوق بھی ہوا کرتی تھی۔۔۔ ہے نا۔" وہ خود سے تمام نتائج اخذ کر لینے کے بعد رسماً اپنی تائید چاہ رہی تھی۔

وہ گردن موڑ کر اسے دیکھنے لگا۔ اس لمحے مہریز نے کہنا چاہا کہ وہ اسے کبھی بھول ہی نہیں پایا تو یاد کرنے یا رکھنے کا کیا سوال؟ جو لڑکی اس کے خوابوں میں رہتی تھی۔ جس کی ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز کو اس نے بہت سنبھال سنبھال کر رکھا تھا۔ اس سے اپنی عقیدت کا اظہار وہ ایک جملے میں تو نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے وہ کہہ پایا تو بس یہی۔

"تم اتنا نیگیٹو کیوں سوچتی ہو؟"

"کیونکہ میں حقیقت پسند ہوں۔" جھٹ سے جواب آیا۔ "مجھے اپنے حوالے سے کوئی خوش فہمی

نہیں ہے۔"

آخری فقرہ کہتے ہوئے جانے کیوں اس کا لہجہ سخت اور کھردرا سا ہو گیا۔ مہرز نے اس کا تلخ لہجہ محسوس کرنے کے باوجود جان بوجھ کر نظرانداز کر دیا۔ "فرقان کہاں چلا گیا؟"

"زندگی ہمیشہ ہمیں سرپرائز کرتی رہتی ہے۔ ہمیں معلوم نہیں ہوتا کہ ہمارے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ جیسا میرے ساتھ ہوا۔"

لیلیٰ اور رامین کیبن کے پچھلے حصے میں بیٹھ کر باتیں کر رہی تھیں۔ تابندہ، حیدر اور انکل، آنٹی سونے جا چکے تھے۔ اپنے جذبات رامین پر عیاں کرنے کے بعد وہ دلی طور پر اس سے اور قریب ہو گئی تھی۔ دوپہر میں کیا ہوا تھا۔ وہ پوری تفصیل اسے سنانے لگی۔

"اس لمحہ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں نے اپنا وجود مٹی میں رول دیا ہے۔ نادانستگی میں خود کو کافی ڈی گریڈ کر لیا ہے میں نے... اب وہ کبھی میری عزت نہیں کرے گا۔ میں کبھی اس سے نظریں ملا نہیں سکوں گی اور دیکھیں کیا ہوا۔" لیلیٰ کے چہرے پر تسکین بھری مسکراہٹ ابھری۔ پل بھر میں اس کا چہرہ روشن ہو گیا۔

"اس نے ساری دنیا کے سامنے میری محبت کے آگے گھٹنے ٹیک دیے۔ مجھ سے مجھ ہی کو مانگ کر کیسے میری ذات پر میرا یقین پھر سے قائم کر دیا، مجھے کیسے معتبر کر دیا۔ میں نے کبھی خواب میں بھی تصور نہیں کیا تھا کہ رضا مجھ سے یوں اظہار محبت کرے گا۔"

"تم بہت خوش قسمت ہو۔" رامین کو اس پر رشک آنے لگا۔ "رضا تمہیں بہت چاہتا ہے۔"

"ہاں..." لیلیٰ کی آنکھوں میں قندیلیں جگمگا رہی تھیں۔ اس نے ایک نظر رامین کی طرف دیکھا اور کہا۔ "ویسے خوش قسمت تو تم بھی بہت ہو۔"

"کس لحاظ سے؟"

"جس لحاظ سے میں خوش قسمت ہوں۔"

ان دونوں کے سامنے درختوں کے تاریک جھنڈ سے اوپر بارہویں کا نامکمل چاند بہت صاف اور روشن نظر آ رہا تھا۔ لیکن رامین کو جانے کیوں وہ زرد سا دکھائی دیا۔ "شاید میری بینائی کا قصور ہے۔" اس نے سوچا۔ پھر ایک گہری سانس لے کر لیلیٰ کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

"تم میرا موازنہ اپنے ساتھ مت کیا کرو۔ نہ تو میں خوش قسمت ہوں اور نہ ہی اپنی قسمت سے خوش ہوں۔ مجھے تمہاری طرح ٹوکرے بھر کے محبت نہیں ملی ہے۔ دنیا میں ایسا کوئی نہیں ہے جو مجھ سے محبت کرتا ہو۔" اس کی آواز میں نہ دکھ تھا، نہ مایوسی... بے تاثر لہجہ میں سپاٹ انداز سے کہا گیا جملہ فوری طور پر لیلیٰ کا خیال تبدیل نہیں کر سکا تھا۔ وہ اپنے موقف پر قائم رہی۔

"ہر انسان کے لیے اللہ تعالیٰ نے دنیا میں کم از کم ایک ایسا شخص ضرور پیدا کیا ہے جو اس سے بے حد محبت کرتا ہے۔ اس کی تمام برائیوں، بدصورتیوں اور خامیوں کے باوجود... وہ اس سے پیار کرتا ہے، اس کی چاہت رکھتا ہے اور اپنی بے لوث محبت سے وہ کبھی دستبردار نہیں ہوتا۔"

رامین نے دھیرے سے گردن موڑ کر لیلیٰ کو دیکھا جو انتہائی ٹھوس لہجے میں اس کی تردید کر رہی تھی۔

"اللہ نے تمہارے حصے کی محبت اکٹھی دینے کا پلان بنایا ہو گا۔ اس لیے تمہیں فی الحال اپنی زندگی محبت سے خالی لگ رہی ہے۔ جب وہ ایک شخص تمہیں مل جائے گا۔ جسے اللہ نے صرف تمہیں چاہنے کے لیے پیدا کیا ہے۔ پھر تمہارے تمام شکوہ شکایت دم توڑ دیں گے۔"

"اللہ نے ایک ایسا شخص بھیجا تھا۔ مگر پھر وہ بھی مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔" رامین کی آواز میں آنسوؤں کی نمی گھلنے لگی۔

لیلیٰ نے مڑ کر اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے نرمی سے دبایا۔ "نہیں رامین... جو تمہیں چھوڑ کر چلا گیا۔ وہ تمہارا تھا ہی نہیں۔ اسے تم سے کبھی بھی محبت نہیں تھی۔ جو ہم سے محبت کرتا ہے نا اسے ہم لاکھ دھتکاریں۔ تب بھی وہ ہمیں تنہا نہیں چھوڑتا۔"

رامین بے اختیار رو پڑی تھی۔ لیلیٰ نے اسے گلے لگا لیا۔ روتے روتے رامین نے کہا تھا۔ "میں دعا کرتی ہوں تم رضا کے ساتھ ہمیشہ خوش رہو۔"

"اور میری دعا ہے، اللہ محبت پر تمہارا یقین قائم کر دے، ایسا کہ متزلزل نہ ہو۔"

☆ ☆ ☆

آج صبح دس بجے اس کی نہایت اہم میٹنگ تھی۔ ایک کورین کمپنی ان کے اسٹور میں اپنی الیکٹرونکل پروڈکٹس رکھوانا چاہتی تھی۔ یہ میٹنگ مہرز نے کل رات فون پر کنفرم کی تھی یوسیمیٹی میں... اور پھر وہ رات میں ہی وہاں سے روانہ ہو گیا تھا۔ خوش قسمتی سے اسے فلائٹ بھی مل گئی تھی۔ جس کی وجہ سے پوری رات خراب ہونے سے بچ گئی اور اسے آرام کرنے کا وقت بھی مل گیا تھا۔ پارکنگ لاٹ میں اپنی کار پارک کرنے کے بعد اس نے ایک بار پھر گھڑی کو دیکھ کر اطمینان کیا۔ وہ بالکل ٹھیک وقت پر یہاں پہنچا تھا۔ لیکن کورین کمپنی کا ڈیلیگیشن اس سے پہلے یہاں پہنچ چکا تھا۔ اسی لمحے جب وہ کار کا دروازہ بند کر رہا تھا، اسے اپنے مینیجر کا میسج موصول ہوا اور اس کے قدموں کی رفتار خود بخود تیز ہو گئی۔ اپنے آفس کی طرف جاتے ہوئے اس کا فون دوبارہ رنگ دینے لگا۔ اس نے نمبر دیکھے بغیر کال ریسیو کی اور لفٹ میں سوار ہو گیا۔

"مہرز... کہاں ہو تم..." دعا سلام کیے بغیر رامین نے استفسار کیا اور وہ اس کی آواز سنتے ہی مسکرانے لگا۔

"رامین؟" مہرز بے یقینی... حیرت اور خوشی... بیک وقت ان تینوں کیفیات کا شکار ہوا تھا۔

"ہاں میں رامین بات کر رہی ہوں... کہاں ہو تم؟" اس نے کہاں، کو لمبا کھینچ کر ادا کیا تھا جس سے صاف ظاہر ہوا کہ وہ بے چینی سے اس کی منتظر ہے اور اس سے پہلے کہ مہرز جواب دیتا، وہ پھر سے بول اٹھی۔

"خیر جہاں بھی ہو، فوراً لاج میں آ جاؤ میں نے اتنا زبردست ناشتہ بنایا ہے تمہارے لیے۔" لفٹ تیسری منزل پر پہنچ کر رک گئی اور مہرز نے اس کی بات ختم ہوتے ہی کہا۔

"میں نہیں آ سکتا رامین! میں یہاں اپنے کام پر واپس آ گیا ہوں اور..."

"تم واپس چلے گئے ہو؟" رامین کی آواز یک دم دھیمی ہو گئی۔ سارا جوش و خروش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

"کچھ کہے بغیر؟ مجھ سے ملے بغیر... بتائے بغیر... تم واپس چلے گئے؟" رامین کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

"مجھے بہت ضروری کام تھا رامین... میں رک نہیں سکتا تھا۔" مہرز اپنے آفس کی طرف بڑھنے لگا۔

"تو نہ رکتے۔" وہ غصے میں آ گئی۔ "کم از کم بتا تو سکتے تھے، کچھ کہہ کر تو جا سکتے تھے۔ میں یہاں بیوقوفوں کی طرح انتظار کر رہی ہوں۔ ڈھونڈ رہی ہوں تمہیں۔"

وہ سخت ناراض ہو گئی تھی۔ مہرز کے پاس وضاحت دینے کا وقت بالکل نہیں تھا۔ اپنے آفس کا دروازہ کھولنے سے پہلے اس نے رامین سے کہا۔

"رامین! میں اس وقت تم سے بات نہیں کر سکتا۔"

"تو مت کرو بات... مجھے بھی کوئی شوق نہیں ہے تم سے بات کرنے کا۔" رامین نے اس کا جملہ پورا نہیں ہونے دیا اور غصے میں فون بند کر دیا تھا۔ مہرز نے ایک گہری سانس لے کر اپنے فون کی جانب دیکھا اور اسے آف کر کے جیب میں واپس رکھتے ہوئے اپنے آفس میں داخل ہو گیا۔ جہاں کورین ڈیلیگیشن اس کی آمد کا منتظر تھا۔

میٹنگ ڈیڑھ گھنٹہ جاری رہی، اس کے بعد مہمانوں نے اس کے اسٹور کا جائزہ لیا اور اس کا مزید ایک گھنٹہ ان ہی کے ساتھ گزرا تھا۔ دوپہر کے ڈیڑھ بجے واپس اپنے آفس میں آ کر بیٹھتے ہوئے اس کے ذہن سے ہر چیز محو ہو گئی تھی۔ اپنا کام، آرڈرز، سیلز، پرچیزنگ حتیٰ کہ چند گھنٹوں پہلے میٹنگ میں کن شرائط پر ڈیل کی گئی تھی۔ اسے یہ بھی یاد نہیں رہا تھا۔ رامین کی آواز اس کے ذہن و دل کو جکڑے ہوئے... بار بار وہ شکوے دہرا رہی تھی۔ اسے کام کر کے تھکن محسوس

نہیں ہوتی تھی۔ کبھی بھی نہیں۔۔۔ لیکن آج وہ محض آدھے دن کے بعد ہی خود کو نڈھال محسوس کرنے لگا تھا۔

رامین کی ناراضی بالکل بجا تھی۔ مہرز کچھ کہے بغیر اسے ملے بغیر ہی واپس آگیا تھا۔ اس اچانک واپسی کی وجہ بظاہر وہ میٹنگ تھی' لیکن یہ جھوٹ وہ دنیا کے سامنے تو پیش کرسکتا تھا۔ خود اپنے روبرو وہ ایک تلخ حقیقت کے ساتھ پیش ہوا تھا۔ آج بھی رامین کو۔۔۔ کسی اور کے ساتھ دیکھنا اسے کسی اور کی ملکیت تصور کرنا۔۔۔ اس کے لیے قابل قبول نہیں ہے۔ ہرگز نہیں ہے۔

اگلا تمام دن۔۔۔ روٹھی ہوئی' خفگی سے منہ پھیرے ایک لڑکی سے نظر ہٹا نہیں پایا تھا' جو اس کے دل میں رہ رہی تھی۔ یوں ہی اپنے مینجر کی بات سنتے ہوئے وہ رامین کو منانے کے لیے ذہن میں جملے ترتیب دینے لگ جاتا اور سامنے کھڑا مینجر دیواروں کو ساری تفصیلات سے آگاہ کرتا رہتا' جو مہرز سے زیادہ غور سے اس کی بات سن رہی تھیں۔ وہ پورا دن اسی آنکھ مچولی میں گزرا تھا۔ جب مہرز کے دل نے دماغ کو کام نہیں کرنے دیا تھا۔

رات کو اسے ڈنر پر جانا تھا۔ اپنے اسٹور سے نکل کر باہر پارکنگ میں اپنی کار تک جاتے ہوئے اس نے رامین کو فون ملایا اور پھر کنیکٹ ہونے سے پہلے ہی کاٹ دیا۔ اس نے سوچا رات کو واپس آکر وہ اس سے اطمینان سے بات کرے گا۔ دو' تین گھنٹوں کی تو بات تھی۔ کار کو ریسٹورنٹ کے رستے پر ڈال دیا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ واپسی پر بھی وہ رامین کو کال نہیں کرپائے گا۔

ڈنر کرنے کے بعد جب وہ ریسٹورنٹ سے باہر آیا تو اسے ایک کال موصول ہوئی تھی' جس نے یک دم اس کا موڈ خوشگوار کردیا تھا۔ نیویارک سے آنے والی کال نے اس کے آئندہ چار دنوں کا شیڈول مرتب کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ جیری کو آنے والے ویک اینڈ کے لیے ہدایات دیتے ہوئے وہ بے حد پرجوش تھا۔

مہرز بہت خوش تھا اور خوش کیوں نہ ہوتا' ایک بہت اہم شخص اس ویک اینڈ اس کے پاس آنے والا تھا۔

☼ ☼ ☼

مہرز نہایت سنجیدگی سے نظریں سڑک پر جمائے خاموشی سے ڈرائیو کررہا تھا۔ ایرپورٹ پر اس کا موڈ بہت خوشگوار تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے بغلگیر ہوئے تو بے اختیار حسن کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ سچی خوشی آنکھیں نم کردیا کرتی ہے۔

"کیسا ہے یار؟" اپنے بچپن کے دوست سے برسوں بعد ملاقات ہورہی تھی۔ حال چال پوچھتے مہرز نے اس کے کندھے پر اپنا بازو پھیلا کر ساتھ چلنا شروع کردیا۔ حسن ٹرالی دھکیلتے ہوئے ایرپورٹ سے باہر نکل آیا۔ مہرز اسے وہیں رک کر انتظار کرنے کا کہہ کر اپنی کار لانے پارکنگ کی طرف روانہ ہوا۔

"واؤ۔۔۔" اپنے سامنے بلیک اسپورٹس کار کو رکتے اور اس میں سے مہرز کو برآمد ہوتا دیکھ کر حسن بے اختیار کہہ اٹھا۔ "زبردست گاڑی ہے یار۔" مہرز نے اس کا چھوٹا سا سوٹ کیس اٹھا کر پچھلی سیٹ پر رکھ دیا اور حسن ستائشی انداز میں گاڑی پر ہاتھ پھیر کر اپنی پسندیدگی کا اظہار کرتا رہا۔

"چلو بیٹھو بھی۔" مہرز نے حسن سے کہا اور خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ پھر کار اسٹارٹ کرکے سڑک پر لے آیا۔

اب تک پیش آنے والے اہم واقعات میں حسن کی شادی اور ایک بیٹے کی پیدائش کی تفصیل سنتے ہوئے وہ خوش دلی سے مسکراتا رہا تھا۔ موڈ تو اس وقت خراب ہوا' جب حسن نے یہ بتایا کہ وہ مہرز کے گھر قیام نہیں کرسکتا۔

حسن جس ملٹی نیشنل کمپنی سے منسلک تھا۔ اس نے یہاں سے کچھ مشینری خریدی تھی۔ جسے آپریٹ کرنے کی ٹریننگ لینے کی غرض سے اپنے انجینئرز اور کچھ ورکرز کو کیلی فورنیا بھجوایا تھا۔ اس لیے رہائش کا انتظام بھی کمپنی کی طرف سے تھا۔ جس پر مہرز سخت

مایوسی کا شکار ہوا' لیکن اس نے کہا کچھ نہیں۔ حسن کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنا اس کی خواہش تھی۔ بنا کچھ کہے ناراضی کا اظہار۔۔۔ مہرز کی یہ عادت اس کے لیے نئی نہیں تھی۔ اس کی بات سن کر جس طرح وہ چپ سا ہوگیا تھا۔ حسن کو وجہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی۔

"یار اب ناراض مت ہو۔۔۔ بالکل بھی اچھا نہیں لگ رہا ایسی شکل بنا کر۔"

مہرز نے گردن موڑ کر ایک جتاتی نظر اس کے چہرے پر ڈالی اور دوبارہ سامنے دیکھنے لگا۔ حسن ہنس پڑا۔ "ایمان سے یار۔۔۔ جب ہنیہ خفا ہوتی ہے نا۔۔۔ تو بالکل ایسے ہی دیکھتی ہے مجھے۔۔۔ یوں خفا ہوکر تو بالکل بیوی لگ رہا ہے میری۔"

حسن نے انتہائی لاڈ سے مہرز کا گال نوچا تو مہرز نے کندھا جھٹک کر اپنے ہاتھ سے اس کا ہاتھ پرے کیا۔

"میں تمہارا دوست ہوں۔ مجھ سے یوں محبت کے اظہار نہ کرو۔" مہرز اسٹیئرنگ پر ہاتھ جمائے نہایت احتیاط سے کار ڈرائیو کررہا تھا۔ پھر بھی ہر تھوڑی دیر میں وہ ایک اچٹتی سی نگاہ اس پر ڈال کر اپنے خیالات کا اظہار بھی کردیتا۔ باتوں میں وقت اور راستہ طے ہونے کا اندازہ نہیں ہوا اور گھر آگیا۔ مہرز نے سرسبز لان کے بیچوں بیچ ڈرائیو وے پر گاڑی کھڑی کی۔ حسن نے باہر نکلتے ہوئے ایک اور احسان جتانا ضروری سمجھا۔

"ایک تو میں اپنے گروپ سے ایک دن پہلے تمہارے پاس یہاں آگیا ہوں' کیونکہ مجھے تمہاری یاد نے اس قدر بے چین کردیا تھا کہ میں انتظار نہیں کرسکا اور دوسرا۔۔۔ میں آج کی رات تمہارے گھر ہی ٹھہروں گا' کل سے اپنے گروپ ممبرز کو جوائن کرنا ہے میں نے۔"

"بڑی مہربانی ہے آپ کی۔" مہرز نے طنزیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا اور اس کا سوٹ کیس ہاتھ میں لے کر کار لاک کردی۔ "اب یہ بھی بتاؤ کہ اس ڈیڑھ دن میں تمہیں کس طرح وہ ساری جگہیں دکھاؤں۔۔۔ جو میں دکھانا چاہتا ہوں؟ کیا کیا پلانز سوچ رکھے تھے میں نے۔۔۔ سب ستیاناس ہوگیا۔"

"ویسے یہ سن گلاسز بہت سوٹ کررہے ہیں تم پہ۔" حسن نے بھی حسب عادت بات کو کہیں اور موڑ دیا۔ مہرز نے گہری سانس کھینچ کر اندر لی اور اپنے سن گلاسز اتار کر اسے پکڑا کر بولا۔

"تو۔۔۔ تم لے لو۔" اور سوٹ کیس اٹھا کر داخلی دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ حسن اس کے پیچھے چل پڑا۔

"کیا لڑاکا عورتوں والے انداز اپنا لیے ہیں۔۔۔ اچھا بات تو سن!" اس نے تیزی سے آگے بڑھ کر مہرز کا رستہ روکا۔

"دیکھو۔۔۔ یہ دو ہفتے شیڈول ذرا ٹائٹ ہے۔ اس کے بعد تمہارے پاس آجاؤں گا۔۔۔ پرامس۔"

مہرز کچھ کہے بنا اسے گھورتا رہا۔ حسن اس کے جواب کا منتظر پوری آنکھیں کھولے' عجیب و غریب ایکسپریشن دے رہا تھا۔ مہرز زیادہ دیر سنجیدہ نہیں رہ پایا اور مسکرانے لگا تو حسن کی جان میں جان آئی۔

☼ ☼ ☼

چھ سال پہلے آج ہی کے دن وہ صبح ہی صبح اٹھ بیٹھی تھی۔ اپنے نکاح پر پہننے کے لیے خریدے گئے جوڑے کو اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہوکر کتنی بار خود سے لگا کر ہر زاویے سے گھوم کر دیکھا تھا۔ وہ زیور' چوڑیاں' جوتے۔۔۔ ان تمام چیزوں کو اس نے ہاتھوں میں لے کر بے ساختہ چوما تھا۔ وہ اس قدر خوش تھی۔

لیکن چھ سال بعد طلوع ہونے والا سورج اسے عجیب سے دکھ میں مبتلا کررہا تھا۔ حسب عادت فجر کی نماز کے بعد چہل قدمی کے لیے وہ لان میں آگئی۔ طبیعت بھاری تھی۔ دل پر یادوں کا بوجھ بڑھتا جارہا تھا۔ وہ زیادہ دیر تک چل پھر نہیں سکی تھی اور تھک کر گھاس پر بیٹھ گئی تھی۔

حرا نیلوفر کی فیڈر بنانے کچن میں آئی تو باہر لان میں گھاس پر بیٹھی رامین کو دیکھا۔ وہ سر جھکائے سرسبز

گھاس کے باریک تنکوں کو ہاتھ میں نرمی سے — پکڑ کر کھینچ رہی تھی۔ اس کا چہرہ اسی پرانی والی رامین کا چہرہ لگ رہا تھا۔ جس کے لب خاموش اور آنکھیں ماتم کرتی نظر آتی تھیں۔ وہ پریشان ہے۔ حرا یہ سوچ کر اپنے آپ کو روک نہ سکی اور فوراً اس کے پاس پہنچ گئی تھی۔ عین اس کے سامنے ہی وہ بھی گھاس پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی لیکن رامین نے اتنی ہلچل کے باوجود اس کی آمد کو محسوس نہیں کیا تھا۔

حرا نے اس کی انگلیوں کی جانب دیکھا جو مسلسل حرکت میں تھیں۔ وہ سبز گھاس کے سروں پر چند زرد سوکھے تنکوں کو چن چن کر اکھیڑ رہی تھی۔

"کیا کر رہی ہو؟" حرا نے پوچھا تو رامین نے یوں چونک کر اسے دیکھا کہ اسے یقین ہو گیا۔ وہ اب تک واقعی اس کی آمد سے بے خبر ہی تھی۔ وہ خاموش ٹکر ٹکر حرا کو دیکھنے لگی۔ حرا نے دوبارہ سوال کیا اور زیادہ نرم لہجے میں کہا۔

"میں نے پوچھا... کیا کر رہی ہو رامین؟"

"ہوں؟" وہ تنکے نوچنا چھوڑ کر سوچنے لگی کہ کیا جواب دے... وہ تو اپنے نکاح میں شامل مہمانوں کی صورتیں یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ کیا سوچ رہی تھی کیا یاد کر رہی تھی، حرا کی دلچسپی کا اس میں کوئی سامان نہ تھا۔ ہوتا بھی تو وہ یہ سب باتیں اس سے کہنا نہیں چاہتی تھی۔ کافی دیر سوچنے کے بعد اس نے کہا۔

"یہ آپ دیکھیں... سبز گھاس کے تنکے سوکھ کر زرد ہو رہے ہیں... میں انہیں اکھاڑ رہی ہوں... بدنما لگتے ہیں نا۔"

حرا نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ مبہم سا مسکرائی، پھر کہا... "کچھ دن گھاس کو ٹھیک طرح سے پانی نہیں دیا نا۔ اس لیے سوکھ گئی ہے کچھ جگہوں سے... تمہیں انہیں اکھاڑنے کے بجائے وقت گزرنے کا انتظار کرنا چاہیے۔ دیکھنا! چند ماہ میں مناسب دیکھ بھال سے یہ شگوفے بڑھ جائیں گے تو زرد سوکھے تنکے اپنے آپ جھڑ جائیں گے۔"

"لیکن... پورا لان ان کی وجہ سے بدصورت لگ رہا ہے۔" اس نے گھاس میں انگلیاں ڈبو دیں۔

"نہیں رامین... دور سے دیکھنے پر تو یہ بالکل نظر نہیں آ رہے۔ تمہیں اس لیے دکھائی دے رہے ہیں۔ کیونکہ تم سرسبز گھاس کو چھوڑ کر صرف اور صرف ان زرد سوکھے تنکوں پر غور کر رہی ہو۔ ان پر توجہ مت دو... گھاس کو پانی دو اور بس وقت گزرنے کا انتظار کرو... چند ہفتوں بعد تم دیکھو گی تو یہ بدنما حصے تمہیں کہیں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملیں گے۔"

جانے حرا کی بات کا رامین پر کیا اثر ہوا تھا، وہ گھاس سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھنے لگی۔ حرا نے اپنی بات جاری رکھی۔

"دیکھو رامین... زندگی کی مثال بھی اسی طرح ہے... ہم گزر جانے والے برے وقت کی تکلیف دہ یادوں پر بار بار توجہ دے کر زندگی کو بدصورت سمجھنے لگتے ہیں۔ حالانکہ وہ ہماری زندگی کا فقط ایک حصہ ہوتے ہیں، پوری زندگی نہیں اپنے زخموں کو بھرنے کا وقت دو... انہیں بار بار کھرچو مت... جو بھی ہوا، تم اسے بدل سکتی ہو، نہ ہی اپنی زندگی سے نکال سکتی ہو۔"

"مگر میں بھولنا چاہتی ہوں... میں اتنی کوشش کرتی ہوں آج میں جینے کی... پر وہ یادیں میرا پیچھا ہی نہیں چھوڑتیں میں کیا کروں۔" وہ اب حرا کے سامنے کھل کر بولنا شروع ہوئی تو حرا نے اسے کہنے دیا۔

"میں خوش ہونا چاہتی ہوں... پر یادیں میرا پیچھا نہیں چھوڑتیں... مجھے خوش نہیں ہونے دے رہیں... میں کیا کروں؟ میں چاہتی ہوں میرے ساتھ کچھ ایسا ہو جائے کہ میں سب کچھ بھول جاؤں۔ میں نے سوچا تھا ماما کے مرنے کے بعد..." اس کے گلے میں اٹکتے آنسوؤں کے گولے نے اس کی آواز بھاری کر دی، ایک گہری سانس لے کر اس نے اپنے آنسو اندر اتار لیے۔ "سوچا تھا ماما کے مرنے کے بعد میری زندگی بدل جائے گی۔ بھائی سے مل کر... یہاں آ کر میں سب کچھ بھول جاؤں گی... لیکن ایسا نہیں ہوا۔

میرا ذہن ہر گزری بات کو دن میں سو سو بار دہراتا ہے... کیوں؟" اس نے زچ ہو کر اپنے بال مٹھی میں جکڑ لیے۔ "ہمارے دماغ میں کوئی ڈیلیٹ بٹن کیوں نہیں ہوتا بھابھی۔"

"ہوتا ہے رامین..."

"میرے پاس تو نہیں ہے۔" اس نے بے بسی سے کہتے ہوئے سر جھکا لیا۔

"ہے... بس تم اسے دیکھ نہیں پا رہیں۔"

حرا اسے محبت سے، دلار سے سمجھاتی رہی۔ دلاسے دیتی رہی، اس کے پرخلوص رویے کا خاطر خواہ اثر ہوا تھا اس پر اور اس نے تہیہ کر لیا۔ وہ آج کا پورا دن ہنس کر خوش رہ کر گزارے گی۔ آج کے اہم دن کو ایک نیا حوالہ دے گی۔ ایک نیا کام کرے گی جو اس نے پہلے نہ کیا ہو اور پھر... ہر آنے والے سال میں اس دن کو اسی حوالے سے یاد کرے گی۔

اپنی اسی حکمت عملی پر عمل کرتی وہ آج بالکل اکیلی ڈزنی لینڈ کا وزٹ کرنے آئی تھی۔

وہاں مہرز کو دیکھ کر اسے پہلے حیرت ہوئی، پھر شدید غصہ آیا تھا۔ اگر وہ خفا ہوئی تھی۔ کم از کم مہرز کو منانے کی کوشش تو کرنی چاہیے تھی۔ لیکن اس نے فون کیا نہ ہی کسی قسم کی وضاحت دی تھی۔ یوں اتفاقاً سامنا ہو جانے پر بھی مہرز کا رویہ سرد مہری لیے ہوئے تھا۔ مگر اس کے ساتھ جو شخص موجود تھا۔ وہ اسے دیکھتے ہی اس کے پاس آیا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ شخص دوبارہ دوڑتے ہوئے اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"رامین عبید۔" ایک اجنبی مرد کے منہ سے اپنا نام سن کر حیرت زدہ کھڑی تھی۔

"السلام علیکم رامین عبید! کیسے خیریت سے ہیں آپ؟" حسن، بے تکلفی کی انتہا پر پہنچا ہوا تھا۔

"آئم سوری، مگر میں آپ کو پہچان نہیں پا رہی ہوں... کیا آپ اپنا تعارف کروائیں گے۔" اس کا لہجہ محتاط تھا۔

"اتنی آسانی سے نہیں... جناب آپ کچھ محنت وغیرہ کریں، دماغ پر زور ڈالیں۔ اچھا ایسا کرتے ہیں آپ کو مہلت دیتے ہیں۔ اگر اس آخری شوکیس کے پاس پہنچنے تک آپ کو یاد آ گیا کہ میں کون ہوں؟ تو آپ جیت گئیں... ورنہ دوسری صورت میں آپ کو آئس کریم کھلانی پڑے گی۔"

"ایکسکیوز می..." رامین نے آنکھیں سکیڑ کر حسن کو بےزاری سے دیکھا۔ "مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے اس قسم کی شرطوں میں۔ آپ اپنے دوست کے ساتھ اپنی سیر مکمل کریں اور گھر جائیں۔" اتنا کہہ کر وہ تیز قدموں سے سیڑھیاں اترنے لگی اور پھر مینار سے باہر نکل گئی۔

"لو جی... یہ تو ناراض ہو گئیں۔" حسن کا منہ لٹک گیا۔ اس کی شکل دیکھ کر مہرز کو ہنسی آ گئی تھی۔

"سنیے... یہ میرا پاسپورٹ ہے۔ آپ چاہیں تو چیک کر سکتی ہیں... میرا نام حسن چوہدری ہے... میں آپ کے ساتھ اسکول میں تھا۔ مجھے معاف کر دیں۔ مجھ سے غلطی ہو گئی۔ میں نے داڑھی رکھ لی۔ یونیفارم بھی نہیں پہنا اور آپ سے پہچاننے کا مطالبہ کر دیا۔ آئس کریم بھی مانگ لی... آئندہ ایسے نہیں کروں گا... آپ..."

"حسن تم..." وہ جو اسے جھاڑنے کا پکا ارادہ کر چکی تھی۔ کھلکھلا کر ہنستے ہوئے اسے ٹوک دیا۔ "پہلے نہیں بتا سکتے تھے اسٹوپڈ!"

"کیسی ہو؟" حسن اس کا خوشگوار موڈ دیکھ کر دوبارہ حال چال پوچھنے لگا۔

"میں ٹھیک ہوں اور تم... یہاں... کب آئے۔" مہرز نے تو ذکر ہی نہیں کیا تھا کہ تم سے کوئی رابطہ بھی ہے اس کا۔" حسن اور رامین نے بیک وقت مہرز کی جانب دیکھا جو چند قدم کے فاصلے پر کھڑا ان کی گفتگو سینے پر ہاتھ باندھے سن رہا تھا۔ توجہ پا کر چلتا ہوا نزدیک آ گیا۔

"ویسے اب تو میں تمہیں ضرور آئس کریم کھلاؤں گی۔" رامین اپنے پرس سے پیسے نکالتے ہوئے بولی تھی۔ "لیکن لے کر تم آؤ گے... پے میں کروں گی۔ منظور..." رامین نے چند ڈالرز حسن کی طرف

بڑھائے تو وہ بدک کر پیچھے ہٹا۔ "مجھے تو معاف ہی رکھو۔"

"ارے۔۔۔ لاؤ نا۔۔۔ بھائی نہیں ہو؟" رامین کی ریکونسٹ بے اثر رہی۔۔۔ حسن نے مہرز کو پکڑ کر آگے کردیا۔

"بالکل نہیں۔۔۔ میں نہیں جاؤں گا۔۔۔ تم ایسا کرو مہرز کو بھائی بنالو۔" اس سے پہلے کہ رامین کچھ کہتی' مہرز نے حسن کو ڈانٹ دیا۔۔۔ "شٹ اپ۔"

اس کا موڈ بگڑتا دیکھ کر حسن نے بات سنبھالنے کی غرض سے فوراً" ہی رامین کے ہاتھ سے پیسے لے لیے۔ "اچھا لاؤ دو۔۔۔ میں لے کر آتا ہوں۔۔۔ مہرز! تم کون سا فلیور لوگے؟"

"کافی لے آنا مہرز کے لیے۔" اس کے بجائے رامین نے جواب دیا تھا۔ حسن نے رامین کی پسند پوچھی تو مہرز نے کہا۔

"چاکلیٹ فلیور اور الگ سے کپ میں روسٹڈ آلمنڈز لے کر آنا۔" رامین چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ اچھے بچوں کی طرح سرہلاتا حسن آرڈر لے کر وہاں سے روانہ ہوگیا۔

یوں اچانک ملاقات سے رامین کا موڈ ہشاش بشاش ہوگیا تھا۔ مسکراتے ہوئے اس نے پلٹ کر مہرز کو دیکھا' جو نہایت سنجیدہ صورت بنائے دونوں ہاتھ جیبوں میں ڈال کر کھڑا اپنے جوتے دیکھ رہا تھا جس کی نوک زمین پر آڑی سیدھی لکیریں کھینچ رہی تھی۔ رامین کے مسکراتے لب سکڑنے لگے۔ آہستہ آہستہ چلتی وہ اس کے نزدیک آکھڑی ہوئی۔

"میری شکل کیا اتنی بری ہے کہ نظر اٹھا کر دیکھنا بھی نہیں چاہتے؟"

مہرز سنبھل کر سیدھا کھڑا ہوا۔ ایک گہری سانس لے کر رامین کے ناراض چہرے پر بھرپور نگاہ ڈالی اور کہا۔ "السلام علیکم"

"وعلیکم السلام۔۔۔ ویسے خدا حافظ کہنا بھی اتنا ہی آسان ہوتا ہے۔" رامین نے جواب دینے میں دیر نہیں لگائی اور نہ ہی جتانے میں تاخیر سے کام لیا۔ مہرز اسے دیکھ کر رہ گیا۔ اس کی خاموشی نے رامین کو مزید تپا دیا۔

"مجھے تم سے یہ توقع ہرگز نہیں تھی۔ بہت ہرٹ کیا ہے تمہاری اس حرکت نے مجھے۔" اس کی آواز میں گہرا دکھ جاگزیں تھا۔

"آئم سوری۔۔۔" مہرز وہ کہہ گیا جو اس نے نہ کہنے کا ارادہ کیا تھا مگر اس میں کون سی نئی بات تھی۔ رامین یوں ہی اسے بے اختیار کردیا کرتی تھی۔ "مجھے تم سے مل کر واپس آنا چاہیے تھا۔ میں اپنی غلطی تسلیم کرتا ہوں۔"

"یہ تو تم اس لیے کہہ رہے ہو کہ آج اتفاق سے میں تمہارے سامنے آئی ہوں۔ ورنہ اتنے دن گزرنے کے باوجود تمہیں خیال نہیں آیا تھا کہ تمہیں اپنے اس عمل کی وضاحت کرنی چاہیے۔ جبکہ تم جان چکے تھے کہ میں ناراض ہوں۔ تم نے مجھے کال بیک تک نہیں کی۔ اس کا صاف صاف مطلب تو یہی نکلتا ہے کہ تم یہ سب کچھ جان بوجھ کر کررہے تھے۔" نہایت تیکھے انداز میں وہ اس سے گریز پر شکوہ کناں تھی۔

"میری میٹنگ تھی رامین۔۔۔ بہت مصروف تھا میں۔" مصالحت کی کمزور سی کوشش رامین کے طوفانی غصے نے ناکام بنادی۔

"میٹنگ ختم بھی ہوئی تھی مہرز! یا اب تک چل رہی ہے؟ تم صاف صاف کیوں نہیں کہتے' تم یہ دوستی توڑنا چاہتے ہو۔"

"ٹھیک ہے۔۔۔ یہی سمجھ لو۔" مہرز نے قطعی انداز میں اس کے شک کی تصدیق کردی۔

"میں کیوں سمجھوں؟ تم اپنے منہ سے ایک بار کہہ دو۔۔۔ دوبارہ شکل نہیں دکھاؤں گی تمہیں۔" وہ جھاگ کی طرح بیٹھی تھی۔

"میں ایکسکیوز کرتا ہوں تم ایکسپٹ نہیں کرتیں۔ وضاحت کروں تمہیں یقین نہیں آتا۔ میں کیا کروں تم بتادو؟ میں تم سے دور جانا نہیں چاہتا' تمہیں اگنور نہیں کرسکتا' میں یہ دوستی ختم نہیں کرنا چاہتا۔ میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں؟ یہ واحد رشتہ ہے جو میں زندگی بھر قائم رکھنا چاہتا ہوں۔ ہرگز اس سے دستبردار نہیں ہوسکتا۔ چاہوں بھی تو بھی نہیں۔۔۔ یہ میرے بس میں نہیں ہے' بلیومی۔"

خود سے کیے تمام وعدے بھلا کر وہ رامین کے سامنے اپنی بے بسی کا اعتراف کر بیٹھا اور اس کے لہجے کی سچائی رامین کے ذہن و دل سے ہر بدگمانی یکمشت ختم کرگئی تھی۔ پر اس کا اداس مدھم لہجہ' شکست خوردہ انداز دیکھ کر وہ اس کے لیے پریشان ہوگئی۔

"آئی بلیو یو۔" اس نے فوراً" کہا' جو یقین دہانی اس نے مانگی تھی۔ مہرز دے چکا تھا۔

وہ زبردستی مسکرایا تھا۔ رامین اس کے اچھے موڈ کا اطمینان پاکر حسن کی طرف چل پڑی جو تین آئس کریم کونز کو یوں بمشکل اٹھا کر چل رہا تھا۔ جیسے ابھی گرادے گا۔ مہرز وہیں کھڑا اسے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ ایک بار پھر وہ اپنے آپ سے بری طرح ہارا تھا۔

☆ ☆ ☆

"تابندہ آنٹی نے تو رامین کو زبردستی یہاں بٹھایا ہے۔۔۔ مگر تم یہاں کس خوشی میں فارغ بیٹھی ہو۔۔۔ جاؤ ہیلپ کراؤ آنٹی کی۔"

تابندہ کچن میں کبابوں کا مسالا تیار کررہی تھیں۔ رضا کے چہرے پر شرارت تھی۔ رامین اپنی مسکراہٹ دبا کر پھر سے مصروف ہوگئی تھی۔ مگر لیلیٰ چڑ گئی تھی۔

"ماما نے خود مجھے بھیجا ہے یہاں۔۔۔ مرچوں سے میرے ہاتھ جلتے ہیں۔ مسالا نہیں لگا سکتی میں۔"

"ارے ہاں۔۔۔ میں تو بھول ہی گیا تھا۔۔۔ بہت نازک ہیں تمہارے ہاتھ۔۔۔ لاؤ دکھاؤ ذرا۔۔۔"

اس نے فوراً" لیلیٰ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ اس بے تکلفی کا خمیازہ بھی فوراً" ہی بھگتنا پڑ گیا۔ لیلیٰ نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر زور سے مارا۔ "زیادہ فری ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

مہرز اسی دم دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔

مسالا اچھی طرح مکس ہوگیا تھا۔ تابندہ۔۔۔ ہاتھ دھونے کے لیے سنک کی طرف بڑھی تھیں کہ کچن کاؤنٹر پر رکھا ان کا ہینڈ بیگ گنگنانے لگا۔

"کوئی بچہ میرے ہینڈ بیگ سے موبائل نکال دے گا پلیز۔"

انہوں نے لاؤنج کی طرف منہ کرکے مدد کی درخواست کی۔ مہرز فوراً" آگے بڑھا اور ان کا ہینڈ بیگ اٹھا کر ان کے پاس لے آیا۔

"بیٹا! موبائل نکال دو' میرے ہاتھ مسالے والے ہورہے ہیں۔" مہرز نے جی کہہ کر ان کے بیگ سے فون نکال کر ان کے سامنے کیا تو وہ ہاتھوں پر صابن ملتے ملتے رامین سے مخاطب ہوئیں۔

"ارے رامین۔۔۔ تمہارے باڈی گارڈ کا فون ہے۔ دوپہر سے پچاس کالیں کرچکا ہے۔ خدا کے لیے اس سے بات کرلو' تاکہ تسلی ہوجائے کہ تم خیر خیریت سے ہو۔۔۔ پلیز بیٹا! یہ رامین کو دے دو۔"

انہوں نے آخری جملہ مہرز سے کہا تھا۔ اس نے خاموشی سے موبائل رامین کو پکڑا دیا۔ جو پہلے ہی خالہ کی بات سن کر صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

اس کے ہاتھ سے فون پکڑتے ہی اس نے سیل فون کان سے لگالیا۔ جانے کیوں مہرز کا دل ڈوب سا گیا۔ رامین کے خوشی سے تمتماتے چہرے کو بغور دیکھتا وہ اس کی گفتگو بھی بے حد دھیان سے سن رہا تھا۔ جو یقیناً" کسی دل عزیز ہستی کے ساتھ جاری تھی۔ جسے وہ بار بار اپنی خیریت کا یقین دلا رہی تھی۔

"جی ہاں۔۔۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔" بے اختیار ہنستے ہوئے اس نے کہا۔ "آپ مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ اس لیے پریشان ہوجاتے ہیں۔ اب تسلی ہوگئی آپ کو؟ ہاں وہ میرے ہاتھ میں کیمرا تھا۔ اس لیے ہینڈ بیگ خالہ کے پاس چھوڑ دیا تھا۔

آئم سوری۔۔۔ اب ایسا نہیں ہوگا۔۔۔ میں دھیان رکھوں گی۔۔۔ پلیز تھوڑا سا ہنس دیں۔" وہ بڑے لاڈ سے منا رہی تھی۔

"اب میری پرنس سے تو بات کروادیں۔" رامین فون پر اتنی مگن ہوچکی تھی کہ اسے کسی کے ہونے یا نہ ہونے کا بالکل احساس نہیں ہوا۔ دوسری طرف سے

سنائی دیتی چہکار اسے اندر تک سرشار کر گئی۔

"میری گڑیا۔۔۔ میرا بے بی۔۔۔ میری پرنسس کیسی ہو؟ آئی مس یو سو مچ۔" اس نے شدت جذبات میں آکر فون پر ہی پیار بھیجا تھا۔

محبت کے اس والہانہ اظہار نے مہرز کو واپس حقیقت کی دنیا میں لا پٹخا تھا۔ وہ کیسے بھول گیا کہ رامین شادی شدہ ہے۔ اس کی ایک بیٹی ہے۔ وہ تو اسے دیکھ چکا تھا رامین کی گود میں۔۔۔ اس دن رضا کے گھر۔ پھر وہ کیسے بھول گیا؟

اپنے آپ پر افسوس کرتا وہ کیبن سے باہر آیا۔ دروازہ بند کرتے ہوئے اس نے ایک نظر رامین کو دیکھا، جو ابھی تک فون پر مصروف تھی۔ وہ اس وقت بھی اس کی زندگی میں نہیں تھا۔ جب ہو سکتا تھا تو پھر آج کس طرح وہ اپنی جگہ بنا سکتا ہے۔ رامین کو تو شاید کبھی بھی اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ یہ خود اس کی چاہ تھی جو ہمیشہ اسے رامین کے قریب لے جاتی رہی۔۔۔

سیل فون پر آنے والے میسج نے اسے اپنی جانب متوجہ کیا تھا۔ کیبن سے بہت دور درختوں کے زرد پتوں کو کچلتا بے خیالی میں چلتا ہوں وہ ٹھٹک کر رکا اور جیب سے فون نکال کر میسج پڑھنے لگا۔ پیغام بھیجنے والے کو یقیناً احساس نہیں تھا کہ اس نے مہرز پر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔ جواب بھیجتے ہی وہ تیز قدموں سے واپس ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔ ماضی کے گرداب سے نکلنے کی واحد صورت یہی تھی کہ وہ بہتی ناؤ میں سوار ہو جائے۔ فی الوقت اسے فرار چاہیے تھا۔ بہانہ کوئی بھی ہوتا اسے دور جانا ہی تھا۔ سزا بھی دینا تھی خود کو۔۔۔ بے اختیار وہ رامین کے اس قدر نزدیک آ گیا تھا۔ اسے خود سے شرمندگی تھی۔ ملال تھا، پچھتاوا تھا۔ غلطی اس کی تھی۔ سزا بھی اسے ہی ملنی چاہیے۔ یوں کسی سے کچھ کہے بغیر اس نے واپسی کا سفر اختیار کر لیا۔ حال میں واپسی کا۔

☆ ☆ ☆

سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنا بھی نہیں
لیکن اس ترک محبت کا بھروسا بھی نہیں
بھول جاتے ہیں کسی کو مگر ایسا بھی نہیں
یاد کرتے ہیں کسی کو، مگر اتنا بھی نہیں
ایک مدت سے تیری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں
سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنا بھی نہیں
لیکن اس ترک محبت کا، بھروسا بھی نہیں

محض سات دن بعد رامین کو اپنے سامنے دیکھ کر خود سے کیے تمام عہد ریت کی دیوار ثابت ہوئے تھے۔ وہ اپنے آپ سے ہار گیا تھا۔ اپنی محبت سے ہار گیا تھا اور یہ شکست اسے ہمیشہ کی طرح سرخرو کر گئی۔ اسے اپنی محبت کی پائیداری پر فخر محسوس ہوا تھا۔

آج وہ جان گیا تھا رامین سے متعلق اس کے جذبے کبھی ماند نہیں پڑنے والے۔۔۔ چاہے کچھ حاصل ہو یا نہ ہو۔

وہ عمر بھر اسے اول روز کی طرح چاہے گا۔ وہ کبھی اس کا دل نہیں توڑ سکتا۔ اسے دکھی نہیں دیکھ سکتا۔ چاہے اس کے لیے وہ خود ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جائے، ٹوٹ جائے، ختم ہو جائے، حسن سے ہنس ہنس کر باتیں کرتی رامین کو محویت سے تکتے ہوئے وہ ادراک کی کئی منزلیں طے کرتا چلا گیا۔

چھوٹی اینٹوں سے بنے فرش کے کنارے پتھریلے فٹ پاتھ پر سازندے جاز کی دھن بجا رہے تھے۔ آؤٹ ڈور ریسٹورنٹس سے آتی فرنچ کھانوں کی اشتہا انگیز خوشبو لوگوں کی بھوک میں اضافہ کرتی انہیں اپنی جانب کھینچ رہی تھی۔ شام ڈھل رہی تھی اور ماحول کی رومانیت نہایت اثر انگیز تھی۔

مہرز نے لیمن ایڈ کے تین گلاس خریدے، تینوں اس سڑک کے آخری سرے پر موجود ایک قدیم طرز کی عمارت کے سامنے پہنچ گئے جس کے گیٹ کے ستون پر "ہاؤنٹڈ مینشن" کے الفاظ درج تھے۔

"یہ رائیڈ بہت خوف ناک ہے۔ ایسا کرو تم دونوں چلے جاؤ میں باہر ہی ویٹ کرتی ہوں۔"

"ادنہوں۔۔۔ اب ساتھ یہاں تک آ گئی ہو تو اندر بھی چلو۔ اتنے سارے لوگ ہیں ڈرنے کی کیا بات ہے۔"

"اتنے سارے لوگوں کے ساتھ بھی ڈرتی ہو۔"

"اتنے سارے لوگ؟"

"تمہاری فیملی۔" مہرز کے حلق میں لیمن ایڈ اٹکنے لگا۔

"بھائی کے پاس اتنی فرصت تھوڑی ہوتی ہے کہ ہر جگہ ساتھ لے کر جاؤں۔ ویسے میں اپنی بھابھی اور بھتیجی کے ساتھ ہی آتی ہوں ہمیشہ۔۔۔ بس آج اکیلی چلی آئی۔"

"میں تمہارے ہزبینڈ کی بات کر رہا تھا۔"

"تم زین کو کیسے جانتے ہو۔" اس نے دیکھا۔ وہ حیران بھی تھی اور متجسس بھی، لیکن لہجہ کچھ پیشان سا تھا۔

"میں نہیں جانتا۔" اس نے فوراً کہا۔ "میو سمیٹی میں تمہارے لیے فون آیا تھا نا۔ میں نے دیا تھا تمہیں۔"

"زین کا فون؟" اور پھر وہ ساری کہانی سمجھ گئی، مہرز کو غلط فہمی ہوئی تھی۔

"بھائی کا فون تھا۔ انہی کی بیٹی سے بات ہوئی تھی میری۔"

"اچھا۔۔۔ ویسے کیا کرتے ہیں تمہارے شوہر؟" مہرز نے پتا نہیں کہاں سے اتنی جرات اکٹھی کر لی یہ سوال کرنے کی۔

"میری شادی نہیں ہوئی۔" رامین سر جھکائے کیو کی طرف واپس آتے ہوئے بولی۔ اس کا سر مزید جھک گیا "صرف نکاح ہوا تھا۔ وہ بھی ختم ہو گیا تھا۔ ڈیڑھ ہفتے بعد۔"

اس نے سنا اور وہیں ٹھہر گیا رامین نے ٹھٹک کر اس کا رکنا بھی محسوس کر لیا تھا۔ اسے انتظار رہا کہ مہرز کچھ کہے مگر وہ خاموش کھڑا اسے بس دیکھے جا رہا تھا۔

وہ کیا کہتا۔ اس کے اندر تو گہری خاموشی چھا گئی تھی۔ کتنا رویا تھا وہ اس رات۔ اپنے رب کے آگے سر بسجود ہو کر کیسے گڑگڑا کر اس نے رامین کو اپنے لیے مانگا تھا۔ کتنی شدت سے اس نے چاہا تھا وہ شخص اسے چھوڑ کر چلا جائے۔ اور ایسا ہو گیا تھا۔ اس کی دعا قبول ہو گئی تھی۔ اور یہ اسے آج معلوم ہو رہا تھا۔ اتنے سالوں بعد۔۔۔

اتنے سارے دن گزر جانے کے بعد اسے پتا چل رہا تھا تو وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ کیا محسوس کرے۔ رامین کے لیے افسوس کرے، جسے یہ دکھ اٹھانا پڑا۔ یا اپنے لیے خوشی محسوس کرے کہ اب وہ اسے پا سکتا ہے۔

"زین نے رخصتی سے پہلے ہی ڈائیوورس دے دی تھی مجھے۔" رامین نے جیسے پہاڑ کو دھکیلا تھا۔ بہت تکلیف ہو رہی تھی اسے یہ سب کہنے میں۔

"کیوں۔۔۔ کیوں کیا اس نے ایسا؟"

وہ جواب نہیں دینا چاہتی تھی۔ جواب دینے کے لیے اسے یاد کرنا پڑتا۔ ذہن میں ہر اذیت ناک لمحہ۔ جس سے وہ گزر آئی تھی، پر شاید وہ تکلیف نہیں گزری تھی۔

آج کا دن وہ رونا نہیں چاہتی تھی۔ سو زبردستی مسکرا کر اس نے مہرز کے مقابل آتے ہوئے لاپروا انداز میں کہا۔ "میرا خیال ہے میں اسے اچھی نہیں لگتی تھی۔" اتنا کہہ کر وہ بلاوجہ ہنسنے لگی۔ یہ جاننے کے باوجود کہ مہرز اس کی روح میں جھانکنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور وہ اس سے کچھ نہیں چھپا سکتی۔

"تم اسے اچھی نہیں لگتی تھیں؟" اس نے تم پر خاصا زور دیتے ہوئے تبصرہ کیا "اندھا تھا کیا؟"

"نہیں۔" ایک بار پھر بلاوجہ کی کھلکھلاہٹ۔

"اندھی تو میں ہوں۔ ایک آنکھ سے دکھائی نہیں دیتا مجھے۔ یہ دیکھو!" اس نے پنجوں کے بل اچک کر مہرز کو اپنی بائیں آنکھ پوری طرح کھول کر دکھانے کی کوشش کی۔

"مذاق مت کرو۔" مہرز خود ہی تھوڑا سا پیچھے ہو کر کھڑا ہو گیا۔

"ارے۔ میں مذاق نہیں کر رہی۔ دیکھو! غور سے میری آنکھوں میں۔ تمہیں فرق پتا چلے گا۔" اسی وقت حسن نے مہرز کو ہاتھ ہلا کر اندر جاتی کیو میں واپس

آنے کے لیے آواز دی۔

"چلو۔" مہرز نے پہلے اسے آگے بڑھنے کے لیے کہا تو رامین نے بری سی شکل بنالی۔

"مجھے نہیں جانا نا۔ بس میں اس پاتھ سے گزر کر دوسری طرف سے نکل جاؤں گی۔ مینشن کے اندر نہیں جاؤں گی۔" وہ کسی بچے کی طرح ضد پر اڑ گئی تھی۔ مہرز نے بڑے اطمینان سے جیبوں میں ہاتھ ڈال کر زمین پر قدم جماتے ہوئے اسے وارننگ دی۔

"اگر تم ساتھ نہیں چلوگی تو میں بھی یہاں سے نہیں ہلوں گا سمجھیں!" وہ کچھ دیر تو اسے گھورتی رہی جیسے اس کی ثابت قدمی کا اندازہ کررہی ہو۔ جب اسے یقین ہوگیا کہ وہ واقعی اکیلے نہیں جانے والا تو تھوڑا جھلاتے مگر مسکراتے ہوئے وہ پیر پٹختی آگے جاتی کیو میں شامل ہوگئی۔

کیولین سے باہر آکر حسن' رامین اور مہرز کا انتظار کرنے لگا۔ اس کے سامنے ہی چند ستونوں پر ان افراد کے Statue busts تھے جو مینشن میں پراسرار طور پر ہلاک ہوگئے تھے۔ ان ستونوں پر کندہ تحریر ان افراد کی موت کی وجہ عجیب پہیلی کی صورت میں ظاہر کررہی تھیں۔ وہ باری باری ہر ستون کو بغور دیکھتا زیر لب دہرا رہا تھا' انکل جیکب کے ستون پر لکھی آخر سطر۔

"Now try to diseover
Who killed who"

(یہ جاننے کی کوشش کریں' کس نے کس کو مارا؟) پڑھ کر وہ ٹھٹک گیا۔

"ایں۔ یہ کیا بات ہوئی؟" حسن' رامین کو سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "اب ہمیں کیسے پتا چلے گا کس نے کس کو مارا؟"۔

"اندر ان تمام افراد کی روحیں گھوم رہی ہیں' ان سے پوچھ لینا۔ چلو چلو۔" رامین مزے سے کہتی آگے بڑھ گئی۔

گزرگاہ کے بیچ کھڑی چھوٹی سی دیوار کے چاروں اطراف میوزیکل۔ انسٹرومنٹس ریلیف نظر آرہے تھے۔

رامین اور حسن جس انسٹرومنٹ پر ہاتھ سے چھوتے ڈالتے وہ دھن بکھیرنے لگتا۔ چند منٹ تک وہ دونوں لطف اندوز ہوتے رہے۔

مینشن کے داخلی دروازے کو پار کرکے ایک ہشت پہلو کمرے میں داخل ہوگئے۔ جس کی دیواروں پر بڑی بڑی پورٹریٹس آویزاں تھیں۔ پورٹریٹس کے نیچے جلتی بجھتی لو سے مدھم روشنی پیدا کرتی موم بتیاں جھلملا رہی تھیں۔ ان کے اندر پہنچتے ہی دروازہ بند ہوگیا اور ایک خوفناک آواز سنائی دی۔

"اس مینشن سے باہر جانے کے تمام راستے بند کیے جاچکے ہیں۔ نہ کوئی کھڑکی' نہ ہی دروازہ ہے۔"

اس کے بعد ایک زوردار قہقہے کے ساتھ ہی کمرے میں اندھیرا ہوگیا۔ تمام روشنیاں یکدم بجھ گئیں۔ چھت غائب ہوئی اور بادلوں کی زبردست گڑگڑاہٹ کے ساتھ جیسے بجلی کوند گئی۔ اس پل بھر کی چمک میں اپنے سروں پر تمام لوگوں کو چھت سے ٹنگا ڈھانچہ نظر آیا اور کانوں کے پردے پھاڑ دینے والی چیخ سنائی دی۔

"ہائے امی۔" حسن اچھل کر پاس کھڑے مہرز سے لپٹ گیا۔

مہرز بری طرح جھنجلایا اور اسے پرے ہٹا کر رامین کی طرف دیکھا۔ اسی وقت لائٹ واپس آگئی۔ مہرز نے کانوں میں انگلیاں ٹھونسے کھڑی رامین کو مسکرا کر دیکھا۔ یقیناً" اس نے بہت پہلے ہی یہ حفاظتی اقدامات کرلیے تھے۔ وہ آنکھیں سختی سے بند کیے ہوئے تھی۔ تیز روشنی کے احساس ہونے پر اس نے پہلے ایک آنکھ کھول کر دیکھا' پھر دونوں آنکھیں کھول دیں۔ مہرز نے اس کے کان میں ٹھنسی انگلی کو پکڑ کر ہٹایا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ کمرے کا دروازہ خود بخود کھل گیا اور سب لوگ ایک ایک کرکے مینشن میں داخل ہونے لگے۔

مہرز کے ہاتھ میں رامین کا لرزتا ہاتھ اس کے ڈر کو ظاہر کررہا تھا۔ اس نے ہلکا سا دباؤ بڑھاتے ہوئے اپنی گرفت مضبوط کی۔ گیلری کے باہر رائیڈ کے لیے ڈوم

بگیز ٹریک پر ایک لائن میں آگے آتی جارہی تھیں۔ جس میں بیک وقت دو ہی لوگ بیٹھ سکتے تھے۔ مہرز اور رامین ایک ساتھ بیٹھنے لگے تو حسن' چڑ کر مہرز کو اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بدلہ لینے کا ڈراوا دیتا ایک انگریز عورت کے ساتھ جاکر بیٹھ گیا۔

ڈوم بگی میں بیٹھتے ہوئے رامین نے آہستگی سے اپنا ہاتھ مہرز کے ہاتھ سے چھڑالیا۔ اس بھوت کی آواز یہاں بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ ڈوم بگی گراؤنڈ فلور پر پہنچی جہاں بھوتوں کی برتھ ڈے پارٹی منائی جارہی تھی۔ ایک طویل ڈائننگ ٹیبل کے گرد چہکتی روحیں ناچتی گاتی' جن کے آرپار دیکھا جاسکتا تھا' خوشیاں منارہی تھیں۔

"شکر ہے انہوں نے ہمیں انوائٹ نہیں کیا۔" رامین نے جھرجھری لے کر مہرز سے کہا۔

"اگر کرلیتیں تو میں ضرور جاتا وہاں۔" مہرز نے میز کی طرف اشارہ کیا۔ "اور وہ جو سب سے حسین روح بیٹھی ہے کیک کے سامنے۔ اس کے ساتھ ڈانس کرتا۔"

"تو اب چلے جاؤ۔ انویٹیشن کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں۔" رامین نے جل کر جواب دیا اور وہ مسکرا کر سامنے دیکھنے لگا۔

ایک جھٹکا کھا کر ڈوم بگی قبرستان میں داخل ہوگئی۔ جہاں بے شمار قبروں کے گرد جھاڑ جھنکار بکھرا پڑا تھا۔ کریہہ صورت آسیب کتبوں کے پیچھے سے اچانک برآمد ہوتے۔ پھر ہوا میں تحلیل ہوجاتے۔ صدیوں پہلے مرنے والوں کو آج ہی قبر پھاڑنے کا خیال آیا تھا۔ ایک کے بعد ایک مردہ قہقہے لگاتا۔ گیت گاتا برآمد ہونے لگا۔ وہ ایک خاص پُراسراریت جو شروع سے اس بھوت بنگلہ کا ماحول اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھی۔ پوری طرح بے نقاب ہوکر سب کو چیخنے پر مجبور کردیا تھا۔ بھوتوں کے ساتھ زندوں کی چیخیں گڈمڈ ہورہی تھی۔ مہرز تھوڑی تھوڑی دیر میں رامین کی خیریت کا اطمینان کرتا پھر اسے باتوں میں الجھالیتا۔ مگر اچانک ہی اس نے کہا۔

"وہ دیکھو۔" مہرز نے رامین کی توجہ آئینوں کی طرف دلائی تو وہ جو ارادہ کیے بیٹھی تھی کہ ہرگز اس جانب نہیں دیکھے گی۔ مہرز کے کہنے پر بے دھیانی میں سامنے نظر ڈالی۔ آئینے میں ان دونوں کے عکس کے درمیان ایک Poltergiest بیٹھا ان کی حیرت کا مزا لے رہا تھا۔ رامین نے دانت پیستے ہوئے زور سے ایک دھمو کا رسید کیا' جو بھوت کو نہیں یقیناً" مہرز کے کندھے پر لگا تھا۔

رائیڈ کا اختتام ہوچکا تھا۔ مہرز نے اترنے میں رامین کی مدد کی۔ پھر اپنے پیچھے آنے والی بگی سے حسن کو نکلتے دیکھا۔ وہ بھی اترنے کے بعد ان کے ساتھ آکر کھڑا ہوگیا۔

"آپ لوگ بڑے خوش لگ رہے ہیں' رشتہ داروں سے ملاقات ہوگئی۔" اس نے دونوں کے مسکراتے چہروں کو دیکھ کر فقرہ کسا۔

"اتنی خوف ناک شکل کے رشتہ دار تمہارے ہی ہوسکتے ہیں۔" رامین نے جواب دینے میں دیر نہیں لگائی۔

مہرز نے اس کے برجستہ جملے سے خوب لطف لیا تھا۔

"تم اتنے تھوڑے سے دنوں کے لیے آئے ہو۔ اب اگلی بار چکر لگاؤ تو پوری فیملی کے ساتھ آنا۔" رامین حسن سے باتیں کرتی آگے بڑھتی رہی۔ "اب دوبارہ کب آنا ہوگا۔"

مہرز نے تو آئی پوڈ سننا شروع کیا۔ اس کے کانوں میں ایئرفون لگے تھے۔ حسن نے ایک نظر اسے دیکھا۔

"ان موصوف سے کہو شادی کرلیں۔ اس کی شادی پر میں ضرور آؤں گا۔" رامین نے مسکرا کر مہرز کی طرف دیکھا جو ان دونوں کی گفتگو سے بے نیاز گانا سننے میں مصروف تھا۔ اس نے چڑ کر اس کا ایئرفون کھینچا۔

"چھوڑو اسے۔ باتیں کرو ہم سے۔ کون سے گانے سن رہے ہو؟" مہرز کے جواب دینے سے قبل وہ ایئرفون اپنے کانوں میں لگاچکی تھی۔

"جلیبی بائی؟" رامین کو پہلے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ "مہرز۔۔۔ تم ایسے گانے بھی سنتے ہو؟" پھر وہ ہنس پڑی۔ اس کے سوال پر مہرز نے بوکھلا کر حسن کی طرف دیکھا' کیونکہ "آئی پوڈ اس کا تھا" بجائے وضاحت کرنے کے حسن بھی اسے لتاڑنے لگا۔

"شرم آنی چاہیے مہرز تمہیں۔۔۔ بھلا یہ گانا ہے شریفوں کے سننے والا۔۔۔" اس کی بات رامین کی بے ساختہ ہنسی میں دب کر رہ گئی۔ اس طرح کھل کر ہنستی ہوئی وہ مہرز کو بہت اچھی لگی۔ اتنی اچھی کہ مہرز نے خود بھی کسی قسم کی وضاحت دینے کا ارادہ ترک کر دیا۔ غلط فہمی ہی سہی۔۔۔ پر اس کی ہنسی رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"آج مجھے اتنا مزا آیا ہے' میں بتا نہیں سکتی۔ کاش آنے والا ہر دن اسی طرح گزرے۔" وہ حسرت آمیز لہجے میں اپنی خوشیوں کے دائمی ہونے کی خواہش مند تھی۔

"یہ تو تم پر منحصر ہے۔" مہرز مسکرایا۔ "اگر تم چاہو تو ہر دن اسی طرح بھرپور طریقے سے گزار سکتی ہو۔"

"یہ اتنا آسان تھوڑی ہے۔" اس نے سر جھٹک کر جیسے افسوس کا اظہار کیا۔ "ہم تینوں ہر روز تو یہاں اکٹھے نہیں ہو سکتے نا۔"

حسن کی بات یاد آتے ہی اس کے لب مسکرانے لگے۔

"حسن کہہ رہا تھا مہرز سے کہو' شادی کر لے۔ اس کی شادی پر ضرور آؤں گا میں۔۔۔ پوری فیملی کے ساتھ۔۔۔"

مہرز نے ایک لمحے کے لیے بھی رامین پر سے نظریں ہٹائی نہیں تھیں اور پھر اس نے کچھ ایسا کہا کہ وہ چونک کر اس کی جانب دیکھنے پر مجبور ہو گئی۔

"سوری کیا کہا تم نے۔۔۔ میں نے سنا نہیں۔" وہ پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

"میں کہہ رہا ہوں کہ میں اسے واپس نہیں جانے دوں گا۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ میں شادی کر رہا ہوں۔۔۔ بہت جلد۔"

"اوہ ریئلی!" رامین کی ایک دم سمجھ میں نہیں آیا وہ کیا کہے۔ مہرز نے اچانک ہی اس کے سر پر جیسے بم پھوڑا تھا۔

"ہاں۔۔۔" مہرز کا اطمینان قابل دید تھا۔ جیسے ساری تیاریاں مکمل ہو چکی ہوں۔

"اور تم نے ہمیں بتایا بھی نہیں۔۔۔ حسن کو بھی معلوم نہیں۔ ورنہ وہ مجھ سے نہ کہتا کہ تمہیں شادی کے لیے رضامند کروں۔" مہرز نے ایک بھرپور بدن کو بھر لینے والی سانس بھری اور ہاتھوں کو سینے پر باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ اسے رامین کا رد عمل دیکھ کر مزا آیا تھا۔

"چلو اچھا ہے۔۔۔ میں نے یہاں کوئی شادی اٹینڈ نہیں کی اب تک۔۔۔ پتا نہیں یہاں رسمیں وغیرہ کیسی ہوتی ہیں۔ ویسے تم نے کیا سوچا ہے۔ پاکستانی اسٹائل میں شادی کرو گے یا امریکن؟"

"بھئی لڑکی پاکستانی ہے تو شادی بھی اسی طرح کروں گا۔" رامین کو یہ بات سن کر ہنسی آگئی۔

"یعنی تم۔۔۔" اس نے مذاق اڑانے والے انداز میں انگلی سے مہرز کی طرف اشارہ کیا۔ "گولڈن شیروانی اور سہرے کے ساتھ۔۔۔ ڈالر کے نوٹوں کا بڑا سا ہار پہن کر۔۔۔ سفید گھوڑی پہ سوار ہو کر دلہن بیاہنے جاؤ گے؟"

مہرز اسی طرح آگے بڑھ کر رامین کے قریب آیا۔

"تم بتاؤ تمہیں کیا پسند ہے۔ سفید گھوڑی یا بلیک سپورٹس کار؟"

"یہ تو اپنی ہونے والی دلہن سے پوچھو۔۔۔ میں کیا بتاؤں؟" انتہائی غیر محسوس انداز میں وہ الٹے قدموں تھوڑا سا پیچھے ہٹی تھی۔ مہرز دو قدم اور آگے بڑھ کر دوبارہ اس کے بالکل نزدیک آگیا۔

"اسی سے تو پوچھا ہے۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں رامین!"

رامین نے سنے تھے بالکل صاف اور واضح طور پر۔

وہ ایک ایک لفظ جو مہرز کی زبان سے ادا ہوئے۔ مشکل بننے میں تمہیں' یقین کرنے میں ہو رہی تھی۔ اس کی مسکراہٹ سمٹ کر معدوم ہوتی چلی گئی۔

"کیا کہہ رہے ہو مہرز؟" اس نے آنکھیں سکیڑتے ہوئے مہرز کی جانب یوں دیکھا جیسے اسے اپنے الفاظ واپس لینے کی تنبیہہ کر رہی ہو۔

"تو تمہیں برا لگا؟"

"تمہارے منہ سے یہ بات سن کر واقعی بہت برا لگا۔" مہرز کے لیے اس کا یہ رد عمل قطعی غیر متوقع تھا۔

"تم ابھی شادی نہیں کرنا چاہتیں۔۔۔ یا مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتیں؟"

"میں کبھی بھی۔۔۔ کسی سے بھی شادی نہیں کرنا چاہتی۔" مضبوط لہجے میں دو ٹوک جواب دیتے ہوئے اسے بس ایک لمحہ لگا تھا۔

"بہت سال پہلے میں اس تجربے سے گزر چکی ہوں اور وہ ہرگز ایسا خوشگوار نہیں تھا کہ میں اسے بار بار دہراتی رہوں۔ میں آج جہاں ہوں' جیسی ہوں' جس حال میں ہوں' مطمئن ہوں۔"

"تم میرے ساتھ خوش رہو گی رامین!"

"مگر تم میرے ساتھ خوش نہیں رہو گے مہرز۔۔۔ میں تمہاری توقعات پر پوری نہیں اتر سکوں گی۔"

"کیسی توقعات؟ مجھے صرف تمہارا ساتھ چاہیے' تم جیسی ہو' مجھے اچھی لگتی ہو' میں تمہیں بدلنا نہیں چاہتا۔"

"یہ تو تم ابھی کہہ رہے ہو نا۔۔۔ جب میں تمہاری بیوی بن جاؤں گی۔۔۔ تب تمہیں میری خامیاں نظر آئیں گی۔ میں نارمل لڑکی نہیں ہوں۔ زین نے اسی لیے ڈائیورس دی تھی مجھے۔" پہلے جو اس کی بات پر خفگی کا اظہار کر رہی تھی۔ اب اس کے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش میں تھی۔ وہ بیک وقت رحم کی بھیک مانگ رہی تھی اور دھتکار بھی رہی تھی۔ مہرز نے آگے بڑھ کر اسے بازوؤں سے تھام لیا۔

"تم بھول کیوں نہیں جاتیں اسے۔۔۔ ایک تلخ تجربے کی بنیاد پر اپنی آئندہ زندگی خوشیوں سے خالی کر لینا کہاں کی عقل مندی ہے رامین! بھول جاؤ اپنا ماضی۔"

وہ اسے بہت پیار سے سمجھا رہا تھا۔ جبکہ رامین اس کی مضبوط گرفت کے باوجود خود کو ٹوٹتا پھوٹتا محسوس کر رہی تھی۔ اس نے مہرز کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔ اپنے آنسوؤں کو آنکھوں سے بہنے سے روک لیا تھا اس نے۔۔۔ مگر وہ نمی آواز میں اتر آئی۔

"مہرز۔۔۔ مجھے مجبور مت کرو۔۔۔ اس اندھے کنویں میں دوبارہ کودنے کا حوصلہ نہیں ہے مجھ میں۔۔۔ میرے لیے سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔"

"کچھ ختم نہیں ہوا ہے۔۔۔ تمہارے سامنے پوری زندگی پڑی ہے ابھی۔۔۔ میرا بھروسا کرو رامین! میں تمہیں مایوس نہیں کروں گا۔"

"میں نے تمہیں زین کے بارے میں اس لیے بتایا تھا کہ تم ترس کھا کر مجھے پرپوز کر دو؟"

"میں تم پر ترس کیوں کھاؤں گا؟"

"کیونکہ تم نے ہمیشہ ایسا ہی کیا ہے۔۔۔ میری ہر اچھی بری بات کو سپورٹ کیا ہے۔ میری خوشی کے لیے خود کو لیٹ ڈاؤن کیا ہے۔۔۔ اور آج بھی تم یہی کر رہے ہو۔۔۔ مجھ سے ہمدردی رکھتے ہو۔۔۔ مگر اس کے لیے اپنی لائف برباد مت کرو۔"

"یہ۔۔۔ محبت بھی تو ہو سکتی ہے۔"

"پلیز۔۔۔" رامین نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کیا۔ "میں اسے محبت نہیں مان سکتی۔" اسے غصہ آنے لگا تھا۔

"مت مانو۔ وقت خود ثابت کر دے گا۔ مگر یہ بات اپنے ذہن سے نکال دو کہ زین کا تمہاری زندگی سے چلے جانا کوئی سانحہ تھا۔ جو بھی ہوا۔۔۔ اچھے کے لیے ہوا ہے۔۔۔ تمہیں تسلیم کر لینا چاہیے کہ اس کے بغیر تم زیادہ خوش ہو۔۔۔ میں بہت خوش ہوں کہ اس نے تمہیں چھوڑ دیا۔۔۔ میں نے چاہا تھا ایسا ہو جائے۔"

"تم چاہتے تھے کہ زین مجھے چھوڑ دے؟" رامین نے آہستگی سے اس کے ہاتھ اپنے بازوؤں پر سے

ہٹائے اور پیچھے ہٹ گئی۔

"میں تمہارے گھر آیا تھا رامین۔۔۔ میں نے زین کو دیکھا تھا مارکیٹ میں تمہارے ساتھ۔۔ تب میں نے۔۔۔ میں نے اللہ سے تمہیں مانگا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ تم میرے سوا کسی اور کی ہو کر رہو۔ میں نے دعا کی تھی' وہ تمہیں چھوڑ کر چلا جائے اور تم میری ہو جاؤ۔"

کتنے برسوں کی چاہت۔۔۔ اور کتنا کم وقت ملا تھا اظہار کے لیے۔۔۔ پھر بھی اس نے پوری کوشش کی تھی۔۔۔ کہ وہ رامین کو اپنی محبت کا یقین دلا سکے۔۔۔ مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔

"میں ہمیشہ تمہیں اپنا خیر خواہ سمجھتی آئی تھی۔۔۔ مگر مجھے نہیں معلوم تھا تم اس طرح مجھے تباہ کرو گے۔۔۔ تمہاری بددعا نے میری زندگی برباد کر دی۔۔۔ میرے بابا ختم ہو گئے۔۔۔ انہیں آخری بار دیکھ بھی نہیں پائی میں۔۔۔ وہ مجھے اکیلا چھوڑ کر چلے گئے۔۔۔ تم نہیں جانتے میری ماما نے میرے ساتھ کیا' کیا۔۔۔ تم ان خود غرض انسانوں میں سے ایک ہو۔۔۔ جو اپنی خوشی حاصل کرنے کی دعا میں مانگ کر دوسروں کو زندہ درگور کر دیتے ہیں۔۔۔ تم میرا درد کبھی نہیں سمجھ سکتے۔۔۔ وہ تکلیف کبھی محسوس نہیں کر سکتے جو میں نے سہی۔" ہر درد' ہر دکھ دوبارہ 'زندہ ہو چکا تھا' وہ زارو قطار رو رہی تھی۔

"میں سمجھ سکتا ہوں۔" یقین دلانے کے لیے بدگمانی کے جانے اور کتنے کڑے امتحانوں سے گزرنا تھا اسے۔

"تم نہیں سمجھ سکتے۔" وہ ہسٹریائی ہو رہی تھی۔ "تمہیں نہیں معلوم جب سر سے خون بہتا ہے تو کتنا درد ہوتا ہے۔۔۔ اور۔۔۔ زخم دینے والے ہاتھ اپنے ہوں تو آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں۔۔۔" اپنے آنسوؤں کے پار اسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

"میری بات سنو رامین!" مہرز نے اسے سنبھالنے کی کوشش کی مگر اس نے بے رحمی سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"میں کچھ نہیں سننا چاہتی۔۔۔ تم یہاں سے چلے جاؤ۔ آئندہ مجھے اپنی شکل مت دکھانا۔"

رامین نے بار بار دلاسا دیتے مہرز کو زور سے پیچھے دھکیلا۔۔۔ آنکھوں سے آنسو جھٹک کر ہتھیلی سے صاف کیے اور فوراً" تیز قدموں سے چلتی دور چلی گئی۔ وہ اسے روک نہیں سکتا تھا۔ جب وہ ناراض ہوتی تھی تو کوئی بھی عذر یا وضاحت قبول نہیں کرتی تھی اور آج تو وہ ہر رشتہ ہر تعلق توڑ کر جا رہی تھی۔ وہ کس حیثیت سے اسے روکتا۔۔۔ کیا کہتا؟

ڈزنی لینڈ کے گیٹ سے باہر پارکنگ میں کھڑی اپنی کار کا دروازہ کھولتے' اسے اسٹارٹ کر کے مین سڑک پر لاتے ہوئے وہ اپنے آنسوؤں پر قابو پا چکی تھی۔ گھر نزدیک ہی تھا۔ پھر بھی اسے بے حد احتیاط سے ڈرائیو کرنا تھا زندہ سلامت اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے۔ شام پھیل چکی تھی۔۔۔ اندھیرا بڑھنے لگا تھا۔۔۔ لحہ بہ لحہ۔

☆ ☆ ☆

نیند تو جیسے کمرے سے باہر ہی رہ گئی تھی۔ بستر پر پندرہ منٹ سختی سے آنکھیں بند کر رکھنے کے باوجود وہ سو نہیں پائی تو جھنجلا کر اٹھ بیٹھی۔ لیمپ آن کیا' کتاب اٹھائی اور صفحے پلٹنے لگی۔ پڑھنے کی کوشش کی تو ایک لفظ سمجھ نہیں آیا۔ ہر تحریر اپنا مفہوم کھو چکی تھی۔ غصے میں اس نے کتاب اچھال دی جو ہلکی سی دھپ کے ساتھ بستر پر جا گری۔ بستر سے اتر کر پیروں میں سلیپرز گھسیٹتی وہ اپنے ڈیک کے پاس آئی اور اسے آن کر دیا۔ آواز نہایت کم رکھتے ہوئے وہ فلور کشن پر وہیں بیٹھ گئی۔ گانا بیچ میں سے ہی کہیں شروع ہوا۔

No summers high
No warm july
No harvest moon to
Light one tender
august night
No autumn breeze
No falling leaves

بستر پر پڑا اس کا موبائل گنگنایا تھا۔ اس نے کشن سے اٹھ کر اپنا فون اٹھایا اور کال ریسیو کر لی۔ ابھی ہیلو کہا تھا کہ دوسری طرف سے التجا سنائی دی۔

"پلیز رامین! فون بند مت کرنا۔۔۔ تم سن رہی ہونا۔" وہ مہرز تھا۔

"بولو۔۔۔" حتی الامکان اپنی آواز اور لہجہ بے تاثر سپاٹ رکھتے ہوئے اس نے کہا۔

"میں جانتا ہوں' تم نے منع کیا تھا۔ لیکن یہ بات کہے بغیر۔۔۔ میں مرنا نہیں چاہتا۔" وہ سانس روکے سننے لگی۔ "میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں رامین آئی لو یو۔"

اور کال منقطع ہو گئی۔ رامین بے چین ہو کر ہیلو ہیلو کرتی رہی۔ مگر دوسری طرف انگیج ٹون کے علاوہ کوئی آواز نہیں تھی۔ اس نے فون اپنی نگاہوں کے سامنے لا کر نمبر دیکھا اور ریس کر دیا۔ اسے خود بھی معلوم نہیں تھا وہ اسے فون کیوں ملا رہی ہے۔۔۔ وہ تو کبھی اس کی شکل نہ دیکھنے کا تہیہ کر چکی تھی' کبھی بات نہ کرنے کی قسم کھائے بیٹھی تھی تو پھر اب؟ کال مل نہیں سکی تھی۔ انگیج ٹون کی آواز تھی اور بس۔۔۔ ہاں۔۔۔ کمرے میں Stieve Wonders کی آواز ضرور تھی۔

Not even time for birds
to fly to southern skies
I just called to say
I love you__
and i mean it
from the bottom
of my heart

دل پگھل رہا تھا۔۔۔ عجیب انداز سے۔۔۔ وہ بے اختیار ہو رہی تھی۔۔۔ جبکہ وہ نہیں ہونا چاہتی تھی۔ وہ اپنے آپ کو صحیح ثابت کرنے کے لیے خود اپنے آپ سے ہی لڑے چلے جا رہی تھی مگر اس کا دل ہر دلیل کو مسترد کرتا ایک ہی گردان کیے جا رہا تھا۔

"مہرز اتنے برے سلوک کا مستحق ہرگز نہیں تھا۔"

ٹھیک ہے۔۔۔ وہ شادی نہیں کرنا چاہتی۔۔۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ وہ اس سے محبت نہیں کرتی۔۔۔ لیکن۔۔۔ کم از کم وہ آرام سے اس کی بات تو سن سکتی تھی۔ تھوڑے سے تحمل کا مظاہرہ کر سکتی تھی۔ اس کے ساتھ جو بھی ہوا تھا۔ زین سے علیحدگی' بابا کی ڈیتھ' ماما کا تشدد اور بھائی سے جدائی۔۔۔ ان سب میں مہرز کا تو کوئی قصور نہیں تھا۔ وہ مانتی نہ مانتی' صبح کے ڈپریشن نے نکاس کا غلط راستہ اختیار کیا تھا۔ اس کی بھڑاس غلط انسان پر نکلی تھی۔

☆ ☆ ☆

پھر کسی پیاس کے صحرا میں مجھے نیند آئی
اور میں خواب میں ڈھونڈوں تجھے پانی کی طرح

وہ "سراب" تھا۔ چمکتا رہتا ہے جسے پیاسا دور سے دیکھے۔۔۔ تو پانی سمجھے۔۔۔ اس نے بھی یہی غلطی کی تھی۔۔۔ انتہائی مایوسی کے عالم میں وہ تھک ہار کر وہیں بیٹھ گئی۔۔۔ کھولتی ریت اس کا بدن جھلسائے دے رہی تھی۔۔۔ پر اب اسے کوئی پروا نہیں تھی۔ آگے جانا اس کے بس میں نہیں تھا۔۔۔ وہ اور نہیں چل سکتی تھی۔

تب ہی کسی نے اس کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ سر اٹھا کر دیکھا تو کچھ اجنبی چہرے اس کے گرد گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔۔۔ جن کے سایوں کی وجہ سے سر پر پڑتی تیز دھوپ کا رستہ رک گیا تھا۔ وہ ٹکر ٹکر سب کے چہرے دیکھنے لگی۔ ان میں سے کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ وہ سب آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔

پھر۔۔۔ ایک ایک کر کے وہ سب ہٹتے چلے گئے۔۔۔ وہ پریشان سی ادھر ادھر دیکھتی اٹھ کھڑی ہوئی۔۔۔ اب وہ پھر اکیلی تھی۔ اس نے دوبارہ آسمان کی طرف دیکھا اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔

"میرے مالک مجھے سیراب کر دے۔"

گڑگڑا کر دعا مانگنے کے بعد جیسے ہی اپنے ہاتھ نیچے کیے سامنے ایک شخص دکھائی دیا۔ جس نے دونوں ہاتھوں سے خوشنما رنگوں سے مزین پیالا تھاما ہوا تھا۔ اس شخص نے خود آگے بڑھ کر پیالہ اس کے سامنے

پیش کردیا۔۔۔

اس کے ہونٹ تر ہو چکے تھے۔ زبان پر ٹھنڈے میٹھے پانی کا ذائقہ تھا اور جیسے جیسے سوکھا حلق سیراب ہو رہا تھا اس کے ہاتھ پاؤں میں جان آتی جارہی تھی۔ اس نے احسان مندی سے اس شخص کی جانب دیکھا جو پہلے ہی اسے نہایت محبت سے تک رہا تھا۔ اس کی پیاس بجھ گئی تو پیالا ہونٹوں سے جدا کردیا۔ جانے کتنی دیر سے وہ پانی پی رہی تھی مگر وہ پیالا ہنوز پانی سے لبالب بھرا ہوا تھا۔ وہ حیران ہوئی۔ اسی دم آسمان سے بارش برسنے لگی۔ ہلکی ہلکی بارش۔۔۔ اس کی رگ و پے میں سکون اترنے لگا۔

"رامین۔۔۔" کسی نے اس کا نام پکارا تھا۔ سرعت سے پلٹتے ہوئے اس شخص کو دیکھا تو خوف سے رامین کی جان نکل گئی۔ وہ مہرزان۔۔۔ چہرہ سرخ خون سے تر بتر تھا۔

بارش کا قطرہ اچھل کر اس کی آنکھ میں گرا۔۔۔ اور اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ فوراً" اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ اپنا لیمپ جلا کر اس نے ٹائم دیکھا، صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ تو یہ خواب تھا۔ گھڑی دیکھ کر اس نے ایک طویل گہری سانس لی۔ عجیب سی خوشبو اور خنکی تھی کمرے میں۔۔۔

اس طویل خواب کو ذہن میں دہراتے ہوئے وہ دوبارہ تکیے پر سر رکھ کے لیٹ گئی۔ یہ خواب اسے پہلے بھی ایک بار دکھائی دیا تھا؟ ماما کی وفات سے پہلے اور اب دوبارہ نظر آیا ہے۔ وہ شخص۔۔۔ کون تھا؟ ایک گہری سانس لے کر اس نے آنکھیں بند کرلیں اور کوشش کرکے اس کا چہرہ یاد کرنے لگی اور پھر چشم تصور میں اس شخص کا چہرہ نظر آتے ہی وہ لرز کر رہ گئی۔۔۔ وہ اسے اچھی طرح جانتی تھی۔

خون میں تر بتر چہرہ۔۔۔ مہرز کا تھا۔

☼ ☼ ☼

فری وے پر سب ہی گاڑیاں بہت تیز رفتار تھیں۔ اس کی اسپورٹس کار بھی تیزی سے ہر گاڑی کو پیچھے چھوڑتی آگے بڑھ رہی تھی لیکن اس کا ذہن پیچھے کی طرف دوڑ رہا تھا۔ وہ ایسا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے سر جھٹک کر کار کی رفتار تھوڑی اور بڑھادی۔ وہ آواز اس کے اردگرد ہر طرف گونج رہی تھی۔

"تمہاری بددعا نے میری زندگی برباد کردی۔" دہائی دیتی، شکوہ کرتی آواز۔۔۔ مہرز نے ایک گاڑی کو اوور ٹیک کیا، پر دل جہاں رکا تھا، وہاں سے ایک انچ آگے نہیں بڑھا تھا۔

"تم میرا درد کبھی نہیں سمجھ سکتے۔۔۔ وہ تکلیف کبھی محسوس نہیں کرسکتے جو میں نے کی ہے۔"

اس کی آنکھیں دھندلا گئیں۔ سر جھٹک کر اس نے آنسوؤں کو آنکھ سے باہر نکالا۔۔۔ ہاتھ اسٹیرنگ سے ہٹاتا تو کار بے قابو ہوسکتی تھی۔ وہ اپنی کار اور اپنے آپ پر قابو پانے کی بھرپور جدوجہد کررہا تھا۔ کار تو کنٹرول میں تھی مگر وہ خود۔۔۔

"تم یہاں سے چلے جاؤ۔ آئندہ مجھے اپنی شکل مت دکھانا۔"

مہرز نے رفتار اور بڑھادی۔۔۔ اپنے اور اس کے درمیان فاصلہ بھی بڑھادیا۔ اس کا شہر بہت بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ پر اس کا خیال پیچھا نہیں چھوڑ رہا تھا۔ وہ اس کی ہر بات مانتا آیا تھا۔ یہ بھی مان رہا تھا۔ وہ اس سے دور جانا چاہتی تھی۔ وہ دور جارہا تھا۔ وہ کبھی اس کی شکل نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ ملاقات کا ہر امکان ختم کررہا تھا۔ مگر ایک کسک دل میں کانٹے کی طرح چبھ رہی تھی۔ کیا رامین کو کبھی معلوم ہوسکے گا کہ وہ اسے دیوانوں کی طرح چاہتا رہا ہے جو وہ کہنا چاہتا تھا، اس کا موقع تو آج بھی نہیں ملا تھا۔

اس نے اپنا سیل فون اٹھایا اور رامین کا نمبر ملایا۔ اسی وقت ایک سرخ کار نے اسے اوور ٹیک کیا۔ مہرز نے ہارن پہ ہاتھ رکھا کے بجایا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

رامین نے ہیلو کہا۔ مہرز کو ڈر تھا۔ وہ اس کی آواز سنتے ہی فون بند کردے گی۔ اس لیے پہلی بات کی گئی تھی اس نے۔۔۔ شکر ہے رامین اس کی بات سننے کے لیے رضامند ہوگئی تھی۔۔۔ اور پھر مہرز نے کہہ دیا۔ حالانکہ وہ اس طرح یہ اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا۔۔۔ اور نہ ہی اس نے کبھی یہ سوچا تھا کہ محبت کے اعتراف کے بعد وہ کبھی اس سے مل نہیں پائے گا۔ اسے دیکھ نہیں پائے گا۔

شام کو رامین کی سنگت میں گزارے گئے وہ چند گھنٹے ہر خوف، ہر اندیشے سے پاک تھے۔ زندگی میں پہلی بار اسے اپنی محبت کو حاصل کرنا ممکن نظر آرہا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا اس خواہش کا اظہار ہی رامین کو ہمیشہ کے لیے اس سے دور لے جائے گا۔ دو فقروں میں اپنی بات کہہ کر مہرز نے فون منقطع کرکے سیٹ پر اچھال دیا۔ وہ رامین کا نفرت بھرا جواب سننا نہیں چاہتا تھا۔۔۔ ورنہ اسی لمحے مرجاتا۔۔۔

سرخ کار ابھی تک اسے آگے نکلنے سے روکے ہوئے تھی۔ غصے میں جبڑے بھینچ کر اس نے ایکسیلیٹر پر پاؤں رکھتے ہوئے اس کار کو دائیں جانب سے اوور ٹیک کرنے کا ارادہ کیا۔ اس لمحے اپنی لین تبدیل کرنے سے پہلے اسے انڈیکیٹر دینے کا خیال نہیں آیا تھا۔ اس لین میں تیز رفتاری سے آتے ٹرک نے ہارن بجا کر اسے خبردار کیا تھا۔ مگر بہت دیر ہوچکی تھی۔ اس اسپورٹس کار کو زد میں آنے سے بچانے کے لیے اس نے پورا اسٹیرنگ گھمایا، اس کے باوجود ایک دھماکے کے ساتھ ٹرک نے کار کو ٹکر ماری تھی۔

مہرز کی اسپورٹس کار وہ ٹکر برداشت نہیں کرپائی اور بیچ سڑک پر لہرا کر اپنا توازن کھوتی ہوئی الٹ گئی۔ ونڈ اسکرین کرچی کرچی ہوکر اس کے پورے جسم سے لپٹ گئی تھی۔ اگر سیٹ بیلٹ نہ بندھی ہوتی تو اسٹیرنگ وہیل اس کے سینے کو توڑ ڈالتا۔

اس کی گردن میں زبردست جھٹکے لگ رہے تھے۔ کار الٹنے کے باوجود رکی نہیں، بلکہ سڑک پر گھسٹتی جارہی تھی۔ پھر ایک جھٹکے سے اس کے پورے جسم کا بوجھ بائیں طرف منتقل ہوگیا۔ کار اپنے بائیں حصے پر الٹ کر آخرکار رک ہی گئی۔ پیچھے تمام گاڑیاں رک گئی تھیں۔۔۔ بھری پری سڑک پر لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہورہا تھا۔ مسلسل ہارن بج رہے تھے۔ لوگ چیخ رہے تھے۔ اسے پکار رہے تھے۔ لیکن وہ انہیں دیکھ سکتا تھا نہ سن سکتا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کا اپنا خون بہہ رہا تھا۔

"تمہیں نہیں معلوم جب سر سے خون بہتا ہے تو کتنا درد ہوتا ہے۔"

اسے درد ہو رہا تھا اور بہت درد ہو رہا تھا، وہ جان گیا تھا۔

"اور زخم دینے والے ہاتھ اپنے ہوں تو آنکھیں اندھی ہوجاتی ہیں۔"

اس نے اندھی ہوتی آنکھوں کو کھلا رکھنے کی ناکام سی کوشش کی۔۔۔ دوڑتے قدم، اجنبی چہرے۔۔۔ اس کے لیے پریشان تھے۔ سڑک پر اوندھی پڑی کار میں لہولہان مہرز کو یقین ہوگیا۔۔۔ وہ مر رہا ہے۔ اس کے حواس معطل ہو رہے تھے۔

زندگی ساتھ چھوڑ رہی تھی۔

"میرے مرنے کے بعد۔۔۔ کیا وہ مجھے دیکھنے آئے گی؟"

ذہن تاریک ہوتا جارہا تھا۔ بند ہوتی آنکھوں نے دنیا سے منہ موڑ لیا تھا۔

آخری خیال یہی آیا تھا۔ "کیا وہ آئے گی؟"

☼ ☼ ☼

کار سیٹ کی پشت پر سر ٹکائے وہ آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی۔

"اتنی چپ چپ کیوں ہوگئیں؟" مہ جبیں نے سڑک پر نظریں جمائے ہوئے اس سے پیار سے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔۔۔ بس ایسے ہی۔۔۔ تھک گئی ہوں شاید۔" وہ بدقت مسکرائی۔

"تمہاری خاموشی کی وجہ سے آج مجھے یہ راستہ بہت لمبا لگ رہا ہے۔" انہوں نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا۔

"اب تو پہنچ گئے ہیں نائیکرز فیلڈ۔ تھوڑی دیر میں

آپ کا گھر آہی جائے گا۔"

"ہاں۔۔۔ لیکن پہلے میں فیول بھروالوں۔۔۔" انہوں نے گاڑی گیس اسٹیشن کے احاطے میں لے جاتے ہوئے کہا۔ کچھ پیسے لے کر رامین گاڑی سے اتری اور پیٹرول کا پمپ ہاتھ میں لے کر گاڑی میں پیٹرول بھرنے لگی۔

مہ جبیں کا سیل فون بجنے لگا۔ فون سنتے ہی وہ بے حد گھبرا گئی تھیں۔ وہ جلدی سے پائپ واپس جگہ پر رکھ کر گاڑی کے اندر آگئی۔

"وہ ٹھیک تو ہے؟ میرے خدایا۔۔۔ میں پہنچ رہی ہوں۔" مہ جبیں نے سیل آف کرنے کے بعد نہایت پریشانی کے عالم میں گاڑی مین سڑک پر لاکر اسپتال کی طرف موڑی۔۔۔

"کیا ہوا خالہ۔۔۔ سب خیریت ہے؟"

"نہیں۔۔۔ خیریت نہیں ہے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا نا میری بہت اچھی فرینڈ کا بیٹا' جو ہمارے نیبر زمیں رہتے ہیں۔۔۔ اس کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔ بہت سیریس کنڈیشن ہے اس کی۔ وقار وہیں اسپتال میں ہیں۔"

"اچھا وہ۔۔۔ رز؟ جن کے گھر آپ نے کیک بھجوایا تھا۔" اسے یاد آگیا۔

"ہاں وہی۔۔۔ اس کا نام مہرز ہے۔"

"جی۔۔۔؟" رامین کی نگاہوں کے سامنے وہی ہنستا مسکراتا چہرہ یکدم خون میں نہا گیا۔

☼ ☼ ☼

وہ اپنے دھڑ دھڑاتے دل پر قابو پانے میں ناکام ہو چکی تھی۔

"اللہ کرے وہ ٹھیک ہو۔" اسپتال کے گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی بے اختیار اس کا دل چاہا وہ کار سے باہر کود جائے۔ اس سے صبر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ جلد سے جلد اسے صحیح سلامت دیکھ کر اپنی تسلی کرنا چاہتی تھی۔

مہ جبیں نے پارکنگ لاٹ میں گاڑی کھڑی کی اور تیز تیز قدم اٹھاتے اسپتال کے ایمرجنسی یونٹ کی طرف بڑھیں۔ استقبالیہ پر ہی وقار خالو نظر آگئے۔ رامین کا ذہن آندھیوں کی زد میں تھا' اس نے بے قرار ہو کر ادھر ادھر دیکھا' تو آئی سی یو کے باہر کاریڈور میں حسن نظر آیا۔

"کیا ہوا ہے اسے حسن۔۔۔ بولو؟" حسن کا کالر پکڑ کر وہ زور زور سے رونا شروع ہو گئی۔ "بتاؤ مجھے۔۔۔ وہ زندہ ہے نا۔۔۔ وہ ٹھیک ہے نا؟"

"رامین سنبھالو خود کو۔۔۔" مہ جبیں دوڑ کر اس کے نزدیک آئیں۔ اور اسے کندھوں سے تھام کر سہارا دیا۔

"نہیں خالہ۔۔۔ وہ مجھ سے ناراض ہے۔ اس نے کہا تھا وہ مر جائے گا۔ دیکھیں وہ چلا گیا۔ اسے روک لیں پلیز اسے روک لیں۔ اب میں اس سے کبھی نہیں لڑوں گی۔ اسے واپس بلا لیں۔" رامین ان کے ہاتھوں سے نکلی جا رہی تھی۔ وہ حسن کا بازو کھینچ کر اسے جھنجھوڑتے ہوئے التجا کرنے لگی۔

"وہ تمہارا دوست ہے نا' تمہاری بات ضرور سنے گا۔ اس سے کہو مجھے معاف کردے۔۔۔ وہ دیکھو اس کی ہارٹ بیٹ رک گئی ہے۔ وہ اسے لے کر جا رہے ہیں۔ انہیں روکو حسن۔۔۔" رامین کو شیشے کے پار ہارٹ مانیٹر صاف نظر آرہا تھا۔ جس میں دل کی دھڑکن سیدھی لکیر کی صورت چل رہی تھی۔

حسن نے مڑ کر دیکھا' رامین ٹھیک کہہ رہی تھی۔ ہارٹ مانیٹر پہ دل کی دھڑکن لکیر کی صورت نظر آتے آتے معدوم ہونے لگی۔

"رامین! وہ بالکل ٹھیک ہے۔" حسن نے اسے کندھوں سے تھام کر نرمی سے سمجھایا۔ "ہارٹ مانیٹر آف کر دیا گیا ہے۔ اسے روم میں شفٹ کر رہے ہیں۔ کچھ گھنٹوں بعد اسے ہوش آجائے گا۔ اب اس کی حالت خطرے سے باہر ہے۔"

اسے یقین نہیں آیا۔ وہ یک ٹک حسن کے ہونٹوں کی جنبش دیکھتی رہی۔ جو اسے مہرز کے زندہ ہونے کی نوید سنا رہے تھے۔

حسن نے دوبارہ کہا۔ "ہی از فائن رامین!"

"اللہ کا شکر ہے۔" مہ جبیں نے رامین کو اپنے بازوؤں میں بھرتے ہوئے اس کا سر اپنے کندھے سے لگاتے ہوئے کہا۔

☼ ☼ ☼

مہرز ابھی تک خواب آور دواؤں کے زیر اثر تھا۔ رامین اس کے بیڈ کے بالکل پاس کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس کے زخمی چہرے اور دائیں بازو پر موجود خراشوں پر باریک کھرنڈ ابھرنے لگا تھا۔ بایاں بازو دو جگہ سے فریکچر تھا' جن پر پلاسٹر چڑھا دیا گیا تھا۔ کار الٹ جانے باعث اس کے سر کو شدید جھٹکے لگے تھے۔ زخم بھی آیا تھا پر زیادہ گہرا نہیں تھا۔ اس کی خوش قسمتی تھی' ونڈ اسکرین کی کرچیوں سے آنکھیں محفوظ رہی تھیں۔ پولیس ڈاکٹر سے رپورٹ لے چکی تھی' وہ نشے میں نہیں تھا۔ یہ ایکسیڈنٹ ذہنی دباؤ جلد بازی کا نتیجہ تھا۔

رامین سانس روکے جانے کب سے اس کے زخم گنے چلے جا رہی تھی۔ پھر بھول جاتی اور دوبارہ گننے لگتی۔ اسی دوران اس کی پلکوں پر ٹھہرے آنسو چھلک کر مہرز کی کلائی پر گرے۔ اس باریک سی خراش پر جس کے کناروں پر ہلکا سا خون ابھی تک تازہ تھا۔ وہ آنسو اس خراش میں جذب ہوا اور مہرز کا ہاتھ لرزا۔

"جب تم روتی ہو' مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے۔" اس نے سچ کہا تھا۔ رامین کے رونے سے واقعی اسے تکلیف ہو رہی تھی۔ وہ لب بھینچ کر فوراً" پیچھے ہٹ گئی اور بے رحمی سے تمام آنسو پونچھ ڈالے' اسے اپنے آپ سے نفرت ہو رہی تھی۔ جب وہ کہہ رہا تھا کہ اس کا درد سمجھ سکتا ہے تو رامین کو یقین نہیں آیا تھا۔ بھلا جب اس نے وہ درد سہا نہیں تو جان کیسے سکتا تھا۔ سمجھ کیسے سکتا تھا؟ مگر اب وہ جان گئی تھی۔ کسی تکلیف کا احساس کرنے کے لیے خود وہ زخم کھانا ضروری نہیں ہوتا۔ اگر ہم کسی کو دل سے چاہتے ہوں تو اس کا ہر حال ہمارے اوپر اترتا ہے۔ اس کا ہنسنا ہمیں ہنساتا ہے' اس کی خوشی ہماری خوشی ہوتی ہے' اس کے آنسو ہماری آنکھ سے بہتے ہیں اور اس کا درد۔۔۔ ہم اپنے جسم پر سہتے ہیں اور سسکتے ہیں۔

یہ درد تو جسم کے تھے۔ ان سب سے بڑھ کر ایک زخم اور تھا جو اس کے دل کو گھائل کر رہا تھا۔ پچھتاوے اور افسوس کا۔ ماہی بے آب کی طرح تڑپنے کے لیے چھوڑ دیا دل کو۔۔۔ مہرز کی اس حالت کی ذمہ دار وہی تھی اور سب سے بڑھ کر غم خوار بھی خود وہی تھی۔ ندامت کے آنسو ٹھہرنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔

حسن آہستگی سے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ وہ بے آواز قدموں سے چلتا ہوا اس کے نزدیک آگیا اور جھک کر سرگوشی کی۔ "اٹھو رامین' باہر آنٹی بلا رہی ہیں' اب تم گھر جاؤ۔ رات بہت ہوگئی ہے۔" اس نے سر اٹھا کر حسن کی طرف دیکھا۔

پتا نہیں کیوں اسے خوف محسوس ہوا کہ اس کمرے سے باہر آکسیجن نہیں ہے۔ وہ مہرز کے پاس سے چلی گئی تو مر جائے گی۔ اس سوچ نے قدم جکڑ لیے تھے۔

"صبح دوبارہ آجانا۔" حسن اسے گہری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ کچھ بڑبڑا رہی تھی۔

"کیا صبح ہو گی؟" اس نے ساتھ کچھ اور بھی کہا جو حسن کو سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

"تم گھر جا کر آرام کرنا۔۔۔ جب مہرز کو ہوش آیا' میں تمہیں کال کر کے بتا دوں گا۔"

رامین نے سر جھکا لیا پھر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

پورا گھر خالی پڑا تھا' یقیناً" خالہ اور خالو اسپتال جا چکے تھے۔ اس کی نظر ڈائننگ ٹیبل پر رکھے ہوئے ایک پیکٹ پر جا رکی۔ وہ میز کے نزدیک آئی اور پیکٹ کھول کر تمام چیزیں باہر نکال لیں۔

ایک سیل فون' چابیاں' ڈرائیونگ لائسنس اور والٹ۔ ان میں سے دو چیزوں کو وہ اچھی طرح پہچانتی

تھی۔ سیل فون اور والٹ مہرز کا تھا' اس نے ڈرائیونگ لائسنس اٹھایا تو تصویر دیکھ کر اس کا دل آنکھوں میں سمٹ آیا۔ مہرز کی تصویر دیکھ کر اس کی بے تابی میں خاطر خواہ کمی آئی تھی۔ اپنے لیے چائے بنانے کچن میں آئی تو فریج پر لگے نوٹ کو پڑھا' مہ جبیں نے لکھا تھا' وہ دوپہر تک آکر اسے اپنے ساتھ دوبارہ اسپتال لے جائیں گی۔ مہرز کو ابھی تک ہوش نہیں آیا تھا۔ حسن کو اپنی ٹریننگ پر واپس آنا تھا اس لیے وہ مہرز کے پاس رک رہی تھیں۔ شام میں حسن دوبارہ آنے والا تھا۔

اپنی چائے لے کر وہ باہر لان میں کرسی پر آکر بیٹھ گئی۔ کرسی پر بیٹھے بیٹھے اس کی نظریں مسلسل مہرز کے گھر کا طواف کر رہی تھیں بتا نہیں کیوں بڑی شدت سے اس کا دل چاہ رہا تھا کہ کسی طرح اس کے گھر کے اندر پہنچ جائے۔

ڈائننگ ٹیبل پر آکر پھر سے وہ پیکٹ کھولا' نہایت عقیدت اور محبت سے ہر شے پہ ہاتھ پھیرتی مہرز کی تصویر کو دیکھے گئی۔ بہت آسان ہوتا ہے درد سہنا۔ پچھتاوے کا بوجھ اٹھانا بہت مشکل ہوتا ہے اور وہ تو شاید ہر مشکل کام کرنے کے لیے پیدا ہوئی تھی۔

ٹیلی فون کی گھنٹی سن کر وہ اچھل پڑی۔ دھڑ دھڑاتے دل کو قابو میں لاتی فون کی طرف بڑھی' دوسری طرف وقار خالو تھے۔

"رامین۔ ابھی تھوڑی دیر میں مہرز کے آفس سے مسٹر جوزف آئیں گے۔ ہماری ڈائننگ ٹیبل پر جو پیکٹ ہے اس میں مہرز کے گھر کی چابیاں ہیں۔ وہ انہیں دے دینا۔ بلکہ تم بھی ساتھ چلی جانا۔ مسٹر جوزف اسٹڈی میں جائیں گے اور وہاں سے اس کی کار کے انشورنس کے کاغذات لے آئیں گے۔ اوکے۔"

"جی۔" اور اس سے پہلے کہ وہ مہرز کے بارے میں پوچھتی انہوں نے فون بند کر دیا تھا۔

مسٹر جوزف دس منٹ بعد ہی آگئے۔ ان کے بیل بجانے پر اس نے چابیاں ہاتھ میں لیں' دروازہ کھولا اور دھڑکتے دل کے ساتھ مہرز کے گھر کی جانب چل پڑی۔

☆ ☆ ☆

مسٹر جوزف مطلوبہ فائل لے کر چلے گئے تو اس نے دروازہ بند کر دیا۔ اب وہ اکیلی تھی۔ آج پہلی بار وہ اس گھر کے اندر آئی تھی مگر بالکل بھی اجنبیت محسوس نہیں کر رہی تھی۔ اسے ڈر نہیں لگ رہا تھا۔ ہچکچاہٹ بھی نہیں ہو رہی تھی۔ پورا گھر خالی پڑا تھا۔ مہرز کے کمرے کے علاوہ فی الحال اسے اور کچھ نہیں دیکھنا تھا۔ اس کا ارادہ وہاں کچھ دیر بیٹھنے کا تھا۔ اور بس۔ پھر وہ واپس چلی جاتی۔

اتنا اندازہ تو تھا اسے کہ لان کی طرف آخری سرے پر اس کا کمرا ہے۔ قدم اپنے آپ بڑھتے ہوئے جا رہے تھے۔ اسے کوئی تردد نہیں کرنا پڑ رہا تھا۔ ایک بے اختیاری سی کیفیت طاری تھی' جس کے زیر اثر وہ کچھ بھی سمجھنے بوجھنے کی صلاحیت کھو بیٹھی تھی۔ اسے سکون کی تلاش تھی۔ جو اسے وہیں مل سکتا تھا۔ جہاں مہرز کی خوشبو تھی۔ اس کی موجودگی کا احساس تھا۔

دروازہ کھولتے ہی اس نے گہری سانس کے ساتھ اس مخصوص مہک کو اپنے اندر اتار لیا' جو مہرز کی پہچان تھی۔ پتا نہیں واقعی اس کا کمرا خوشبو سے مہک رہا تھا یا اسے لگ رہا تھا۔

کچھ دیر آئینے کے سامنے کھڑی رہی جیسے مہرز کا عکس ابھی تک وہیں ٹھہرا ہو۔ پھر پلٹی۔ بیڈ کے نزدیک آئی اور سائیڈ ٹیبل پر سجے فریم میں مہرز کی اپنے ماں باپ کے ساتھ تصویر کو ہاتھ میں لے کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔ کافی دیر نہایت غور سے مہرز کو دیکھتی رہی۔ پہلی بار وہ اسے اس نظر سے دیکھ رہی تھی' جو نئی نئی اس کے دل میں مہرز کے لیے پیدا ہوئی تھی۔ وہ کتنا گڈ لکنگ ہے' یہ اسے اب معلوم ہوا تھا۔ سر جھٹک کر مسکراتے ہوئے اس نے وہ فریم واپس جگہ پر رکھ دیا۔ پھر جانے کیوں اس نے درازیں کھولیں' ایک کے بعد دوسری' پھر تیسری' وہ ہر اس چیز کو بھرپور توجہ دے رہی تھی۔ جس پر مہرز سرسری سی نظر بھی شاید ہی ڈالتا ہو گا۔

پہلی دراز کو آہستگی سے اپنی جانب دھکیلا' چھوٹے بڑے باکسز گفٹ ریپر میں لپٹے رکھے ہوئے تھے' بند کرنے کے بعد اس نے دوسری دراز کھولی۔ چھوٹی سی البم' ڈائری اور جیولری باکس۔ وہ بھی اس نے بند کر دی مگر تیسری دراز کھولنے کے بعد وہ اسے بند نہیں کر پائی۔ جس میں چھوٹے بچوں کی کہانیاں والی کتابیں اور انگلش کامکس بھری ہوئی تھیں۔ رامین سانس روکے اس دراز میں پڑی کتابوں کو دیکھے گئے۔ وہ سب اس کی تھیں۔

اسے یاد تھا وہ بکس پڑھنے کے بعد مہرز کو دے دیا کرتی تھی مگر کتنے سال ہو گئے تھے۔ وہ انہیں اب تک سنبھال کر کیوں رکھے ہوئے تھا؟ لرزتے کانپتے ہاتھوں سے اس نے سب کچھ دوبارہ اسی طرح رکھا۔ اور دوسری دراز نکال کر اپنے سامنے رکھ لی۔ ڈائری اٹھائی' کھولی۔ اس ڈائری میں کچھ بھی لکھا ہوا نہیں تھا۔ پوری ڈائری میں جابجا اسٹکرز اور بہت سی ٹافیز کے ریپرز پیسٹ کیے گئے تھے۔ جو اس نے مہرز کو دیے تھے۔ کلاس ون سے فور تک۔ اسے ٹھیک سے یاد نہیں آرہا تھا یا پھر یقین نہیں آرہا تھا۔ اچھی طرح دیکھنے کے بعد اس نے ڈائری واپس رکھی اور جیولری باکس اپنی گود میں رکھ کر کھول لیا۔ چھوٹا سا سبز رومال' ایک ٹوٹا ہوا کلپ' ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے ٹکڑے' اس نے اپنی آنکھیں رگڑیں۔ وہ سب کچھ صاف صاف دیکھنا چاہتی تھی۔ ایک گہری سانس لے کر اس نے حلق میں اٹکتے آنسوؤں کو گلے کے اندر اتار لیا۔ استعمال شدہ پنسلیں' اس نے ننھی منی کئی پنسلیں اٹھا کر دیکھیں' جو اتنی چھوٹی ہو چکی تھیں کہ انہیں پکڑ کر کچھ لکھا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ اس کی شروع سے عادت تھی۔ وہ ہمیشہ پنسل کو آخر تک استعمال کیا کرتی تھی۔ یہ سب معمولی اور بے کار چیزیں' جنہیں مہرز نے کسی خزانے کی طرح سنبھال کر رکھا۔ وہ سب رامین کی تھیں۔

البم میں ان کے اسکول کی بہت سی پکچرز تھیں' کلاس گروپ فوٹوز' پکنک کارنیول اور سب سے آخر میں فیئرویل فنکشن کی تصاویر تھیں۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے ساری تصویریں دیکھ رہی تھی۔

"یہ محبت بھی تو ہو سکتی ہے۔"

"میں نہیں مانتی۔"

"مت مانو' وقت خود ثابت کر دے گا۔"

اور وقت نے کیسا ثابت کیا تھا۔ بیس اکیس سال۔ اس نے رامین کے ساتھ گزارے ہوئے لمحوں کی ایک ایک یاد کو متاع حیات کی طرح سنبھال کر رکھا تھا۔

"میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں رامین آئی لو یو۔"

کیا تھی وہ۔؟ ایک عام سی لڑکی' جسے وہ دیوانوں کی طرح چاہتا آیا تھا' وہ پوری دراز رامین سے مہرز کی محبت کے ثبوتوں سے بھری پڑی تھی۔ سب سے پہلی دراز بھی نکال لی تھی اس نے۔ وہ چھوٹے بڑے گفٹ باکسز' جن میں سے اکثر گفٹ پیپرز کے کنارے سفید ہو چکے تھے' "تقریباً" دس گیارہ تھے۔ ہر ایک پر تاریخ پڑی تھی۔ چھوٹے سے کارڈ پر درج کیا گیا تھا۔

"ہیپی برتھ ڈے رامین۔"

وہ اس کا گھر جانتا تھا۔ فون نمبر جانتا تھا۔ اس کے باوجود وہ کبھی اس کے پیچھے نہیں آیا تھا۔ جس طرح وہ ہر سال اس کی برتھ ڈے یاد رکھتی رہی تھی' وہ بھی رکھتا آیا تھا۔ نہ صرف یہ کہ اس نے یاد رکھا تھا بلکہ ہر سال کا ایک گفٹ بھی خریدتا تھا' اس سال کا بھی' جب وہ الگ ہوئے تھے' حالانکہ اس وقت بظاہر وہ اس سے شدید خفا تھا۔

اتنے پرخلوص انسان نے اسے چاہا' اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہا۔ اور اس نے کیا کیا؟ اس نے مہرز کو دھتکار دیا تھا۔ آخر کیا چاہیے تھا اسے دائمی خوشی؟ لازوال محبت؟ یا عزت و احترام۔؟

اسے مل تو رہی تھی ہاں اس ہستی سے نہیں مل پائی تھی جس سے وہ امید کر رہی تھی مگر مل تو رہی تھی۔ لیکن اس نے شک کیا۔ اور ٹھکرا دیا۔

اس ضدی بچے کی طرح جسے کھانے کو مٹی نہ دی جائے تو مٹھائی کھانے سے بھی انکار کر دیتا ہے۔

اس نے بھی مہرز کے ساتھ یہی کیا تھا۔ صرف مہرز ہی کیا۔ وہ تو شاہ زیب عرا ئیلو فرانی خالاؤں اور کزنز کے ہوتے ہوئے بھی محبت کی کمی کا رونا روئے جا رہی تھی اب تک... یہ ناشکری نہیں تو اور کیا تھا۔

نازنین کے ماہرانہ ہاتھ ایک لکڑی کے بلاک کو خوب صورت جسم میں باآسانی تبدیل کر لیتے تھے پر اس سے اپنی بیٹی اپنے مطابق ڈھالی نہیں گئی تو سخت ہاتھوں سے اس کی صورت مسخ کرنے پر تل گئی تھی' اپنی بے بسی پر غصہ آتا تھا اسے۔ رامین کو ماں سے متوقع محبت نہ ملی تو وہ خود ترسی کی دلدل میں دھنستی چلی گئی تھی۔

دونوں ماں بیٹی میں زیادہ فرق نہیں تھا۔ ایک خود پرستی میں مبتلا۔ ایک خود ترسی میں۔ دونوں کیفیات انسان کو صرف "میں" تک محدود رکھتی ہیں۔ وہ صرف اپنے بارے میں ہی سوچتے ہیں بس۔ اور ان کے اس "میں" کا بھگتان ان کے پیاروں کو بھگتنا پڑتا ہے' ایک ظالم تو دوسرا مظلوم بن کر تمام عمر اسی رنج میں گرفتار رہتا ہے کہ اسے اس کا حق نہیں ملا۔

یہ دونوں انسان کبھی خوش نہیں رہ پاتے' بے یقین' بے اعتبار رہتے ہیں۔ کسی نعمت کا شکر بھی ادا نہیں کر پاتے۔

اپنے من مندر میں خود اپنی مورت سجا کر نازنین اس کے سامنے سربسجود رہتی بھینٹ لیتی' روپیوں کی' زیور کی' ہیروں کی سونے چاندی کی۔ سب چڑھاوے لے کر بھی اس بت کے لبوں پر حوصلہ افزا مسکراہٹ نمودار نہیں ہوتی۔ وہ کسی کو کچھ نہیں دے سکتا' ماتھے کی شکن تک نہیں۔ لبوں کی مسکراہٹ نہیں' خوشی تو بہت دور کی بات ہے۔

ایسا ہی بت رامین نے بھی خود پر ترس کھا کر بنایا تھا۔ وہ اس کی عبادت نہیں کرتی تھی۔ اس کے گلے لگ کر اپنا دل ہلکا کر لیتی تھی' اس کا ہاتھ تھام کر روتی تھی' اب خوشی کے عالم میں وہ بت اسے نہیں چھوڑ رہا تھا۔ اپنی ماں کے ہاتھوں سے بنائے بت کتنی آسانی سے توڑ ڈالے تھے اس نے' اور اپنی مورت؟ اس کے سامنے وہ خود کو بے جان محسوس کر رہی تھی' سہا تھ کیسے اٹھاتی...؟

☆ ☆ ☆

اس کا ذہن بے دار ہوا تو اس نے بہت وقت سے آنکھیں کھولیں' کمرے میں نیلگوں سفید سی روشنی تھی۔ وہ شدید نقاہت محسوس کر رہا تھا' ٹوٹتے جسم میں ہلنے جلنے کی طاقت نہیں تھی۔ یونہی لیٹے لیٹے وہ یاد کرنے لگا' آخری بار ہوش میں رہتے ہوئے ان کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ ایکسیڈنٹ...

اسے یاد آگیا تھا۔ اور اس وقت وہ یقیناً "اسپتال کے بیڈ پر لیٹا تھا۔ لیکن اسے اس طرح بیڈ پر سیدھے لیٹے ہوئے کتنے گھنٹے یا دن گزر چکے تھے اسے کچھ اندازہ نہیں تھا۔ آہستہ سے گردن ہلاتے ہوئے اس نے اپنے اردگرد دیکھنے کی کوشش کی' کمرا خالی تھا۔

اس نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ اسی سوتی جاگتی کیفیت میں اس نے دروازہ کھلنے کی آواز سنی' پھر بند ہونے کی اور پھر قدموں کی چاپ لحہ بہ لحہ نزدیک آنے لگی۔ کوئی اس کے بالکل پاس آکر ٹھہر گیا۔ مہرز بدستور اپنی آنکھیں بند کیے لیٹا رہا۔

خاموشی کا وقفہ طویل ہوتے ہوتے وہ دوبارہ نیند میں جانے والا تھا کہ اسے محسوس ہوا' اس کے ہاتھ میں چبھی چند باریک سوئیاں ایک ایک کر کے نکل رہی تھی۔ درد تحلیل ہونے لگا' ہر ایک سوئی کے نکلتے ہی محبت بھرا لمس جسم میں اترنے لگتا تھا' اس کے زخموں کو سہلایا جا رہا تھا۔ ذہن یکدم پوری طرح بے دار ہو گیا۔

کچھ لمحوں بعد وہ جادوئی لمس اس کی پیشانی پر بکھرنے لگا' پھر چہرے پر... جہاں جہاں چھوا جاتا' وہ حصہ درد سے خالی ہوتا جا رہا تھا۔

اس کے لب مبہم سا مسکرائے۔

"کون؟" اس نے بند آنکھوں سے دیکھنا چاہا۔

وہ لمس ٹھہرا' پھر مہکتی سانس میں لپٹے چند الفاظ کا تعارف اس کے پورے وجود میں سرایت کر گیا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اسے ہوش میں آتا دیکھ کر وہ مسکرائی۔ جانے اس نے کیا کہا مہرز کی سمجھ میں نہیں آیا تھا' وہ کافی دیر سے اس کا ہاتھ اور پیشانی سہلا رہی تھی جس کے باعث ہر درد معدوم ہونے لگا تھا' پر اب اس کی انگلیاں ساکت تھیں' مہرز نے پرسکون ہو کر اپنی آنکھیں بند کر لیں اور کہا۔

"رک کیوں گئیں۔ مجھے آرام مل رہا تھا۔" اس کے ایسا کہتے ہی وہ لمس دوبارہ سے رگ جاں میں زندگی بن کر اترنے لگا۔

☆ ☆ ☆

مہرز گہری نیند میں چلا گیا تو رامین نے مرہم واپس میڈیسن ٹرے میں رکھ دیا۔ وہ اس کے بازو اور چہرے پر موجود خراشوں پر مرہم لگا رہی تھی۔ اب جبکہ وہ سو چکا تھا تو رامین خاموشی سے اس کے بیڈ کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھ کر اسے غور سے دیکھنے لگی۔

بہت محبت اور پیار سے... ایسی نظر سے اس نے آج سے پہلے کسی مرد کو نہیں دیکھا تھا۔ آخر مہرز میں ایسا کیا تھا؟ یہاں آنے سے پہلے اس نے اپنی پوری زندگی کا تجزیہ کر لیا تھا' اپنے تمام سوالوں کے جواب حاصل کر لیے تھے' اسے کیا نہیں ملا تھا۔ اور اسے کیا چاہیے تھا۔ وہ جان چکی تھی۔

کتاب زندگی کی سب سے طویل الجھن کا اختتام ہو گیا تھا۔ اور بڑے ہی عجیب انداز میں ہوا تھا۔ اس پل' اس لمحے مہرز کے گھر میں اس کے بیڈ روم میں... اس کی دراز میں رکھی اپنی تمام چیزوں کو دیکھ لینے کے بعد اس نے پہلی بار خود پر فخر کیا تھا۔ اور شاید پہلی بار اپنی ذات میں مقید اس روتے دھوتے ماتم کرتے وجود سے گھن محسوس کی تھی' اسے کراہیت آرہی تھی اس ناشکرے بت سے جو خود اس کا ہم شکل تھا۔ اسی کی ذات کا پرتو۔ اس چھوٹے سے خزانے نے... اس کی توقیر میں بے پناہ اضافہ کر دیا تھا۔ وہ معتبر ٹھہرا دی گئی تھی' نہایت قابل احترام ہستی جس کے لیے خود ترسی کے بت کو پاش پاش کرنا بے حد سہل تھا اور اس نے کر دیا تھا۔ اپنی زندگی کے چھبیس سالوں میں وہ کتنے مردوں سے ملی تھی۔ اس کے پاپا' جو ماما سے محبت کرتے تھے مگر جانوروں کی طرح سلوک کرتے اور بے عزت کیا کرتے تھے۔

وہ ترکھان جو بہانے بہانے سے ایک کم سن بچی کو گود میں بٹھا کر اپنی حیوانی جبلت کی تسکین چاہتا تھا۔ اس کی ماں کی شاعری سے محبت کرنے والے' جو اپنی غلیظ نگاہوں سے اسے سر سے پاؤں تک ناپتے رہتے تھے اور پھر زین... محبت کا دعوے دار' جو نکاح میں لانے کے بعد ذلیل کر کے چھوڑ گیا تھا۔ رامین کی نظر میں محبت سے زیادہ ناقابل اعتبار کوئی تھا ہی نہیں۔

اسے عزت و تکریم پانے کی خواہش تھی ہمیشہ سے' اور یہی خواہش اس سے وہ تمام فیصلے کرواتی چلی گئی تھی جس کی بہت بھاری قیمت ادا کرنی پڑی تھی اسے۔

مہرز وہ واحد شخص تھا جو صرف اس سے محبت نہیں کرتا تھا' اس کا احترام بھی کرتا تھا۔ اسے خود سے کمتر نہیں سمجھتا تھا۔ اس کی رائے' اس کی ناراضی کو ویسی ہی اہمیت دیا کرتا تھا جتنی کہ خود اپنے آپ کو دیتا تھا۔

فقط غیر مشروط محبت کا احساس اسے مہرز کے قریب نہیں لایا تھا۔ نہیں!

صرف محبت ہوتی تو وہ کبھی اعتبار نہ کرتی' کبھی مہرز کی زندگی میں شامل ہونے کا فیصلہ نہ کرتی۔

صحیح دیکھا تھا اس نے۔ وہ خواب سچ ہی تھا... اس کی عمر بھر کی پیاس صرف مہرز ہی بجھا سکتا تھا۔ اور کوئی نہیں!

شہزادی عباس خلجی

تیرے سنگ حسین ہے گزر

مکمل ناول

سنگ مرمر کی تنگ سیڑھیاں پھلانگتا وہ تیزی سے اوپر آگیا۔ مدھم چاند کی روشنی میں اس کے پرکشش نقوش پر پھیلا اضطراب اور مایوسی آسانی سے دکھائی دے رہے تھے۔ چند لمحوں قبل اس سے کہی جانے والی بات کے اثر نے اسے یوں سب کے بیچ سے اٹھ آنے پر مجبور کردیا تھا۔

"مرتضیٰ۔" وہ بھی اس کے پیچھے ہی آئی تھی۔ وہ جانتا تھا، وہ آئے گی اس کے پیچھے..... ہمیشہ کی طرح.....

تیز تیز سیڑھیاں چڑھنے کے باعث اس کا سانس پھول رہا تھا۔ وہ چپ چاپ رخ موڑے خفا خفا سا کھڑا رہا۔

"اوہو! ایک تو تم نے یہ عورتوں کی طرح ذرا ذرا سی بات پر روٹھنا کہاں سے سیکھ لیا ہے؟" وہ خاموش رہا۔

"مگر تایا ابا کچھ کہتے ہیں تو تمہارے بھلے کے لیے

ہی کہتے ہیں نا!

"کہیں ضرور کہیں۔ مگر یوں ہر کسی کے سامنے تذلیل کس لیے؟" وہ چیخا۔

"مرتضیٰ۔۔۔ اب میں ابا اور بیگن تمہارے لیے ہر کسی ہوگئے؟" اس کے خفگی سے کہنے پر وہ خجل ضرور ہوا۔ مگر رخ پھیرے ہی کھڑا رہا۔

"پتا نہیں۔۔۔ مگر مجھے اچھا نہیں لگتا۔۔۔ ہر وقت ایک ہی رٹ' ایک ہی طعنہ 'کچھ نہ کرنے کا' خالی بیٹھا رہنے کا۔ میں کوشش کر تو رہا ہوں۔ پڑھنے کے ساتھ ساتھ نوکری کے لیے جوتیاں چٹخا تو رہا ہوں۔ پھر کیوں مجھے بار بار ایسی باتیں سننے کو ملتی ہیں؟"

"او ہو!" اس نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ "یہ باتیں تو تمہیں سرگرم رکھنے کے لیے ہوتی ہیں ناں بے وقوف!" نیم سنجیدہ انداز میں کہہ کر وہ تھوڑا آگے جھکی۔

"یہ لفظ ہی تو تمہیں سرگرم عمل رکھتے ہیں۔۔۔ انہیں کمتر نہ سمجھنا۔" وہ شریر انداز میں بولی۔

"بس کرلی بکواس؟ اب جاؤ یہاں سے۔ میں اوپر کچھ وقت سکون سے گزارنے آیا ہوں اور یہاں بھی تمہاری قینچی جیسی زبان۔۔۔"

"سوچ لو لڑکے! میں چلی گئی تو پھر واپس نہیں آؤں گی۔" وہ ہمیشہ سے ایسے ہی تھی۔ غیر سنجیدہ۔۔۔ لاابالی۔

"ہاں ہاں۔۔۔ جاؤ۔"

"اوکے! پھر میں تو چلی۔۔۔ اور یہ جو تمہاری پسند کی میٹھی مکئی لائی تھی ناں۔۔۔ یہ بھی لے جا رہی ہوں۔"

ہاتھ میں تھمی کاغذ کی بنی دو کپوں میں مکئی لیے وہ واپس مڑی۔ مرتضیٰ نے تھوڑا سا پلٹ کر دیکھا۔ وہ اس کے پیچھے کھڑی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

"ندیدے!" دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

مرتضیٰ چلتا ہوا چھت کی منڈیر کے پاس جا کھڑا ہوا۔ ام مریم بھی چلتی ہوئی اس کے پاس جا رکی۔ زرد زرد سا چاند ہلکی چاندنی بکھیرے ہوئے تھا۔ چھت پر پھیلے سناٹے کے دامن میں زرد سی بہتی چاندنی بہت سحر آفرین لگ رہی تھی۔ ام مریم آگے بڑھ کر اس کے ساتھ آ کھڑی ہوئی۔

"لو کھاؤ۔۔۔ اپنی فیورٹ میٹھی مکئی۔" مرتضیٰ نے ایک نظر اس کے بڑھے ہاتھ کو دیکھا اور پھر اس کے چہرے کو' جو خلوص و اپنائیت کی روشنی سے دمک رہا تھا۔

"میری شکل کیا دیکھ رہے ہو۔۔۔ لو ناں!" اس نے کاغذ کی کپی اس کے ہاتھ میں تھما دی اور خود بھی مگن سی کھانے لگی۔

مرتضیٰ کو اس پر ٹوٹ کے پیار آیا۔ وہ اسے اپنی مکئی میں سے دانے اس کی کون میں ڈالتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اسے یہ کتنی پسند تھی۔ وہ ہمیشہ اپنے حصے کی چیز بھی اسے دے دیا کرتی تھی۔ وہ تو اور بھی بہت کچھ جانتی تھی۔ یہ بھی کہ اگر اسے فوری طور پر منایا نہ جائے تو وہ اگلے کئی روز تک منہ پھلائے پھرتا تھا۔ اس لیے وہ ہمیشہ سے اسے منانے میں لمحوں کی بھی تاخیر نہ کرتی تھی۔ وہ ایسی ہی تھی۔ سب کا دل ٹھنڈا رکھنے والی' سب کو خوش دیکھنے کی تمنا کرنے والی۔

"کبھی کبھی میں سوچتا ہوں ام مریم! تم ایسے حالات میں اتنی مطمئن کیسے رہتی ہو؟" وہ اپنے دل کی بات زبان پر لے آیا۔

"مطلب؟" ہتھیلی پر دھرے مکئی کے دانے ایک ایک کرکے ٹونگتی وہ اسے ناسمجھی سے دیکھنے لگی۔

"ہم اور ہمارے حالات ایسے تو ہیں نہیں کہ خوش باش پھرتے رہیں۔" اس کی غیر حاضر دماغی پر وہ قدرے جھنجلایا۔

"کیوں؟ ہمارے حالات کو کیا ہوا؟"

"تن پر ڈھنگ کا کپڑا نہ ہو۔ کھانے کو اچھا دستیاب نہ ہو تو کوئی کیسے خوش رہ سکتا ہے؟ کیونکر مطمئن ہو سکتا ہے؟"

"اف اللہ مرتضیٰ! کتنی بڑی بڑی باتیں کرتے ہو۔ شکر ہے رب کا کہ ہمارے تن پر کپڑا بھی ہے اور کھانے کو اچھا بھی دستیاب ہے۔ اب اپنے ہاتھ میں یہ میٹھی مکئی ہی دیکھ لو۔" بات کے اختتام پر وہ پھر چہکی۔

"مذاق نہیں۔" وہ تنبیہی انداز میں بولا۔

"اچھا اچھا سوری!" جھٹ معذرت کرلی گئی۔ وہ اسے دوبارہ خفا نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"دیکھو ناں! ہم اپنے گھر کے حالات سے بخوبی واقف ہیں اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ہم نے اپنی تعلیم کس طرح پوری کی ہے۔ کیونکہ یہ ہی ایک رستہ ہے کہ ہم اپنے حالات سدھار سکیں۔ خوشحالی کا منہ دیکھ سکیں۔ پارٹ ٹائم جاب ڈھونڈنے کے چکر میں جوتے تو کیا پاؤں بھی گھس گئے ہیں۔ ایسا کب تک چلے گا یار۔" وہ پھر مایوسی میں ڈوب رہا تھا۔

"مرتضیٰ! تم پارٹ ٹائم جاب ڈھونڈ بھی تو ایسی کمپنیوں میں رہے ہو' جو فل ٹائم ورکر بھی مشکل ہی سے رکھتے ہیں' کسی چھوٹی موٹی نوکری سے شروعات کر لو۔ اپنی ڈگری ساتھ ساتھ پوری کرو۔ تب تک ان شاء اللہ بہت اچھی جاب مل جائے گی تمہیں۔"

"ہونہہ۔۔۔ یہ اچھی نوکریاں بھی صرف امیر زادوں کے لیے ہی ہوتی ہیں۔ ہم جیسوں کے پاس تو نہ تگڑی سفارش' نہ اتنا پیسہ کہ ان کا منہ بھر کر نوکری حاصل کرلیں۔" کیسی ناانصافی ہے۔۔۔ آخر یہ سب کچھ ان امیروں کا ہی حق کیوں ہے؟ ہمارا کچھ حق نہیں ہے۔"

"کچھ نہیں۔۔۔ بہت کچھ ہے' جس پر امیر غریب' کالے گورے' شہنشاہ' گدا گر سب کا برابر کا حق ہوتا ہے۔" پوری آنکھیں کھول کر وہ بالکل اس کے سامنے کھڑی اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مرتضیٰ نے سر جھٹک کر منہ موڑ لیا۔

"ذرا ادھر دیکھو' وہ اوپر آسمان میں۔" نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اس کی بے تکی بات پر اوپر دیکھنے لگا۔

"ہاں! کیا نظر آیا؟ چاند۔۔۔ کتنا حسین ہے ناں؟ اس کی ٹھنڈی میٹھی روشنی کسی حسب و نسب' دولت و حشمت' امیری و غریبی سے بے نیاز سب کے لیے یکساں ہے۔ یہ تارے ہی دیکھ لو۔ یہ صرف کسی امیر آدمی کے آگے نہیں ٹمٹماتے۔۔۔ پھر بارش جیسی نعمت سے بھی ہم محروم نہیں۔ سورج کی تپش' سردی کی خنکی اور۔۔۔"

"بس بس۔۔۔ مان لیا کہ یہ سب ہر خاص و عام کے لیے ہیں۔ مگر ان سے پیٹ نہیں بھرتا۔ امیروں کی تجوریاں بھری ہیں' فریج ذخیرہ خوراک سے لدے ہیں۔ ہر نعمت انہی کے لیے ہے۔ ہر چیز پر جیسے ان ہی کا حق ہے۔"

یہ برے حالات سے گھبرائے اور روشن مستقبل کے لیے بھاگ دوڑ کرتے اور اس میں مسلسل ناکام ہوتے ایک نوجوان کی بھڑاس تھی' جو وہ اس لڑکی کے سامنے نکال رہا تھا' جس سے وہ اپنی ہر بات بے فکری سے کر سکتا تھا۔

"کہہ تو تم صحیح رہے ہو۔ مگر یہ سمجھ لو کہ جس کے نصیب کا جتنا رزق لکھا ہے' وہ اسے ملتا ہے۔"

"تو شاید میرے نصیب میں رزق ہے ہی نہیں۔" ماتھے پر بل ڈالے وہ پھر خفگی سے بولا۔

"کیوں نہیں ہے۔ ضرور ہے اور بہت زیادہ رزق لکھا ہے۔ یہ میں تمہاری چمکتی پیشانی پر دیکھ سکتی ہوں کہ تمہارا مستقبل بہت تابناک ہوگا لڑکے! بس ہمت و جرأت سے کوشش کرتے رہو۔ کامیابی تمہاری قدم بوسی کو یہیں کہیں آس پاس ہی ہے۔" کسی سیانے بزرگ کی طرح سر دھنتے ہوئے وہ اسے تسلیاں دے رہی تھی۔ مرتضیٰ نے سر جھٹکا۔

ام مریم کی یہ حد سے بڑھی ہوئی خوش فہمی اسے حیرت میں ڈالنے کے ساتھ ساتھ جھنجلاہٹ میں بھی مبتلا کردیتی تھی۔

"ویسے۔۔۔ تمہیں ایک راز کی بات بتاؤں؟" وہ کھسک کر قریب ہوئی اور سرگوشیانہ انداز میں بولی۔ بجائے کوئی جواب دینے کے وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

"ایک چیز ایسی ہے' جو صرف تمہارے پاس ہے۔

وہ کسی بڑے سے بڑے رئیس اعظم اور شہنشاہ، سفیر، وزیر کو بھی حاصل نہیں۔۔۔ بتاؤں کیا؟" وہ اپنی چمکتی آنکھوں سے اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگی۔

"ام مریم۔۔۔!" ایک ہاتھ سینے پر رکھ کر وہ قدرے جھک کر اداسے بولی تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ یہ جواب وہ جانتا تھا اور پورے دل سے اس کی سچائی کا اعتراف بھی کرتا تھا۔

کہ ام مریم کے لیے مرتضیٰ اور مرتضیٰ کے لیے ام مریم کا وجود تنگ دستی کے ان تاریک حالات میں بھی حوصلے و ہمت کا وہ ٹمٹماتا جگنو تھا۔ جسے وہ اپنی نم ہتھیلیوں میں لیے تبدیلی وقت کی اچھی امید باندھے آگے کی طرف قدم بڑھاتے چلے جارہے تھے۔

☆ ☆ ☆

چھ ہزار ماہوار آمدن کے حصول کے لیے جان مارنے والا عبدالرحیم کپڑے کی ایک دکان پر بطور سیلز مین کام کرتا تھا۔ یہ سیلز مینی اب کی بات نہ تھی۔ بلکہ بارہ سال کی عمر میں اس کا باپ اسے کپڑے کی جس دکان پر چھوڑ آیا تھا، وہیں کام کرتے کرتے اس نے عمر بتادی تھی۔ سالوں کی وفاداری کے صلے میں ایک ایک سو روپیہ سالانہ بڑھتی تنخواہ ڈیڑھ ہزار سے چھ ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ ساتھ ہی اسے سینئر سیلز مین کا درجہ بھی دے دیا گیا تھا۔ اس کا مالک اس سے خوش تھا۔ اس کی ایمان داری اور شرافت کی لوگ قدر کرتے تھے۔ کم گو

سا عبدالرحیم اپنے حالات پر قانع اور صبر، شکر کرنے والا شخص تھا۔ مگر دو بیٹیوں کی ذمہ داری اور اس سے سبکدوش ہونے کا خیال اس کے ناتواں کندھوں پر بار لاد کے انہیں مزید جھکا دیتا تھا۔ اس کی بیوی حمیدہ دوسری بیٹی کی پیدائش کے وقت کچھ عرصہ علیل رہی اور اس سے قبل کہ بیماری کی تشخیص ہو پاتی، وہ ملک عدم سدھار گئی۔

عبدالرحیم نے اپنی بساط کے مطابق بیٹیوں کو تعلیم دلائی تھی۔ کم از کم یہ ایسا زیور تھا جس سے وہ اپنی بیٹیوں کو آراستہ کر سکتا تھا۔ ام مریم بڑی اور سبین چھوٹی تھی۔ گورنمنٹ اسکولوں میں پڑھ کر خوب محنت کے نتیجے میں ملنے والی اسکالرشپ نے ہی دونوں کو کالج کے گیٹ کو عبور کرنے کا حقدار ٹھہرایا تھا۔ کیونکہ محنت کیسی بھی ہو کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔

بی ایس سی کے بعد ام مریم اور ایف اے کے بعد سبین نے تعلیم کو خیرباد کہہ دیا۔ دونوں میں محض تین سال کا فرق تھا۔ مگر عقل اور بردباری میں سبین، ام مریم سے کہیں آگے تھی۔ ام مریم میں بڑی ہونے کے باوجود کھلنڈرا پن تھا۔ وہ اپنے حال میں مگن رہنے والی لڑکی تھی۔ اسے نہ تو کبھی محلہ رسول نگر کی تنگ اور سانپ کی طرح بل کھاتی لمبی لمبی گلیوں میں ایک دوسرے کے اندر دھنستے گھروں سے وحشت ہوتی تھی ۔ نہ ہی ہر گھنٹے بعد ہوتی لوڈشیڈنگ کے نتیجے میں پھیلے اندھیرے اور حبس سے اس کی جان جاتی تھی۔ وہ اپنی ڈھائی مرلے کی چھت پر چڑھ کر اکا دکا آگے ہوا کے جھونکوں سے ہی خوش ہو جاتی۔ چھت پر گھٹن کم ہونے کی واحد وجہ ذرا کی ذرا ترس کھاتی ہوا ہی نہ تھی ۔ بلکہ دیوار سے ملحقہ چھت اور نیچے اس کا چھوٹا سا تنگ صحن بھی اسے اتنا ہی خوشگوار لگتا۔ جتنا بارش کے دنوں میں برستے مینہ کو دیکھ کے کبھی کبھی پکوڑوں کی عیاشی۔۔۔۔۔

دیوار کے اس پار مرتضیٰ کا وجود اس کے لیے اتنا ہی ٹھنڈک بھرا احساس تھا۔ مزاجاً" مشرق اور مغرب ہونے کے باوجود دونوں میں گہری دوستی تھی اور اب سے نہیں، بچپن سے تھی۔ بچپن میں کبھی کھیلے گئے "گھر گھر" میں دولہا دولہن بننے کا روپہلا سا منظر صرف ام مریم کے کچی عمر کے خوابوں میں شامل نہ ہوا تھا۔ بلکہ مرتضیٰ کے لیے بھی اس کا وجود ناگزیر تھا۔۔۔ خاص تھا۔

عبدالرحیم سے بڑے عبدالکریم تھے۔ ساری زندگی ایک پرچون کی دکان پر چاکری کرنے کے بعد انہوں نے کسی نہ کسی طرح اپنی کریانے کی دکان کھول

لی تھی۔ رسول نگر کے چوک میں "عبدالکریم جنرل اسٹور" کے چھوٹے سے مٹے مٹے لفظوں سے بجی ڈربہ نما چوکور دکان صرف اتنی تھی کہ تین اطراف کی دیواروں میں اوپر تک بنے لکڑی کے خانوں میں بھرے مسالا جات دال، گھی، چینی اور زمین پر دھری آٹے کی تین چار بوریوں کے بعد بس اتنی جگہ بچ پائی کہ ایک اونچا اسٹول رکھ کر اس پر بیٹھا جاسکے۔

مگر عبدالکریم "اپنے کاروبار" کی برتری اکثر عبدالرحیم پر جتاتے رہتے۔ ان کا کہنا تھا کہ انہیں بھی اب نوکری کو چھوڑ کر کوئی چھوٹا موٹا اپنا کام شروع کر دینا چاہیے۔ مگر سرمائے کے بنا یہ ناممکن تھا۔

گیارہ سال تک دونوں اپنے باپ کی چھوڑی واحد جائیداد اس پانچ مرلے کے گھر میں رہتے رہے۔ پھر بچوں کے بڑا ہونے کے عذر کو سامنے رکھ کے صحن سے ایک دیوار کھینچ کے ڈھائی ڈھائی مرلے کا بٹوارا کر لیا گیا۔

عبدالکریم کے پانچ بچے تھے۔ مرتضیٰ تیسرے نمبر پر تھا۔ اس سے بڑی دونوں بیٹیوں کو عبدالکریم نے جیسے تیسے برادری میں بیاہ دیا تھا۔ اس کے بعد چھوٹی منزہ اور کاشف بھی سرکاری اسکولوں میں تعلیم گھسیٹ رہے تھے۔

ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ مرتضیٰ کی سوچ بھی بہت اونچی تھی۔ وہ ایک ہی جست میں امیری و غریبی کے مابین اس لکیر کو پار کر لینا چاہتا تھا۔ رسول نگر کی تنگ گلیوں میں پورا بچپن بتانے کے باوجود اب وہ اسے زہر لگتی تھیں۔ اس کا دم گھٹتا تھا۔ سبز مائل کائی زدہ اینٹوں والی انہی گلیوں میں پوری پوری دوپہر گلی ڈنڈا اور چھوٹے چھوٹے گڑھے کھود کر بنٹے کھیلنے والا مرتضیٰ اب ان ٹوٹی گلیوں اور اونچی نیچی چھتوں والے گھروں سے بے حد نالاں تھا۔ وہ اپنے باپ کی طرح پوری زندگی ڈھائی مرلے کے اس گھر اور چوک کی ڈربہ سی دکان کے چکر کاٹتے ہوئے نہیں گزارنا چاہتا تھا۔ اپنی محنت اور ذہانت کے بل پر پنجاب یونیورسٹی کے ایم بی اے کے اسٹوڈنٹس میں وہ نمایاں تھا۔ پڑھائی کر کے یونیورسٹی سے آنے کے بعد پارٹ ٹائم جاب کی تلاش میں اسے پورا سال گزر گیا تھا۔ مگر ڈھنگ کی ایک بھی جگہ پر اسے موقع نہیں ملا تھا۔

مگر ام مریم کا کہنا تھا کہ "تبدیلی کائنات کا اصول ہے۔ حالات کبھی بھی ایک جیسے نہیں رہتے۔ دونوں کے الٹ پھیر لازم و ملزوم ہیں۔"

وہ رب تعالیٰ کی رحمت سے بڑی پر امید رہتی تھی۔ خوشی و سکون بھرے دنوں کی آس سے چمکتی اس کی کشادہ آنکھیں مرتضیٰ کو نئے سرے سے حالات کا مقابلہ کرنے پر اکساتیں۔ اسے آگے بڑھنے کے لیے اپنی پیٹھ تھپکتے ام مریم کے ہاتھ کسی نعمت سے کم نہ لگتے تھے۔

☆ ☆ ☆

کمرے میں بڑھتے حبس کی وجہ سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے پہلے اوپر چھت پر لگے پنکھے کو بجلی چلے جانے کے باعث ہولے ہولے گھومنے کے بعد رکتے ہوئے دیکھا اور پھر دروازے سے باہر چڑھ آنے والے سورج کی روشنی پر ایک نظر ڈالی۔ جس نے صحن کے ساتھ ساتھ مختصر سے برآمدے کا بھی کچھ حصہ روشن کر رکھا تھا۔ اس کی نگاہ سالوں پرانی دیوار گیر گھڑی پر پڑی۔ صبح کے نو بج چکے تھے۔

آنکھیں ملتی وہ اٹھ بیٹھی اور زوردار جماہی لی۔ یہ گھڑی اس کے دادا کے زمانے کی تھی اور ابھی تک ساتھ نبھا رہی تھی۔ اس نے سرہانے رکھا دوپٹا اٹھا کر شانوں پہ پھیلایا اور بکھرے بال سمیٹ کر کیچر میں باندھے۔ پلنگ کے نیچے پڑی چپل اڑستی باہر چلی آئی۔

سبین صحن میں لگائی گئی واشنگ مشین سے کپڑوں کا آخری چکر نکالنے کے بعد اب انہیں کھنگال رہی تھی۔

یہ اس کی سالوں پرانی عادت تھی۔ علی الصبح بیدار ہونے کا خبط۔ صرف اسی پر اکتفا نہیں تھا۔ بلکہ اٹھتے

کے ساتھ ہی سارا کام مار امار نپٹا کر وہ اس وقت بالکل فارغ ہو چکی ہوتی، جب ام مریم بستر سے اٹھتی۔

ایسا نہیں تھا کہ ام مریم کاہل یا کام چور تھی۔ بلکہ نماز فجر کی ادائی کے بعد اسے نیند اس زور سے جکڑنے لگتی کہ وہ بے بس ہی پھر بستر میں گھس جاتی۔ پھر اٹھنے کے بعد وہ اپنے کام سست روی سے ہی سہی۔ مگر پوری دلجمعی سے نپٹاتی تھی۔ کھانا بنانے کی ذمہ داری ام مریم کی ہی تھی اور بقول عبدالرحیم کے ان کی بیٹی کے ہاتھ میں وہ ذائقہ ہے، جو اس کی مرحومہ ماں کے ہاتھ میں تھا۔

ام مریم وہیں صحن میں لگے نل کے پاس بیٹھ کر منہ دھونے لگی۔ نل کے اوپر ایک چوکور سا چھوٹا شیشہ اور اسٹینڈ لگایا گیا تھا۔ منہ دھونے کے بعد اس نے اسٹینڈ کے اوپر رکھے کنگھے سے بال سیدھے کیے اور ڈھیلی سی چٹیا بنا کر پیڑھی پر بیٹھ گئی اور سبین کو دیکھنے لگی، جو اب کپڑے صحن میں بندھے تار پر پھیلا رہی تھی۔ اس وقت کپڑے کم تھے۔ ورنہ معمول کے دنوں میں چھت پر سکھائے جاتے تھے۔

"ناشتا بنا دوں؟" کپڑے الگنی پر ڈالنے کے بعد وہ دوپٹے سے ہاتھ پونچھتی اس کے پاس آئی۔

"ناشتے کا تو بالکل بھی دل نہیں کر رہا۔ گرمی بھی تو بلا کی پڑ رہی ہے۔"

اس نے چھوٹے۔ مگر صاف ستھرے دھلے دھلائے سرخ اینٹوں والے فرش کی دائیں جانب بنی کیاریوں میں لگے موتیے اور گلاب پر نظر ڈالی۔ ان کے ساتھ املی کے پودے لگائے گئے تھے۔ شہتوت اور امرود کے ۔۔۔۔ درخت بھی تھوڑے فاصلے پر لگے تھے۔۔۔ اس چھوٹی سی کیاری میں تین چار طرح کے پودے اور درخت لگے تھے کیاری میں پانی بھرا تھا۔

"آپا زینب آئی ہوئی ہیں۔ ان کا چھوٹا بیٹا کھیلتا ہوا آیا تھا تو پتا چلا۔"

"اچھا! چلو پھر میں ان سے مل آؤں۔" اٹھنے کے لیے اس نے پاؤں میں چپل پہنی۔ جو وہ پیڑھی پہ بیٹھتے ہی اتار چکی تھی۔

"اوہو! ناشتا تو کر لو۔ آپا کہیں بھاگی تو نہیں جا رہیں۔" مسکراتے ہوئے سبین بولی۔ ام مریم کی بے چینی وہ سمجھتی تھی اور اس کی وجہ بھی۔ مرتضیٰ کو دیکھے بنا اسے سکون آنا ناممکنات میں سے تھا۔

"اوہو تو کیا ناشتا بھاگا جا رہا ہے؟" اسی کے انداز میں کہتے ہوئے وہ چوکھٹ پار کر کے اگلے ہی پل ساتھ والے نیلے دروازے کے پٹ کو دھکیل کر اندر تھی۔

"السلام علیکم آپا جانی۔۔۔ السلام علیکم تائی امی!" ڈیوڑھی سے ہی سلام جھاڑتی وہ خوش دلی سے آگے بڑھی۔ سب ہی برآمدے میں بیٹھے تھے۔

"وعلیکم السلام! آج تو صبح صبح ہی چاند نکل آیا ہے۔" زینب اسے محبت سے دیکھتے ہوئے بولی، جو اس کے چھوٹے بیٹے کو گود میں اٹھائے چٹاچٹ چوم رہی تھی۔ وہ بھاگ کر صحن میں ہی اس کے قدموں سے جا لپٹا تھا۔

"مابدولت ابھی ابھی منہ دھو کے آپ کی آمد کی اطلاع ملتے ہی پہنچے ہیں۔" تائی کے پاس بیٹھتے ہوئے وہ بولی۔

"اچھا کیا آ گئیں۔۔۔ تمہارے آنے سے تو رونق ہو جاتی ہے۔"

"ہاں تب ہی تو یہ رونق لگانے ہر صبح ادھر پہنچی ہوتی ہے۔" یہ رخشندہ تائی تھیں۔ مگر ہمیشہ کی طرح ام مریم نے ان کی بات کا برا ماننے کے بجائے بڑے لاڈ سے ایک بازو ان کے گلے میں حمائل کر لیا۔

"کیوں نہ آؤں میں؟ میری اپنی اماں تو ہیں نہیں تو کیا آپ جیسی ماں سے بھی محروم ہو جاؤں؟" اس نے اتنے پیار سے پوچھا کہ تائی شرمندہ سی ساری طراری بھول کے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس سے ناشتے کا پوچھنے لگیں۔

"نہیں تائی امی! سبین نے بنا لیا ہو گا ناشتا۔ پھر وہ ضائع جائے گا۔" سہولت سے انکار کر کے وہ آپا زینب سے ان کے سسرال کے احوال لینے لگی۔ رخشندہ

مرتضیٰ کے لیے ناشتا بنانے اٹھ گئیں۔ اس کا یونیورسٹی جانے کا ٹائم تھا۔

ام مریم کی آواز سن کر اندر کمرے سے شرٹ کا بٹن بند کرتا مرتضیٰ مسکراتے ہوئے برآمد ہوا۔

"اوئے چڑیل! کبھی اپنے معمولات میں بھی تبدیلی لے آیا کرو۔" شرارت سے کہے جملے میں اس نے ام مریم کی روز صبح صبح آمد کی طرف اشارہ کیا تھا۔ مگر ام مریم نے بھی ڈھٹائی کا ڈپلوما لے رکھا تھا۔

"جو بدل جائے، وہ کمزور ہوتا ہے محترم!" اس نے ڈائیلاگ جھاڑا اور خود ہی ہنس پڑی۔ آپا اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے مسکرا دیں۔ وہ ان کی پسندیدگی کو بہت پہلے سے جانتی تھیں اور تائی کو چھوڑ کے باقی سب کو اس پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ بلکہ سب پورے دل سے آمادہ تھے۔

اس کا اخلاق اتنا ہی دل موہ لینے والا تھا کہ ہر ایک کو اپنا گرویدہ کر لیتا۔ اور یہی بات مرتضیٰ کو اس کی سب سے زیادہ پسند تھی۔

تائی رخشندہ ذرا تیکھے مزاج کی تھیں۔ حالات سے گھبرا کر اکثر قسمت کی کم مائیگی کا رونا روتیں اپنے کرم پھوٹ جانے پر نالاں رہتیں۔ وہ کم از کم "بہو" ایسے ہی جان مار مار کر گزارا کرنے والے "بھوکے ننگے خاندان" سے نہیں چاہتی تھیں۔ اپنے لائق فائق سپوت میں انہیں امید کی کرن نظر آتی تھی۔ جو مزاج کا کچھ حصہ انہی کا لے کر پیدا ہوا تھا۔ حالات سے خفا خفا سا انہیں ایک دم بدل لینے پر سرگرداں۔۔۔

مگر ام مریم ہار ماننے والوں میں سے نہ تھی۔ اس کی امید کی مشعل ہمیشہ جلتی رہتی۔ وہ جانتی تھی کہ محبت سے کسی کا بھی دل جیتا جا سکتا ہے۔

ام مریم وہاں تب تک بیٹھی رہی۔ جب تک مرتضیٰ ناشتا کر کے مسکراتی نگاہوں سے اسے خدا حافظ کہہ کر یونیورسٹی کے لیے نکل نہیں گیا۔ گھر سے نکلتے مرتضیٰ کی چوڑی پشت کو محبت سے دیکھتے ہوئے بے اختیار اس نے آیت الکرسی پڑھ کر غائبانہ ہی اس پر پھونکی تھی۔ اس کے تحفظ و سلامتی سے گھر واپس آ جانے کی دعا بے ساختہ ہی اس کے لبوں پر در آئی تھی۔ یہ بھی اس کی سالوں سے پختہ عادتوں میں سے ایک تھی جسے بدلنے پر وہ ہرگز تیار نہ تھی۔ ایسا گمان بھی اس کے لیے سوہان روح تھا۔

ام مریم کی صبح ہی مرتضیٰ کی صورت دیکھنے سے ہوتی تھی۔ وہ اپنی صبح کے سنہری ہونے میں ایک دن کا بھی ناغہ کرنے کے حق میں نہ تھی۔

☆ ☆ ☆

ڈیپارٹمنٹ کے سرسبز سے احاطے سے گزرتے ہوئے وہ دونوں آخری کلاس لے کر سر مدثر کے دیے گئے اسائنمنٹ کو ڈسکس کرتے ہوئے پارکنگ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ سکندر کو اپنی گاڑی میں اسے مین روڈ تک لفٹ دینی تھی۔ ہاتھ میں تھمی نوٹس کی کاپیز میں سے ایک اس نے الگ کر کے مرتضیٰ کے حوالے کر دی اور اسی کے متعلق بات کرتا ہوا اپنی سفید ہونڈا سوک کی جانب بڑھا کہ یکایک سمیع اور اس کے گروپ کے تین چار لوگ ہاتھوں میں ہیٹ اور ہاکی تھامے سامنے آ گئے۔ یہ بدنام زمانہ گروپ تھا۔ بدمعاشی ان کا وتیرہ تھا۔

اس وقت بھی ان کے خطرناک عزائم ان کے چہروں پر پھیلی کرختگی اور ہاتھ میں تھمے ہتھیاروں سے عیاں تھے۔ اس سے پہلے کہ دونوں کچھ سمجھتے اور سنبھل پاتے، انہوں نے آگے بڑھ کر تابڑتوڑ ان پر ہاکی اور ہیٹ برسانا شروع کر دیے۔ اس اچانک حملے پر وہ حواس باختہ ضرور ہوئے تھے۔ مگر اپنے بچاؤ کے لیے انہوں نے بھرپور مزاحمت کی اور جوابی کارروائی کے طور پر ایک دو کو بری طرح پیٹ بھی ڈالا تھا۔ مگر وہ تعداد میں پانچ تھے اور ہتھیاروں سے لیس تھے۔ نہتے دو لوگ ان کا مقابلہ کیسے کر سکتے تھے۔

ان میں سے ایک نے جیب سے چھوٹا۔ مگر تیز دھار والا چمکتا ہوا چاقو نکالا۔ اس کا مقصد سکندر اور مرتضیٰ کو ہراساں کرنا تھا۔ مگر مرتضیٰ کو لگا، وہ چاقو سے حملہ کرنے

لگا ہے۔ بے اختیار دوڑ کر اس نے لڑکے کے چاقو والے ہاتھ کو پکڑنا چاہا۔ لہرانے کی وجہ سے وہ اس کا ہاتھ تو نہ پکڑ پایا۔ لیکن چاقو کا تیز دھار پھل اس کی مٹھی میں آگیا۔ جسے تیزی سے کھینچتے ہوئے وہ لڑکا پیچھے ہٹا۔ خون ایک باریک دھار کی صورت میں مرتضیٰ کے ہاتھ سے بہنے لگا۔

ایک ہاتھ کو دوسرے میں تھامے درد سے دوہرے ہوئے مرتضیٰ کو زمین پر بیٹھتے دیکھ کر وہ فوراً" سے پیشتر فرار ہوگئے۔

سکندر نے بھاگ کر مرتضیٰ کو اٹھایا اور سہارا دے کر گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر بٹھا کر ٹشو باکس سے بہت سے ٹشو کھینچ کر اس کی ہتھیلی پر رکھے۔ مرتضیٰ کا پیلا پڑتا رنگ اسے پریشانی میں مبتلا کر رہا تھا۔ وہ گاڑی دوڑاتا ہوا قریب کے ہسپتال میں ایمرجنسی میں پہنچا۔ خون سے مرتضیٰ کی آستین بھر چکی تھی۔ ڈاکٹر نے فوری طور پر خون صاف کرکے طبی امداد پہنچانی شروع کردی۔ تقریباً" آدھے گھنٹے میں سکندر کے والد عبدالرحمن ہمدانی وہاں پہنچ گئے۔ سکندر نے انہیں مختصراً" سارا واقعہ سنایا۔

کچھ دن قبل سی کے گروپ کا ایک لڑکا فائن آرٹس کی ایک لڑکی کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے پایا گیا تھا۔ لڑکی کی چیخ و پکار پر وہاں سے گزرتے سکندر نے لڑکے کو منع کیا۔ نتیجے کے طور پر وہ اس کے ساتھ گتھم گتھا ہوگیا۔ اسی ہاتھا پائی میں سکندر نے اس لڑکے کی اچھی خاصی ٹھکائی کردی۔ اسی کا بدلہ لینے آج پورے گروپ نے ان پر حملہ کیا تھا۔

"پاپا! یہ مرتضیٰ ہے۔ میرے چکر میں یہ بھی بری طرح پھنس گیا۔ وہ تعداد میں پانچ تھے اور سنسان جگہ دیکھ کے انہوں نے ہم پر حملہ کردیا۔"

"فکر نہیں کرو۔ میں وی سی سے بات کرتا ہوں۔ یونیورسٹی میں ایسی بدمعاشی کوئی کیسے کرسکتا ہے۔ ان کے خلاف ایکشن لیا جائے گا۔" ان کی بات پر سکندر نے مطمئن ہو کر سر ہلایا۔

"گیٹ ویل سون بیٹے۔" مرتضیٰ کا کندھا تھپتھپا کر وہ مسکراتے ہوئے باہر نکل گئے اور مرتضیٰ کا ذہن ان کی شان دار شخصیت اور برانڈڈ ٹو پیس پر لگی ڈائمنڈ ڈلی پن میں اٹکا رہ گیا۔ ان کے جانے کے بعد بھی بیش قیمت کولون کی مہک پورے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ گہری سانس بھر کے اس نے آنکھیں موند لیں۔

☼ ☼ ☼

صحن میں بچھے پلنگ پر بے تکلفی سے پھیل کر بیٹھی وہ کاشف کی بائیولوجی کی پریکٹیکل نوٹ بک پر ڈایا گرام بنانے میں مگن تھی اور کاشف چہرہ دونوں ہتھیلیوں پر رکھے پورے انہماک سے اس کی ڈرائنگ دیکھ رہا تھا۔ تائی رخشندہ دوبار آکے چائے کا پوچھ چکی تھیں۔ اتنی مہربان وہ عام حالات میں نہ ہوتی تھیں۔ مگر اس وقت ام مریم ان کے بیٹے کو پڑھانے میں مصروف تھی۔ سو اتنا پوچھنا تو اس کا حق بنتا ہی تھا۔ ڈایا گرام مکمل کرکے وہ ایک دم سیدھی ہوئی اور نوٹ بک والا ہاتھ دور لے جاکر آنکھیں سکیڑ کر جائزہ لیا۔

"واہ... کیا شاہکار ڈایا گرام بنائی ہے میں نے۔" بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ کاشف بھی تعریفی نظروں سے اتنی پرفیکٹ اور خوب صورت ڈایا گرام دیکھ کر خوش ہو اٹھا تھا۔

"ارے واقعی مریم آپی آپ نے تو کمال کردیا۔" وہ جوش و خروش سے گویا ہوا۔

"دیکھا پھر... ایسا کون سا کام ہے بھلا جو تیری مریم آپی نہیں کرسکتی؟" اس نے فرضی کالر جھاڑے۔

منزہ بھی ان کے پاس جھکی ڈایا گرام دیکھ رہی تھی۔ ایک دم داخلی دروازہ کھلنے پر ام مریم نے سب سے پہلے مڑ کر دیکھا۔ مرتضیٰ دائیں ہاتھ پر سفید پٹی باندھے اندر داخل ہو رہا تھا۔ اس کی خون سے بھری آستین دیکھ کے مریم کا دل حلق میں آگیا۔ وہ تیزی سے سب چھوڑ چھاڑ کے تخت سے اتری اور بھاگ کر اس تک پہنچی۔

"یہ... یہ کیا ہوا؟" تشویش بھری آواز پر اندر سے رخشندہ تائی بھی نکل آئیں۔

"ارے! یہ کیا ہوا ہاتھ پر؟" تائی بھی پریشان سی اس کی جانب لپکیں۔

"کچھ نہیں... بس ایک جھگڑا ہوگیا تھا۔" اس نے نرمی سے سب کو ہٹایا اور اندر کی جانب بڑھا۔

"کس سے جھگڑا ہوگیا؟ کیوں ہوگیا؟ اتنی چوٹ کیسے آئی؟" رخشندہ بیٹے کا زرد رنگ دیکھ کے فکر مند سی پوچھے جارہی تھیں۔

"یونیورسٹی میں کچھ لڑکوں نے جھگڑا کیا تو بس ہلکا سا زخم آگیا ہاتھ پر... آپ پریشان مت ہوں۔ میں ٹھیک ہوں۔" انہیں مزید پریشان ہونے سے بچانے کے لیے اس نے چاقو والی بات حذف کرلی۔

"خاک ٹھیک ہو... صورت دیکھو اپنی۔ بالکل ہلدی جیسی ہو رہی ہے۔"

"ٹھیک ہوں اماں۔" وہ بے زار سا ہوا۔

"اچھا تو لیٹ جا ادھر۔ اے بچو! سمیٹو اپنا یہ کاٹھ کباڑ اور اٹھو یہاں سے... بھائی کو آرام کرنے دو۔"

مرتضیٰ کو لیٹنے کی تاکید کرتے ہوئے انہوں نے کاشف اور منزہ کو لتاڑا۔ وہ کتابیں سمیٹ کر فوراً" کھسک گئے۔

مرتضیٰ تخت پر لیٹ گیا۔ ام مریم اس کے ہاتھ پر بندھی پٹی اور ماتھے پر زخم کے نشان کو دیکھ رہی تھی۔ مرتضیٰ کی تکلیف پر اس کی آنکھیں لبالب بھر آئیں۔

"مریم — بتی نہیں آرہی... تو مرتضیٰ کو ذرا یہ پنکھا جھل دے۔" تھوڑی دیر بعد تائی پھر سے برآمد ہوئیں اور ہاتھ والا پنکھا اسے تھما کر باورچی خانہ میں مرتضیٰ کے لیے دودھ لینے چلی گئیں۔

مرتضیٰ نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ ام مریم اس کے سرہانے ویسے ہی وحشت زدہ سی کھڑی تھی۔ آنسو پھسل پھسل کر گال بھگونے لگے تھے۔ مرتضیٰ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھایا۔

"ڈرگئی! میں ٹھیک ہوں۔ کچھ بھی تو نہیں ہوا۔" وہ جانتا تھا اس کی ذرا سی تکلیف پر ساری ساری رات نہ سوسکنے والی لڑکی کتنا پریشان ہوگی اسے یوں دیکھ کر۔

"مرتضیٰ یہ کیسے؟" رندھے ہوئے گلے کے ساتھ اس نے اس کی خون آلود شرٹ اور ہاتھ کی جانب اشارہ کیا تو جواباً" مرتضیٰ نے اسے پورا واقعہ مختصراً" کہہ سنایا۔ باقی کچھ تو اس نے سنایا نہیں۔ مگر ہاتھ پر چاقو سے کٹ لگنے کی بات نے اس کا پنکھا جھلتا ہاتھ ایک لمحے کے لیے ساکت کردیا۔ اس نے ایک نظر پھر سے خون سے بھری آستین کو دیکھا اور آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر رونے لگی۔

"اف یار... اوئے... کچھ نہیں ہوتا۔ تم عورتیں تو ذرا سی چھری انگوٹھے پر لگنے پر گھنٹہ آٹھ آٹھ آنسو بہاتی ہو۔ مگر مردوں کو ذرا ذرا سی چوٹوں سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔" اس کے کہنے پر مریم خشمگیں نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔

"ذرا سی چوٹ؟ آٹھ ٹانکے آئے ہیں ہتھیلی پہ اور تم اسے چھوٹی سی چوٹ کہہ رہے ہو؟" وہ بولی تو پریشانی کے ساتھ ساتھ غصہ بھی اس کی آواز سے ہویدا تھا۔

اتنے میں رخشندہ دودھ لے کر آگئیں۔ دونوں خاموش ہوگئے۔ دودھ پلانے کے بعد وہ گلاس لے کر واپس چلی گئیں۔ ان کی ہنڈیا جل رہی تھی۔

"اچھا! اب یوں منہ تو مت بناؤ۔ میں جان بوجھ کے تو نہیں لڑا تاں۔"

اس نے دھیرے سے اس کی انگلی پکڑ کر کھینچی جو رخ موڑے ایک ہاتھ سے اسے پنکھا جھل رہی تھی۔

"مرتضیٰ! مجھے صرف اتنا بتاؤ۔ تمہیں کیا ضرورت تھی کسی کے لیے اپنی جان جوکھم میں ڈالنے کی؟"

"کسی کے لیے نہیں۔ کروڑ پتی باپ کے بیٹے کے لیے۔" اسے چڑانے کے لیے وہ شرارتی انداز میں بولا تو مریم نے پنکھے کی ڈنڈی کھینچ کر اسے دے ماری۔

"اوہ! مار ڈالا ظالم۔" وہ حقیقتاً" کراہا۔

"اگر اس کا باپ ارب پتی بھی ہے... تو بھی کوئی ضرورت نہ تھی تمہیں خود کو یوں خطرے میں ڈالنے کی۔ اپنی جان کی قیمت روپوں میں مت لگایا کرو۔ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔" وہ پنکھا تخت پر پٹخ کر اٹھی اور

باہر نکل گئی۔

مرتضیٰ اس کی پشت پر لہراتی چٹیا کو دیکھتے ہوئے مسکراتا رہا۔

وہ جانتا تھا کہ وہ ام مریم کے لیے کیا ہے۔ یہ اسے بتانے کی ضرورت نہ تھی۔

☼ ☼ ☼

"دس' گیارہ' بارہ اور ساڑھے بارہ۔۔۔ صرف ساڑھے بارہ۔" روپے گن کر اس نے ایک نظر ہاتھ میں تھمی رقم پر ڈالی۔ پچھلے پانچ ماہ سے پیسے جوڑنے کے بعد بھی اتنی رقم اکٹھی نہ ہوئی تھی۔ جتنی اسے مطلوب تھی۔ حالانکہ ان مہینوں میں کسی بہت اہم ضرورت کے علاوہ اس نے کسی بھی چیز کے لیے روپے نکالنے سے حتی الامکان گریز کیا تھا۔

"افوہ۔۔۔ ابھی صرف ساڑھے بارہ ہزار ہوئے ہیں۔" مایوسی اس کے چہرے پر صرف اس پل کے لیے لہرائی۔ مگر اگلے ہی پل پھر سے خوش کن خیال نے انگڑائی لے لی۔

"چلو! ساڑھے بارہ ہزار تو ہو گئے باقی بھی ہو ہی جائیں گے۔" ساڑھے تین ہزار وہ آج کی ہوم ٹیوشنز سے لے کر آئی تھی۔ باقی کے ڈھائی ہزار کے لیے اس کا دماغ تیزی سے سوچنے لگا۔

"ابھی مسز صدیقی کے یہاں سے بھی پیسے ملنا باقی ہیں۔۔۔ کچھ دن میں وہ بھی مل جائیں گے۔" اس کی آنکھوں میں جگنو سے تیرنے لگے۔ اس نے بہت احتیاط سے وہ نوٹ دوبارہ گنے اور تہہ کر کے ربڑ بینڈ چڑھانے کے بعد اس سفید رومال میں باندھ دیے۔ جس پر وہ ہر نماز کے بعد دعائیں پڑھ پڑھ کے پھونکتی تھی۔ جیسے اس سے پیسے رکھے رکھے بڑھنا شروع ہو جائیں گے اور رقم دگنی تگنی ہو جائے گی

اس نے رومال کمرے کے مغربی کونے میں رکھے بوسیدہ سے ٹرنک میں کپڑوں کے نیچے چھپا دیا۔ اب تک کی اس کی پونجی۔ جو وہ مرتضیٰ کو کمپیوٹر خریدنے کے لیے دینے والی تھی۔

عبدالکریم مرتضیٰ کی پڑھائی کے خلاف تھے اور بقول ان کے اگر اسے کچھ کرنا ہی ہوتا تو بی اے کے بعد کر چکا ہوتا۔ ان کا کہنا تھا کہ مرتضیٰ طرح طرح کی ڈگریوں کے نام لے کر صرف پیسے ضائع کر رہا ہے۔

وہ چاہتے تھے کہ مرتضیٰ ان کے ساتھ دکان پر بیٹھے اور کام کرنے میں ان کا برابر سے ہاتھ بٹائے۔ سودا سلف دکان میں بھرنے کے لیے انہیں اسی کی ضرورت پڑتی تھی۔ ملازم رکھنے کی استطاعت وہ نہ رکھتے تھے اور اس عمر میں بوجھ ان سے نہ اٹھایا جاتا تھا۔ چنانچہ ان کی امید و آس کا محور و مرکز محض مرتضیٰ کی ذات تھی۔ کاشف ابھی چھوٹا تھا۔ وہ اکثر کام میں گڑبڑ کر جاتا تھا۔

لیکن مرتضیٰ باشعور نوجوان تھا۔ اسے اپنی پڑھائی اور قابلیت پر بھروسا تھا۔ وہ ہر طرف سے کان بند کیے بس اپنی پڑھائی کی جانب متوجہ تھا۔ فائنل ایئر کے امتحانات قریب تھے۔ باتوں باتوں میں کمپیوٹر نہ ہونے اور اس مجبوری کے باعث دوست کے گھر جا کر پڑھنے کا تذکرہ یونہی ام مریم کے سامنے کر دیا تھا۔

کرنے والا تو شاید اپنی بات بھول گیا ہو۔ مگر یہ ام مریم تھی۔ جس کے لیے مرتضیٰ کا ہر لفظ یاد رکھے جانے کے قابل تھا۔۔۔

اس کی ہر ضرورت' ہر خواہش پوری ہو جانے کے لیے تھی۔۔۔

مہینوں پیسے جوڑ کر وہ رقم اکٹھی کر پائی تھی اور اب مرتضیٰ کو دیے جانے والے اس سرپرائز پر اس کے ردعمل کا سوچ کے ہی ام مریم کی آنکھیں جگمگا اٹھی تھیں۔

☼ ☼ ☼

سین برآمدے میں رکھے لکڑی کی ایک میز پر کپڑا بچھائے ابا کے کپڑے استری کرنے میں مگن تھی۔ بجلی جانے سے پہلے پہلے اسے کام نپٹانے تھے۔ اندر باورچی خانے میں ام مریم کے ہاتھ بھی تیزی سے چل رہے تھے۔ آخری روٹی بیل کر اس نے گرم توے پر ڈالی۔ پھر ڈھکن اٹھا کر سالن کی تیاری کو دیکھنے لگی۔ عجلت میں

وہ بھی تھی۔ مگر بجلی کا جانا اس کی وجہ نہ تھی۔ بلکہ اس کام سے فارغ ہو کے اسے تایا کی طرف بھی جانا تھا۔

دوسرے چولہے پر دھری یخنی بالکل تیار تھی۔ بلکہ سب سے پہلے اس نے یہ ہی تیار کی تھی۔ چنے کی دال گل چکی تھی۔ جو سب کے لیے بنی تھی۔ اس نے آخری روٹی توے سے اتار کر کپڑے میں لپیٹی اور یخنی دوبارہ گرم کرنے کے لیے رکھ کر باہر نکل گئی۔ صحن میں نل کے پاس بیٹھ کر اس نے منہ پر پانی کے چھپاکے مارے اور کنگھے سے بال سلجھانے لگی۔ کپڑے استری کرتی سین نے ایک مسکراتی سی نگاہ اس پر ڈالی۔ وہ جانتی تھی اب ام مریم کہاں جانے والی تھی۔

آج ٹیوشنز سے واپسی پر مسز صدیقی نے بھی اسے پیسے دے دیے تھے۔ ان ہی پیسوں میں سے تین سو الگ کر کے اس نے راستے سے گوشت خریدا تھا۔ مرتضیٰ کو کل سے بخار بھی تھا۔ اس کی زرد پڑتی رنگت سے وہ پریشان سی واپس آئی تھی۔

بی ایس سی کے بعد ام مریم نے کچھ عرصہ ایک اسکول میں بطور سائنس ٹیچر پڑھایا تھا۔ وہیں ایک بچے کی والدہ نے اس سے ہوم ٹیوشنز کے لیے پوچھا تھا۔ یوں یہ سلسلہ چل نکلا۔ مسز صدیقی کے توسط سے ہی اسے قریبی گھروں میں ٹیوشنز ملنے لگیں۔ اپر کلاس کے گھروں میں کچھ گھنٹے پڑھا کر اسے اتنے پیسے مل جاتے تھے۔ جتنے پورا مہینہ اسکول میں جان ہلکان کرنے کے بعد بھی نہ ملتے تھے۔ اسکول اس نے چھوڑ دیا۔ مگر ٹیوشنز جاری رکھیں۔

ٹیوشنز سے ملنے والے پیسے اس کے لیے بڑا سہارا تھے۔ جنہیں اکثر اپنی ضروریات کی تکمیل کے بجائے مرتضیٰ پر خرچ کر دیتی تھی۔ وہ خوش ہو' راحت میں ہو ام مریم کے لیے یہ بات بے حد راحت بخش تھی۔

چٹیا میں بل ڈال کر اس نے پشت پر پھینکی اور شیشے میں اپنا جائزہ لیا۔ مرتضیٰ کو میک اپ سے لپی پتی لڑکیوں سے چڑ ہوتی تھی اور ام مریم کو تو میک اپ کی ضرورت ہی نہ تھی۔ سیدھی مانگ نکال کر سیاہ بالوں کی چوٹی بنائی تو چہرے کے اطراف بکھری لٹوں میں اس کا سادگی میں چمکتا پرکشش چہرہ ہی مرتضیٰ کے لیے سب کچھ تھا۔

کمرے میں جا کر اس نے ٹرنک کھول کر کپڑوں کے نیچے سے وہ سفید رومال نکالا جس پر وہ ہر نماز کے بعد باقاعدگی سے قرآنی آیات پڑھ کر پھونکتی تھی۔ آج ملنے والے روپے بھی وہ اس میں شامل کر چکی تھی۔ مٹھی میں رومال دبائے وہ کچن میں چلی آئی۔ گرم یخنی پیالے میں ڈال کر اس نے دوپٹا شانوں پر پھیلایا اور ٹرے اٹھا کر تایا کے گھر کا دروازہ پار کر گئی۔

شام کا ملگجا پن اندھیرے میں ڈوب رہا تھا۔

سامنے چھوٹے سے صحن میں پیڑھی پر تائی رخشندہ بیٹھی تھیں اور منزہ اپنی کتاب کھولے جلتے بلب کے نیچے بیٹھی ہل ہل کے سبق یاد کرنے میں مصروف تھی۔ رخشندہ نے بڑے غور سے اندر آتی ام مریم اور اس کے ہاتھ میں تھمی ٹرے کو دیکھا۔

"کیا لائی ہے بیٹی؟" لہجے میں خود بخود مٹھاس گھل گئی۔

"تائی امی! مرتضیٰ کے لیے یخنی بنائی تھی تو سوچا گرم گرم دے آؤں۔"

"ہاں ہاں ضرور۔۔۔ اللہ تجھے سکھی رکھے۔ ہر ایک کا کتنا خیال رہتا ہے تجھے۔۔۔ جا اوپر چلی جا۔۔۔ مرتضیٰ چھت پر ہے۔" وہ اوپری دل سے دعائیں دیتے ہوئے بولیں۔

صحن سے سیڑھیاں چڑھ کر وہ اوپر آ گئی۔ ہوا کا ایک تازہ جھونکا اس کے چہرے سے ٹکرایا۔ یکایک موسم میں خوشگواریت در آئی تھی یا مرتضیٰ کو دیکھنے پر یہ احساس اس کے دل میں سرایت کیا تھا۔ وہ فیصلہ نہ کر سکی۔

وہ چارپائی کے پاس کھڑا ایک بازو پہنے دوسرا بازو آستین میں ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر ڈال نہیں پا رہا تھا۔ وہ ٹرے ایک طرف رکھ کر تیزی سے آگے بڑھی اور شرٹ کی آستین پکڑ کر اس کے بازو میں پہنا

دی۔ بائیں ہاتھ سے بٹن بند کرتے ہوئے مرتضیٰ مسکرایا۔ سامنے والے گھر کی چھت پر جلتے بلب کی زرد سی روشنی میں اس کے دھلے دھلائے چہرے پر نظر جما کے وہ بولا۔

"تمہیں کیسے پتا چل جاتا ہے کہ مجھے تمہاری ضرورت ہے؟"

"اس میں میرا نہیں ٹیکنالوجی کا کمال ہے۔" وہ چہکی۔

"اچھا! وہ کیسے؟" ہونٹ بھینچے وہ دلچسپی سے اس کی بونگی سننے کے لیے متوجہ ہوا۔

"بہت آسان سی بات ہے یہ تو۔۔۔ ادھر تمہیں میری ضرورت ہو تو تمہارا دل "ام مریم "ام مریم" پکارتا ہے "اس دیولینتھ کی لہریں یہاں سے وہاں تک مرتعش رہتی ہیں۔ میرے دل میں لگے "سنسرز" مجھے الرٹ کردیتے ہیں اور میں اس پکار پر لبیک کہتی ہوئی دوڑی دوڑی آ پہنچتی ہوں۔" اس کی بات پر وہ کھلکھلا کر ہنسا۔

ام مریم نے اسے نظر بھر کے دیکھا اور بے ساختہ اس ہنسی کے ہمیشگی ہونے کی دعا کی۔ وہ اب چارپائی پر بیٹھ گیا تھا۔

ام مریم نے مٹھی کھول کر اس کے سامنے کی۔

"یہ کیا ہے؟" وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

"خود دیکھ لو!" مرتضیٰ نے رومال کھولا اور سرخ سرخ نیلے نوٹ دیکھ کر حیران سا اس کی صورت تکنے لگا۔

"تمہارے ایگزامز آرہے ہیں ناں مرتضیٰ! تو یہ پیسے تمہارے کمپیوٹر کے لیے ہیں۔ تاکہ تم گھر پر اچھی سی تیاری کرکے شاندار نمبروں سے پڑھائی پوری کرسکو۔"

"ام مریم۔۔۔ اتنے پیسے کہاں سے آئے ہیں تمہارے پاس؟" وہ اب تک حیران پریشان سا تھا۔ ام مریم بے حد محظوظ ہوئی۔

"آپس کی بات ہے۔ کسی کو بتانا مت۔۔۔ ڈاکا ڈالا ہے۔ چھری کی نوک پر راہگیروں کو لوٹا ہے۔" وہ سرگوشی کے انداز میں بول رہی تھی۔

"سیریس ہو جاؤ مریم۔۔۔ اور بتاؤ مجھے سچ۔"

"اف! اتنے سنجیدہ مت ہوا کرو۔ خواہ مخواہ بارعب لگنے لگتے ہو۔ بڑی بڑی مونچھوں اور بھاری تن و توش کے کسی پہلوان کی طرح۔"

وہ چہک رہی تھی۔ مگر مرتضیٰ کی خشمگیں نگاہوں کو دیکھتے ہوئے اسے سنجیدہ ہونا پڑا۔

"ظاہر ہے۔۔۔ جمع کیے ہیں۔ تم بھی کیسے بے سروپا سوال کرتے ہو۔" اس نے سر جھٹکا۔

"اتنے سارے روپے ایک دم کیسے جمع ہوگئے؟" وہ ابھی تک مشکوک نظروں سے اسے تک رہا تھا۔

"ایک دم کہاں؟ یہ تو میں نے اسی دن جمع کرنے شروع کردیے تھے۔ جس دن تم نے کمپیوٹر نہ ہونے کے باعث پڑھائی متاثر ہونے کا بتایا تھا۔ تب سے اب تک تو۔۔۔" وہ انگلیوں کی پوروں پر حساب لگانے لگی۔

"پورے ساڑھے پانچ ماہ ہونے والے ہیں۔ ہر مہینے ٹیوشنز کے پیسے اکٹھے کرکے اتنی رقم ہوگئی۔"

بشاشت اس کے چہرے کے ایک ایک نقش سے پھوٹ رہی تھی۔ مرتضیٰ اس کی اتنی چاہت پر گم صم سا اسے دیکھے گیا۔ اتنی محبت نے اسے گنگ کرڈالا تھا۔

اتنا تو اس کے سگے ماں باپ نے بھی کبھی اس کے لیے نہ سوچا تھا۔ وہ ایک نظر ہتھیلی پہ دھرے پیسے دیکھ رہا تھا تو کبھی ام مریم کو۔۔۔

"ام مریم۔۔۔" وہ بول نہیں پا رہا تھا۔

ام مریم نے مرتضیٰ کی سرسری سی کہی بات نہ صرف یاد رکھی تھی۔ بلکہ اس مسئلے کے حل کے لیے کوششیں بھی کرتی آئی تھی۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ بولے تو کیا بولے۔ محبت کی مسحور سی دبیز چپ کچھ دیر دونوں پر چھائی رہی۔

"یہ پیسے میں نہیں لے سکتا ام مریم!" ہتھیلی پر دھرے نوٹ اسے جہاں یہ احساس دلا رہے تھے کہ وہ ام مریم کے لیے بہت خاص ہے۔ وہیں اسے شرمندگی میں بھی دھنسا رہے تھے۔ وہ مرد ہوکے ایک لڑکی سے اتنا بڑا احسان کیسے لے سکتا تھا۔

"کیا مطلب ہے نہیں لے سکتے؟" اسے غصہ آیا۔

"بس نہیں لے سکتا۔" نظریں نیچی کیے وہ بولا۔ دانستہ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔

"مرتضیٰ! یہ پیسے تمہاری پڑھائی میں مدد کے لیے ہیں۔ کسی عیاشی کے لیے نہیں دے رہی جو تم اس طرح غیروں جیسا برتاؤ کر رہے ہو۔" وہ خفا خفا سی بولی۔

"ہاں۔۔۔ پڑھائی کے لیے ہی سہی۔ یہ جمع کرنے چاہئیں۔" مرتضیٰ کے لہجے کی اجنبیت مریم کو تیخ پا کر گئی۔

"تم تو ایسے کر رہے ہو۔ جیسے پہلی دفعہ میں کچھ دینے لگی ہوں۔ تم بھول گئے بچپن سے اب تک میری ہر چیز لے کر۔۔۔ بلکہ چھین کر ہڑپ کرتے آئے ہو تو اب کیا ہوا ہے؟"

"وہ بات اور تھی ام مریم۔۔۔ لیکن یوں پیسے میں کیسے۔۔۔"

"مرتضیٰ۔۔۔ یہ میں تمہارے لیے نہیں کر رہی۔۔۔ یہ ہمارے لیے ہے۔ ہمارے اچھے کل کے لیے۔۔۔ اس گھر کی خوشحالی کے لیے۔۔۔ شاندار نمبروں سے تمہاری ڈگری کے لیے۔۔۔ "تمہاری کامیابی سے میری خوشی مشروط ہے مرتضیٰ! تمہارا مستقل انکار مجھے دکھ دے رہا ہے۔"

اس کے نین کٹوروں سے پانی پھوٹ پڑا۔ وہ رخ موڑ گئی۔

"اس طرح ناراض مت ہو ام مریم۔" بہت دیر بعد وہ بولا۔

"تو پھر یہ رکھ لو۔" ام مریم نے اس کی ہتھیلی بند کر دی۔

ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے اثبات میں سر ہلا کر اس نے رومال لپیٹ کر جیب میں رکھ لیا۔

بھیگی آنکھوں کے ساتھ وہ ہنس دی تو مرتضیٰ یک ٹک اسے دیکھے گیا۔

گہری ہوتی رات کی نیلگوں روشنی میں اس کے چہرے پر چھائی خوش امیدی کے جگنو وہ باآسانی دیکھ سکتا تھا۔

"میں وعدہ کرتا ہوں ام مریم! میں تمہارے لیے بہت کچھ کروں گا۔ دنیا جہاں کی خوشیاں تمہارے قدموں میں ڈھیر کردوں گا۔ میں ان سب سے ایک بہترین مستقبل کا وعدہ کرتا ہوں۔ جنہوں نے میری پڑھائی کے لیے اتنی قربانیاں دی ہیں۔ ان شاء اللہ اچھے دن بھی آئیں گے اور پھر ہم سب مل کر رہیں گے ایک ساتھ خوش باش۔۔۔"

مرتضیٰ کے جذب سے کہنے پر ام مریم نے صدق دل سے "آمین" کہا اور یخنی کا پیالا اس کی طرف بڑھا دیا۔

☼ ☼ ☼

"ہیلو مرتضیٰ۔۔۔" سکندر اس کے قریب آکر بولا اور گھوم کر اس کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ مرتضیٰ کتابوں میں سر دیے اسائنمنٹ بنانے میں مصروف تھا۔

"کیسے ہو اور ہاتھ کا زخم کیسا ہے اب؟"

"زخم تو بھر گیا ہے۔ ویسے بھی اتنی بڑی چوٹ تو نہیں تھی کہ تم یوں فکر مند ہوتے پھرو۔" اس کے یوں بولنے پر سکندر ہنس پڑا۔

"فکر تو کرنی پڑتی ہے میرے بھائی! آخر کو میرے باعث ہی تم مصیبت میں پڑے تھے۔"

"چلتا ہے یار! میری جگہ کوئی اور ہوتا تو بھی مدافعت کے لیے تمہارے ساتھ ہوتا۔" دونوں میں اچھی دوستی تو نہ تھی۔ مگر مرتضیٰ کلاس کا لائق فائق اسٹوڈنٹ تھا۔ اسی وجہ سے کلاس کے دوسرے اسٹوڈنٹس کی طرح سکندر بھی اس سے اچھی سلام دعا رکھتا تھا۔ جو اس دن کے حادثے کے بعد اچھی دوستی میں بدل گئی تھی۔

وہ مرتضیٰ کا احوال پوچھنے دوبار اس کے گھر بھی گیا

تھا۔ خستہ حال' اکھڑے پلستر والی بیٹھک میں بوسیدہ گھن لگی کرسی پر بیٹھ کے اس نے بڑی حیرانی سے اپنی زبوں حالی پر شرمندہ سے اس ہونہار طالب علم کو دیکھا تھا۔ جس کی قابلیت کے چرچے پروفیسرز کے مابین اور ڈپارٹمنٹ کے باہر تک تھے۔

"مرتضیٰ! تمہارے پاس وقت ہو تو میرے پاس ایک آفر ہے۔" کچھ لمحوں بعد سکندر بولا تو کچھ کہنے کی بجائے مرتضیٰ سوالیہ انداز میں اسے دیکھنے لگا۔

"ایک میٹنگ کے لیے پاپا مجھے اسلام آباد بھیجنا چاہ رہے ہیں۔ کوٹیشن اور پریزنٹیشن امپریسو ہوگی تو ہی پروجیکٹ ہمیں مل سکے گا' اٹلی کی کسی معروف کمپنی کا پروجیکٹ ہے اور شہر کی بڑی کمپنیز یہ گرینڈ پروجیکٹ حاصل کرنے کی سرتوڑ کوششیں کر رہی ہیں۔"

تھوڑی تفصیل بتا کر اس نے مرتضیٰ کو دیکھا۔ جو بڑے دھیان سے اس کی بات سن رہا تھا۔

"پاپا! ایک ڈیلیگیشن کے ساتھ چین جا رہے ہیں۔ اس لیے اس میٹنگ کے لیے مجھے جانا ہوگا۔ ویسے تو میں نے کافی میٹنگز میں پریزنٹیشن دی ہے۔ مگر اتنے بڑے پیمانے پر پہلی بار جاؤں گا۔ پاکستان کی مختلف کمپنیز وہاں اکٹھی ہوں گی۔ اس لیے یہ ٹاسک آسان نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں تم بھی میرے ساتھ چلو۔ یا یوں کہہ لو کہ تم اتنے قابل ہو کہ مجھے تمہاری ضرورت پڑ گئی ہے۔" وہ مسکرا کر بولا۔

"مگر ایگزامز..."

"ایگزامز میں تو ابھی مہینہ پڑا ہے۔ یہ میٹنگ نیکسٹ ویک ہے۔ تم سوچ لو آرام سے۔ کوئی جلدی نہیں ہے۔ پھر بھی میں تو چاہوں گا تم ساتھ چلو مجھے بھی تسلی رہے گی کہ ایک ذہین و فطین آدمی میرے ساتھ ہے۔"

اس کی بات پر مرتضیٰ ہنس پڑا۔

"چلو دیکھتے ہیں' فی الحال تو یہ اسائنمنٹ مکمل کرو' کل سبمٹ بھی کروانی ہے۔"

اثبات میں سر ہلا کر سکندر کتاب ایشو کروانے چل دیا اور مرتضیٰ ایک بار پھر نوٹ بک پر جھک گیا۔

☼ ☼ ☼

"ہرا... مریم آپی جیت گئیں... جیت گئیں!!" صبا اور صالحہ زور زور سے تالیاں پیٹنے لگیں۔ ننھا سا گڈو بھی خوشی سے قلقاریاں مار رہا تھا۔ وہ اس وقت بچوں کے ساتھ اپنے صحن کے بیچ چاک سے لکیریں کھینچے "اسٹاپو" کھیلنے میں مگن تھی۔ ایک پاؤں پر اچھلتی کودتی وہ ثمین کے ساتھ مقابلے پر تھی۔ یہ گیم وہ جیت گئی تھی۔ ثمین کو ان سب کا شوق نہ تھا مگر ام مریم کے کہنے پر زبردستی کھیلنے لگ گئی تھی۔ مریم تو بچوں کے ساتھ بچی بنی رہتی تھی۔ گڈو آپا زینب کا بیٹا تھا۔ چار سالہ صبا اور چھ سالہ صالحہ بڑی آپا نسرین کی بیٹیاں تھیں۔

اس اتوار کو دونوں اپنے میکے آئی ہوئی تھیں اور حسب معمول بچے صبح ہوتے ہی چیختے چلاتے شور مچاتے اپنی "مریم آپی" کے پلنگ پر چڑھ کر اسے جگا چکے تھے مگر بجائے کوفت زدہ ہونے کے اس نے مندی مندی آنکھوں سے انہیں دیکھا اور بشاشت سے مسکرا دی تھی۔

"واہ جی واہ! آج تو ہمارے گھر میں رونق اتری ہے۔" بستر سے اٹھتے ہوئے وہ چہکی تھی۔ جب تک منہ ہاتھ دھو کر وہ باہر آئی بچوں نے اس نے گرد گھیرا ڈال لیا اور تب سے وہ سب مل کر صحن میں دھماچوکڑی مچا رہے تھے۔ برآمدے میں بیٹھے عبدالرحیم' مریم اور بچوں کو دیکھتے ہوئے مسکرائے جا رہے تھے۔ خوب کھیل چکنے کے بعد وہ انہیں لطیفے سنا کر ہنساتی رہتی۔ خصوصاً" ننھے گڈو کی کھلکھلاہٹ تو اس کے دل میں گدگدی سی کر دیتی تھی۔

"مریم آپی! ہمیں مہندی لگائیں ناں..." صالحہ جب بھی نانی کے ہاں آتی اپنے ساتھ کون ضرور لے کر آتی اور مریم سے بطور خاص اپنے ہاتھوں پر بیل بوٹے بنواتی اور پھر انہیں دکھانے کے لیے ننھی ننھی ہتھیلیاں بلند کیے پھرتی رہتی۔ اس کی دیکھا دیکھی صبا بھی شروع ہو گئی۔ تو وہ ان کی انگلی پکڑے تایا کے گھر آ گئی۔ صالحہ بھاگ کر کون اٹھا لائی اور ام مریم دونوں آپاؤں کے پاس ہی چوکڑی مار کے بیٹھ گئی ننھی صالحہ کی ہتھیلی پکڑ کے کون کی نوک سے خوب صورت پھول بنانے کے ساتھ ساتھ وہ ان کی خیر خیریت بھی پوچھتی جاتی۔

"مریم آپی! کہانی سنائیں ناں جو اس دن آپ نے سنائی تھی' پری اور جادوگرنی والی۔" صبا کا حافظہ بڑا تیز تھا۔ صالحہ اپنے ڈیزائن بنوانے کے بعد اب دور بیٹھی اس پر پھونکیں مار رہی تھی۔

"کہانیاں تو رات میں سنتے ہیں نا جانو! تو آپ رات کو آنا پھر میں آپ کو کہانیاں سناؤں گی۔"

"لیکن ابھی کیوں نہیں سنا سکتیں؟" وہ بے صبری ہو رہی تھی۔

"کیونکہ دن میں کہانیاں سنانے سے ماموں گھر کا رستہ بھول جاتے ہیں اس لیے!" اپنے بچپن میں سنی اوٹ پٹانگ سی بات اس نے ان کے سامنے دہرا دی۔

"ارے واہ... ماموں تو گھر پر ہی ہیں پھر رستہ کیسے بھولیں گے؟" دور بیٹھی صالحہ نے اپنے تئیں حاضر دماغی کا ثبوت دیا۔

"جب وہ آپ کے گھر آئیں گے ناں پھر رستہ بھٹک جائیں گے اس لیے کہانی رات میں ہی چلے گی اوکے۔"

مرتضیٰ کے گھر پر ہونے کا سن کے وہ بے چین سی ہوئی تھی۔ اسے اتنی دیر ہو گئی تھی آئے ہوئے لیکن مرتضیٰ نے نہ تو اسے آواز دی تھی نہ اس کی آواز سن کے خود باہر آیا تھا۔ وہ تو یہی خیال کیے بیٹھی تھی کہ وہ گھر پر نہیں ہے۔ جلدی جلدی صبا کو بھی مہندی لگا کے اس نے اسے پنکھے کے نیچے بیٹھنے کو کہا اور خود کچن میں چلی آئی۔ تائی رخشندہ چائے کپوں میں انڈیل رہی تھیں۔

"لے مریم! یہ نسرین اور زینب کو تھما دے اور تیسرا کپ مرتضیٰ کو دے آ' اس کے سر میں درد ہو رہا ہے' صبح سے اس موئے کمپیوٹر میں دماغ کھپا رہا ہے۔"

پلیٹ میں کپ رکھ کے وہ باہر آ گئی۔ اور برآمدے میں بیٹھی نسرین اور زینب کو چائے پکڑا دی۔ تیسرا کپ لیے وہ اندر کمرے کی جانب بڑھی۔ تائی کے ہاں مہمان نوازی کا خاص رجحان نہ تھا۔ اور وہ تو مہمان تھی بھی نہیں گھر کی ہی تھی۔ مگر گھر کا فرد ہونے کی حیثیت سے بھی کبھی چھوٹے منہ سے اسے اس پر ایسی کوئی مہربانی نہ کی گئی تھی اور ام مریم نے بھی یہ فرق کبھی محسوس نہ کیا تھا۔ وہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں پہ دل میں کدورتیں پالنے والوں میں سے نہ تھی۔

مرتضیٰ سامنے کی دیوار کے ساتھ کونے میں رکھے کمپیوٹر کے آگے بیٹھا تھا۔ ام مریم کے جیسے دینے کے تیسرے ہی روز وہ کمپیوٹر لے آیا تھا۔ گھر میں سب ہی حیران تھے مگر ام مریم نے اسے پیسے دینے کا بتانے سے منع کیا تھا۔ اس لیے مرتضیٰ نے یہی بتایا کہ اس نے جمع کیے تھے پیسے اور کچھ ادھار لے کے کمپیوٹر لایا ہے۔ جو وہ خود کما کے چکا دے گا۔

اس نے بڑھ کر چائے زور سے ٹیبل پر رکھی تو اس نے مڑ کر دیکھا۔ ام مریم کے چہرے پر ہلکی سی خفگی تھی۔ یہ تمتماہٹ یقیناً" اس کی اتنی دیر کی موجودگی کو نظرانداز کیے جانے کے باعث تھی۔

مرتضیٰ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ اس کا فون بجنے لگا۔ دائیں ہاتھ سے فون اٹھا کر سننے لگا۔ اسے پھر سے مصروف دیکھ کے ام مریم جانے کے لیے مڑی مگر مرتضیٰ نے اس کی کلائی پکڑ کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ ناراض ناراض سی منہ پھلائے پاس پڑی کرسی پر ٹک گئی۔ چند منٹ بعد فون بند ہو گیا تو وہ اس کی جانب مڑا۔

"یہ اتنا منہ کیوں پھلایا ہوا ہے تم نے؟"

"کوئی نہیں منہ پھلایا ہوا' میں ٹھیک ہوں اور آپ

کو اتنی پرواہ کیوں ہو رہی ہے؟ رہیں آپ مصروف!" وہ ناراضی میں تم سے "آپ" پر آجاتی تھی۔ خفگی کے بے ساختہ اظہار پر مرتضیٰ کے چہرے پر بے ساختہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"اوہو اتنی سی بات پر خفگی.... بری بات ام مریم۔"

"یہ اتنی سی بات ہے کہ پچھلے آدھے گھنٹے سے میں آئی بیٹھی ہوں اور تم یوں کمرے میں چھپے بیٹھے ہو جیسے گھر میں ہو ہی نہیں۔"

"کام کر رہا تھا مریم! ویسے بھی مجھے پتا تھا تم خود ہی آجاؤ گی تھوڑی دیر تک۔"

"ہونہہ۔"

"اچھا موڈ سیٹ کرو' یہ دیکھو میں صبح سے اس کام میں سر کھپا رہا ہوں۔"

مریم نے قدرے رخ موڑ کر کمپیوٹر اسکرین کی طرف دیکھا۔ کسی انٹرنیشنل کمپنی کا ویب پیج کھلا تھا۔

"کیوں ایسا کیا کر رہے ہو؟" ناراضی بھول بھال کر وہ دلچسپی سے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"میں اس کمپنی کا بیک گراؤنڈ اور پروگریس رپورٹ پر ریسرچ کر رہا تھا۔ وہ میرا دوست ہے نا' سکندر' اس نے ایک کانٹریکٹ کے لیے پریزنٹیشن کی تیاری میرے سپرد کی ہے۔"

مرتضیٰ اسے کمپنی کے شاندار ریکارڈ سے آگاہ کرنے لگا اور ام مریم چہرہ ہتھیلی پر رکھے اس کی بات بغور سننے لگی۔

"میٹنگ اسلام آباد میں ہے' دو تین دن میں واپسی ہو جائے گی' وہاں بڑے بڑے لوگوں سے ملنے کا موقع ملے گا۔ بزنس ڈیلنگز کیسے ہوتی ہیں' کاروباری داؤ پیچ سیکھنے اور بہت کچھ دیکھنے کا موقع ملے گا۔" مرتضیٰ پرجوش سا کہہ رہا تھا۔

"تم دعا کرو کہ جو اتنی محنت کی ہے وہ وصول ہو جائے' کانٹریکٹ سکندر کو مل جائے۔"

"سکندر کے لیے اتنی محنت کیوں کر رہے ہو تم؟" وہ الجھ رہی تھی۔

"ام مریم! تم نہیں سمجھو گی ان معاملات کو.... میں یہ کیوں کر رہا ہوں یہ سوچنا چھوڑو اور بس اس لیے دعا کرو کہ میں محنت کر رہا ہوں۔" مریم کا ہاتھ تھامے وہ اسے دعا کرنے کے لیے کہہ رہا تھا۔

لیکن وہ خود بھی جانتا تھا کہ ام مریم کی دعاؤں کا محور اسی کے نام سے شروع ہو کر اسی کے وجود پر ختم ہوتا تھا۔

☆ ☆ ☆

اسلام آباد کی صاف ستھری کشادہ سڑکوں پر دوڑتی سیاہ وٹز وسیع رقبے پر پھیلی ایک عظیم الشان بلند و بالا عمارت کے سامنے آ رکی تھی۔ مرتضیٰ اپنی جانب کا دروازہ کھول کر نیچے اترا۔ اپنی اپنی گاڑیاں پارک کرتے سوٹڈ بوٹڈ بریف کیس' لیپ ٹاپ بیگز اٹھائے ہوئے لوگ بلڈنگ میں داخل ہو رہے تھے۔ عمارت کے وسیع رقبے اور اونچائی کو دیکھتا ہوا مرتضیٰ اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ ڈرائیونگ سیٹ سے نکلتے سکندر نے ڈیش بورڈ پر ہاتھ مارا پھر بیک سیٹ پر متلاشی نگاہیں دوڑائیں۔

"اوہ نو!" اس کی تشویش بھری آواز سن کر بلڈنگ میں داخل ہوتے لوگوں کو دیکھتا مرتضیٰ اس کی جانب پلٹا۔

"یار! بڑی گڑبڑ ہو گئی۔ وہ پریزنٹیشن والی فائل شاید کمرے میں ہی رہ گئی ہے۔" اس کے لہجے سے پریشانی ہویدا تھی۔ پریشان ہونا بنتا بھی تھا کیونکہ آج کی اس میٹنگ میں پریزنٹیشن اس فائل کے ڈیٹا کے بل پر ہی دی جانی تھی جو مرتضیٰ نے کئی دن کی لگاتار محنت کے بعد تیار کر کے اس کے حوالے کی تھی اور جس پر ایک نظر ڈالتے ہی سکندر کو اندازہ ہو گیا تھا کہ ایسی ریسرچ پر مبنی بہترین پریزنٹیشن ڈیٹا کسی نے یکجا نہیں کیا ہو گا۔

مگر غلطی سے وہ وہ فائل وہیں چھوڑ آیا تھا اور اب شدید الجھن میں گھرا خود کو کوس رہا تھا۔ میٹنگ ہال سے ہوٹل کا فاصلہ کم سے کم بھی بیس منٹ کا تھا اور آنے جانے میں لگنے والا وقت بہت زیادہ....

جبکہ میٹنگ اگلے دس منٹ میں شروع ہونے والی تھی۔ سکندر پر شدید جھنجلاہٹ طاری ہو گئی' مرتضیٰ بھی فکر مند تھا۔

"مرتضیٰ! یوں کرو تم اندر جاؤ' یہ کارڈ رکھ لو۔" اس نے اے آر گروپ آف کمپنیز کا کارڈ اسے تھمایا۔

"میں ہوٹل جا کر فائل لے کر جلد آنے کی کوشش کرتا ہوں' اگر ہم دونوں غیر حاضر ہوں گے تو مسئلہ ہو گا۔ تم ہماری کمپنی کے ممبر کی حیثیت سے کانفرنس روم میں جاؤ میں بس ابھی آیا۔"

تیزی سے اسے سمجھاتا وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر بیٹھا۔ مرتضیٰ کو ڈرائیونگ نہ آنے کے باعث اسے یہ سب خود کرنا تھا اور بہت تیزی سے کرنا تھا۔

"مگر میں اکیلا کیسے....." اس کی گھبراہٹ میں یکدم اضافہ ہو گیا تھا۔ اتنے بڑے بڑے لوگوں کے سامنے جا کر بیٹھنے کے خیال سے ہی اس کی پیشانی عرق آلود ہو گئی تھی۔

"کم آن مرتضیٰ! جب تک ہماری پریزنٹیشن کی باری آئے گی۔ میں آچکا ہوں گا۔ تمہیں وہاں جا کر صرف ہماری کمپنی کی جانب سے شرکت کی یقین دہانی کروانی ہے۔"

تیز تیز بولتا وہ اسپیڈ میں گاڑی نکال لے گیا۔

ایسا نہیں تھا کہ اس نے کبھی اتنے لوگوں کے سامنے پریزنٹیشن نہ دی تھی۔ وہ اپنی کلاس کا کانفیڈنٹ اسٹوڈنٹ تھا' اپنے ڈپارٹمنٹ کا ہونہار طالب علم تھا۔ مسئلہ اس کا نہیں تھا' مسئلہ تو بس اس کلاس کے فرق کا تھا۔ وہ اپر کلاس سے جس حد تک مرعوب تھا اس سے کہیں زیادہ نروس بھی تھا۔ وسیع و عریض ہال نما لابی کی خنک فضا میں بھی اس کے چہرے پر آئے پسینے کے ننھے قطرے صاف دیکھے جا سکتے تھے۔ اس نے جیب سے سفید رومال نکال کر چہرہ صاف کیا۔ یہ ام مریم کا دیا رومال تھا۔ اسے مریم کے خیال سے ہی تقویت مل گئی۔ وہ ریسپشن کی طرف بڑھ گیا۔ لڑکی نے اس کی رہنمائی کی۔

مرتضیٰ نے ہال پر تفصیلی نگاہ ڈال کر ایک بار پھر رومال سے چہرہ صاف کیا۔ خود کو یہ احساس دلانے کے لیے کہ وہ تنہا نہیں ہے' ام مریم کی ہمت بندھاتی خوشبو اس کے ساتھ ہے۔ وہ چلتا ہوا دائیں جانب خالی نشستوں میں سے ایک پر آکے بیٹھ گیا۔ ہال میں موجود تقریباً" تمام نشستیں بھر چکی تھیں۔ صرف چند ایک خالی تھیں۔

اپنی چھبیس سالہ زندگی میں پہلی بار وہ ایسی کسی میٹنگ میں شرکت کر رہا تھا۔ اس نے اپنی بہترین شرٹ پر چیک والی ٹائی لگائی تھی جو وہ دو دن قبل ڈھائی سو کی خرید کر لایا تھا۔ مگر ارد گرد بیٹھے لوگوں کی ڈائمنڈز سے جڑی ٹائی پنز اور گھڑیوں کے چمکتے ڈائل اس کی خود اعتمادی کو بار بار ڈگمگا رہے تھے۔

وہ کبھی اتنا نروس نہیں ہوا تھا جتنا اس وقت ہو رہا تھا۔ گھڑی نے دس بجنے کا اعلان کر دیا تھا۔ تمام لوگوں نے باتیں ترک کر کے فوراً" نشستوں پر اپنا رخ سامنے کی طرف کر لیا تھا۔ جہاں متعلقہ انٹرنیشنل کمپنی کا ڈیلیگیشن آچکا تھا۔ مرتضیٰ نے گھڑی دیکھتے ہوئے بے ساختہ سکندر کے آجانے کی دعا کی۔ تعارف کا مرحلہ شروع ہو چکا تھا۔ معروف کمپنیز کے چیئرمین اور ڈائریکٹرز کے پراعتماد تعارف کے بعد اس کی باری بھی آئی تو قدرے اٹکتے ہوئے اے آر گروپ آف کمپنیز کے حوالے سے اس نے اپنا تعارف بھی کروا دیا۔

اس چھوٹے سے لمحاتی مرحلے نے ہی اس کے ہاتھوں میں لرزش طاری کر دی تھی۔ بھلا اتنا گھبرانے والی کیا بات تھی۔ اس نے خود کو پرسکون کرنے کے لیے کرسی کی بیک سے پشت ٹکالی۔ فل ایئر کنڈیشنڈ فضا میں مدھم مدھم سی بھنبھناہٹ بھی تھم گئی جب پہلی پریزنٹیشن کا آغاز ہوا۔ مرتضیٰ نے بڑے دھیان سے اس کے Contents کا تجزیہ کیا۔ ان کا انداز بیاں اتنا متاثر کن تھا کہ مرتضیٰ ساری گھبراہٹ بھول

کر پریزنٹیشن دینے والے کے پُراعتماد انداز اور قائل کر لینے والے لہجے پر غور کرنے لگا۔ کاروباری طرز کی ان پریزنٹیشنز کا تجربہ کافی سکھا دینے والا تھا۔ مرتضیٰ کے لاشعور میں کلبلاتی بزنس مین بننے کی نادیدہ خواہش اسے ایک ایک بات میں دلچسپی لینے پر اکسا رہی تھی۔ گھڑی کی سوئیاں سرک رہی تھیں مگر سکندر اب تک نہ آیا تھا۔ ایک کے بعد دوسری پھر تیسری پریزنٹیشن بھی ختم ہو گئی۔

چوتھی باری اے۔ آر گروپ آف کمپنیز کی تھی۔ کوآرڈینیٹر نے ان کا نام پکارا۔ تمام لوگ منتظر نگاہوں سے اس کی جانب دیکھنے لگے تو وہ پھر سے گھبرا گیا۔

مرتضیٰ عبدالکریم کو فوری فیصلہ کرنا تھا۔ اب تک وہ صرف اس لیے مطمئن بیٹھا تھا کہ ابھی اتنی کمپنیز باقی ہیں تو ان کی باری آنے تک سکندر آ ہی جائے گا مگر اتنی جلدی ان کا نمبر آ جائے گا' یہ اس کی توقع کے خلاف تھا۔

کیا یہ قسمت کی طرف سے کوئی اشارہ تھا؟

کیا یہی وہ دستک ہے جس کی آواز کے لیے چوکھٹ سے کان لگائے اس جیسے لوگ عمر بتا دیتے ہیں……؟

وقت کم تھا۔

کچھ کرنے کا وقت تھا…… صحیح فیصلے کا وقت تھا اور …… فیصلہ ہو گیا!

اس نے سامنے دھرا پانی کا گلاس اٹھا کر لبوں سے لگایا اور دو تین گھونٹ بھر کر خود میں ہمت مجتمع کر کے پورا وزن قدموں پہ ڈال کے اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا۔

وہاں موجود ہر فرد اپنی پریزنٹیشن کے پیپرز یا لیپ ٹاپ ساتھ لے کر اٹھا تھا صرف وہی تھا جو خالی ہاتھ اپنی سیٹ سے اٹھ آیا تھا کیونکہ اس کے پاس کچھ تھا ہی نہیں۔

چند ثانیے خاموش رہنے کے بعد پریزنٹیشن کا آغاز اسی طرح کیا جس طرح اس نے باقیوں کو کہتے دیکھا تھا۔

اس کے پاس کوئی پیپر نہیں تھا مگر اس کے ذہن میں وہ تمام اعداد و شمار اور ریسرچ گھومنے لگی جسے اس نے بہت ڈھونڈنے کے بعد یکجا کیا تھا اور جو بار بار پڑھنے پر اس کے ذہن پر نقش ہو چکی تھیں۔ اس نے مختصراً اے آر گروپ آف کمپنیز کا تعارف کروایا جو یقیناً کسی تعارف کی محتاج نہیں تھی۔ مگر سب کی طرح رسماً اسے بھی یہ کرنا تھا۔ پھر وہ مارکر اٹھا کر وائٹ بورڈ پر کچھ گرافس بنانے لگا۔ وہ ان پوائنٹ کو بیان کر رہا تھا جو اے آر گروپ آف کمپنیز اور اس اٹالین کمپنی میں یکساں تھے۔

اس کی اور باقی لوگوں کی پریزنٹیشن میں ایک واضح فرق تھا۔ باقی تمام لوگ اپنی کمپنی کی ترقی اور پس منظر کو بیان کرنے میں لگے تھے جبکہ مرتضیٰ نے اس اٹالین کمپنی کے باریک مگر چند اہم نکات سامنے رکھنے کے بعد اسی کی مناسبت سے اپنا مدعا سامنے رکھا۔ اس نے اپنی ریسرچ کے حوالے سے ہی ڈیلی گیشن کے ممبران کا دل موہ لیا تھا۔ نوجوان کی اس حکمت عملی پر بہت سے چہروں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

وہ پراجیکٹر استعمال نہیں کر رہا تھا کیونکہ اس کے پاس پراجیکٹر پر چلانے کے لیے کسی قسم کا ڈیٹا نہیں تھا۔ وہ سی ڈی بھی اسی فائل میں رہ گئی تھی جو سکندر نے تیار کی تھی۔ مگر بجائے ہاتھ پر ہاتھ دھر کے شانے اچکاتے ہوئے میٹنگ سے لاتعلقی ظاہر کرنے کے وہ اتنا مواد لیے ڈائس پر آ گیا تھا جو کسی کمپیوٹر کی مانند اس کے دماغ میں محفوظ تھا۔ وہاں موجود ہر فرد دلچسپی سے اس نوجوان کو دیکھ رہا تھا جس کے ہاتھ تیزی سے وائٹ بورڈ پر کچھ ڈرا کرتے زبان وضاحت دیتی اور پھر مٹا کر وہ نئے سرے سے کوئی نئی لاجک دینے لگتا۔

وہاں بیٹھے ہر شخص نے اعتراف کیا تھا کہ جس گرینڈ پراجیکٹ کے حصول کے لیے وہ سب وہاں اکٹھے ہوئے تھے اس انٹرنیشنل کمپنی کے متعلق اس لڑکے سے اچھی ریسرچ کسی نے نہیں کی تھی۔

اٹالین ڈیلیگیشن بھی اس کے منہ سے وہ حقائق سن کر بہت متاثر تھا جس کی باریکی میں کوئی اترتا ہے۔ مرتضیٰ نے اپنی کوٹیشن آغاز میں ہی دینے کی حماقت نہیں کی تھی۔ اس نے صرف ایک نقطے پر مختلف لاجکس اکٹھی کر دی تھیں کہ یہ پراجیکٹ اے آر گروپ آف کمپنیز کو ہی کیوں ملنا چاہیے۔ سکندر اس پریزنٹیشن کے درمیان ہی آ چکا تھا اور مرتضیٰ کے ساتھ جا کر کھڑا ہونے کے بجائے وہ حیرت سے منہ کھولے اسے بنا اٹکے 'بنا رکے بولتا دیکھ رہا تھا…… مرتضیٰ کو اپنے ساتھ لا کر یقیناً" اس نے عقل مندی کا ثبوت دیا تھا ورنہ آج اپنی کوتاہی کے باعث وہ نہ صرف ایک بڑے کانٹریکٹ کو پانے کا چانس کھو چکا ہوتا۔ بلکہ اپنی کمپنی کی ریپوٹیشن پر بھی سوال کھڑا کر دیتا۔

مرتضیٰ نے زیادہ وقت نہیں لیا تھا۔ اختتامیہ جملے بول کر اس نے کوٹیشن سامنے رکھیں جو سکندر اسے راستے میں بتا رہا تھا۔ وائٹ بورڈز سے ڈیٹا مٹا کر خود اعتمادی سے سب کی جانب ایک مسکراہٹ اچھالتا وہ یہ سوچتے ہوئے اپنی نشست کی جانب بڑھ گیا کہ ام مریم صحیح کہتی ہے 'زندگی ہر انسان کو خود کو جیت لینے کا ایک موقع ضرور دیتی ہے۔ تب انسان کو حواس باختہ ہونے کے بجائے خود اعتمادی سے آگے بڑھ کر اس سے استفادہ حاصل کرنا چاہیے۔

سکندر کے پرجوش انداز میں اس سے ہاتھ ملانے نے مرتضیٰ کو بتا دیا تھا کہ زندگی اسے وہ سنہری موقع دے چکی ہے اور کیوں نہ دیتی کہ گزشتہ رات سے اٹھے ہاتھ اور ہلتے لب مستقل اس کی کامیابی کے لیے دعاگو تھے۔

☼ ☼ ☼

"بعض اوقات کسی کے ایک حرف دعا سے قسمتیں بھی جگمگا اٹھتی ہیں لیکن اگر انسان اسے رب کی رحمت سمجھے نا کہ اپنی عقل کل کا کمال……

دستک ہو رہی تھی…… مسلسل ہلکی ہلکی مگر تسلسل سے…… اور اس سے پہلے کہ تقدیر پلٹ جائے۔ بشر کو دروازہ کھول ہی دینا چاہیے……!

وہ بھی آگے بڑھ آیا تھا۔ دروازے کے باہر سکندر کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ مرتضیٰ سے آلپٹا۔

"مصطفیٰ! ہم نے وہ کانٹریکٹ حاصل کر لیا ہے۔ کھلکھلاتے ہوئے سکندر نے اسے بہت بڑی خوش خبری سنائی۔ مرتضیٰ بھی حیران حیران سا خوشی سے منور چہرہ لیے اسے دیکھنے لگا۔

"بہت بہت مبارک ہو سکندر۔"

"ناں' میرا اس میں کوئی کمال نہیں جو کیا صرف تم نے کیا' تمہاری وجہ سے یہ کانٹریکٹ ہمیں ملا ہے۔ میرے ساتھ چلو تم۔ پاپا بہت خوش ہیں' وہ تم سے ابھی ملنا چاہتے ہیں۔"

"ابھی……" مرتضیٰ نے ایک نظر اپنے حلیے پر ڈالی۔ آف وائٹ ٹی شرٹ کے سامنے بنا ڈیزائن بہت بار دھلائی کی وجہ سے اتنا ماند پڑ چکا تھا کہ بھدا لگنے لگا تھا۔

"ہاں ابھی۔ تم فٹافٹ چینج کر آؤ میں باہر کھڑا انتظار کرتا ہوں۔" مرتضیٰ کو تذبذب دیکھ کر سکندر نے آسانی پیدا کی۔

"تم آؤ ناں۔ اندر بیٹھو۔"

"نہیں نہیں۔ میں ٹھیک ہوں' تم بس جلدی آ جاؤ یار۔" اس کے بے صبری سے یوں کہنے پہ مرتضیٰ مسکراتے ہوئے مڑ گیا۔

☼ ☼ ☼

اے آر گروپ آف کمپنیز کی بلڈنگ کے گراؤنڈ فلور پر بائیں جانب بنے سجے سجائے دفتر کا انٹیریر دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ باقی باہر ہال میں بنے مختلف کیبن میں تمام ورکرز اپنے کام میں منہمک تھے۔ ڈائریکٹر عبدالرحمن حمدانی اس وقت شیشے کے جہازی سائز میز کے پیچھے بیٹھے انٹرکام کا ریسیور اٹھائے مرتضیٰ کے لیے کولڈ ڈرنک اور کچھ اسنیکس کا کہہ رہے تھے۔ اس کا استقبال اس کی سوچ سے بھی زیادہ پرجوش طریقے سے ہوا تھا۔ عبدالرحمن اس سے بہت خوش تھے۔

"آپ کو اندازہ ہے کہ کتنی بڑی کمپنیز کے سامنے سے کانٹریکٹ جیت کر لائے ہیں آپ؟" وہ ہنستے ہوئے

مرتضیٰ سے پوچھ رہے تھے۔وہ متانت سے مسکرا دیا۔

"سر! ایسی میٹنگ میں شرکت کا پہلا موقع تھا' اس لیے میں خاصا نروس تھا۔ لیکن شکر ہے اللہ تعالیٰ کا کہ اس نے اتنی ہمت دی' اتنی طاقت دی کہ میں ایسی بڑی کمپنیز کے ڈائریکٹرز کے سامنے بول سکوں' اس میں میرا کوئی کمال نہیں۔"

"پاپا! میں نے آپ سے کہا تھا ناں کہ مرتضیٰ ان لوگوں میں سے ہے۔ جنہیں اپنی قابلیت کے جوہر دکھانے کے لیے محض ایک موقع ہی کافی ہوتا ہے۔" سکندر نے بھی بے ساختہ اس کی تعریف کی۔

مرتضیٰ کو اتنی اہمیت جیسے ہوائیں اڑانے لگی۔ شہر کی ایک نامی گرامی کمپنی کا ڈائریکٹر خود اس کی صلاحیتوں کا معترف تھا۔

"ایم بی اے مکمل کرنے کے بعد کیا کرنے کے ارادے ہیں آپ کے بیٹا؟"

"ارادے تو بہت بلند ہیں سر۔۔۔ جاب ہی کروں گا۔ مگر جاب تو بس ایک آغاز ہوگا۔ منزل نہیں۔ میں بزنس کرنا چاہتا ہوں۔"

اس کی بات پر عبدالرحمٰن مسکرائے۔

اپنے سامنے بیٹھے اس قابل نوجوان کے نقوش میں انہیں اپنا آپ نظر آیا۔ جس میں کچھ کر دکھانے کا جنون تھا' جو صرف قسمت کی جانب سے ایک موقع' ایک اشارے کا منتظر تھا۔ خود انہوں نے یہ کمپنی جس طرح کھڑی کی تھی یہ جدوجہد کی ایک لمبی داستان تھی

اٹھتے وقت مرتضیٰ نے اجازت چاہی تو عبدالرحمن ہمدانی نے خود اٹھ کر گرم جوشی سے اسے گلے لگایا تھا۔

عمارت کے داخلی دروازے سے باہر نکلتے ہوئے مستقبل میں کچھ کر دکھانے کے خیال سے اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں روشن دنوں کی لو دیتے ننھے ننھے بے شمار چراغ جگمگا رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

وقت معمول کی رفتاری سے گزرتا رہا۔ مرتضیٰ کے امتحانات اچھے سے ہو گئے اور جتنے اچھے پیپرز ہوئے تھے اسے یقین تھا کہ بہت شاندار نہ سہی مگر ایک بہتر رزلٹ آئے گا اور چند مہینوں بعد نتیجہ آنے پر اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ پنجاب یونیورسٹی کے گولڈ میڈلسٹ اسٹوڈنٹس کی فہرست میں مرتضیٰ عبدالکریم کا نام بھی شامل ہو چکا تھا۔ پورا گھر اس کی کامیابی پر نازاں تھا اور ام مریم تو سجدے سے سر ہی نہیں اٹھا پا رہی تھی۔

اسے لگتا تھا کہ اب کامیابی اور اس کے بیچ کوئی نہیں آسکتا۔ لیکن قسمت کو جانے کیا منظور تھا۔ اتنے اچھے رزلٹ کے بعد بھی اسے — نوکری نہ مل رہی تھی اور اس چیز نے اسے ہر شے سے متنفر کر دیا تھا۔ ہر بات سے بے زار کر ڈالا تھا۔ ام مریم کی ہمت بندھاتی باتیں بھی اب اسے طفل تسلیوں کے سوا کچھ نہ لگتیں۔ کیونکہ انسان اتنا ہی بے صبرا ہے۔ وہ سب کچھ فوراً"ہی مل جانے کی تمنا کرتا ہے۔

"صبر کا پھل ہمیشہ میٹھا ہوتا ہے۔" ام مریم کی یہ بات سن سن کر وہ تھک گیا تھا اور تقدیر اس کی بے صبری پر مسکرائے چلی جا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ سر جھاڑ منہ پہاڑ مٹی سے اٹے صحن میں بیٹھی ردی اور فالتو اشیا میں سے کام آجانے والی چیزیں الگ کر رہی تھی۔ کاغذوں اور پھٹی پرانی کتابوں کو ایک تھیلے میں بھر کر وہ ردی والے کو بھجوانے کا سوچ رہی تھی۔ سامنے والے کمرے کے ساتھ موجود چھوٹے سے اسٹور کی صفائی آج بڑے دن بعد کی تھی۔ ارادہ تو بہت دن سے تھا مگر وہ سستی کر جاتی تھی۔ سبین نے کچن کی تفصیلی صفائی پر کمر کس رکھی تھی۔

ڈھائی مرلے کے اس گھر میں دو بیٹیوں کے ہاتھوں کے سلیقے اور سگھڑاپے کی گہری چھاپ نظر آتی تھی۔ کمروں میں سامان کی بھرمار نہ تھی۔ اس لیے گھر صاف ستھرا اور پرسکون لگتا تھا۔ سامنے والے کمرے میں دو پلنگ' جن پر کڑھی ہوئی سفید چادریں بچھی تھیں' ان کی مرحومہ ماں کے جہیز کی ایک آئینے اور چھوٹی سی میز والی سنگھار میز اور ان ہی کا بوسیدہ سا ٹرنک' دوسری طرف کپڑوں کی ایک چھوٹی الماری بھی تھی۔ ام مریم اور سبین اس کمرے میں عرصے سے سوتی آئی تھیں۔

اماں کے انتقال کے بعد عبدالرحیم نے ہی انہیں ماں کی طرح پالا تھا۔ ہر ضرورت کا خیال رکھا' بے شک ان کی حیثیت کم تھی مگر اس کے مطابق انہوں نے اپنی بیٹیوں کو کوئی کمی نہ ہونے دی اور وہ دونوں تھیں بھی صابر' قناعت کرنے کا وصف عبدالرحیم سے ان میں آیا تھا۔ عبدالرحیم کا بستر داخلی دروازے کے ساتھ والے باہری کمرے میں بچھا تھا۔ وہاں لکڑی کی تین کرسیاں اور ایک چھوٹی تپائی بھی رکھی تھی۔ آنے جانے والے مہمانوں کو وہیں بٹھایا جاتا تھا۔ یوں یہ کمرہ بیٹھک کا کام بھی دیتا تھا۔ سامنے والے کمرے کے دائیں جانب اسٹور تھا اور چھوٹے سے برآمدے کے باہر صحن کے ایک جانب کچن اور باتھ روم اور دوسری جانب دیوار کے ساتھ ایک کیاری بنی تھی۔

سالوں پہلے عبدالرحیم نے ام مریم کی ضد پر وہاں زمین کھود کر کھاد ڈلوادی تھی اور نتیجتاً" اتنے سالوں کی محنت سے شہتوت اور امرود کا ایک ایک چھتنار درخت چھوٹے سے صحن پر سایہ فگن رہتا اور گرمیوں میں سورج کی تپش شہتوت کے اس گھنے درخت میں منہ گھسائی گھر میں گھسنے کی کوشش میں ہی ہانپ جاتی۔ ام مریم نے کیاری میں درختوں کے ساتھ ساتھ' موتیا' گلاب کے پودے لگا رکھے تھے۔ جب کبھی موتیا کے پھول کھلتے سارا گھر بھینی خوشبوؤں سے مہکنے لگتا۔ گلاب سے زیادہ موتیا کے یہ اجلے اجلے کھلے ہوئے سفید پھول ام مریم کی کمزوری تھے۔ جب بھی کلیاں آتیں تو دن بھر وہ ان منہ بند کلیوں کے نظارے سے خوش ہوتی رہتی اور سر شام کھلتے ہی توڑ کے دو پھول اپنے کانوں میں پہن لیتی۔

یہ پھول اسے قسمت کی دین لگا کرتے' جب بھی کھلتے' ام مریم کے لیے کوئی خوشی دستک دے کر صحن میں آکھڑی ہوتی۔ ساری فالتو اشیا ٹھکانے لگا کر اس نے صحن دھویا اور خود نہانے گھس گئی۔

نہا کر باہر آئی تو ایک بار پھر اس کی نظر امرود کے اطراف میں لگے موتیا پر پڑ گئی۔ وہ مسکرا دی۔ ایک پودے پر چار پانچ پھول ایک ساتھ کھلے تھے اور وہ ہمیشہ کی طرح لاشعوری طور پر خوشی کی مہک پانے کے لیے منتظر تھی۔ کچن کے باہر تخت پر بیٹھ کر وہ اپنے گیلے بال سلجھانے لگی۔

وہ گیلے بالوں کا آبشار سامنے کی طرف کیے دھیرے دھیرے ان پر کنگھا پھیر رہی تھی۔ اچانک داخلی دروازے پر ہونے والی آہٹ پر اس نے مڑ کر دیکھا۔ مرتضیٰ کو آتا دیکھ کے وہ کھل اٹھی۔ اس کے قدموں میں تیزی اور چہرے پر دبے دبے جوش کی سرخی تھی۔ آتے ہی اس نے ام مریم کے ہاتھ پکڑے اور اس کے بالکل سامنے پنجوں کے بل زمین پر بیٹھ گیا۔ مرتضیٰ کے چہرے پر چھائی سرخی کسی بہت بڑی خوشی کی غماز تھی۔

"بوجھو ام مریم۔۔۔۔ میں تمہارے لیے کیا خبر لایا ہوں؟"

"آں۔۔۔ تمہاری جاب لگ گئی؟" اسے سوچنے کی ضرورت نہ تھی پھر بھی سوچنے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے بولی۔ تو مرتضیٰ کھلکھلا کر ہنسا۔ اس کی کھلکھلاہٹ میں خوشی کی کھنک تھی۔

"اس سے بھی بڑی بات ہے۔۔۔۔ تم بوجھو۔"

"اس سے بڑی کیا بات ہوگی۔۔۔۔ پرائز بانڈ نکل آیا ہے کیا؟"

"بس سمجھو لاٹری ہی نکل آئی ہے۔ سکندر ایک نئی کمپنی اسٹارٹ کر رہا ہے اور اس نے مجھے چالیس پرسینٹ کی پارٹنرشپ آفر کی ہے۔" فرط انبساط سے اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔

"اتنی بڑی آفر۔۔۔۔" مریم آنکھیں پھاڑے اسے دیکھتے ہوئے خوشی و حیرت کے سمندر میں غرق ہو گئی۔

"ہاں اور وہ بھی بنا کسی انویسٹمنٹ کے۔۔۔۔ چالیس

فیصد کے حساب سے جتنی انویسٹمنٹ میرے حصے میں ہوگی۔ وہ میری محنت اور کام کے عوض ملتے پرافٹ میں سے تھوڑی تھوڑی کرکے ادا ہوتی جائے گی۔“ اس نے اور مضبوطی سے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے۔ جس کی آنکھیں خوشی کے مارے نم سی ہوگئی تھیں۔

”زندگی نے مجھے خود کو جیت لینے کا موقع دے دیا ہے ام مریم ــــ تم سمجھتی ہو ناں اس پارٹنرشپ کا کیا مطلب ہے؟ بزنس کرنے جارہا ہوں میں‘ چھوٹے پیمانے پر سہی مگر اپنا کام کرنے جارہا ہوں‘ یہ ہم سب کے دلدر دور کردے گا‘ یہ موقع ہم سب کو اس کنویں سے نکال دے گا۔“ وہ جوش سے بولتا جارہا تھا۔

اثبات میں سرہلاتی ام مریم کی نم آنکھوں سے آنسو بہہ کر گالوں کو بھگونے لگے۔ وہ اپنے رب کی خواہشوں پر اپنی دعاؤں کے اسی قدر جلد مستجاب ہوجانے پر گنگ سی ہوگئی تھی۔

مرتضیٰ کی پیشانی پر پھیلی طمانیت کی ٹھنڈی سی چھاپ ام مریم کو رب العزت کے حضور سربسجود ہونے پر اکسا رہی تھی۔

”تم مجھے ہمت نہ دلاتیں تو آج میں یہ سب نہ کرپاتا مریم...... تھینکس‘ تھینکس اے لاٹ۔“ وہ حقیقتاً“ اس کا ممنون تھا۔ کہ وہی تو اس کے لیے اتنے گھپ اندھیرے میں امید کی کرن خوش امیدی کی شعاع بن کر روشن تھی۔

☼ ☼ ☼

سکندر کی پیشکش مرتضیٰ کے لیے کسی نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہ تھی۔

عبدالرحمن ہمدانی بہت عرصے سے یہ کمپنی سکندر کے نام سے شروع کرنے کا سوچ رہے تھے اور صرف اس کے ایم بی اے مکمل ہونے کے انتظار میں تھے‘ باقی انتظامات تو مکمل تھے۔ سکندر سمجھ دار لڑکا تھا مگر یہ بات عبدالرحمن بھی جانتے تھے کہ غیر متوقع صورت حال اس کے ہاتھ پاؤں پھلا دیتی ہے۔ اسلام آباد کی اس میٹنگ کے لیے انہوں نے سکندر کو بہت بریف کرکے بھیجا تھا مگر صرف ایک فائل ہوٹل کے کمرے میں رہ جانے نے اس کے سارے اعتماد کو پانی کا بلبلہ بنادیا تھا۔ ایسے میں مرتضیٰ کے بروقت فیصلے اور دانش مندی سے صورت حال سنبھالنے نے اس سال کا سب سے بڑا کانٹریکٹ کھونے سے بچالیا تھا۔

وہ مرتضیٰ سے بہت خوش تھے اور نئی کمپنی اپنے بیٹے کے حوالے کرنے سے پہلے انہوں نے سکندر سے مکمل مشورے کے بعد یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ مرتضیٰ کو یہ آفر دیں۔

پھر سب کچھ اتنی تیزی سے بدلا تھا کہ ہر دیکھنے سننے والا منہ میں انگلی دابے رہ گیا تھا۔ کمپنی کے ابتدائی کاموں اور کاغذات کے چکر میں وہ دنوں گھر سے غائب رہتا۔ رات گئے گھر لوٹتا بھی تو بس سونے آتا۔ اٹھ کر کپڑے بدلتا اور ایک بار پھر چوکھٹ پار کر جاتا۔ اس پر دھن سوار ہوگئی تھی۔ اس ایک موقع نے اسے اور بھی سرگرم کردیا تھا۔ کاروباری اسرار و رموز اس نے دنوں میں سیکھ لیے تھے‘ چند مہینوں میں ہی ان تمام حربوں کو استعمال کرنا وہ سیکھ چکا تھا جسے سمجھنے میں لوگ کئی سال لگادیتے ہیں۔

اس نئی کمپنی نے آغاز میں ہی مارکیٹ میں ایک نام بنانا شروع کردیا تھا جو یقیناً“ ایک ذہین اور پرجوش نوجوان کی محنت کا نتیجہ تھا۔ یہ خوش آئندبات تھی۔

پہلے کانٹریکٹ سے حاصل ہونے والے پرافٹ میں سے انویسٹمنٹ کا کچھ حصہ ادا کرنے کے بعد بھی رقم اتنی تھی کہ کھرا کروہ تمام رات یہی سوچتا رہا کہ نوٹوں کی اس گڈی کو وہ کہاں حفاظت سے رکھے۔ اسے گھر کا کوئی کونہ اتنا محفوظ نہ لگ رہا تھا۔ اگلی صبح اٹھتے ساتھ ہی اپنے سرہانے کے غلاف میں چھپائی پانچ پانچ ہزار کے نوٹوں کی سنہری گڈی لیے وہ ام مریم کے پاس جا پہنچا تھا۔ مریم کی نیند میں ڈوبی آنکھیں اتنے سارے روپے ایک ساتھ دیکھ کے تقریباً“ ابل پڑی تھیں اور مرتضیٰ اس کے ردعمل پر محظوظ ہوکے جی بھر کے ہنسا تھا۔

ایسے میں بینک اکاؤنٹ کی ضرورت ناگزیر تھی۔ پھر اکاؤنٹ بھی کھل گیا اور ہر مہینہ اس کے اعداد و شمار میں اضافہ ہونے لگا۔ گھر کا ہر فرد خوشی سے تقریباً“ دیوانہ ہوچلا تھا۔

حالات ٹھیک ہوتے ہی سب سے پہلے اس نے گھر دیکھنا شروع کیا تھا اور صرف چار ماہ میں ہی ایک صاف ستھرے علاقے میں آٹھ کمروں والا گھر خرید لیا تھا۔ گھر ڈبل اسٹوری تھا۔ چار کمرے نیچے اور چار اوپر۔

خوب صورت رنگ و روغن والے اس گھر میں سفید ماربل کے فرش تھے۔ کھلے کھلے کمروں میں چاک کی چھتیں خوب صورتی میں اور اضافہ کرتی تھیں۔ جس روز وہ رخشندہ اور عبدالکریم کو یہ گھر دکھانے لایا حیرت سے ان کی آنکھیں پھٹ گئی تھیں۔ حالانکہ یہ کوئی بہت بڑا بنگلہ نہ تھا۔ مگر دو کمروں والے تنگ ڈربے کے مقابلے میں یہ محل ہی لگ رہا تھا۔ نئے گھر میں پرانی کرسیوں‘ دیمک زدہ پلنگوں کا کوئی کام نہ تھا اس لیے مناسب سا ضروری فرنیچر بھی خرید لیا گیا۔ گھر خریدنے کے لیے کم پڑنے والے پیسے سکندر نے دیے تھے۔ پارٹنر ہونے سے پہلے وہ اچھے دوست تھے اس لیے سکندر کی طرف سے خرچ ہونے والے پیسوں کو مرتضیٰ کی سہولت کے مطابق واپس کرنے کی بھی پیشکش تھی۔ سب کچھ سیٹ ہوگیا تھا۔

اچھا گھر‘ اچھا کھانا‘ تن پر خوب صورت ملبوس۔ انسان ان ہی مادی چیزوں کے لیے جدوجہد کرتا ہے گھر بدلنے سے جہاں ام مریم بہت خوش تھی وہیں مرتضیٰ کے الگ ہوجانے‘ دور چلے جانے ــــ پر وہ بہت دلبرداشتہ بھی تھی۔ اس نے ظاہر نہ کیا لیکن مرتضیٰ سمجھتا تھا۔

جن نیلے کواڑوں کو وہ دن میں ورجنوں بار پار کرتی تھی وہ اب مقفل پڑے رہتے‘ چھت پر ساتھ والی منڈیر سے جھک کر وہ صحن میں دیکھتی وہاں اڑتی دھول اور ویرانی اس کے دل میں ڈیرے ڈالنے لگتی۔

☼ ☼ ☼

ان ہی دنوں ایک بہت اچھے گھر سے ام مریم اور جبین کے لیے رشتے آئے۔ وہ لوگ اپنے دونوں بیٹوں کی شادی ایک ساتھ کرنا چاہتے تھے۔ کھاتے پیتے گھرانے سے آیا رشتہ کسی نعمت سے کم نہ تھا۔ عبدالرحیم نے سوچنے کے لیے وقت مانگا۔ ان کی فکر بجا تھی۔ دونوں بیٹیاں خیریت سے اپنے گھروں کی ہو جائیں‘ یہی تو بس ایک خواہش تھی ان کی۔

مگر ام مریم کے لیے کوئی اور رشتہ وہ سوچ بھی نہ سکتے تھے۔ یہ بات بچپن ہی سے ڈھکے چھپے انداز میں سب پر عیاں تھی کہ ام مریم مرتضیٰ کے لیے ہے۔ گھر کا ہر بڑا چھوٹا اس بات کو جانتا تھا چنانچہ عبدالرحیم نے آنے والے رشتے کے لیے ام مریم کی رائے لینا بھی ضروری نہ سمجھا اور صرف جبین کے لیے ہاں کردی۔ جبین کے سسرال والوں کو بہت جلدی تھی۔ لوگوں نے باتیں بنائیں کہ بڑی کو چھوڑ کے چھوٹی کو بیاہ رہے ہیں مگر جاننے والے اندر کی بات بھی جانتے تھے۔ چنانچہ یوں جبین عبدالرحیم شادی کرکے جبین احمد رضا بن کے پیا گھر سدھار گئی۔

عبدالرحیم نے اپنی ساری پونجی نکال کے جبین کو وہ سب کچھ دیا جو ان کی حیثیت کے مطابق تھا۔ ام مریم کے لیے وہ دوبارہ جمع کرلیں گے‘ یہ سوچ کر سب کچھ جبین کی شادی پر خرچ کردیا۔ تایا ابا نے بھی شادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا اور بخیر و خوبی تمام کام انجام پاگئے تھے۔ مرتضیٰ بہت کم وقت کے لیے آسکا تھا مگر مہندی سے لے کر بارات تک اس نے تمام فنکشن میں شرکت کی تھی اور سارا وقت ام مریم کے سجے سنورے روپ کو نظروں کے حصار میں لیے رکھا تھا۔

ام مریم نے اب شام کو گھروں میں جاکر ٹیوشنز لینا بند کردیا تھا۔ عبدالرحیم کے دکان جانے کے بعد وہ گھر کو اکیلا نہ چھوڑ سکتی تھی۔ ویسے بھی اب سب کاموں کی ذمہ داری اسی پر آگئی تھی۔ اس لیے وہ گھر میں ہی ان بچوں کو پڑھانے لگی جنہیں پہلے جبین پڑھاتی

تھی۔

دن بھر کے کام نپٹا کر وہ دوپہر میں کچھ دیر سو جاتی پھر اٹھ کر بچوں کو پڑھاتی اور فارغ ہو کے شہتوت کے درخت کے نیچے کرسی بچھا کر گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے مرتضیٰ کے فون کا انتظار کرنے لگتی۔ گزشتہ کچھ مہینوں سے یہ بھی اس کی عادت بن گئی تھی۔ روزانہ کے وعدے کے باوجود ہفتے میں دو تین بار وہ کال ضرور کر لیتا تھا۔ مگر روز انتظار کرنا مریم نے نہیں چھوڑا تھا۔ یہ فون مرتضیٰ نے اس کی سالگرہ پر تحفے میں دیا تھا۔

اتنے مہنگے تحفے پر وہ بجائے خوش ہونے کے رونے بیٹھ گئی تھی۔ اس کا دل اتنا ہی چھوٹا تھا۔ باوجود خوش امیدی اور توقع کے جب وہ توقع پوری ہو جاتی تو اس کا چڑیا جتنا دل اسے سہار نہیں پاتا تھا۔ اس وقت بھی وہ چھت پر کپڑے پھیلا کر نیچے آئی تھی جہاں صحن میں فرش پر بچے اپنے اپنے بیگز رکھے لکھنے پڑھنے میں مشغول تھے۔ حساب کے کسی سوال میں الجھتے ہوئے وہ نئے سرے سے حل کرنے لگی تھی کہ آہٹ پر چونکی۔

دروازے سے رخشندہ تائی اندر داخل ہو رہی تھیں ساتھ میں منزہ بھی تھی۔ جب سے گھر چھوڑا تھا۔ انہوں نے آنا بہت کم کر دیا تھا کیونکہ نیا گھر کافی دور تھا۔ خود مریم بھی گھر دیکھنے صرف ایک ہی بار وہاں گئی تھی۔ ام مریم اٹھ کر بے اختیار تائی کے گلے جا لگی۔ اتنے دنوں بعد ان کی آمد پر اس کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔ کچھ دیر رخشندہ جز بزسی کھڑی رہیں۔

"پیاس سے حلق میں کانٹے پڑ رہے ہیں مریم! اتنی گرمی میں اب کیا گلے سے چمٹی ہی رہو گی۔" تائی نے اسے الگ کرتے ہوئے بے زاری سے کہا۔ ام مریم بھیگی مسکراہٹ کے ساتھ منزہ سے ملنے لگی۔

"تائی اماں! آپ بیٹھیں ناں۔۔۔ میں ابھی شربت بنا کر لائی۔" وہ کچن کی طرف بھاگی اور جلدی سے سکنجبین بنا کر لے آئی اور تخت پر ٹرے رکھی جہاں رخشندہ اپنی چادر کو پھیلا کے دونوں ہاتھوں میں تھام کر پنکھے کی طرح جھل رہی تھیں۔

"توبہ کتنی گرمی ہو گئی ہے اور تیرا دل نہیں گھبرا؟ یوں بنا پنکھے کے صحن میں بیٹھی ہے؟" وہ حیرت سے انہیں دیکھنے لگی جنہوں نے خود پوری زندگی یونہی صحن میں پڑنے والی سخت گرمی میں حبس بیٹھے گزاری تھی۔ پھر وہ مسکرا دی۔ تائی کی طبیعت وہ اچھی طرح سمجھتی تھی۔

"اچھا لیں آپ شربت پئیں، میں ہاتھ والا پنکھا لے آؤں اندر سے پیڈسٹل فین بھی خراب ہے۔"

وہ اٹھی پھر جاتے جاتے رکی۔ اس کے دماغ نے بھی کام کرنا بند کر دیا ہے شاید۔ سر پر ہاتھ مار کے وہ پھر پلٹی۔

"تائی اماں! آپ اندر چل کر بیٹھیں ناں پنکھے کے نیچے۔"

"نہیں، بس ٹھیک ہوں ادھر ہی، جا ہاتھ والا پنکھا ہی لے آ۔" سر ہلاتی وہ مڑی۔ عرصے بعد ان کی آمد وہ کھل سی اٹھی تھی۔ اپنوں کے ساتھ کا سکھ بھی کتنا پیارا لگتا ہے۔

تائی رخشندہ غیروں کی طرح تکلف سے تخت پر بیٹھی تھیں۔ اسے عجیب سا لگنے لگا۔ پنکھا جھلتے ہوئے وہ منزہ سے چھوٹی چھوٹی باتیں پوچھتی رہی جو اسے اپنی شاپنگ دکھا رہی تھی۔

"کیا ہوا تائی امی۔ پئیں ناں شربت۔" بڑی دیر سے ہاتھ میں تھمے گلاس کو جوں کا توں دیکھ کے وہ بول ہی پڑی۔

"عجیب سا ذائقہ ہے اس شربت کا تو۔"

ان کی عجیب سی بات پر وہ سوالیہ انداز میں منزہ کی طرف دیکھنے لگی۔

"وہ۔۔۔ امی منرل واٹر کہہ رہی ہیں۔" تیرہ سالہ منزہ نے شرمندہ شرمندہ سی وضاحت دی تو مریم کو زور کی ہنسی آئی مگر ضبط کر کے انہیں دیکھنے لگی۔

"یہ پانی مجھے ڈاکٹر نے منع کر رکھا ہے اب تو جی بھی نہیں کرتا ایک گھونٹ پینے کا بھی۔"

"اچھا تائی اماں! میں آپ کو بوتل منگوا دیتی ہوں۔" اپنے تئیں اس نے بے حد مناسب بات کی تھی۔

"نہ بابا نہ مجھے تو معاف رکھو اب دو نمبر بوتلیں پی کے مجھے اپنا معدہ خراب نہیں کروانا۔"

متانت سے سر ہلاتی ام مریم کو ہنسی چھپانا بہت دشوار۔۔۔ لگنے لگا تو وہ ٹرے اٹھا کر یہ سوچتے ہوئے کچن میں رکھنے چلی گئی کہ انسان خواہ کتنی ہی ترقی کر لے اسے اپنے اصل، اپنے ماضی کو نہیں بھولنا چاہیے۔ آگے کی زندگی جینے میں آسانی ہوتی ہے۔

☼ ☼ ☼

اس نے کروٹ بدل کر پھر گھڑی کو دیکھا جو دوپہر کا ڈیڑھ بجا رہی تھی اور سرہانے کے قریب ہاتھ پھیر کر اے سی کا ریموٹ ڈھونڈنا چاہا پھر سائیڈ لیمپ کے پاس وہ اسے مل گیا۔ ریموٹ سے اے سی آن کر کے وہ ایزی لیٹ گیا۔ کمرے کی پھیلتی خنکی اسے پھر سے نیند کے حوالے کرنے لگی۔

یہ اے سی اس نے پچھلے مہینے ہی لگوایا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ ان کے ہاں دولت کی ریل پیل ہو گئی تھی اور پیسہ برس رہا تھا۔ آسائشات نہ سہی مگر بہت سی سہولیات اس گھر میں آگئی تھیں۔ اس نے اماں ابا کے کمرے میں ایک اے سی لگوایا تھا، دوسرا اپنے کمرے میں منزہ اور کاشف بھی رخشندہ کے کمرے میں ہی سوتے تھے۔ اب اتنی رئیسی بھی نہیں آئی تھی کہ وہ ہر کمرے میں اے سی اور ٹی وی لگوا دیتا۔ ہاں بس اتنا ہوا تھا کہ عبدالکریم کی قلیل آمدنی میں جس گھر کا گزارا کھینچ تان کر ہوتا تھا اور کوئی ضرورت پوری کرنے کے لیے کسی وقت پیٹ بھی کاٹنا پڑتا تھا۔ آج کم سے کم کھانے پینے کے لیے ہاتھ تنگ نہ تھا۔

کمرہ ٹھنڈا ہو چکا تھا اور نیم خوابیدہ سی کیفیت میں دودھیا رنگت والی روحا اسے یاد آ رہی تھی وہ رات کو ہی کراچی سے واپس آیا تھا۔ آفس کے کام سے ایک سیمینار میں شرکت کرنے وہ اور سکندر کراچی گئے تھے۔

کراچی میں انہوں نے شیرٹن جیسے مہنگے ہوٹل میں پورے چار دن گزارے۔ اس لگژری کمرے کا فرنیچر کارپٹ اور انٹیریئر دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ مرتضیٰ نے پہلی دفعہ ایلیٹ کلاس کے کسی ہوٹل میں قیام کیا تھا۔ اسے ایک ایک چیز متاثر کر رہی تھی۔ روز باقاعدگی کے ساتھ بیڈ شیٹس اور کشن کورز تبدیل کیے جاتے۔ دبیز کارپٹ کو ویکیوم کلینر سے صاف کرنے والا عملہ بے حد مستعد تھا۔ ڈھونڈنے بھی کمرے میں گرد کا ایک ذرہ تک دکھائی نہ دیتا۔ حتیٰ کہ باتھ روم اس قدر چمک رہا ہوتا کہ اس کے فرش اور دیواروں پر اسے اپنا عکس نظر آتا۔ ایک سے بڑھ کر ایک امپورٹڈ شیمپو، صابن اور شیونگ کا سامان وہاں دستیاب تھا۔ ان چار دنوں میں مرتضیٰ کو گمان ہوا وہ کسی ریاست کا راجہ ہے۔

چوتھے روز ضروری کام نمٹا کر وہ شام کے وقت ساحل سمندر پر نکل کھڑے ہوئے تھے۔ سورج ڈوبنے کا اس سے حسین منظر مرتضیٰ نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ساحل کی گیلی ریت پر چلتے چلتے مسکراتے ہوئے وہ سوچنے لگا کہ اگر ام مریم ہوتی تو وہ جھاگ جیسے پانی کی لہروں کو بھاگ بھاگ کے اپنے پیروں سے لپٹتا دیکھ کے خوشی سے دیوانی ہی ہو جاتی۔ چلتا چلتا وہ دور آگیا تھا۔ سکندر کی آواز پر اس نے مڑ کر دیکھا وہ اسے بلا رہا تھا۔ سکندر کی ایک کزن اسے وہاں اتفاقیہ مل گئی تھی اور وہ خاصا مسرور تھا۔ مرتضیٰ کا بھی اس سے تعارف ہوا۔ خوب صورت اسٹائلش سی دو لڑکیاں بڑی بے تکلفی سے اس سے ملیں۔ شاید ان میں ہاتھ ملا کر ہیلو کہنے کا رواج عام تھا مگر مرتضیٰ جیسے شخص کو بہت عجیب لگا۔ سکندر اپنی کزن کے ساتھ چلتا ہوا دور نکل گیا۔ وہ اسی بے نیازی سے اس سے چھوٹی چھوٹی باتیں کر رہی تھی۔ روحا سکندر کی کزن عفرا کی فرینڈ اور کلاس میٹ تھی۔ اور کل ہی دونوں ایک فیشن شو میں شرکت کے لیے کراچی آئی تھیں۔ وہ فیشن ڈیزائننگ کی اسٹوڈنٹس تھیں، روحا بے پناہ حسن کی مالک تو نہ تھی مگر اس کی بے حد اجلی گوری بے داغ رنگت اس کا بے پروا انداز اور اس کی اسٹائلش ڈریسنگ جیسے نظر کو جکڑ لیتی تھی۔ اردو سے زیادہ انگریزی بولتی روحا کچھ ہی

دیر میں اس سے بے تکلف ہو کے آپ سے تم پر آ چکی تھی۔ ام مریم کے بعد یہ پہلی لڑکی تھی جس سے مرتضیٰ نے اتنی دیر اور اتنی زیادہ باتیں کی تھیں۔ اسے اچھا لگا۔ ان چاروں نے ڈنر اکٹھے کیا۔ جاتے وقت اس نے مرتضیٰ کا موبائل نمبر مانگ کر اسے ہکا بکا کر دیا تھا۔ پھر اس نے سوچ کے سر جھٹکا کہ جس سوسائٹی سے وہ تھیں وہاں یہ عام بات تھی۔

اسے نہیں پتا چلا وہ کب سے روحا کو سوچے جا رہا تھا۔ نیند کب کی اڑ گئی تھی۔ کروٹ لے کر اس نے بے تکے سے خیال کو ذہن سے جھٹکا اور موبائل نکال کر لاشعوری طور پر ام مریم کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ دوسری بیل پر ہی فون اٹھا لیا گیا۔

"السلام علیکم!" اس کے بولنے سے قبل ہی ام مریم کی چہکتی ہوئی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔ اس کی ساری کلفت جاتی رہی۔ سوچ کا تانا بانا ٹوٹ گیا۔ وہ مسکراتے ہوئے اٹھ بیٹھا وہ ایک ہی سانس میں اس کا حال احوال، گھر والوں کی خیر خیریت کے ساتھ ساتھ آفس روٹین بھی پوچھے جا رہی تھی۔

وہ مرتضیٰ کے غیر متوقع۔ فون آجانے پر بہت خوش تھی۔

"کتنے دن سے تم نے گھر کا چکر نہیں لگایا مرتضیٰ! ابا کتنا یاد کرتے ہیں تمہیں۔"

"صرف چچا یاد کرتے ہیں مجھے؟" زیریں لب دبا کر وہ شرارت سے بولا۔

"نہیں، چچا کی صاحبزادی بھی آپ کو صبح و شام باقاعدگی سے یاد کرتی ہے، آ کے مل جائیں اس سے پہلے کہ آپ کی صورت بھی اسے بھولنے لگے۔"

"ام مریم مرتضیٰ کو بھی بھول سکتی ہے کیا؟"

"ام مریم تو نہیں مگر مرتضیٰ شاید ام مریم کو بھول سکتا ہے۔"

اس کے شکوہ کناں ہونے پر مرتضیٰ کھلکھلا کے ہنسا اور شام میں آنے کا وعدہ کر کے فون بند کر کے نہانے چل دیا۔

☼ ☼ ☼

شام کی سرمئی چادر پھیلتے ہی ام مریم نے رگڑ رگڑ کر منہ دھویا اور اپنا سب سے اچھا سوٹ نکال کر پہنا۔ آنکھوں میں کاجل کی لکیریں بھی کھینچیں۔ سیاہ مائل رنگت میں گندم کے سنہری خوشوں جیسی چمک تھی۔ پرکشش نقوش پر چھوٹی سی ناک اور مناسب سا دہانہ... وہ بہت خوب صورت نہ تھی مگر بڑی بڑی گہری آنکھوں میں کبھی کبھی کاجل ڈال لیا کرتی تو اپنی آنکھوں سے دیکھنے والے کو سحر میں ڈال سکتی تھی۔ آج کاجل لگانے کی زحمت اس نے بڑے دن بعد کی تھی اور جس کے لیے کی تھی اس کے انتظار میں کٹا ایک ایک منٹ بھاری ہو گیا تھا۔

ٹیوشنز والے بچوں کو جلدی جلدی پڑھا کے چھٹی دیتے ساتھ ہی وہ کچن میں گھسی مرتضیٰ کی پسند کے شامی کباب بنانے لگی۔ اس کی تیاری کے بعد ساتھ چاول دم پہ رکھ کے جلدی سے رائتہ تیار کیا۔ یہ مرتضیٰ کا من پسند کھانا تھا۔ جو بے حد دل سے تیار کر کے وہ باہر آ گئی کپڑے استری کر کے پہن کے اب بالکل تیار تھی۔

عبدالرحیم دوپہر میں اپنے ایک دوست کی بیٹی کی شادی میں شرکت کرنے گئے تھے۔ ام مریم نے سوچا وہ بھی اتنے دن بعد اچانک مرتضیٰ کو گھر پا کر بے حد خوش ہو جائیں گے...

موسم خوشگوار ہو چلا تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔

سرمئی مٹیالا سا آسمان اب ہلکا ہلکا سیاہ پڑنا شروع ہو گیا تھا اور ام مریم کی منتظر آنکھوں کی جوت بھی... بے چینی سے چھوٹے سے صحن کے چکر کاٹتی مریم نے تھک کے مرتضیٰ کے موبائل پر کال کرنا شروع کر دی تھی۔ نمبر بند تھا۔ اس نے کان سے موبائل ہٹا کر حیرت سے اسکرین پر سے جواب موصول نہ ہونے کے بعد نمبر غائب ہوتے دیکھا۔ کچھ لمحے بے یقینی سے دیکھتے رہنے کے بعد اس نے پھر تیزی سے نمبر ڈائل کر دیا۔

نمبر اب بھی بند تھا۔ اسے پریشانی ہونے لگی

مرتضیٰ اتنا غیر ذمہ دار تو کبھی نہ رہا تھا اور اس کے معاملے میں تو کبھی بھی نہیں۔

وہ چپ چپ سی تخت پر بیٹھ گئی اور نظریں جھکائے اپنے پیروں کو دیکھنے گئی مگر اس کے کان اب بھی دروازے پر ہونے والی مانوس سی دستک کے منتظر تھے۔ کیا پتا وہ رستے میں ہو اور نیٹ ورک کی خرابی کے باعث نمبر نہ مل رہا ہو۔ اس نے بے اختیار نیٹ ورک کی خراب سروس کو کوسا... آدھا گھنٹہ، گھنٹہ اور پھر رینگتے رینگتے دو گھنٹے بھی گزر گئے رات پوری طرح پھیل گئی تھی۔

وہ اب تک تخت پر یونہی اطراف میں دونوں ہتھیلیاں رکھے، سر جھکائے بیٹھی پیروں پر نظر جمائے ہوئے تھی مگر اب اسے اپنے پیر نظر آنا بند ہو گئے تھے۔ پورا گھر اندھیرے میں ڈوب گیا تھا۔ اس نے اٹھ کر صحن میں لگے بلب کو جلانے کی زحمت بھی نہیں کی تھی۔ عبدالرحیم ابھی تک گھر نہیں آئے تھے۔ تنہائی اور اندھیرے سے خوف زدہ ہونے والی ام مریم اس وقت ہر طرح کے احساس سے قطعی بے نیاز تھی۔

اسے کسی اور چیز کی وحشت نے ساکت کر رکھا تھا۔

اسے کسی اور دھڑکے نے جامد کر رکھا تھا...

اس کے اندر واہمے جنم لینے لگے۔ خوش گمانی کی عینک گر کر پیروں کے نیچے آ کر تڑخ گئی تھی۔ وہ بدلتے وقت کی بے رحمی سے واقف ہو رہی تھی۔ ہاں وقت واقعی بدل گیا تھا۔ تو کیا رشتے بھی بدلنے تھے؟ اسے لگا مرتضیٰ عبدالکریم اس کی رسائی سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ خوف کے مارے اسے جھرجھری سی آگئی۔

نہیں... نہیں! ہو سکتا ہے کوئی ضروری کام آن پڑا ہو۔ ہو سکتا ہے وہ ادھر آنے کے لیے نکلا ہو اور کوئی ارجنٹ میٹنگ میں جانا پڑ گیا ہو... ہو سکتا ہے... وہ تڑخا ہوا خوش امیدی کا چشمہ اٹھا کر پھر اسی سے دیکھنے لگی تھی۔

ہاں ہو سکتا ہے... مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ مرتضیٰ ام مریم سے ملنے نہ پہنچے...

ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ ام مریم نے آواز دی تھی اور مرتضیٰ اس کی پکار پر لبیک کہتا وہاں نہ پہنچا تھا۔ ام مریم کی سانس ساکن نہ ہوتی تو اور کیا ہوتا۔

☼ ☼ ☼

شام کو گیراج میں ٹراوزر کے پائنچے فولڈ کیے۔ آستین چڑھائے اپنی بائیک دھو رہا تھا۔ خرید لینے کے کچھ دن بعد ہی یہ بھی آ گئی تھی۔ اسے مگر اس کی خاص ضرورت نہ پڑی۔ کیونکہ آفس کی گاڑی اسے پک اینڈ ڈراپ دیتی تھی۔ البتہ خود کہیں جانا ہوتا تو یہ بائیک استعمال میں لائی جاتی ورنہ یونہی کھڑی رہتی۔ ام مریم نے ابھی یہ بائیک نہیں دیکھی تھی اس لیے وہ اسے سرپرائز دینا چاہ رہا تھا۔

کچھ ہی دیر میں وہ چچا کی طرف جانے والا تھا۔ لیکن پاس پڑے موبائل پر موصول ہونے والی کال نے اس کے ارادے پر مٹی ڈال دی۔

"روحا کالنگ" کے جگمگاتے الفاظ حیرت سے دیکھتے ہوئے اس نے یس کا بٹن دبا دیا۔ یہ لڑکی اس کی سوچ سے زیادہ ایڈوانس تھی۔

"ہائے مرتضیٰ! کیا ہو رہا ہے؟" کال ریسیو ہوتے ہی وہ چہکی۔

"کچھ خاص نہیں، آپ سنائیے کیسے مزاج ہیں؟" روحا کی بے تکلفی کے باوجود وہ اسے "آپ" کہہ کر ہی مخاطب کر رہا تھا کیونکہ یہ اس کی فطرت تھی۔ اس لیے اس نے بھی مروتاً خوش دلی سے استفسار کیا۔

"مزاج ٹھیک نہیں، موڈ بھی آف ہے۔" وہ لہجے کو اداس کرتے ہوئے بولی۔

"ارے وہ کیوں؟"

"عفرا کی بچی تو کراچی میں ہی اٹک گئی ہے ناں تو میں اکیلی بور ہو رہی ہوں۔"

"اچھا تو یہ بات ہے۔ سکندر بھی اب تک وہیں ہے۔"

"ظاہر ہے جہاں سکندر ہو گا عفرا نے تو وہاں موجود رہنا ہی ہے۔" اس کی معنی خیز بات پر وہ دونوں ہنس

پڑے۔

سکندر کی پسندیدگی کا کچھ کچھ اندازہ اسے بھی ہو گیا تھا۔

"اصل میں عفرا اور میں ایک دوسرے کی کمپنی بہت انجوائے کرتے ہیں۔ تو اب اس کی غیر موجودگی میں عجیب سی قنوطی ہو رہی ہوں۔ پھر میں نے سوچا کہ اپنے نیو فرینڈ سے کمپنی کی درخواست کی جائے۔"

"اوہ ہاں شیور۔۔۔ وائے ناٹ! اینی ٹائم۔" مسکرا کے اس نے کہا۔

"تو پھر آپ آجائیں کافی پینے چلتے ہیں۔" اس کی بے باکی مرتضیٰ کو خائف کرنے لگی۔

"ابھی۔۔۔ ابھی تو اصل میں مجھے ایک ضروری کام سے ؟"

"افوہ کم آن مرتضیٰ اب یہ مت کہیے گا کہ آپ بہت مصروف ہیں اور آپ کے ساتھ کچھ وقت بتانے کے لیے مجھے باقاعدہ اپائنٹمنٹ لینی پڑے گی۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" مرتضیٰ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تو پھر آپ یوں کریں آپ مجھے گھر کا ایڈریس بتائیں میں آپ کو پک کر لیتی ہوں۔" وہ اس کے انکار کے سارے راستے مسدود کر رہی تھی۔ مرتضیٰ بوکھلا گیا۔

"آپ کو بلا وجہ زحمت ہو گی روحا! میں آجاتا ہوں۔"

"مجھے زحمت بالکل نہیں ہو گی لیکن اگر آپ اپنے گھر نہیں آنے دینا چاہتے تو صاف کہہ دیں۔" اس کے یوں کہنے پر مرتضیٰ شرمندہ سا ہو گیا اور اسے پتا بتانے لگا۔

"اوہو یہ تو قریب ہی ہے میں دس منٹ میں آپ کو پک کر لوں گی' اوکے گڈ بائے۔" کہتے ہوئے اس نے فون بند کر دیا۔

روحا سے وہ اتنا مرعوب تھا کہ چاہتے ہوئے بھی انکار نہ کر پایا۔ اس نے سوچا فون کر کے ام مریم کو پھر کسی دن آنے کا کہہ دے۔ قسمت خراب کہ جب وہ کال ملانے لگا تو موبائل کی بیٹری جو کہ پہلے ہی ڈاؤن تھی۔ اب بالکل بند ہو گئی۔

"اوہ شٹ۔۔۔" وہ کمرے کی جانب بڑھا تاکہ چارج کر کے فون کر سکے مگر اگلے دس منٹوں میں اسے صرف اتنا ہی موقع ملا کہ وہ جلدی سے کپڑے بدل سکا۔ گیٹ پر گاڑی کا ہارن سنتے ہی وہ والٹ اٹھا کر باہر نکل آیا سوچا کسی کافی شاپ یا ریسٹورنٹ میں فون کر کے ام مریم کو بتا دے گا۔

روحا اس سے پہلے سے بھی زیادہ بے تکلف انداز میں ملی تھی جیسے ان کی دوستی بہت پرانی ہو۔ کسی لڑکی کے ساتھ باہر جانے کا یہ پہلا اتفاق تھا اور وہ بھی روحا جیسی خوب صورت اور بے باک لڑکی۔

اس کے احساسات عجیب سے ہو رہے تھے۔ ام مریم کو نظر انداز کر کے روحا کے ساتھ چلے آنے پر کوئی اس کے دل میں چٹکیاں سی لے رہا تھا۔ مگر جلد ہی روحا کی خوشگوار سی ہنستی ہنساتی باتوں نے اس افسوس پر کائی جما دی۔

وہ اسے لے کر جم خانہ چلی آئی تھی۔

وہاں اسی جیسے بہت سے بے فکرے لوگ خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

روحا نے اپنے ملنے والوں سے مرتضیٰ کو بھی متعارف کروایا۔ سب نے خوش دلی سے اس کا خیر مقدم کیا تھا۔ اسے ان بے فکر خوش باش اور اپنے لیے جینے والے لوگوں کے گروہ میں بیٹھ کے حقیقتاً" اچھا لگا تھا۔ ایک کلاس کے یہ نوجوان اور مرد عورتیں ملے جلے بیٹھے تھے۔ کچھ مختلف گیمز کھیلنے میں مصروف تھے تو کچھ فٹنس کے لیے مختلف طرح کی ایکسر سائز میں' جم خانہ کی خوب صورت بلڈنگ کے بیچوں بیچ واقع سوئمنگ پول میں کچھ لوگ تیراکی کر رہے تھے۔ وہ پول کے اطراف میں بچھی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔

روحا ذہین لڑکی تھی۔ وہ سامنے والے کے مزاج اور طبیعت کو مد نظر رکھ کر اس سے بات کرتی تھی۔ اپنے متعلق تو وہ مرتضیٰ کو پہلی ملاقات میں ہی بتا چکی تھی۔ آج وہ اس سے اس کے متعلق جاننے بیٹھی تھی۔

مرتضیٰ نے سادگی سے اسے اپنے بارے میں سب بتا دیا۔

"تمہاری انفرمیشن' تمہاری محنت میرے لیے بہت انسپارنگ ہے مرتضیٰ۔" "آئی ایم امپریسڈ۔"

اس کی بات پر مرتضیٰ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

روحا واقعی اس ذہین نوجوان سے باتیں کر کے متاثر نظر آرہی تھی اور مرتضیٰ کو پہلی بار یوں کسی لڑکی سے ملنا اور گھنٹوں باتیں کرنا بڑا سرور دے رہا تھا۔

وہ دونوں چلتے ہوئے باہر آگئے۔ موسم بڑا خوشگوار ہو رہا تھا۔ شاہراہ کی صاف ستھری سڑکوں پر رش تو بہت تھا مگر ٹھنڈی ہوا اعصاب کو پر سکون رکھے ہوئے تھی۔

"کافی ہو جائے؟" گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے پوچھا۔

"شیور!"

تقریباً" ساڑھے آٹھ کے قریب وہ شہر کے ایک مصروف ہوٹل میں داخل ہوئے تھے۔ یہ بھی روحا کی پسند سے منتخب ہوا تھا۔ مرتضیٰ کو اب ایسی جگہوں پر آنے کی عادت ہو گئی تھی۔ بزنس میٹنگز کے لیے وہ سکندر کے ساتھ ہر جگہ جاتا تھا۔ پہلے والی حواس باختگی اب نہ رہی تھی بلکہ اس کی جگہ اعتماد نے لے لی تھی۔ جس نے مرتضیٰ کی شخصیت کو ایک وقار بخشا تھا۔ اس کے چہرے پر ذہانت سے چمکتی آنکھوں کی چمک میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا۔ وہاں روحا کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے اسے وقت کا پتا ہی نہیں چلا۔ وہ یہ بھی بھول گیا کہ اس نے ام مریم کو کال بھی کرنی ہے۔ کافی کے بجائے انہوں نے ڈنر ہی کر لیا کیونکہ وقت بھی ہو رہا تھا اور مرتضیٰ کو بھوک بھی لگی تھی۔

ڈنر کے دوران روحا اسے اپنی یونیورسٹی کے مختلف قصے سناتی رہی فیشن ڈیزائنر بننے کے بعد اپنے منصوبوں سے آگاہ کرتی رہی۔

مرتضیٰ نے بہت دھیان اور دلچسپی سے اس کی باتیں سنی تھیں۔ وہ ایسی ہی تھی کسی کی بھی توجہ کھینچ لینے والی۔۔۔

بے شک ہوٹل میں آئے جوڑوں اور فیملیز میں بھی ایسی ہی اسٹائلش اور خوب صورت لڑکیاں تھیں مگر روحا جیسی دل کھینچ لینے والی معصومیت اور بے ساختگی ان میں مفقود تھی۔ ارد گرد بیٹھے اور پاس سے گزرنے والے لوگوں کی نگاہوں میں رشک تھا۔ اسے فخر سا ہونے لگا۔

اس نے کبھی کوئی افیئر نہیں چلایا تھا اس نے کبھی ڈپارٹمنٹ کی کسی لڑکی سے غیر ضروری بات نہ کی تھی۔ ام مریم اس کے لیے سب کچھ تھی۔ محبت' دوست' کزن۔۔۔ سب کچھ! روحا اسے فون کر کے اپنے ساتھ لے آئی ورنہ وہ کبھی کسی لڑکی کو یوں ساتھ لے جانے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔

گھر کے باہر اسے ڈراپ کرتے ہوئے وہ مسکراتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کرنے لگی۔

"تم سے مل کر بہت، بہت اچھا لگا مرتضیٰ! تمہارے ساتھ وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا ہے۔"

"اس میں میرا نہیں آپ کی خوش گفتاری کا کمال ہے۔" اس کے کہنے پر نقرئی گھنٹیوں جیسی ہنسی گاڑی میں گونج اٹھی۔

"اوہو تو تعریف بھی کر لیتے ہو تم۔"

"بے شک محترمہ! ہم بھی صنف نازک سے بات کرنے کے اس بنیادی اصول سے واقف ہیں۔" ایک بار پھر وہ دونوں ہنس پڑے۔

"تھینکس اگین' بائے بائے۔" ہاتھ ہلاتی وہ گاڑی آگے بڑھا لے گئی۔

مرتضیٰ عجیب سرشاری میں تھا۔ اس نے بہت مختلف اور بہت اچھا دن گزارا تھا۔ بے فکرا سا۔۔۔ جوش سے بھرا۔ سیٹی پر کوئی دھن بجاتا وہ اپنے پاس موجود ڈپلیکیٹ چابی سے گیٹ کھول کر اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ سب سو گئے تھے۔

کمرے میں آکر اس نے لائٹس آن کیں اور جیب سے والٹ اور موبائل نکال کر ٹیبل پر رکھا۔ بند پڑے موبائل کو دیکھ کے ایک دم اسے سب یاد آگیا جو وہ بڑی دیر سے بھولا بیٹھا تھا۔

آگے بڑھ کر اس نے چارجر ڈھونڈ کر فون چارجنگ پر لگایا اور وہیں کرسی پر بیٹھ گیا تاکہ فون آن ہوتے ہی وہ ام مریم کو کال کرکے آج کے لیے معذرت کرکے آئندہ پھر کسی دن آنے کا پکا وعدہ کرلے۔ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا جو ساڑھے گیارہ بجا رہی تھی۔ لیکن اسے پتا تھا کہ وہ نہیں سوئی ہوگی۔

چند منٹوں کی چارجنگ کے بعد موبائل آن ہوگیا۔ اس نے مریم کا نمبر ڈائل کرکے فون کان سے لگایا۔ دوسری طرف سے کال ریسیو کرلی گئی مگر مکمل خاموشی رہی۔ وہ کچھ نہیں بول رہی تھی۔

"ام مریم۔۔۔" اس نے پکارا مگر کوئی جواب نہیں آیا۔

"ام مریم!" اسے دوبارہ پکارنا پڑا۔ اب کی بار ایک بوجھل سی سانس خارج کرتے ہوئے اس نے سلام کیا تھا۔

"سوتو نہیں گئی تھیں؟" سوال ہی غلط تھا۔

"سو سکتی تھی کیا؟" تین لفظوں پر مبنی اس شکوے سے پر سوال نے تھوڑی دیر کے لیے مرتضیٰ کو لب بستہ سا کردیا۔

"مجھے پتا ہے۔ تم ناراض ہو مریم! یقین کرو' میں آنے والا تھا۔ شام تک بالکل تیار تھا۔"

"کوئی بزنس میٹنگ آگئی ہوگی۔" ام مریم کی آواز بہت بوجھل ہورہی تھی۔ شاید وہ روتی رہی تھی۔

"آں۔۔۔ ہاں' وہ ایک دم ہی ضروری کام پڑ گیا اور میٹنگ کینسل نہیں کرسکتا تھا اس لیے آ نہیں سکا۔"

وہ ام مریم سے چھپانا نہیں چاہتا تھا مگر زندگی میں پہلی بار ایسے کسی لڑکی کے ساتھ شام بتانے کے بعد وہ ام مریم کو کس منہ سے سب بتاتا۔ اس جھوٹ پر اس کا ضمیر اسے شرمندہ کررہا تھا۔

"خفا مت ہو یار' میں پھر کسی دن ضرور۔۔۔" وہ اس سے اگلی بار آنے اور زیادہ دیر رکنے کا وعدہ کرنے والا تھا کہ ام مریم کی بات نے اس کا اطمینان بھی رخصت کر دیا۔

"یہ کون سی بزنس میٹنگ تھی مرتضیٰ! جو فائیو اسٹار ہوٹل میں تنہا لڑکی کے ساتھ ہورہی تھی؟"

اس کے سوال نے کچھ لمحوں کے لیے اسے گنگ سا کردیا۔

"سبین اپنے ہزبینڈ کے ساتھ اسی ہوٹل میں دعوت پر انوائیٹڈ تھی۔"

اس نے ٹھہر ٹھہر کر ٹھنڈے لہجے میں ہوٹل کا نام لیا تو بجائے تسلیم کرنے کے وہ ڈھٹائی پر اتر آیا۔

"تو تمہاری بہن نے فوراً تمہیں رپورٹ پہنچا دی۔" وہ تلخ ہوگیا۔

"میری بہن تمہاری بھی کچھ لگتی ہے۔" جواباً اس نے بھی سخت لہجے میں کہا۔

"میں جس کے ساتھ مرضی گھوموں' ڈنر کروں یا میٹنگ میں کسی کو جواب دینے کا پابند نہیں۔" کچھ دیر پہلے اپنی حرکت پہ ہونے والی شرمندگی بھک سے اڑ گئی تھی اور اب وہ دیدہ دلیری سے اعتراف کررہا تھا۔

"اگر مرتضیٰ رات گئے تک کسی لڑکی کے ساتھ گھومتا پھرے تو کیا ام مریم اس سے پوچھنے تک کی مجاز نہیں ہے؟" وہ چیخ رہی تھی۔

"ٹھیک ہے پوچھو' مگر شک کرنے والے انداز میں نہیں۔"

"کون ہے وہ؟ کولیگ یا کلائنٹ؟" ام مریم کا لہجہ کڑواہٹ سے بھرا تھا۔

"دوست ہے وہ میری۔" مرتضیٰ کے منہ سے یہ الفاظ اسے بڑے اجنبی سے لگے۔

"دوست؟ آج سے پہلے تو تم نے ایسی کوئی دوستی نہیں پالی مرتضیٰ تو پھر آج تمہیں اس کی ضرورت کیوں کر پڑ گئی؟"

"دوستوں کی ضرورت انسان کو ہمیشہ رہتی ہے' پھر وہ لڑکا ہے یا لڑکی اس سے فرق نہیں پڑتا۔ اس سوسائٹی میں یہ فضول سوچ ہے ہی نہیں۔"

"مت بھولو کہ تم بھی اسی سوسائٹی سے ہو جہاں ایسی باتیں معیوب سمجھی جاتی ہے۔" وہ اس سے جرح کررہی تھی۔

"ہاں یہ الگ بات ہے کہ اب تمہاری سوچ بہت

ایڈوانس ہوگئی ہے۔" مریم بولتی گئی۔ "اپنی غلطیوں کو روشن خیالی کہہ کر پردہ ڈالنے والی سوچ۔"

"اچھا اگر یہ اتنی معیوب بات ہے تو تمہاری مجھ سے دوستی کیوں ہے؟"

مرتضیٰ کی بات نے اسے دونوں ہاتھوں سے دھکا دیا تھا۔ وہ لڑتے لڑتے رک سی گئی۔ شام سے بھیگتی آنکھیں کاجل سے بے نیاز ہوچکی تھیں پھر سے بھر آئیں۔

"وہ اس لیے کہ تم میرے تایا زاد ہو مرتضیٰ! میں نے تمہارے ساتھ اپنا بچپن بتایا ہے' اور ہم میں صرف یہی ایک رشتہ تو نہیں ہے۔"

آنسو ضبط کرتی وہ ٹھہر ٹھہر کے بولی۔

"تو پھر اپنی سوچ بدلو' کنوئیں کی مینڈک نہ بنو زندگی اس پس ماندہ رسول نگر سے باہر بھی ہے۔"

مرتضیٰ کا ایسا لہجہ تو اس نے کبھی نہیں سنا تھا۔ دکھ کی انتہا نے اسے بولنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ بڑی دیر بعد وہ بولی تھی۔

"میری زندگی رسول نگر کے اندر ہی ہے اور میں اس کنوئیں کی مینڈک بن کے ہی خوش ہوں' سوچ وہی بدلیں جن کے حالات بدل گئے ہیں۔"

"اوہ! تو میرے حالات بدل جانے پر جلن ہورہی ہے تمہیں؟" اس نے جیسے تیز دھار چاقو سے کٹ لگا دیا۔

"جلن۔۔۔۔ اور مجھے؟" سارا جھگڑا' سارے الفاظ بھک سے اڑ گئے۔

"ہاں جلن ہورہی ہے کیا؟ سب تو مجھ سے حسد کرنے ہی لگے ہیں مگر مجھے یہ نہیں پتا تھا کہ تم بھی میرے حالات سدھر جانے پر حسد کرنے لگو گی' میرا اسٹیٹس' میری سوچ بدلتے دیکھ کر تم سے سہا نہیں جا رہا' میں اپر کلاس میں گھومتا پھرتا ہوں تو تمہیں تکلیف ہورہی ہے' تم تو میرے۔۔۔۔"

اس کی تیر برساتی زبان کو بریک لگ گئے۔ دوسری جانب سے رابطہ منقطع کردیا گیا تھا۔ اس نے غصے سے فون پٹخ دیا۔

شاید دولت کی تیز سنہری چمک انسان کی وہ بینائی چھین لیتی ہے جس سے وہ محبت خلوص اور ایثار و وفا میں لپٹے رشتوں کو دیکھتا ہے۔

وہ لڑکی جس نے برے سے برے وقت میں اس کا ساتھ دیا تھا۔ اس نے مرتضیٰ سے تب سے محبت کرنی شروع کردی تھی جب اسے صحیح سے لفظ محبت کا ادراک بھی نہیں ہوا تھا۔

کیا ایسی لڑکی مرتضیٰ عبدالکریم سے حسد کرسکتی ہے؟

حسد۔۔۔ جلن۔۔۔ ہاں۔ جلن تو اسے ہورہی تھی۔ اور یہ طے تھا کہ یہ جلن اسے تمام رات جگا کر رکھنے والی تھی۔ بھیگتے گالوں کو رگڑتے ہوئے وہ تخت پر سیدھی لیٹ کے آسمان تکنے لگی۔

☼ ☼ ☼

ان میں تو کبھی تلخ کلامی تک نہ ہوئی تھی۔ ام مریم نے ہمیشہ مرتضیٰ کی بات سنی تھی اور ہمیشہ اس کی بات مانی تھی پھر اب سرد لہجے میں منہ پر بات مارنے والا انداز وہ کیونکر برداشت کرلیتا۔ اسے ام مریم پر بہت غصہ تھا ویسے بھی اب اسے کچھ سوچنے کی ضرورت کم ہی ملتی تھی۔ آفس کے بعد جم چلا جاتا۔ اب اس نے وہاں کی باقاعدہ ممبر شپ لے لی تھی۔ یہاں بہت سے لوگوں سے اس کی جان پہچان ہوگئی تھی۔ بہت سے نامور لوگوں کو سامنے سے دیکھنے اور بات کرنے کا موقع ملا تھا۔ پوش علاقے میں موجود یہ جم خانہ اپر کلاس کے لیے وقت گزاری کی بہترین جگہ تھی۔ مرتضیٰ بھی آہستہ آہستہ ان ہی کے رنگ میں رنگنے لگا۔

روحا باقاعدہ تو جم خانہ نہ آتی تھی لیکن جس روز آجاتی' وہ شام خوشگوار ثابت ہوتی۔ چہکتی ہوئی روحا اس سے دنیا جہان کی باتیں کرتی پھر وہ چائے یا کافی پیتے اگر وقت ہوتا تو ڈنر بھی کرلیتے۔ سکندر اور عفرا نے بہت بار انہیں بھی آؤٹنگ کے لیے ساتھ انوائیٹ کیا تھا۔ وہ چاروں ٹیک اینڈ براب اکثر اکٹھے پائے جاتے۔ مرتضیٰ کی زندگی ایک انوکھے ہی ٹریک پر چل پڑی

تھی۔

☼ ☼ ☼

موسم بدلنا شروع ہو گیا تھا۔ گرمیوں کی طویل دوپہریں سکڑ کر چھوٹی ہوتی جا رہی تھیں۔ فضا میں ہلکی ہلکی خنکی در آئی تھی۔ محلہ رسول نگر کے صحن اور چھتوں پر سوتے لوگ اب کمروں میں سونے لگے تھے۔ رات کو ٹھنڈ ہوتی البتہ دن خوشگوار رہتا۔

ام مریم بچوں کو ٹیوشن پڑھا کر فارغ ہوئی اور موبائل اٹھا کر چھت پر آ گئی۔ ہوا میں دل کو سکون دینے والی تھپکیاں تھیں۔ چارپائی پر بیٹھ کر اس نے موبائل سامنے رکھ لیا۔

یہ بھی اس کے معمولات کا حصہ بنتا جا رہا تھا۔ وہ موبائل کو اب لاپروائی سے ادھر ادھر نہیں چھوڑتی تھی۔ وہ مرتضیٰ کی کال کی شدت سے منتظر تھی۔ وہ جانتی تھی جلد یا بدیر اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گا۔ اپنی کوتاہی پر پچھتاوا ہو گا اور وہ اسے فون کرے گا۔ زندگی میں پہلی بار ام مریم روٹھی تھی اور وہ مرتضیٰ کی جانب سے منائے جانے کی منتظر تھی۔ شام کی خنک سی ہوا نے چوٹی سے نکلے بالوں کو چہرے کے گرد پھیلا دیا تھا۔ جنہیں وہ ہاتھ سے سمیٹ کے کانوں کے پیچھے اڑستی جا رہی تھی۔ یکدم اسے گلی میں اپنے گھر کے دروازے کے آگے رکشہ رکنے کی آواز آئی۔ اس نے تجسس سے منڈیر سے جھانکا۔

"ابا!" وہ چیخی اور تیزی سے نیچے کی طرف لپکی۔

نذیر انکل رکشے والے کی مدد سے عبدالرحیم کو اٹھائے اندر لا رہے تھے۔ ان کے سر پر پٹی بندھی تھی۔ انہیں اندر چارپائی پر لٹا کر رکشے والا چلا گیا۔

"ابا... ابا! کیا ہوا ابا کو؟ نذیر انکل کیا ہوا ہے؟" نذیر احمد بھی کپڑے کی اسی دکان پر ملازم تھے۔ جہاں عبدالرحیم کام کرتے تھے۔ وہ ایک بار وہ ان کے گھر بھی آئے تھے اس لیے مریم جانتی تھی۔

"بیٹا گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے آپ رونا بند کریں۔" وہ اسے ایکسیڈنٹ کے متعلق بتانے لگے جو بے طرح روتے ہوئے عبدالرحیم کے سرہانے بیٹھی تھی۔ دکان کے لیے استعمال ہونے والی موٹر سائیکل پر مال لے کر آنے کے لیے عبدالرحیم مارکیٹ گئے تھے اور سامان موٹر سائیکل کی پچھلی نشست پر بندھوا کر واپس آ رہے تھے جب بھری سڑک پر اوور لوڈ ہو جانے والی بائیک ڈگمگا گئی اور ساتھ والی لین سے آتی گاڑی سے ٹکرا کے دور جا گری۔ ام مریم نے متوحش ہو کر آنکھیں بند کر کے لیٹے عبدالرحیم کو دیکھا۔ ماتھے پر پٹی کے علاوہ دایاں بازو ان پٹیوں میں جکڑا تھا اور ٹانگ فریکچر ہو چکی تھی۔ وہ پریشان کیسے نہ ہوتی۔

"تم کو ہمت سے کام لینا ہو گا بیٹا! اللہ کا شکر ہے اس نے جان بچالی۔ میں آتا رہوں گا' یہ دوائیں رکھیں اور کھانے کے بعد باقاعدگی سے دیں۔ یہ درد کم کریں گی۔ ڈاکٹر نے انہیں دو ماہ تک چلنے پھرنے سے منع کیا ہے' ٹانگ کا فریکچر ٹھیک ہونے میں وقت لگے گا۔ مگر خود کو اکیلا مت سمجھنا کسی بھی چیز کی ضرورت ہو مجھے فون کر لینا بیٹا!" اسے تسلی دے کے وہ چلے گئے۔

اور عبدالرحیم کو دیکھ دیکھ کے بلکتی مریم بیین کا نمبر ملانے لگی۔ اسے بتا کر اس نے مرتضیٰ کو فون کیا' کال پھر نہیں ملی۔ اس نے گھر پر فون کیا اور تائی رخشندہ کے فون اٹھانے پر ابا کے ایکسیڈنٹ کا بتا کے تھک کر موبائل رکھ دیا۔ اس ناتواں سی جان کے لیے اتنا بڑا غم سہارنا مشکل تھا۔ وہ اپنوں کو آوازیں دے رہی تھی۔

بیین کے آنے سے اسے بہت حوصلہ ملا تھا۔ عبدالرحیم بہت مشکل سے ہاتھ کو ہلا پا رہے تھے اور ٹانگ تو ایک انچ بھی سرکاتے تو درد سے کراہتے۔ آس پڑوس والے بھی ان کا حال پوچھنے آئے تھے۔ ایک روز تائی رخشندہ بھی بھولے سے آ گئی تھیں اور اوپری دل سے عیادت کر کے چند منٹ بیٹھ کے چلی گئی تھیں۔ ام مریم کا خیال تھا کہ مرتضیٰ خواہ کتنا بھی ناراض ہو' خون کا رشتہ تو ہے۔ اب تو وہ چکر لگائے گا ہی۔ لیکن وہ غلط ثابت ہوئی۔ کئی دن گزرنے کے بعد بھی نہ تو مرتضیٰ آیا تھا اور نہ عبدالکریم نے بھائی کی خیریت دریافت کی تھی۔ اب مریم نے انتظار کرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔

وہ سمجھ گئی تھی کہ دولت کے سامنے رشتے اپنی وقعت کھونے لگے ہیں۔ اور مرتضیٰ جیسے شخص کے بارے میں یہ سوچنا بہت تکلیف دہ امر تھا کیونکہ اس سے مریم کا صرف خون کا رشتہ نہ تھا' دل کا بھی تھا...

بیین کچھ دن رہ کے واپس چلی گئی۔ سسرال کے بکھیڑوں کے باعث وہ زیادہ دن رک نہ سکتی تھی۔

عبدالرحیم کی خدمت میں اس نے کوئی کمی نہ چھوڑی مگر اب اسے اور ہی فکریں ستانے لگی تھیں۔ عبدالرحیم تو اب کچھ ماہ کے لیے بستر کے ہو رہے تھے اور ڈاکٹرز کا کہنا تھا کہ اس کے بعد بھی انہیں معمول کے انداز میں چلنے پھرنے میں وقت لگے گا۔ ام مریم نے کچھ رقم پس انداز کر رکھی تھی۔ اس سے ان کا علاج چلتا رہا۔ اور اب ٹیوشنز والے پیسوں میں سے ہزار کا آخری نوٹ مٹھی میں تھامے دروازے میں کھڑی تھی کہ کسی جانے والے کو دے کر اسٹور سے ابا کے لیے دوائیں منگوا سکے۔ دوائیں بہت مہنگی تھیں اور گھر کا خرچ الگ۔ ہر مہینے آنے والے پانی و گیس و بجلی کے بل بھی ادا کرنے تھے۔ کسی کے سامنے ہاتھ وہ نہیں پھیلا سکتی تھی۔

اس نے سوچا کہ اسے کوئی نوکری کر لینی چاہیے۔ اس سے پہلے کہ وہ بالکل خالی ہاتھ رہ جائے' اسے کچھ تو کرنا تھا۔ اخبارات میں دیکھ دیکھ کر وہ کچھ جگہوں پر انٹرویو بھی دے آئی تھی اور اب وہاں سے انٹرویو کال آنے کی منتظر تھی۔

☼ ☼ ☼
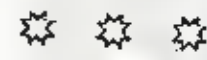
ہوٹل میں زرد نارنجی سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میوزک کی ہلکی ہلکی دھن ماحول کو رومان پرور بنا رہی تھی۔ باہر کی نسبت اندر کا ماحول قدرے گرم تھا۔ ٹیبلز کے گرد بیٹھے بے فکرے سے لوگوں کے وقفوں وقفوں سے آتے قہقہوں کی آواز سکون بھری فضا میں ارتعاش پیدا کر دیتی تھیں۔ ایک دیوار کے پاس والی ٹیبل پر آمنے سامنے بیٹھے وہ دونوں بھی ماحول کی خوب صورتی کو محسوس کرتے ہوئے باتوں میں منہمک تھے۔

روحا اور عفرا کا شاندار رزلٹ آنے پر دونوں نے آج یہاں ٹریٹ دینی تھی مگر سکندر اور عفرا کو کہیں اور جانا پڑ گیا تھا۔ پچھلے مہینے ان دونوں کی منگنی ہوئی تھی دونوں بہت خوش تھے۔ اس وقت بھی مرتضیٰ ان ہی کے متعلق روحا سے بات کر رہا تھا۔

"دونوں اس منگنی سے بہت خوش ہیں۔ کیا یہ پہلے سے ایک دوسرے میں انوالو تھے؟" وہ روحا سے پوچھ رہا تھا۔

"ہاں انوالو تو کافی عرصے سے ہیں۔"

"چلو اچھی بات ہے پھر تو... محبت کا خوب صورت انجام تک پہنچ جانا ہی اچھا ہے' انسان مطمئن و سرشار رہتا ہے۔"

اس کی بات پر روحا نے زوردار قہقہہ لگایا اور کافی دیر ہنستی رہی۔ پھر بمشکل ہنسی روک کر بولی۔ "یہ کس زمانے کی باتیں کرتے ہو تم؟ اب تو رشتے ضرورت اور مفاد کی بنیاد پر طے ہوتے ہیں۔ سکندر اور عفرا نے بھی اس رشتے میں باہمی مفاد سب سے پہلے مدنظر رکھا ہے۔ یہ محبت وحبت کون کرتا ہے اب کسی سے؟ حالات بدل جائیں تو دل بھی بدل جاتے ہیں اور رشتے بھی۔"

وہ مذاق اڑا رہی تھی اور مرتضیٰ کا چمچ والا ہاتھ منہ تک جاتے جاتے رک گیا تھا۔ وہ بھی تو حالات بدلتے ہی سب کچھ بھول گیا تھا۔ محبت بھی' رشتے بھی۔ مرتضیٰ کے چہرے پر سایہ سا لہرا گیا۔

"کیا ہوا؟" مرتضیٰ کو غیر معمولی طور پر یکدم خاموش دیکھ کے وہ پوچھنے لگی۔

"کچھ نہیں" اس نے مسکرانے کی کوشش کی اور سر جھکا کر خود کو کھانے میں مصروف ظاہر کرنے لگا۔

روحا نے شانے اچکائے اور کھانا کھانے لگی۔ کچھ دیر بعد روحا کا موبائل بجا۔ نمبر دیکھ کے اس نے کاٹ دیا اور مرتضیٰ سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی۔ چند لمحوں بعد فون پھر بجا۔ اس نے پھر کاٹ دیا۔ مرتضیٰ نے اس سے نہیں پوچھا کہ کس کی کال ہے۔ اس کی روحا سے اچھی دوستی تھی مگر وہ ذاتی

نوعیت کے سوال نہیں کرتا تھا۔
اگلی دفعہ روحا کا فون نہیں بجا تھا بلکہ میسج ٹون نے روحا کو ہاتھ میں تھمے موبائل پر پیغام پڑھنے پر مجبور کردیا۔ پیغام پڑھ کے اس کے چہرے پر الجھن پھیل گئی۔ وہ متذبذب سی ادھر ادھر دیکھنے لگی۔
"اینی پرابلم؟" مرتضیٰ نے کھانے سے ہاتھ روک کے پوچھا۔
"نو نو۔ سب ٹھیک ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔
"میں ذرا واش روم سے فریش ہو کے آتی ہوں!" وہ اٹھ کر اس طرف چل پڑی جہاں واش رومز بنے تھے۔ مرتضیٰ کرسی سے ٹیک لگائے روحا کے الفاظ یاد کرنے لگا۔
"محبت وحبت کون کرتا ہے کسی سے۔" بالوں میں ہاتھ چلاتے ہوئے اس نے گہری سانس خارج کی۔
وہ کتنی آسانی سے اسے اتنی سخت باتیں کہہ گیا تھا۔ حالانکہ وہ خود بھی جانتا تھا کہ اسے کامیاب دیکھ کے ام مریم سے زیادہ کوئی خوش نہیں تھا۔
اسے کامیاب ہوتے دیکھ کر ام مریم سے زیادہ فخر کسی کو نہیں تھا۔ پھر کیسے اس نے یہ کہہ دیا کہ وہ اس سے حسد کرتی ہے۔ کیسے! اسے شدید تاسف ہونے لگا۔
موبائل پر آنے والی کال نے اس کا دھیان کھینچا۔ سکندر کی کال تھی۔ وہ اسے اپنے ایک دوست کے گھر بلا رہا تھا۔ جس نے ایک پراجیکٹ کی کچھ ضروری باتیں ڈسکس کرنی تھیں۔
موبائل جیب میں رکھ کے اس نے والٹ نکال کر بل ادا کردیا اور نظریں ادھر ادھر گھمائیں۔ روحا ابھی تک نہیں آئی تھی۔ وہ اٹھا اور اس طرف چل پڑا جہاں وہ گئی تھی۔ واش رومز کا دروازہ کھلا تھا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ ادھر سامنے کی راہداری میں اچھی طرح دیکھ کے وہ پلٹنے لگا تو ہلکی ہلکی باتوں کی آواز پر اس نے ذرا پیچھے ہٹ کر اس سمت دیکھا جہاں سے آوازیں آرہی تھیں۔ وہ دائیں جانب پتلی سی ایک اور راہداری تھی جو شاید ہوٹل کے کچن سے جاملتی تھی۔ اس نے آگے ہو کر جھانکا تو حیران سا رہ گیا۔ روحا رخ موڑے کھڑی تھی اور اس کے پاس ایک وجیہہ لڑکا کھڑا کچھ کہہ رہا تھا۔ ان میں کسی بات پر بحث ہورہی تھی۔ مرتضیٰ کے دیکھتے ہی دیکھتے اس لڑکے نے روحا کا بازو کھینچ کے اپنی طرف کیا اور آگے جو ہوا اس سے زیادہ دیکھنا مرتضیٰ جیسے شخص کے لیے مشکل ہوگیا۔
اتنی غیر اخلاقی حرکت کرتے دیکھ کے مرتضیٰ کا چہرہ سرخ ہوگیا وہ تیزی سے مڑا اور ٹیبل کی طرف جانے کے بجائے باہر کی طرف بڑھ گیا۔ روحا کو ضروری کام اچانک آجانے پر اپنے جانے کا میسج کرتے وہ گیٹ پر پہنچا ہی تھا کہ روحا کا میسج آگیا۔ اس نے اپنا انتظار کرنے کا کہا۔ وہ ہونٹ بھینچے کھڑا رہا۔ چند ہی منٹ بعد وہ اسے آتی دکھائی دی۔ نارمل انداز میں بالوں میں ہاتھ چلاتی وہ اسے پارکنگ کی طرف آنے کا اشارہ کرکے اس طرف بڑھ گئی۔
"اتنی کیا جلدی تھی کہ میرے آنے کا بھی انتظار نہ کیا؟" اس کے پاس پہنچتے ہی وہ بولی۔
"سکندر کی کال آرہی تھی۔ بلا رہا ہے، شاید ضروری کام ہے اس لیے میں چلا آیا۔"
حتی الامکان وہ اس کی طرف دیکھنے سے گریز کررہا تھا۔ دانت پر دانت جمائے وہ بہت مشکل سے خود پر جبر کیے ہوئے تھا۔
"ہاں تو کیا ہوا؟ میں واش روم تک ہی گئی تھی، وہاں عمر بتانے تو نہیں گئی تھی۔" اس کے نیم سنجیدہ انداز میں کہنے پر مرتضیٰ کے ضبط کا پیمانہ چھلک پڑا۔
"مگر تم واش روم میں تو نہیں تھیں۔" وہ اس کی بات کو لاپروائی سے نظر انداز کرتی گاڑی میں بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کرنے لگی۔ مرتضیٰ لب بھینچے اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ایسی غیر اخلاقی گری ہوئی حرکت کرکے آنے کے بعد بھی وہ پرسکون بیٹھی تھی۔ شرمندگی کی ہلکی سی رمق اس کے چہرے پر نہ تھی۔
"کون تھا وہ؟" سامنے دیکھتے ہوئے مرتضیٰ نے بڑے ضبط سے پوچھا۔

"کون؟" روحا کے انجان بننے کا ڈراما اسے مزید غصہ دلا رہا تھا۔
"وہی جس کے ساتھ تم وہاں کھڑی......"
"اوہ......" روحا کو سمجھنے میں ایک لمحہ لگا تھا۔
"وہ میرا بوائے فرینڈ تھا۔ خفا تھی میں اس سے بہت عرصے سے، یہاں میں نظر آئی تو بات کرنا چاہتا تھا، مجھے منانا چاہتا تھا اس لیے میں......"
"تم لوگ بات کررہے تھے یا بے حیائی پھیلا رہے تھے؟" مرتضیٰ کی آواز خود بخود بلند ہوگئی۔ اسے شدید غصہ آرہا تھا، وہ روحا کو اچھی دوست ماننے لگا تھا۔ اتنا تو وہ حق رکھتا تھا کہ کچھ غلط کرنے پر اس سے پوچھ سکتا، اسے روک سکتا۔ اور یہی وہ کررہا تھا۔
"واٹ ربش کیا بکواس ہے یہ۔ تمہیں کیا پرابلم ہے؟ میں اپنے ہر فعل کے لیے آزاد ہوں، آج تک کسی نے مجھ سے اس طرح کی جواب طلبی نہیں کی تو تم کون ہوتے ہو؟" وہ بھی اکھڑ لہجے میں چیخی۔
"کسی نے جواب طلبی کی ہوتی تو تم یوں اپنی نفس کی غلام نہ ہوتیں۔"
"فار گاڈ سیک مرتضیٰ! اپنی یہ تھرڈ کلاس مینٹلیٹی چھوڑ دو۔ چلتا ہے یہ سب۔"
"میں تھرڈ کلاس مینٹلیٹی رکھتا ہوں تو بھی کوئی برائی نہیں، عزت اور حیا انسان کے اندر ہونی چاہیے خواہ وہ کسی بھی کلاس سے تعلق رکھتا ہو۔"
"کردی نال وہی گھٹیا بات؟ تم جیسے لوگ خواہ کتنا ہی ہم جیسوں میں گھسنے کی کوشش کرلیں، کتنا ہی کانٹوں چھچوں سے کھانے کا سلیقہ سیکھ لیں۔ رہیں گے وہی اجڈ اور گنوار، سو سال پرانی ذہنیت کے مالک، جو کنویں کا مینڈک بن کے ہی زندگی گزارنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔"
مرتضیٰ کو لگا اس نے اسی کے الفاظ اس کے منہ پر دے مارے ہیں۔ جو کبھی اس نے ام مریم کو کہہ کے اذیت کی کھائی میں دھکیلا تھا۔ بحث کے دوران روحا گاڑی سڑک کے کنارے روک چکی تھی۔
مرتضیٰ نے ایک جھٹکے سے اپنی طرف کا دروازہ کھولا اور باہر نکل آیا۔
تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے وہ دور چلا گیا اور روحا نے بھی اسے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔
مرتضیٰ کا ذہن روشن خیالی کے اس پہلو کو قبول ہی نہیں کرپا رہا تھا۔ وہ آج غلط ثابت ہوگیا تھا۔
اسے آج اندازہ ہوا تھا کہ جس کلاس کے طور اطوار اپنانے کی کوشش میں وہ اپنے رشتوں کو بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا، وہ تو اس کی فطرت سے میل ہی نہیں کھاتے تھے......
وہ تو ہمیشہ سے محلہ رسول نگر میں رہنے والے دقیانوسی مگر پاک صاف سوچ رکھنے والے لوگوں کا ہی حصہ تھا...... اس کی تربیت اسی صحیح غلط اور اچھے برے میں فرق دکھاتے ہوئے کی گئی تھی۔
ام مریم کے ساتھ تنہائی کے ایسے سینکڑوں مواقع ملے تھے مگر کبھی اسے کوئی غلط سوچ تک نہ آئی تھی۔
اسے آج وہ ٹوٹ کر یاد آئی تھی۔
ام مریم نے ہمیشہ اسے آگے بڑھنے کے لیے ہمت بندھائی تھی۔ پھر جب وہ آگے بڑھ آیا تو اپنے پیچھے رہ جانے والی مریم کو کیسے بھول گیا۔ کیسے...... کیسے اس نے ان رنگینیوں میں خود کو گم کرکے ام مریم کے وجود کو بھلا دیا۔ وہ رنگینیاں جن کی عمر صرف لمحاتی ہے، جن کی کشش صرف چند ثانیے کی ہے۔
ان جیسی سطحی چیزوں کے لیے اس نے ام مریم کے انمول وجود کو کیسے نظر انداز کردیا؟
وہی تو تھی اس کی خواہشوں کی تکمیل کے لیے ہر نماز میں دعا کرنے والی۔
اس کی کامیابی و کامرانی کے لیے منتیں ماننے والی۔
پھر اس نے کیسے رخ بدل لیا ام مریم سے......؟
آسمان پر اڑان بھرنے والا پرندہ تھک کر اب زمین پر اتر رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

سکندر کے ساتھ آنے والی میٹنگ ڈسکس کرتے ہوئے وہ اے آر گروپ آف کمپنیز کی عمارت میں

داخل ہو رہا تھا۔ انہیں عبدالرحمٰن نے بلایا تھا۔ داخلی دروازے کے بغل میں راہداری سے گزر کر وہ اندر آفس میں داخل ہونے لگا تھا جب چند فٹ دور سے اسکارف میں لپٹی گزرتی ہوئی لڑکی دیکھ کے چونکا۔ ایک سیکنڈ کے بھی دسویں حصے کی اس جھلک میں اسے لگا وہ ام مریم ہے۔ لیکن ام مریم یہاں کہاں سے آگئی۔

وہ الجھتا ہوا مڑا اور دیکھنے لگا۔ لڑکی اب داخلی دروازے سے باہر جا رہی تھی۔ سکندر منیجر سے ضروری پیپرز نکلوا رہا تھا۔ ساکت کھڑے مرتضیٰ میں حرکت ہوئی وہ باہر کی جانب بڑھا۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا وہ ام مریم ہی تھی۔ لیکن جب تک وہ دروازے تک پہنچا لڑکی سڑک پار کرکے سامنے آتی ویگن میں سوار ہو گئی تھی۔

وہ الجھتا ہوا سا واپس پلٹ آیا۔ عبدالرحمٰن حمدانی ہمیشہ کی طرح مرتضیٰ سے پرتپاک انداز میں ملے تھے۔ مرتضیٰ کا ذہن مسلسل اسی جانب لگا تھا۔ جھجکتے ہوئے اس نے عبدالرحمٰن سے کچھ دیر قبل ان کے دفتر سے نکلتی لڑکی کے متعلق پوچھا۔

"وہ لڑکی' ہاں ام مریم نام ہے اس کا' ایک جاننے والے کے توسط سے جاب کے لیے آئی تھی وہ بتا رہے تھے کہ لڑکی ضرورت مند ہے والد کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ اس لیے اسے ارجنٹ جاب چاہیے' لیکن میرے پاس تو صرف سیکریٹری کی پوسٹ خالی ہے اور اس کا تجربہ بالکل صفر ہے اور تم تو جانتے ہو کہ سیکرٹری چاق و چوبند اور ٹرینڈ رکھنی چاہیے۔ خیر میں دیکھوں گا کوئی جاب ویکنسی آئی تو بلا لیں گے۔" مرتضیٰ ان کی باتیں نہیں سن رہا تھا۔

"والد کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔" اس کا دماغ سائیں سائیں کرنے لگا۔

"لڑکی ضرورت مند ہے۔" ایسے کون سے حالات آگئے ہیں کہ مریم یوں...... وہ سوچ کر ہی گم صم سا ہو گیا۔

کتنا گھٹیا شخص تھا وہ جس نے پلٹ کر چچا اور ام مریم کی خبر تک نہ لی۔ اتنے برے حالات میں بھی کہ جب مریم ماری ماری جاب کی تلاش میں پھر رہی ہے۔

وہ ایک جھٹکے سے اٹھا اور عبدالرحمٰن سے معذرت کرتا تیزی سے گھر کی جانب چل پڑا۔ وہ اماں اور ابا کو بھی چچا کے ایکسیڈنٹ کا بتا کے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ لیکن جب گھر میں داخل ہوتے ہی اماں کو اطلاع دی تو جواب سن کر وہ ساکت ہو گیا۔

"ہاں میں گئی تو تھی عیادت کرنے' اب کیا بھائی صاحب کی پٹی سے بندھ کر بیٹھ جاتے سارے؟"

"اماں! آپ نے بتایا تک نہیں گھر میں؟" حیرت اور دکھ کے ساتھ ساتھ تاسف نے اس کی رنگت زرد سی کر دی۔

"کیا بتاتی؟ تمہارے ابا کی طبیعت ویسے ہی ٹھیک نہیں اور تم اپنے دفتری کاموں میں مصروف' باقی کیا منزہ اور کاشف جاتے ان کی خیریت پوچھنے؟"

"اماں! آپ بتائیں تو سہی' کیا سوچتے ہوں گے چچا کہ حالات بدلنے پر پلٹ کر دیکھا تک نہیں' پوچھا تک نہیں۔"

"سوچتے ہیں تو سوچتے رہیں' ہم نے سب کا ٹھیکہ تو نہیں لے رکھا۔"

اماں کی بات پر وہ دکھ اور افسوس سے سر ہلانے لگا۔ لیکن رخشندہ کی تو شروع سے یہی عادت تھی۔ کم از کم اسے ہی دھیان رکھنا چاہیے تھا۔ اتنے عرصے میں سوائے چند ایک بار کے اس نے ادھر کا رخ بھی نہیں کیا تھا۔

"آپ نے بہت غلط کیا ہے اماں! بہت...... لیکن آپ سے زیادہ قصوروار میں ہوں جو سگے چچا کو بھول گیا' میری غلطی ہے سب' اتنے برے حالات آپڑے ہیں ان پہ کہ ام مریم نوکری کے لیے دھکے کھاتی پھر رہی ہے اور ہم انجان بنے آنکھیں بند کیے بیٹھے ہیں...... تف ہے مجھ پر!" اپنے بالوں کو ہاتھوں کی مٹھیوں میں بھینچتا وہ اٹھ گیا۔

"بس اپنی جان کو روگ لگا لینا اب' اس کی فکر میں گھلتے رہنا' باؤلا ہو گیا ہے اس کلموہی کے لیے۔" تیزی سے باہر نکلتے مرتضیٰ کو پیچھے سے آتی رخشندہ

کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں مگر اب وہ رکنا نہیں چاہتا تھا' اسے اب دیر نہیں کرنی تھی یہ طے تھا' اسے ام مریم کو کہے اپنے ہی لفظوں کی بازگشت نے تڑپا کر رکھ دیا تھا۔

"میں تمہارے لیے بہت کچھ کروں گا ام مریم جس نے میرے لیے اتنی قربانیاں دی ہیں۔ ہم سب ایک ساتھ رہیں گے' خوش حال و خوش باش!

☼ ☼ ☼

وہ تھالی میں دال ڈالے چن رہی تھی۔ ابا کے لیے کھچڑی بنانی تھی۔ صبح مسز صدیقی کے شوہر کی کال پر وہ ایک جگہ انٹرویو دینے گئی تھی۔ ابا کے پاس ہمسائیوں کے تیرہ سالہ فخرو کو چھوڑ کے وہ عجلت میں گھر سے نکلی تھی۔ اس وقت جاب ملنا اس کی سب سے بڑی ضرورت تھی۔ آفس ڈھونڈنے میں اسے مشکل پیش نہیں آئی تھی لیکن وہاں سے بھی اسے کوئی مثبت ریسپانس نہیں ملا تھا۔ وہ ناامید سی لوٹی تھی۔

صبح ہی موتیا کے پودے پر پھول کھلے تھے۔ صحن مہکنے لگا تھا لیکن اسے اب موتیا کے سفید پھول خوش بختی کی علامت نہ لگا کرتے۔ اس کا بخت سو گیا تھا۔

مطلع صبح سے ابر آلود تھا۔ بادلوں نے پورے شہر کو ڈھک رکھا تھا۔

انٹرویو سے واپسی پر بارش شروع ہو چکی تھی لیکن بہت ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ گھر آکر اس نے صحن میں تار پر پھیلے کپڑے جلدی جلدی سمیٹے اور ابا کے لیے کھچڑی بنانے کا سوچ کے دال منگوالی۔ وہ اندر کمرے میں سو رہے تھے۔ عبدالرحیم کے سر اور بازو کے زخم تو بھر گئے تھے مگر وہ اب بھی خود سے چلنے پھرنے کے قابل نہ ہوئے تھے۔ ایکسیڈنٹ نے ان کے گھٹنے کے جوڑ کو شدید نقصان پہنچایا تھا۔ بڑے بھائی نے ان کی خیریت پوچھی نہ ان کے چہیتے بھتیجے نے ہی یہ زحمت گوارا کی۔

وہ تو ایسا گیا تھا کہ پلٹ کر دیکھا تک نہ تھا۔ انہیں اب افسوس ہوتا تھا کہ سبین کے ساتھ ساتھ انہوں نے ام مریم کے لیے بھی اقرار کیوں نہیں کر لیا۔ اپنے گھر میں مطمئن تو ہوتی۔

دولت آنے پر مزاج اور نظریں تو سب سے پہلے بدلتی ہیں' بس وہی اپنی سادگی میں خوش فہمی میں جیتے رہے۔

ام مریم نے دال صاف کرنے کے بعد چاول والا شاپر اٹھا کر اس میں سے مٹھی بھر کے تھال میں ایک طرف انڈیلے اور صاف کرنے لگی۔ اداس اداس سی کاجل سے بے نیاز آنکھیں تھالی میں پڑے کنکر چن رہی تھیں۔

دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی تھی۔ اس نے ان سنی کر دی۔ اب دروازے پر ہوتی دستکوں پہ اس نے چونکنا چھوڑ دیا تھا۔ دستک دوبارہ ہوئی۔ محلے میں سے کوئی ہو گا۔ یہ سوچ کے بھی وہ بیٹھی رہی۔ وہ اتنی مایوس اور دل برداشتہ تھی کہ جھوٹے منہ بھی کسی سے مسکرا کے نہیں مل سکتی تھی۔ دستک بدستور ہوتی رہی۔ وہ تھالی ایک طرف رکھ کے اٹھی اور تھکے قدموں سے بھیگتے صحن میں پڑتی پھوار سے گزر کر باہر

کی طرف جانے لگی کہ دستک دینے والا ضبط کھو کے کواڑ دھکیل کر خود ہی اندر آگیا۔ ام مریم جہاں تک پہنچی تھی وہیں جم گئی۔

آنے والے نے صحن تک کا مختصر سا رستہ بہت سست روی سے طے کیا۔ سر جھکائے بوجھل قدموں سے چلتے ہوئے وہ اس کے پاس رکا جو پتھرئی ابھی تک دروازے کو ہی تک رہی تھی۔

چند لمحے وہ اس کے پاس کھڑا پھوار میں بھیگتے فرش کو دیکھتا رہا۔ پھر چلتا ہوا اندر کمرے کی جانب بڑھ گیا اور دروازہ بند کر لیا۔

ام مریم کے وجود میں تب بھی کوئی جنبش نہ ہوئی۔ بہت باریک سی پھوار کے بے حد ننھے ننھے قطرے اس کے بالوں میں اٹکنا شروع ہو گئے تھے۔ اندر وہ جانے کیا بات کر رہا تھا' اسے پتا نہیں چلا۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا اور وہ عبدالرحیم کے ناتواں سے وجود کو اپنے مضبوط بازوؤں میں اٹھائے اس کے سامنے سے گزر کر باہر لے گیا۔

ام مریم کے چہرے پر بارش کے قطروں اور آنسوؤں میں فرق کرنا مشکل ہو گیا۔ سب گڈمڈ ہو گیا تھا۔ اگر آنسوؤں کا بھی رنگ ہوتا تو یہ بارش بھی ام مریم جیسے لوگوں کا بھرم نہ رکھ پاتی۔ مرتضیٰ آتے ہوئے سکندر کی گاڑی لے آیا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اگر اسے تمام عمر پچھتاوے اور بے سکونی میں نہیں تو اسے وہی کرنا تھا جو اس کے دل کی رضا تھی۔ آٹھ کمروں کے گھر میں ان دو نفوس کی جگہ بہت آسانی سے بن جاتی۔ ام مریم کو آج نہیں تو کل اسے لے ہی جانا تھا۔ تو پھر عبدالرحیم چچا کو کیوں نہیں۔۔۔

اگر وہ خود اس کنویں سے نکل آیا تھا تو یہ اس کا فرض تھا کہ وہ انہیں وہاں تنہا نہ چھوڑتا بلکہ ان کا ہاتھ تھام کر وہ بند گلی عبور کر جاتا جس کے بعد زندگی کی روشن صبحیں ان کی منتظر ہوتیں۔

گاڑی کی پچھلی سیٹ پر عبدالرحیم کو لٹا کے وہ پھر اندر آیا۔ ساکت کھڑی ام مریم کی نگاہیں اب موتیا کے خوشنما پھولوں پر جمی تھیں۔ اس کے قریب آکر وہ چند لمحے خاموش رہا پھر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا۔

"چچا کی دوائیں اور کچھ ضروری چیزیں سمیٹ لو' باقی بعد میں آکر لے لینا۔" اپنے لہجے کو نارمل رکھتے ہوئے اس نے ہدایت دی جو شاید اس نے نہیں سنی تھی۔ وہ یوں ہی ساکت کھڑی تھی۔

"مریم۔۔۔ میں تم سے کہہ رہا ہوں۔" اس نے نرمی سے پھر اپنی بات دہرائی مگر اسے یونہی کھڑا دیکھ کے وہ خود کمرے میں چلا گیا۔ پلنگ کے پاس رکھی تپائی پر سے دوائیں اکٹھی کرنے لگا۔ پھر نکل کر کچن میں چلا آیا' کچھ ڈھونڈنے کے بعد واپس کمرے میں چلا گیا۔ ام مریم اس کے ادھر ادھر پھرنے کا کوئی نوٹس نہیں لے رہی تھی۔ بس اس کا دل رو رہا تھا۔

ایک شاپر میں دوائیں اکٹھی کر کے اندر کا دروازہ بند کر کے وہ صحن میں آگیا۔

"چلو۔" اس کا ہاتھ پکڑ کر وہ چلنے لگا تو ام مریم نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور رخ پھیر کر کھڑی ہو گئی۔ بارش کی پھوار اب اس کے بالوں اور پشت پر اوس کی مانند گرنے لگی تھی۔

اتنے عرصے کے بعد اچانک اسے سامنے دیکھ کے اس پر جمی ناراضی کی برف اب پگھل رہی تھی مگر وہ ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔

مرتضیٰ نے گہری سانس بھری اور دوا والا شاپر تخت پر رکھ کر اس کے پاس آگیا۔ اسے منانا نہیں آتا تھا۔ وہ اس سے کبھی خفا نہیں ہوئی تھی۔ اب ناراض تھی تو اسے روٹھی ہوئی مریم کو منانے کا ڈھنگ نہیں آ رہا تھا۔

"یار! خود ہی مان جاؤ' مجھے منانا نہیں آتا' یہ تم جانتی ہو۔"

بڑے بھونڈے انداز میں کہہ کر وہ پھر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ جیسے کوئی رستہ ڈھونڈ رہا ہو ام مریم کی ناراضی دور کرنے کا۔

بارش نے اب دونوں کو بھگو ڈالا تھا۔ ہلکی پھوار

مستقل پڑنے سے اب مرتضیٰ کی شرٹ بھیگنے لگی تھی۔

"ایک بار غصے میں کچھ کہہ دیا تو اس سے حقیقت بدل تو نہیں گئی۔ میں تو اب بھی وہی مرتضیٰ ہوں' ام مریم کا مرتضیٰ۔"

ام مریم نے پہلی بار نظر اٹھا کر براہ راست اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

"میں تو تمہاری کامیابیوں سے حسد کرتی ہوں' بھول گئے؟" دھیمے مگر اذیت سے پر لہجے میں اس نے سوال کیا۔

"نہیں۔۔۔ اگر ایسا ہوتا تو آج میں ناکام تمہارے پاس کھڑا ہوتا۔" اس نے پھر ام مریم کی نخ کلائی پکڑ کے اوپر کی۔

"کس لیے آئے ہو تم' میں نے تو تصور کرنا بھی چھوڑ دیا تھا کہ تم کبھی اس گھر میں قدم بھی رکھو گے۔" وہ بے حد نالاں تھی۔

"اگر ایسا ہوتا تو تمہارے موتیا پر پھول کھلنا بند ہو چکے ہوتے۔" وہ ام مریم کی ان پھولوں کو خوش بختی کی علامت سمجھنے والی بات سے واقف تھا۔

مریم خاموش ہو گئی۔ اسے اس شخص سے روٹھنے کا سلیقہ بھی نہیں آیا تھا۔ وہ جب تک نظروں سے اوجھل تھا۔ مریم اس سے خفا تھی۔ مگر اسے سامنے سے دیکھ کے اس کی ناراضی ہوا میں تحلیل ہوتی جا رہی تھی۔

"جانتی ہو مریم! تم نے زندگی میں کوئی ڈھنگ کی بات نہیں کی سوائے ایک کے۔۔۔" وہ اب اسے ہنسانے کی کوشش کرنے چلا تھا۔ مریم نے نہیں پوچھا کہ وہ کس بات کے متعلق کہہ رہا ہے۔

"تم نے کہا تھا ناں کہ سورج' چاند' ستارے' بارش' ہوا یہ سب ہر خاص و عام کے لیے یکساں ہیں؟ تو تم نے صحیح کہا تھا۔ دیکھو' اس صحن میں ہم دونوں ہی اس بارش میں بھیگ رہے ہیں حالانکہ مجھ جیسے رئیس میں اور تم میں بہت فرق ہے۔" ہنسانے کی کوشش رائیگاں گئی تھی۔ وہ یونہی لب بستہ کھڑی تھی۔

مرتضیٰ سنجیدہ ہو گیا۔ اسے واقعی منانا نہیں آتا تھا۔

"تم صحیح کہتی تھیں مریم! دولت کے ساتھ ساتھ محبت بھی ضروری ہے دولت کے بغیر تو زندگی گزر سکتی ہے لیکن محبت کے بنا زندگی ادھوری اور نامکمل ہے۔ میں دولت پا کر بھٹک گیا تھا لیکن اب جان گیا ہوں۔ اپنوں کے بنا کوئی بھی خوشی مکمل نہیں ہو سکتی۔

اللہ نے نوازا تھا' اس لیے کہ میں اپنے ساتھ ساتھ اپنوں کو بھی اس بند گلی سے نکال لے جاؤں' مجھ سے کوتاہی ہوئی ہے میں مانتا ہوں' لیکن مریم! تم نے یہ نہیں سنا کہ صبح کا بھولا شام کو گھر واپس آجائے تو اسے بھولا نہیں کہتے؟" وہ جھک کر اس سے پوچھنے لگا۔

"کہتے ہیں۔" منہ پھلائے پھلائے ہی وہ بولی تو مرتضیٰ ہنس پڑا۔ پھر رازدارانہ انداز میں اس سے بولا۔

"چلو کہتے ہوں گے' تمہیں ایک راز کی بات بتاؤں؟ کسی کو بتانا مت۔۔۔ پتا ہے ایک چیز ایسی ہے' جو صرف میرے پاس ہے' کسی رئیس' اعظم' شہنشاہ' امرا' سینیٹر' وزیر' کسی کو بھی حاصل نہیں۔۔۔ بتاؤں کیا؟" وہ مسکراہٹ لبوں میں دبائے اس سے پوچھ رہا تھا۔

اور مریم جواب جاننے کے باوجود اشتیاق سے اس کی صورت تکنے لگی۔

"ام مریم!" اس کے بالوں کی بھیگی لٹیں کان کے پیچھے اڑستے ہوئے وہ پیار سے بولا تو مریم کھلکھلا کے ہنس پڑی اور مرتضیٰ اپنے مضبوط ہاتھ میں اس کا نخ ہاتھ تھامے گھر کا دروازہ پار کر گیا۔

میمونہ صادق

"امی۔۔۔ امی! کدھر ہیں؟ میں نے رات سامنے الماری پر اپنی فائل نکال کر رکھی تھی۔ کہاں گئی وہ؟"

عروہ نے ساری الماری کھنگال ڈالی مگر فائل نہ ملی۔ عروہ کا پارہ صبح صبح ہی چڑھ گیا۔ ایک تو ویسے ہی آج دیر سے آنکھ کھلی اور اوپر سے وین والا بھی جلدی آگیا۔ آج تو اسے اپنی اکنامکس کی اسائنمنٹ جمع کرانی تھی اور اس نے رات ہی اتنی محنت سے مکمل کرکے فائل میں لگا کر سامنے الماری پر دھری تھی اور اب صبح صبح فائل غائب تھی۔ پارہ تو ہائی ہونا ہی تھا۔

"ادھر ہی ہوگی۔ آرام سے ڈھونڈو۔" امی دوپٹے سے ہاتھ پونچھتی کچن سے نکلی تھیں۔

"ڈھونڈلی۔ ہر جگہ دیکھ لیا۔ کہیں نہیں ہے۔ یقیناً" آپ کی مہارانی صاحبہ نے رکھ دی ہوگی سنبھال کر۔ اور ایسی سنبھالی ہے کہ اب مل ہی نہیں رہی۔" اس نے تپتے ہوئے دانت پیسے۔

وین والا ہارن پر ہارن دیے جارہا تھا۔ امی جلدی سے کمرے میں گئیں اور واپسی پر ان کے ہاتھ میں نیلی فائل تھی، جو رات اس نے سامنے الماری پر دھری تھی۔ وہ طنزیہ مسکرائی۔ جتاتی ہوئی مسکراہٹ سے دیکھا۔ "میں نے کہا تھا نا اس نے رکھی ہوگی۔ یہ کہاں سے ملی؟" اس نے بیگ کاندھے پر ڈالا اور جلدی سے فائل تھامی۔

"اندر ریک پر رکھی تھی۔" امی نے کہا مگر اس نے سنا ہی نہیں۔

"ایسی صفائی کہیں نہیں دیکھی بھئی۔ اگلے کی زندگی عذاب بنادو۔" منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی وہ جلدی سے باہر لپکی، جہاں وین والا پانچ منٹ سے کھڑا ہارن پر ہارن دے دے کر پورا محلہ سر پر اٹھا چکا تھا۔

نائلہ درانی کی دو ہی بیٹیاں تھیں۔ بڑی عروہ جو بی۔ اے کی طالبہ تھی اور اس سے چھوٹی فروا الیف۔ اے کی طالبہ تھی۔ عروہ یوں تو سمجھ دار تھی مگر تھوڑی کاہل اور سست واقع ہوئی تھی۔ جو چیز جہاں سے اٹھاتی واپس اسی جگہ رکھنے میں سستی دکھا جاتی۔ سوچتی ہی رہ جاتی کہ ابھی اٹھا کر رکھتی ہوں اور بس پھر جو لے سنی پڑتیں۔ بھلا کس کے ہاتھوں؟ اپنی چھوٹی بہن کے۔

جی ہاں۔ فروا اتنی ہی صفائی کی شوقین تھی جتنی عروہ چور تھی۔ خبط تھا اسے صفائی کا۔ کوئی چیز جگہ سے انچ بھر بھی نہ ملے۔ سامان بکھرا ہوا نہ ملے۔ ہر شے سے نفاست جھلک رہی ہو۔ سامنے کی الماریوں، تپائیوں، انگیٹھیوں یا صوفوں پر کچھ بھی دھرا نہ ملے۔ سارا دن وہ چیزوں کو ٹھکانے لگانے میں جتی رہتی۔ ترتیب سے رکھتی یا اپنے حساب سے ترتیب بدلتی رہتی۔ ساتھ میں سارا نزلہ عروہ پر ہی گرتا، جس کی چیزیں اکثر جابجا بکھری نظر آتیں۔ عروہ ہزار بار کوشش بھی کرچکی تھی مگر پھر بھی کہیں کوئی کسر رہ ہی جاتی تھی کہ فروا کو بولنے کا موقع مل جاتا۔

☆ ☆ ☆

"میں تمہارے باپ کی نوکر نہیں لگی ہوئی کہ پورا دن تمہاری چیزیں سمیٹتی رہا کروں۔ جب دیکھو کمرا بکھرا پڑا ہوتا ہے۔ صبح جب میرے بعد جاگی تھیں تو بستر کیوں نہیں سمیٹا؟ کل کے کپڑے دھل کر آئے

ہوئے ہیں۔ ابھی تک بکھرے کیوں پڑے ہیں؟ سمیٹے کیوں نہیں؟ ہر وقت میں ہی گھر سمیٹتی رہا کروں۔" وہ زور و شور سے کمرا سمیٹتی ہوئی اونچی آواز میں بول رہی تھی۔ عروہ کان لپیٹے ناشتا کررہی تھی۔

"کمرے کا حال دیکھو۔ کیا ہورہا ہے؟"

عروہ نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اردگرد دیکھا۔ سوائے صوفے پر کپڑوں کے انبار اور شکن آلود بستر کی چادر کے ایسا تو کچھ نظر نہ آیا جس کا وہ رونا رورہی تھی۔ نجانے وہ کس حال کی بات کررہی تھی؟ عروہ نے سر جھٹک کر ناشتے کی طرف دھیان کیا۔

"کس قدر ڈھیٹ ہو تم عروہ! کان پر جوں تک نہیں رینگتی تمہارے۔ سوائے کھانے پینے کے کوئی کام ہے بھی تمہارا۔" فروا نے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا تو عروہ کے حلق میں نوالہ سا پھنس گیا۔

"اب کیا کردیا ہے میں نے ایسا؟" بھرے منہ سے وہ بمشکل بول پائی۔

"یہی تو رونا ہے کہ تم کچھ بھی نہیں کرتیں، سوائے کام بڑھانے کے۔" عروہ نے معصومیت سے آنکھیں پٹپٹائیں اور نوالہ نگلا۔

"یہ گھر ہے عروہ بی بی گھر۔ مگر تم نے شاید ہوٹل سمجھ رکھا ہے۔ آئے کھائے، آرام کیا بس۔"

وہ تڑپ اٹھی اس الزام پر۔

"ایسا تو مت کہو۔ اتنے کام تو کرتی ہوں میں۔"

"اچھا۔ مثلاً؟" اس نے دونوں ہاتھ کمر پر ٹکا کر ابرو اچکائے اور کڑے تیوروں سے اسے گھورنے لگی۔

"مثلاً"۔ میں شام کی چائے کے ساتھ کچھ نہ کچھ بنا کر رکھتی ہوں سب کے لیے اور۔۔۔ اور میں سارا دن سنک میں پڑے برتن دھوتی ہوں۔ اور سارا دن گیٹ پر جا جا کر دیکھتی ہوں کہ کون آیا ہے؟ گھر بھر کے کپڑے استری کرتی ہوں۔ سب کے دھلے دھلائے کپڑے سمیٹ کر جگہ پر رکھتی ہوں اور۔ اور۔۔۔" وہ انگلیوں پر سوچ سوچ کر گنوا رہی تھی۔

"بس بس۔ بہت ہوگیا۔ بہت کام کرتی ہیں آپ۔" فروا نے ہاتھ ہوا میں کھڑا کرکے اسے خاموش ہوجانے کا عندیہ دیا۔ عروہ کی چلتی زبان کو چپ لگی۔

"کیوں ان کاموں کی کوئی اہمیت نہیں ہے؟ ہر کام اہم ہوتا ہے چاہے چھوٹا ہو یا بڑا۔" اس کے چہرے پر بلا کی معصومیت تھی جس نے فروا کو مزید تپا دیا۔

"ساری زندگی بس ایسے چھوٹے کام ہی کرتی رہنا۔

ہیں تمہارے باپ کی نوکر ہیں ہوں نہ تمہارے بکھیڑے سمیٹتی رہا کروں۔ آئندہ مجھے اگر تمہاری کتابیں، کپڑے یا کچھ بھی سامان باہر نظر آیا تو میں اٹھا کر گلی میں پھینک دوں گی۔ سمجھیں؟“

اس قدر کٹیلے لہجے میں وہ بولی کہ عروہ کی آنکھیں بھر آئیں اتنی ہتک پر۔ ناشتا وہیں چھوڑ کر وہ کچن میں چلی گئی۔

بڑی بہنوں والی عزت دینا تو در کنار، فروا اکثر اس کے ساتھ اتنی تلخ ہو جاتی کہ اس کا دن گزارنا مشکل ہو جاتا۔ اس کے الفاظ ہتھوڑے کی طرح اعصاب پر برستے۔ حالانکہ وہ اکثر کاموں میں ہاتھ بٹاتی تھی۔ کھانا پکانے کا بھی سلیقہ تھا۔ صرف اس ایک کام میں سستی دکھا جاتی۔ نہ گھر کی حالت پر غور کرتی اور نہ ہی حالت سدھارنے کا خیال آتا۔ اس لیے روز اسے فروا سے کبھی براہ راست سننے کو ملتی، کبھی امی سے کہلوا دیتی۔

اور وہ.... کبھی جواب دیتی، صفائیاں پیش کرتی، معافی مانگ لیتی اپنی غلطی پر تو کبھی خاموش ہو جاتی اور کسی کونے میں بیٹھ کر آنسو بہا لیتی۔ خود سے عہد کرتی کہ آئندہ خیال رکھے گی مگر ہر بار سستی آڑے آجاتی اور عہد ٹوٹ جاتا۔

☼ ☼ ☼

”جسٹ پرفیکٹ۔ کتنی زبردست اسائنمنٹ بنائی ہے عروہ کی بچی! میڈم تعریف نہ کرتیں تو کیا کرتیں۔ مائیکرو اسکوپ لے کر ڈھونڈتیں تو بھی غلطی نہیں نکل سکتی۔ قسم سے لش ہے۔“ جویریہ نے چپس منہ میں رکھتے ہوئے اس کی بنائی انگلش کی اسائنمنٹ کا ناقدانہ جائزہ لیا اور آگے فریحہ کو پکڑا دی، جو دیکھے بغیر بھی جانتی تھی کہ یہ اسائنمنٹ بھی اس کی دیگر اسائنمنٹ کی طرح زبردست ہو گی۔

”کون سی نئی بات ہے؟ میڈم عروہ درانی صاحبہ تو یوں بھی ہر کام پرفیکٹ ہی کرتی ہیں۔“

مگر اتنی ڈھیروں تعریف پر بھی اس کا چہرہ بجھا بجھا ہی رہا۔ فریحہ اس کے اسکول کے زمانے کی دوست تھی۔

محسوس تو کر رہی مگر جویریہ کی موجودگی کے سبب خاموش رہی۔ کتنی دیر وہ دونوں ادھر ادھر کی ہانکتی رہیں اور عروہ بس غائب دماغی سے ہوں ہاں میں جواب دیتی رہی۔

جویریہ کی وین آگئی تو وہ جلدی چلی گئی۔ یوں بھی کالج آف ہو چکا تھا۔ ان دونوں کی وین آنے میں ابھی وقت تھا پھر فریحہ نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”کیا ہوا ہے۔ منہ پر بارہ کیوں بج رہے ہیں؟“ اس نے ٹالنا چاہا مگر فریحہ بھی پوچھ کر ہی دم لینے والوں میں سے تھی۔

”بس یونہی۔ تم سب میری یوں تعریفیں مت کیا کرو۔ جسٹ پرفیکٹ۔ کیا پرفیکٹ ہے مجھ میں؟ کچھ نہیں۔“ اس کی آواز بھرا گئی تو فریحہ چونکی۔

”کوئی انسان بالکل پرفیکٹ نہیں ہوتا۔ بٹ یو آر جسٹ کلوز ٹو اٹ۔“ اس نے زچ ہو کر فریحہ کی جانب دیکھا۔

”پلیز فار گاڈ سیک یار! کوئی پرفیکٹ نہیں ہوں میں۔ جب دیکھو امی اور فروا مجھے لعن طعن کرتی رہتی ہیں۔ اتنی تنقید کرتیں اگر میں اتنی پرفیکٹ ہوتی تو؟ تم لوگ خواہ مخواہ میری تعریفیں کر کے میرا دماغ آسمان پر مت پہنچاؤ۔ مجھے زمین پر ہی رہنے دو پلیز۔“

اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تو فریحہ نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا۔ کچھ دیر وہ روتی رہی اور جب جی ہلکا ہوا تو خود ہی آنسو پونچھ کر چپ ہو گئی۔

”فروا.... کہتی ہے کہ میں گھر میں محض بکھراوا کرنے کو ہوں اور بس.... میں ناکارہ ہوں۔ فالتو ہوں۔ بتاؤ فریحہ میں ایسی ہوں کیا؟“ فریحہ نے سر نفی میں ہلاتے ہوئے اس کا ہاتھ تھپکا۔

”ایسا کچھ نہیں ہے، دماغ خراب ہے فروا کا۔ تم کیوں اس کی باتوں کو اتنا سیریسلی لیتی ہو اور تم اس قابل ہو عروہ! تب ہی ہم تمہاری تعریفیں کرتے ہیں اور جائز تعریفیں کرتے ہیں۔ یو ڈیزرو اٹ۔“

فریحہ کو یقین نہیں آرہا تھا کہ فروا اور امی واقعی اسے لعن طعن کرتی ہوں گی یا عروہ کسی کام میں سستی بھی دکھا سکتی ہے۔ کلاس میں سب سے جلدی اور پوری

ذمہ داری سے تمام کرنے والی عروہ ہی تو تھی۔ تمام اساتذہ بھی اس بنا پر اس کی بہت تعریف کرتیں اور اسے پسند کرتی تھیں۔ اس کے کسی کام میں ڈھونڈنے سے بھی نقص نہ نکلتا تھا۔

ایک بار کلاس میں سب لڑکیوں کو مختلف ٹائٹل دیے گئے تھے۔ اس میں ”دی موسٹ ایفیشنٹ گرل“ کا ٹائٹل عروہ درانی کو ملا تھا۔ وہ واقعی سراہے جانے کے قابل تھی تو پھر....

مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان اکثر دوہری زندگی گزار رہا ہوتا ہے.... ایک دوسرے سے قدرے مختلف۔ ایسا ہی کچھ عروہ کے ساتھ بھی تھا۔ پڑھائی میں بہت اچھی تھی.... کالج کے تمام فنکشنز، ذمہ داریوں کو بخوبی نبھانے والی عروہ درانی کی زندگی کا دوسرا کمزور پہلو بھی تھا کہ وہ گھریلو معاملات میں بے خدست اور کاہل تھی۔ کچھ وہ سست بھی تھی اور کچھ فروا اور امی کی اکثر تنقید کا نشانہ بننے کی وجہ سے جان بوجھ کر سستی دکھا جاتی کہ کام کرنے بھی وہ باتیں سننی ہے تو بہتر ہے کرے ہی نہ۔

”فریحہ.... میں جانتی ہوں کہ میں سست ہوں۔ کاموں کو اکثر ٹال جاتی ہوں مگر.... میں جان بوجھ کر ایسا نہیں کرتی۔ بس مجھ سے ہو جاتا ہے۔ میں کوشش کر کے بھی اپنی اس عادت سے پیچھا نہیں چھڑا سکتی۔ ہر انسان میں کچھ برائیاں ہوتی ہیں اور کچھ اچھائیاں۔ میری اس خامی کو میری سزا بنا کر ہر روز کیوں کچوکے لگائے جاتے ہیں۔ فروا کو شوق ہے صفائی کا بلکہ خبط ہے تو اس میں میرا کیا قصور؟ میں اس جیسی نہیں ہوں۔ میں اس جیسی نہیں بن سکتی۔ ہاں مان لیا کہ وہ بہت اچھا گھر سمیٹ سکتی ہے اور میں اس کام میں ناکام ہو جاتی ہوں تو بہت سے کاموں میں وہ بھی ناکام ہے اور میں کامیاب، مگر میں تو اسے طعنے نہیں دیتی۔ مگر حد ہے۔ میری اس کمزوری پر بات بات پر مجھے بے عزت کیا جائے.... روز صبح و شام۔ اگر میرے گھر میں بھی مجھے ذہنی سکون نہیں تو میں کدھر جاؤں؟“

فریحہ خاموشی سے سننے کے ساتھ ساتھ بہت گہری

سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی... وہ عروہ کی مدد کرنا چاہتی تھی مگر کیسے؟ یہ اس کی گھریلو زندگی سے منسلک مسئلہ تھا اور وہ چاہ کر بھی اس معاملے میں اس کی مدد نہیں کر سکتی تھی۔ اسے افسوس ہو رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

”اف شکر ہے خدا کا.... پورے ڈیڑھ ہفتے بعد نہانا نصیب ہوا ہے۔ بڑا کام ہوتا ہے، ذمہ داری ہوتی ہے نہانے کی بھی۔ اب عرصے تک سکون رہے گا۔“ فروا گیلے بالوں کو تولیے سے رگڑتے ہوئے خشک کر رہی تھی۔ بالوں سے چھینٹے اڑ اڑ کر عروہ پر پڑ رہے تھے اور وہ مزے سے بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھی۔

”کوئی ذرا سنے اس لڑکی کی گفتگو.... نہانا.... ذمہ داری.... بڑا کام وہ بھی مارچ کے مہینے میں۔“ امی سامنے ہی بیٹھی دھوپ سینک رہی تھیں۔ سردی بس اب ختم ہوا چاہتی تھی۔ تاہم موسم بھی کبھی جاڑے کا ہو جاتا تو کبھی کھلی کھلی دھوپ.... عجیب سا موسم ہوتا ہے ان دنوں بھی۔ سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ دھوپ میں کس زاویے سے بیٹھیں کہ نہ سردی لگے نہ گرمی۔

امی کی بات سن کر فروا دانت نکالنے لگی جیسے بڑے فخر کی بات ہو جبکہ عروہ نے سر جھٹک دیا۔

”بندہ ایسا بھی نہ ہو کہ ڈیڑھ دو ہفتے بعد نہائے۔ پتا نہیں اسے خود سے کراہیت کیوں محسوس نہیں ہوتی۔ لوگ بھاگتے ہوں گے دور بدبو سے۔“

فروا بھی کہاں چپ رہنے والوں میں سے تھی۔ دوبدو جواب دیا۔ ”تمہیں آئی ہے بدبو؟ تم بھاگتی ہو دور؟ نہیں نا تو پھر اور بھی کوئی نہیں بھاگ سکتا۔“

”تمہیں صفائی کا خبط صرف گھر کی حد تک ہی ہے۔ اپنی ذات سے نہیں.... خود بے شک ہفتے دو ہفتے نہ نہاؤ مگر گھر چمکنا چاہیے۔“ اسے بھی اب ایک کی دو سنانے کا موقع مل ہی گیا تھا، سو ہاتھ سے کیوں جانے دیتی۔

”جو ظاہر ہے وہ تو چمکتا رہنا چاہیے۔“ تولیہ جھٹک

[illegible] اس نے سامنے کی ریلنگ پر پھیلا دیا اور خود ایک نظر نیچے گلی میں جھانک کر پیچھے ہو گئی۔

"کیوں صفائی کا حکم محض ظاہر کو چمکانے کے لیے ہے۔ باطن اور اندر کو گندا چھوڑ دینا چاہیے۔ جو لوگوں کے سامنے ہے وہ صاف رہے، جو نظروں سے پوشیدہ ہے وہ گندا ہی رہنے دو۔ واہ واہ۔"

اس کے طنزیہ انداز اور مسکراہٹ پر فروا کا دل جل کر رہ گیا۔ کچھ کہنے کو منہ کھولنے ہی والی تھی کہ امی بیچ میں بول پڑیں۔

"کیا فضول کی بحث کر رہی ہو تم دونوں۔"

"فضول کی بحث کہاں امی! ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ اسے گھر کی گندگی کو صاف کرنے کا جنون ہے۔ مگر اپنے آپ کو نہیں دیکھتی، دنوں ایک ہی جوڑا پہنے رکھتی ہے۔ ہفتہ ہفتہ نہاتی نہیں۔ پھر مجھے کس منہ سے بولتی ہے؟"

فروا جواباً خاموش تھی۔ فی الفور کوئی جواب ہی نہ بن پایا۔ امی بھی چپ ہو گئیں۔ اس کے دل کو قرار سا آ گیا تھا۔ ٹھیک تاک کر نشانہ لگایا تھا۔

☼ ☼ ☼

امی کی خالہ زاد بہن رابعہ جو فیصل آباد میں مقیم تھیں۔ ان کی بیٹی کا چند روز قبل ہی زچگی کے دوران انتقال ہو گیا تھا۔ امی اُس وقت چند وجوہات کی بنا پر نہ جا سکیں۔ اب ارادہ بن رہا تھا کہ ان کی طرف ہو آئیں۔ جوں ہی امی نے ارادہ ظاہر کیا وہ دونوں بھی ساتھ جانے کو تیار ہو گئیں۔

"تو کیا ہوا امی۔۔۔ ہماری بھی آؤٹنگ ہو جائے گی۔ کتنا وقت گزر گیا کہیں آنا جانا نہیں ہوا۔" فروا نے پیار سے ان کے گرد بازو حمائل کیے۔

"پیچھے تمہارے ابو اکیلے ہوں گے۔۔۔ کون دیکھے گا انہیں؟ کھانا پکانا، گھر بار کون دیکھے گا۔" امی متفکر تھیں۔

"اوہو امی۔۔۔ ہم کون سا مہینہ بھر کے لیے جا رہے ہیں۔ دو دن کی بات ہے۔ کھانا بنا کر فریز کر جائیں گے۔

[illegible] ابو [illegible] آ جائیں گے۔ کیا مسئلہ ہے؟"

اس نے چٹکیوں میں مسئلہ حل کر دیا۔ امی نے گھور کر دیکھا تو اس نے مسکرا کر امی کو دیکھا۔

"اتنا اچھا حل تو نکالا ہے امی پلیز نا۔۔۔ ہمیں بھی جانا ہے۔ ابو کوئی بچے تھوڑا ہیں۔ پچھلے سال جب عارف ماموں کی بیٹی کی شادی ہوئی تھی تب بھی تو ابو گھر میں اکیلے تھے نا۔"

امی خاموش رہیں، مطلب نیم رضامند تھیں۔

عروہ بھی اٹھ کر امی کے گھٹنوں سے لگ کر بیٹھ گئی۔ انہوں نے دونوں کی آس بھری، جگمگاتی نگاہوں کی طرف دیکھا اور ہولے سے مسکرا دیں۔

"یاہو۔۔۔" دونوں نے نعرہ لگایا تو امی کھل کر مسکرا دیں۔

"مگر پہلے سے بتا دوں۔۔۔ رابعہ اصولوں کی بہت سخت ہے۔ وہ گھر آئے مہمانوں کا بھی لحاظ نہیں کرتی۔ سب سے اپنے وضع کیے اصولوں پر عمل کرواتی ہے۔ کرنل کی بیوی ہے مگر اس کا میاں اتنا سخت نہیں جتنی وہ ہے۔ صفائی ستھرائی کا خبط ہے اسے۔"

امی نے ہولانے کی کوشش کی تو فروا تو خوشی سے جھوم اٹھی۔

"لو پھر تو میری اور ان کی خوب جمنے والی ہے۔ بڑا مزا آئے گا۔"

عروہ نے برا سا منہ بنایا اور منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔

"یک نہ شد دو شد"

☼ ☼ ☼

دو دن بعد وہ تینوں فیصل آباد رابعہ خالہ کے گھر پہنچیں۔ مین گیٹ سے اندر تاحد نگاہ سبزہ ہی سبزہ، گھاس اتنی نفاست سے تراشی ہوئی تھی، لگ رہا تھا جیسے کوئی سبز مخملی قالین بچھا ہوا ہو۔ طرح طرح کے پودے، پھول بہار دکھانے میں پیش پیش تھے۔

"رابعہ کو باغبانی کا بے حد شوق ہے۔ گھنٹوں خود بھی اور نوکروں کو بھی اس کام میں لگائے رکھتی ہے۔ یہ سب اس کی محنت ہے جو نظر آ رہی ہے۔"

[illegible] تب امی نے بتایا۔ عروہ نے ستائشی نظروں سے باہر گردن گھما گھما سارے لان کا جائزہ لیا جبکہ فروا تو کچھ زیادہ ہی متاثر ہو گئی۔ اس کا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ پودوں سے جھولنے لگے، گھاس پر قلابازیاں لگائے یا پھول سونگھ سونگھ کر کھنک اندر اتار لے۔

"اف امی۔۔۔ کیا زبردست لان ہے رابعہ خالہ کا۔"

امی اسے کھینچ کر داخلی دروازے کی طرف لائیں۔ جہاں باہر ریک میں بڑی بڑی چپل رکھی تھیں۔

"میڈم آپ اپنے جوتے اتار کر یہ چپل پہن کر اندر جائیں گی۔" ساتھ چلتے نوکر نے ادب سے انہیں مالکن کا حکم پہنچا دیا۔ کچھ دیر تو تینوں کی سمجھ میں ہی نہ آیا کہ کیا کہا جا رہا ہے۔ پھر امی نے ہی اشارہ کیا کہ جو کہا جا رہا ہے، وہ کرو۔

بڑے بڑے باتھ روم سلیپر پہنے من من قدم اٹھائے وہ اندر داخل ہوئیں۔ سارے نوکر یونیفارم پہنے آگے پیچھے پھر رہے تھے۔ سامنے ہی صاف ستھرا استری شدہ ایک بھی شکن سے پاک لباس پہنے، بال بنائے پُروقار سی شخصیت ملنے کو آگے بڑھی جو یقیناً رابعہ خالہ مطلب مسز فرقان تھیں۔ ملنے ملانے کے بعد تینوں کو ڈرائنگ روم میں پہنچایا گیا۔ فروا خوب چوڑی ہو کر صوفے میں دھنس گئی اور ابھی صوفے کی ہتھی پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ مسز فرقان بول اٹھیں۔

"بیٹا پلیز! سیدھے بیٹھیں۔۔۔ صوفے خراب ہو جاتے ہیں نا۔"

اتنی مٹھاس تھی لہجے میں کہ فروا کو یقین ہی نہ آیا کہ جو الفاظ اس نے سنے ہیں کیا واقعی وہی ادا ہوئے۔ گڑبڑا کر وہ سیدھی بیٹھ گئی۔ ملازمہ تب تک کولڈ ڈرنکس لے آئی تھی۔ گلاس ٹرے سے اٹھا کر جوں ہی عروہ نے میز پر رکھنا چاہا مسز فرقان تڑپ اٹھیں۔

"رکیں بیٹا۔۔۔ شہناز! باجی کو ٹیبل میٹ رکھ دیں۔" شہناز نے جلدی سے ٹیبل میٹ سامنے کیے۔ عروہ شرمسار سی گلاس ہاتھ میں لیے بیٹھی اب رکھے نہ

رکھے کی [illegible] میں [illegible] تھی۔ مسز فرقان اب امی کے ساتھ باتوں میں مگن تھیں۔ وہ دل ہی دل میں کلس کر رہ گئی۔ گھر میں فروا کی صورت مصیبت کیا کم تھی جو یہاں آ کر دوہرا عذاب بھگتنا پڑ گیا۔ اسے افسوس ہی ہوا اپنے یہاں آنے پر۔

کتنی دیر وہ اس طرح سیدھی بیٹھی رہیں۔ کمر ہی اکڑ گئی تھی۔ پہلو بدلتی فروا نے بےزاری سے عروہ کا چہرہ دیکھا، جہاں چھائے تاثرات اس کے چہرے سے مختلف نہ تھے۔

کچھ دیر بعد ہی دبلی پتلی سی خوب صورت نقوش کی حامل ایک لڑکی اندر داخل ہوئی، جسے مسز فرقان نے ان سے اپنی بہو کہہ کر متعارف کروایا۔ ادیبہ بڑی ہی ملنسار لڑکی تھی۔ کافی دیر وہ دونوں اس سے گفتگو کرتی رہیں۔ پھر گھر دکھانے کے بہانے دونوں اس کے ساتھ اندر چلی گئیں۔

اندر لاؤنج میں دو گول مٹول سے بچے ادیبہ کے بیٹے تھے۔ بڑی شرافت سے دونوں ٹی وی کے آگے بیٹھے کارٹون موویز دیکھ رہے تھے۔ پورا گھر دیکھنے کے بعد وہ دونوں ادیبہ کے کمرے میں چلی آئیں۔

"ماشاء اللہ بہت ہی شاندار گھر ہے اور اس سے زیادہ آپ نے مین ٹین کر رکھا ہے۔" فروا نے دل کھول کر تعریف کی تو وہ بلا ارادہ مسکرا دی۔ "بس سب آنٹی کی وجہ سے ہے۔ وہ دن رات گھر کی دیکھ بھال اور صفائی ستھرائی میں لگی رہتی ہیں۔"

"رابعہ خالہ کافی سخت مزاج ہیں، لگتا ہے۔" عروہ کے جملے پر اس کے لبوں کی مسکان اور گہری ہوئی۔

"سخت مزاج تو نہیں ہیں، بس کافی سے زیادہ اصول پسند ہیں۔"

"بہت اچھی بات ہے بندے کو ڈسپلنڈ ہونا چاہیے۔ کیوں فروا؟"

عروہ نے فروا کو یونہی چھیڑا۔ وہ محض "ہوں" کر کے رہ گئی۔ اب عروہ کو مزا آنے لگا تھا۔ چلو کوئی تو تھا جو فروا کو بھی زچ کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

"ہم کب تک ان باتھ روم سلیپرز میں گھومتے

رہیں گے؟"

"جب تک آپ یہاں رہیں گی۔" ادیبہ نے مسکرا کر ہی جواب دیا۔ بڑی ہمت تھی کہ وہ اس گھر میں رہتے ہوئے اس قدر مسکرا سکتی تھی۔

"ماما ہم شیراز کے گھر جا رہے ہیں۔" دونوں بیٹوں میں سے ایک نے اندر کمرے میں جھانکا۔ ادیبہ نے سر ہلاتے ہوئے اجازت دی۔

"واپس آکر مین ڈور والے باتھ سے شاور لے کر اندر آنا' ورنہ دادو بہت ڈانٹیں گی۔ آپ ہمیشہ بھول جاتے ہو حارث!"

ماں کی تنبیہہ پر اس نے چہرے کے زاویے بگاڑتے ہوئے لاپروائی سے اوکے کہا اور چلا گیا۔ ادیبہ نے ان دونوں کو دیکھ کر وضاحت کی۔

"آنٹی کا یہ اصول ہے کہ جو جتنی بار گھر سے باہر جا کر اندر آئے گا۔ وہ پہلے نہا کر مین باتھ روم سے پھر اندر داخل ہوگا۔ بڑوں کے لیے تو پھر بھی اس اصول میں نرمی ہے مگر بچے تو جب بھی کھیل کر آتے ہیں نہائے بغیر اندر داخل ہونا منع ہے۔ کھیل کھیل کر گندے جو ہو جاتے ہیں۔ آنٹی کو گندگی ذرا نہیں پسند۔ کتنی کتنی بار گھر کی صفائی ہوتی ہے ایک ہی دن میں۔ سب کو ہی خیال رکھنا پڑتا ہے۔" دونوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔

"ہائیں۔۔۔ اتنے کڑے اصول۔" فروا نے زچ ہوتے ہوئے کہا۔

"بس آنٹی بہت زیادہ صفائی پسند ہیں۔"

فروا پھرتی' عروہ کی ہنسی چھوٹتے چھوٹتے رہ گئی۔ لو جی کہہ بھی کون رہا تھا' جو پورا دن اپنے گھر والوں کی زندگی اجیرن کیے رکھتی ہے اسی صفائی کے پیچھے۔

"رات میں سونے سے پہلے سب کو نہا کر سونا پڑتا ہے۔ چاہے وہ گھر والے ہوں یا گیسٹ ہوں۔" فروا نے عروہ سے کہیں زیادہ برا بنایا۔ نہانے کی تو وہ حد درجے چور تھی۔ دو روز کے قیام میں دو بار نہانا۔ وہ بھی رات میں۔ کیا مصیبت تھی بھئی۔ آرام کی غرض سے دونوں امی کے ہمراہ گیسٹ روم میں چلی آئیں۔

"امی! آپ تعزیت کرنے آئی تھیں۔ ہو گئی تعزیت۔ ایک دن بہت ہے رہنے کو۔ کل صبح واپس چلتے ہیں۔" عروہ نے بیڈ پر آلتی پالتی مارتے ہوئے تکیہ گود میں رکھا۔

"اب آئے ہیں تو دو تین روز تو رکیں نا۔" امی بڑے اطمینان سے لیٹ گئی تھیں۔ اتنے سکون پر سب سے زیادہ آگ فروا کو ہی لگی۔

"امی! آپ کی یہ کزن مجھے کھسکی ہوئی لگتی ہیں۔ توبہ۔۔۔ گھر والوں کی ہمت ہے جو ایسی خاتون کو برداشت کرتے ہیں۔ روبوٹ بنا کر رکھا ہوا ہے سب کو۔ سانس بھی ان کی مرضی سے لیتے ہوں گے۔ میں تو نوکروں پر حیران ہوں۔۔۔ کیسے پورا دن گھن چکر بنے رہتے ہوں گے۔۔۔ اور ادیبہ بھابھی۔ اف امی! کیسی بہو ہے وہ۔ بے چاری کیسے پورا دن ایسی ساس کے ساتھ گزارتی ہوگی۔"

"آہستہ بولو۔۔۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔" امی نے ٹوکا تو وہ ڈھٹائی سے ہنس دی۔

"او ہو امی۔۔۔ کان ہی ہوتے ہیں نا زبان تو نہیں جو کسی دوسرے کو بتائیں گے۔"

"چلو پیچھے ہٹو۔ مجھے تھوڑی دیر آرام کرنے دو اب۔ سر میں درد ہو رہا ہے۔ رات کا کھانا لگے گا تو اٹھوں گی۔" امی نے آنکھیں موند لیں۔ عروہ بھی کمر سیدھی کرنے کو لیٹ گئی۔ کب سے سیدھی بیٹھ بیٹھ کر دکھ گئی تھی۔

"کھانے میں بھی نجانے کتنے رولز اینڈ ریگولیشن ہوں گے۔ گیسٹ بھی پناہ مانگتے ہوں گے یہاں آکر۔" کمرے کا جائزہ لیتی وہ پردے ہٹا کر باہر لان کا نظارہ کرنے لگی۔

"ویسے ایک بات کہوں۔" وہ جھانک جھانک کر باہر دیکھ رہی تھی۔ عروہ کی بات پر خاص دھیان نہ دیا۔

"تمہیں نہیں لگتا کہ بڑھاپے تک تم بھی اسی طرح سٹھیا جاؤ گی۔" عروہ کی بات پر وہ کرنٹ کھا کر پلٹی۔

"ہائیں۔۔۔ میں کیوں؟"

"کیونکہ شاید تمہیں احساس ہی نہیں' دن بدن تم

بھی صفائی کے پیچھے اتنی ہی پاگل ہوتی جا رہی ہو اور دوسرے کے لیے ناقابل برداشت حد تک ارٹیٹنگ۔" اس نے صاف گوئی سے کام لیا اور فروا شکل دیکھتی رہ گئی۔ عروہ نے اسے کہاں سے کہاں ملا دیا تھا۔

"کس قدر بدتمیز بہن ہو تم۔ میں ایسی سائیکو لگتی ہوں؟ اور تم مجھے بددعائیں دے رہی ہو کہ بڑھاپے میں ایسی سٹھیائی بڈھی ہو جاؤں گی میں۔ تف ہے تم پر عروہ درانی۔" اسے بڑا قلق ہوا تھا۔

عروہ نے معصوم سی صورت بنائی۔ "لو۔۔۔ میں نے کون سی بددعا دے ڈالی ہے۔ سیدھی بات کی ہے اور تم ہتھے سے اکھڑ گئیں۔ ہو سکتا ہے اپنی جوانی میں وہ بھی ایسی نہ ہوں۔ بس صفائی کا تھوڑا شوق ہو۔ اب وقت گزرنے کے ساتھ تو بندہ یوں بھی عجیب سا ہو جاتا ہے نا۔ خبطی اور سنکی سا۔۔۔ تو وہ بھی ہو گئیں۔ بھلا بتاؤ اس درجے صفائی کا کیا فائدہ کہ بندہ دن میں کتنی بار گھر کی جھاڑ پونچھ کروائے اور یہ جوتے جو ہمارے پاؤں سے ہزار گناہ بڑے ہیں اف۔۔۔ خود کا تو دماغ چل گیا ہے دوسروں کو بھی اذیت دیتی ہیں۔ قسم سے فروا تم ایسی ہو جاؤ گی عنقریب۔"

فروا کا دل ہول اٹھا۔ وہ شاکی نظروں سے بہن کو گھورتی رہی جو اب مزے سے چادر تانے سونے کے لیے لیٹ چکی تھی۔ کیا واقعی عروہ سچ کہہ رہی ہے؟ اپنا موازنہ رابعہ خالہ سے کرتے اسے جھرجھری سی آگئی۔

"استغفراللہ۔۔۔ اللہ نہ کرے۔ میں بھی کیا کیا سوچنے بیٹھ گئی۔ یہ عروہ بھی نا۔" اس نے پردے برابر کر دیے اور سامنے رکھا ٹی وی آن کر کے آواز بند کیے خالی خولی چلتی پھرتی تصاویر دیکھنے لگی۔

☆ ☆ ☆

رات کا کھانا تقریباً" دس بجے لگا جب ان کی آنتیں قل ہو اللہ پڑھ پڑھ کر داغ مفارقت بھی دے گئیں تو کھانے کے لیے بلا لیا گیا۔

"شکر ہے خالہ کو خیال آیا کہ گھر آئے مہمانوں کو کھانے کا بھی پوچھتے ہیں ورنہ میں تو [illegible] شاید یہ بھی کوئی اصول ہوگا کہ کھانا کھانے سے بھی گھر گندہ ہوتا ہے۔" عروہ نے سرگوشی کی۔ امی نے گھور کر دیکھا۔

فروا پیٹ پکڑے ہنس ہنس کر دوہری ہو رہی تھی۔

"اب چلو ڈائننگ روم تک اس سے پہلے کہ کھانا اٹھا لیا جائے اصول نمبر دو کے تحت۔" امی بات کے اختتام تک ہلکا سا مسکرا دیں۔

"امی آپ بھی۔" فروا نے قہقہہ لگایا۔

ڈائننگ ٹیبل پر ادیبہ' بچوں' خالہ کے علاوہ انکل فرقان بھی تھے۔ بارعب سی شخصیت والے ریٹائرڈ کرنل۔۔۔ جن کی زوجہ محترمہ ان سے کہیں زیادہ بارعب واقع ہوئی تھیں۔ انکل سے ملنے کے بعد وہ تینوں پھر بیٹھ گئیں۔

"نائلہ! یہ ایپرن پہن لیں کھانے کے لیے اور آپ دونوں بھی بیٹا۔"

ایپرن پہنتے ہوئے وہ کوفت سے سامنے بیٹھے مکینوں کو دیکھنے لگیں جو بڑے سکون سے ایپرن پہنے کھانے میں منہمک تھے۔ ان کے آنے سے قبل ہی کھانا شروع کیا جا چکا تھا۔

"آپ بھی کھانے کے لیے بیٹھ جائیں۔ ٹھیک پندرہ منٹ بعد کھانا اٹھا لیا جائے گا۔ پہلے ہی آپ لوگ کھانے پر لیٹ پہنچے ہیں۔"

دونوں نے ایک دوسرے کی شکلیں دیکھیں اور کھانے پر ٹوٹ پڑیں۔

"آرام سے۔۔۔ کھانا نیچے نہیں گرنا چاہیے۔" فروا نے عروہ کو آہستگی سے تنبیہہ کی' مبادا خالہ انہیں کچھ گر جانے پر "گیٹ آؤٹ" ہی نہ کر دیں۔ پندرہ منٹ تک وہ جتنا کھا سکیں کھا گئیں۔

پندرہ منٹ بعد برتن اٹھا لیے گئے۔ صد شکر وہ پیٹ بھر چکی تھیں۔ کھانے کے بعد ساتھ لگے سنک سے سب نے فروا" فروا" ہاتھ دھوئے اور لاؤنج میں چلے آئے۔

"ہمارے گھر کا اصول ہے' رات سونے سے پہلے

سوتے ہیں۔ آپ لوگوں کے باتھ روم میں گاؤن ہینگ ہوں گے۔ سونے سے قبل میں سب کے روم وزٹ کروں گی۔"

فروا کا تو دماغ کھول اٹھا۔ "خالہ! آپ نے یہ سنہری اصول کہیں لکھ کر لٹکا کیوں نہیں دیے؟ سب سے مناسب جگہ باہر والا گیٹ ہے۔ وہاں آپ کو لکھ کر لگانا چاہیے تاکہ آنے والا باہر سے پڑھ کر ہی شکریے کے ساتھ اجازت چاہے۔" اس نے تبھی لہجے میں تیزی گھول کر ایسے انداز سے کہا کہ باقی سب تو مسکرا دیے مگر خالہ کا رنگ اڑ گیا۔

"کیا مطلب؟"

"کچھ نہیں رابعہ۔ یہ یونہی بکتی رہتی ہے۔" امی نے اسے بازو سے دبوچ کر وضاحت کی۔ بازو پر پڑنے والا دباؤ اتنا شدید تھا کہ وہ بلبلا اٹھی۔

"ویسے خالہ! آپ کو بچپن سے ہی صفائی کا اس قدر شوق تھا؟" امی کا ہاتھ بازو سے ہٹاتے ہوئے پھر سے ڈھیٹ بن کر اس نے سوال کیا۔

"شوق تو ہمیشہ سے تھا مگر آپ کے انکل سے شادی کے بعد مجھے بڑے ڈسپلن سے رہنا پڑا۔ بس عادت ہی ہو گئی پھر تو۔ اب تو جہاں گندگی دیکھوں مجھے دورے سے پڑنے لگتے ہیں۔" عروہ پوری صورت حال سے حظ اٹھا رہی تھی۔

"بہت ہی اچھی بات ہے۔ میں نے پوری زندگی آپ جیسی ڈسپلنڈ خاتون نہیں دیکھی۔ نائس ٹو میٹ یو خالہ!" بمشکل مسکرا کر وہ کمرے میں چلی گئیں۔

"امی! میں آپ کو بتا رہی ہوں کہ کل صبح ہم نے نکل جانا ہے۔ ناشتے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ راستے سے کچھ کھا لیں گے۔ میرا تو دماغ پھٹنے لگا ہے اس گھر میں ایک دن گزار کر ہی۔"

فروا کمرے میں آتے ہی دھپ سے بستر پر گری اور جوتے اتار کر ایک ادھر اچھالا اور دوسرا ادھر۔

"دماغ درست ہے ملے بغیر کیسے چل پڑیں؟" امی نے نہانے کی تیاری پکڑی۔

ابل ابل ... جائیں گے ورنہ میرے منہ سے کچھ نکل گیا تو پھر نہ کہیے گا۔"

"اچھا۔ چپ کر جاؤ۔ صبح دیکھیں گے۔" امی کہتے ہوئے نہانے گھس گئیں اور عروہ صوفے پر بیٹھی ٹی وی دیکھنے لگی۔

"کیسی روبوٹ فیملی ہے یار؟" فروا کے تبصرے پر بھی وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

"کیا مصیبت ہے اب رات کے اس پہر بندہ نہائے اور گاؤن پہن کر سوئے۔ اف خدا! مجھے تو ہول اٹھ رہے ہیں۔" گال پیٹتے ہوئے اب وہ کمرے میں چکرا رہی تھی۔ عروہ پرسکون سی بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔

"میں تم سے مخاطب ہوں میڈم۔ تمہیں کوئی فرق ہی نہیں پڑ رہا جیسے پکنک پر آئی بیٹھی ہو۔" اس کا شانہ جھنجھوڑ کر وہ وہیں صوفے پر ٹک گئی۔

"تو مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔ گھر میں تمہاری سنو یہاں خالہ کی۔" وہ ڈھیٹ بنی بیگ کی جیب سے چپس نکال کر کھانے لگی۔ کچر کچر کی آواز بھی فروا کے اعصاب پر ہتھوڑے کی طرح برس رہی تھی۔

"میں اتنی سائیکو تو نہیں ہوں۔"

"عمر کا فرق ہے نا تب ہی۔" عروہ کی دل جلی مسکراہٹ اسے سچ مچ جلا گئی تھی۔

"کیا مطلب؟"

"تم اس لیے تنگ ہو رہی ہو کہ وہ تم پر حاکم بن کر تمہیں اپنے مطابق چلا رہی ہیں جبکہ گھر میں یہی کام تم خود کرتی ہو دوسروں پر۔"

"عروہ! میں اتنی بھی گئی گزری نہیں۔" فروا نروٹھے پن سے بولی۔

"ہاں شاید۔ مگر مجھے گھر میں بھی اپنا آپ محکوم لگتا ہے اور یہاں بھی۔ فرق تھوڑا سا ہے۔ تم ذرا کم ظالم حاکم ہو اور خالہ۔ بہر حال حاکم تو دونوں ہی ہو نا اور ایک حاکم دوسرے حاکم سے اسی طرح خار کھاتا ہے جیسے کہ تم خالہ سے کھا رہی ہو سمپل۔" فروا اب کی بار چپ سی رہ گئی۔

امی نہا کر نکلیں تو عروہ نہانے کے لیے گھس گئی اور

عروہ کے نکلنے کے بعد فروا کو چار و ناچار نہانا ہی پڑا۔ مسز فرقان بھی اپنے نام کی ایک تھیں۔ واقعتاً" رات سونے سے پہلے ان کے کمرے کا چکر لگا کر گئیں اور ساتھ میں کہہ بھی گئیں کہ کسی چیز کی ضرورت ہو تو نوکر حاضر ہیں رات بھر۔

"لو نوکروں کو رات کو بھی سکون نہیں لینے دیتیں۔" فروا نے چڑ کر کروٹ بدل لی۔

اگلی صبح ہی فجر کی نماز پڑھ کر انہوں نے سامان باندھا۔ صبح صبح خالہ باہر لان میں واک کر رہی تھیں۔ ان کے جانے کا سن کر اندر چلی آئیں۔

"ارے اتنی جلدی کیا ہے؟ چند دن رکتیں تو نائلہ! بچیاں پہلی بار آئی ہیں۔ میں آج گاڑی منگوا دوں گی ڈرائیور ہو گا۔ تھوڑا گھومو پھرو۔ شہر دیکھو۔"

عروہ اور فروا کسی صورت مان کر نہ دیں۔

"اچھا چلو میں ناشتا تو بنوا دوں۔ ناشتا کر کے جانا۔"

ناشتے کی میز پر ایپرن پہنے وہ روبوٹ بنی ناشتا کر رہی تھیں۔ ناشتے کے "فوراً" بعد اجازت چاہی۔ باہر دروازے کے قریب دھرے اپنے جوتے پہنے اور باہر کھڑے ڈرائیور کے ہمراہ اسٹیشن تک آ گئیں۔

☆ ☆ ☆

وہ کالج سے لوٹی تو لاؤنج کے کارپٹ پر دھلے کپڑوں کا ڈھیر نظر آیا۔

"لو۔ آج پھر مجھے سننے کو ملے گا کہ کپڑے دھل کر آئے تو اٹھائے کیوں نہیں۔" اس نے بیگ سامنے الماری پر رکھا اور کپڑے تبدیل کرنے کمرے میں آ گئی۔

"ہائیں۔ یہ کیا آج تو میرے کپڑے صوفے پر ہی دھرے ہیں۔ صفائی بی بی نے اٹھائے کیوں نہیں؟" اس نے جلدی سے کپڑے تبدیل کیے اور کچن میں چلی آئی۔

"امی۔ آج سب خیریت ہے نا؟ فروا کی طبیعت ٹھیک ہے نا؟ میں لوٹی تو باہر صحن میں بیٹھی ناول پڑھ رہی تھی جبکہ اندر کوئی چیز جگہ پر نہیں ہے۔ یہ کیسے ہو گیا؟"

"طبیعت تو ٹھیک ہے۔ اس نے آج پورے گھر میں جھاڑو لگائی ہے۔ ڈسٹنگ کی ہے۔ کپڑے بھی دھوئے ہیں۔" اسے کانوں پر یقین نہ آیا۔ باہر صحن میں آ کر اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔

"آج خیریت ہے نا۔"

"ہاں۔ کیوں؟" وہ حیرت سے پوچھ رہی تھی اور عروہ کی حیرت میں مزید اضافہ ہوا۔

"نہیں وہ۔ کپڑے دھل کر آ گئے اور اب تک سمیٹے نہیں گئے۔ صبح میں کپڑوں کو صوفے پر ہی چھوڑ گئی تھی وہیں پڑے ہیں اور تو اور بجلی کے بل بھی اب تک میز پر پڑے ہیں ورنہ تو نجانے کس کونے میں گھس چکے ہوتے۔" فروا نے ایک آہ بھری اور ناول پھر سے کھول کر قدرے بے زاری سے گویا ہوئی۔

"بس۔ ایک دن خالہ رابعہ کے گھر گزار کر مجھے صفائی سے چڑ سی ہو گئی ہے۔" عروہ کی باچھیں چر کر کانوں تک جا پہنچیں۔

"بس ضروری سی صفائی کر دی ہے۔ باقی کپڑے تم سمیٹ ہی دو گی کبھی نہ کبھی۔ مجھے انہیں کوفت سی ہو رہی تھی۔" عروہ کو واقعتاً" کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

"مطلب میں محکوم نہیں رہی اب۔" فروا نے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا۔

"سوری۔ وہ تو یونہی کہہ دیا تھا میں نے۔" عروہ کو اپنے الفاظ کی سنگینی کا یکدم احساس ہوا۔

"نہیں ٹھیک کہا ہے۔ کسی بھی بات کا خبط خود کے لیے بھی اذیت ہوتا ہے اور دوسروں کے لیے بھی۔"

"چلو اچھا ہی ہوا کہ بات جلدی سمجھ میں آ گئی۔" عروہ نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا اور ساتھ ہی سوچا بڑے ٹھیک کہتے ہیں کہ "لوہا ہی لوہے کو کاٹتا ہے۔"

وہ اٹھ کر اندر چلی آئی۔ اسے اب کپڑے سمیٹنے تھے۔ آخر کو وہ اس گھر کا حصہ تھی۔

کام تو اسے بھی کرنا ہی تھا اچھی بیٹی بن کر مگر اپنی خوشی سے۔ کسی کے کہے بغیر۔

☆

کنیز نبوی

صنم سے صمد تک

سمندر کی بے کراں وسعتیں تا حد نگاہ پر محیط تھیں۔ ٹھاٹھیں مارتے بحر بے کنار کے کنارے منتظر حسنین کی نگاہ اس ایک منظر پر اٹک کر رہ گئی۔

وہ لڑکی کھیل کا جوش رکھنے والا لڑکا سمندر کی طرف بڑھتا۔ لہر قریب آتی تو بھاگنے سے اجتناب برتتا۔ کبھی وہ جیت جاتا تو کبھی لہریں' ارتکاب و اجتناب کے انوکھے کھیل میں کیسا سرور تھا۔

اس مسرور سے لڑکے کو دیکھتے ماضی کا کوئی سماں اس کی آنکھ میں اتر آیا تھا۔

جب سمندر ایسی گہری آنکھوں والی کی پلکوں کی جھالر پر اس کی انشہد انگلی کا پور آ ٹکا۔ محبت اجتناب و ارتکاب کے بیچ کیسی سہمی سہمی خوف زدہ رہتی ہے۔ امید و بیم کی یہ کیفیت گھائل کرنے کے لیے کافی ہے۔ اجتناب و ارتکاب ہجر و وصال کے کنارے ہیں۔

ان میں سے اک مکمل اختیار کرنا کم از کم آدمی کو اُس کنارے کے سپرد تو کر دیتا ہے اور محبت کیف و مستی کے عالم میں کسی اونچ نیچ کے بغیر اپنی ڈگر پر سر نہوڑائے چلتی جاتی ہے۔

منتظر حسنین کی انگلی کا پور بھگ گیا۔ اس نے زندگی میں پہلی بار اس کو شانوں سے پکڑ کر تھام لیا۔ اس وقت وہ خود اپنے احساسات کے شعور سے قاصر تھا۔ وہ محبت تھی یا ہمدردی۔

اک سسکی اس کے شانے کے پار اتر کر مٹی میں مل گئی۔

"منتظر حسنین! میں تمہارے بغیر کچھ بھی نہیں' میرے دل کی شادابی اگر تمہارے وصل سے بہرہ مند ہے تو دل کی ویرانی تمہارے ہجر سے متصل ہے۔"

آنسوؤں میں بھیگی آواز کی لڑکھڑاہٹ نے پانچ فٹ نو انچ کے منتظر حسنین کو لڑکھڑا دیا تھا۔

اس نے مضطربانہ نگاہ ارد گرد دوڑائی جیسے اس کو تلاشتا ہو۔ رات شام کے شانے پھلانگ کر اتر آئی۔

سمندر اس کی تنہائی بانٹنے اس کے پاؤں میں آ پڑا۔

ریت پاؤں کے نیچے وقت کی طرح سرکتی جاتی تھی' سمندر ایسی محبت رکھنے والی لڑکی کی یاد کی امربیلیں

اس کے روئیں روئیں سے نکل کر جسم وجاں سے لپٹی جا رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"سفر تاریخ کا ہو' زندگی کا۔ یا محبت کا۔ یا ایک زمین سے دوسری زمین تک کا۔ ہمیشہ روح اور جسم کو مضطرب و مضمحل دکھی اور تھکا دینے والا ہوتا ہے۔" وہ اس کے سفری بیگ میں چیزیں سمیٹتے بولی۔

وہ تولیے سے منہ پونچھتے مسکرایا۔"لگتا ہے تم ان سارے سفروں کا ادراک رکھتی ہو۔ ہم تو جہاں ہیں وہیں مگن ہیں۔"

"ہوں!" اس نے گہری سانس بھری۔ "شاید ہمارے جیسے لوگ ہمیشہ ہی اسیر ادراک رہتے ہیں۔" متبسم ہو کر منتظر حسنین پر نظر مرکوز کی۔ وہ پرفیوم کا چھڑکاؤ کر کے اس کی طرف پلٹا۔ "نا سمجھ میں آنے والی باتیں اور چیزیں۔۔۔ ان سے میں ہمیشہ دور بھاگتا ہوں۔"

"ہاں۔ عقل۔ استدلال۔ شعور اور دل۔۔۔ انسان کے لیے ہمیشہ مشکل ترین' خطرناک اور بے رحم ثابت ہوتے ہیں۔" بیگ بند کر کے وہ صوفے پر ٹک گئی۔

"اور۔ تاریخ۔ زندگی۔ محبت۔۔۔ ان کے بارے میں تو میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ بس جو جہاں جب بھی اچھا لگے اس کو اپنا لو' حاصل کر لو۔" اس نے شانے اچکائے۔ "اور جو برا لگے اسے چھوڑ دو۔"

"کبھی بے خبری میں بھی عافیت ہوتی ہے۔" وہ سادگی سے مسکرائی۔ وہ بیگ اٹھا کر ٹی وی لاؤنج میں آیا۔

"اچھا آنٹی! چلتا ہوں۔ آٹھ دن بعد پھر آپ کا مہمان بنوں گا۔" وہ کہتے ان کے سامنے جھک گیا۔ انہوں نے شانوں سے پکڑ کر پیشانی کا بوسہ لیا۔

"مہمان کیوں بیٹا۔۔۔ یہ تمہارا اپنا ہی گھر ہے۔"

وہ بیگ اٹھا کر گاڑی میں آبیٹھا۔

اس نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ ایرپورٹ تک سارا راستہ وہ خاموش رہی۔

"اتنے ماہ سے دیکھ رہا ہوں' بہت چپ چپ رہتی ہو۔ کوئی وجہ؟" اس نے مسکرا کر سر کو نفی میں جنبش دی۔

"وجہ کوئی نہیں۔ طبعاً" خاموش ہوں۔ ویسے آپ کو تو مکمل کمپنی دیتی ہوں۔ کوئی شکایت؟"

"ارے نہیں! مجھے تو تمہارے اور اپنے گھر میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ بلکہ زیادہ اپنائیت بھرا ماحول ملتا ہے۔ جو کہ ہمارے گھر میں افراد کی کمی کی وجہ سے نایاب ہے۔ مگر پھر بھی کبھی کبھی تم مجھے بہت کھوئی کھوئی اور اداس لگتی ہو۔ ایک جامد سکوت۔ سناٹے کی کیفیت۔" وہ سوٹ کیس کھینچتے ہوئے ۔۔۔ رک کر بولا۔

وہ لمحہ بھر کے لیے سن سی رہ گئی۔ مگر دوسرے ہی لمحے اس نے اپنی بکھرتی دھڑکنوں پر قابو پالیا۔

"کیا یہ میرے جذبے سے واقف ہو چکا ہے۔" اس نے بغور اپنے ساتھ چلتے منتظر حسنین کو دیکھا۔ جس کے چہرے پر بے فکری والا لاابالی پن دیکھ کر اس نے اپنی سوچ کی نفی کی۔

"میرے خیال سے میرا اکلوتا پن اس کا بڑا سبب ہے' اور شاید کچھ ہاتھ بے تحاشا مطالعے کا بھی ہے۔" وہ بھنویں سکیڑ کر لاپروائی سے بولی۔

"اچھا اب تم جاؤ۔ رات پھیلتی جا رہی ہے۔ آنٹی انتظار کر رہی ہوں گی۔" لاؤنج میں پہنچ کر وہ رکا۔ "ویسے کہنے کی ضرورت تو نہیں' پھر بھی اپنا خیال رکھنا۔"

"مشورے کا شکریہ۔" اس کی ہنسی بے ساختہ تھی۔

وہ پلٹی۔ گاڑی کا لاک کھول کر بیٹھی اور ریورس گیئر لگا کر بغیر اس کی طرف دیکھے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

☆ ☆ ☆

بعض دفعہ اسے یہ سب کچھ خواب کی مانند محسوس ہوتا۔ ساری عمر اچھا کھانے پینے پہننے اوڑھنے کو ترستا ہی رہا تھا۔ مگر اچانک اتنی آسائشات سہولیات وہ قسمت پر حیران بھی تھا اور نازاں بھی۔

اس کی یادوں میں وہ دن پتھر کی طرح نقش تھے' جب یونیورسٹی کے ایڈمیشن کے لیے اس کی ماں نے اپنا حق کا بار بیچا تھا۔ اس نے دیکھا تھا وہ کتنی ہی دیر تک ہار کو لیے گم سی بیٹھی رہی تھیں۔ مگر تب اسے احساس نہیں تھا کہ وہ اس وقت ہار سے بندھی کتنی ہی خوشگوار یادوں کے حصار میں گھر چکی ہیں۔ اس وقت اعلا تعلیم کا جنون اس کے سر پر سوار تھا۔

اس کا ماموں رکشہ چلا کر گزر بسر کرتا تھا۔ ممانی جوانی میں ہی ٹی بی کے مرض کا شکار ہو گئی تھیں۔ اور جلد ہی میں ان کی فوتگی ہوئی۔ اور پھر کچی آبادی میں بنے گھر میں وہ' اماں اور ماموں رہ گئے۔ بجلی' گیس' پانی کے بل دے کر وہ اتنا ہی بچا پاتے جس سے گھر کا راشن اور انٹر تک اس کے تعلیمی اخراجات ہی چلا سکے۔ روزانہ پچاس روپے جیب خرچ میں وہ کیسے گزارہ کرتا' یہ وہ ہی جانتا تھا۔

ماموں کی مالی حالت دیکھ کر وہ کلستا رہ جاتا۔ تب آنکھوں میں اعلا تعلیم کے بعد اچھی پوسٹ کے خواب اس کے اندر نئی توانائی بھر دیتے۔

"بس تعلیم مکمل کرنے کی دیر ہے۔ ماموں کو تو میں راج کراؤں گا۔" اچھے علاقے میں گھر اور زندگی کی آسائشات اس کی پہلی ترجیح بن چکی تھیں۔ جب بھی اپنے خواب ماں کو بتاتا' وہ خوش ہو کر اسے دعا تو دیتی مگر ساتھ میں یہ نصیحت بھی کرتی کہ "بیٹا! تمہارے حصے کا رزق تو تمہیں ہر حال میں ملے گا بس ذرائع حلال استعمال کرنا ہم نے تمہیں حلال لقمہ کھلا کر جوان کیا ہے۔" تب وہ فوراً" اپنی صابر شاکر ماں کے ہاتھ تھام کر چوم لیتا اور دل ہی دل میں رزق حلال کا عہد پختہ کر لیتا۔

"اماں! میں محنت کروں گا۔ دو ملازمتیں کروں گا مگر حلال لقمے میں حرام کی آمیزش نہیں کروں گا۔"

تب ان کے ہاتھ دعا کے لیے بلند ہو جاتے۔

☆ ☆ ☆

"محبت انسان کو موم کی طرح پگھلا دیتی ہے۔ پانی کی

طرح بہادیتی ہے۔ ہوا کی طرح اُڑا دیتی ہے۔ آگ کی طرح جلادیتی ہے۔ مٹی کی طرح دبادیتی ہے۔

میں حیا حسین۔۔۔ جس معاشرے سے تعلق رکھتی ہوں' وہاں لڑکیوں کا اندر ہی اندر سلگنا اور شب بھر آنچلوں کو بھگو دینا یہاں کے رواج ہیں۔ اس سماج نے ابھی عورت کو اپنی زندگی کے فیصلوں میں مختار نہیں بنایا۔ یہاں عورت ابھی تک ذاتی ملکیت تصور کی جاتی ہے۔ وہ محبت تو کرسکتی ہے لیکن اس کے اظہار پر پابندی ہے۔ حالانکہ محبت تو انسان کو سب کچھ بھلادیتی ہے۔ مان' مرتبہ' حسب نسب۔۔۔ محبت کی وجہ سے شاہی تخت ٹھکرائے گئے۔ بادشاہ بھکاری بن گئے اور حکمراں مفتوح ہوگئے۔"

ڈائری کے آگے اوراق خالی تھے۔ وہ جو بیٹی کی مزاج پُرسی کرنے آئے تھے۔ اس کے کمرے میں ہکا بکا کھڑے تھے۔

"کیا حیا کا بخار ٹینشن کا نتیجہ ہے۔ محبت کی تپش ہے۔ اور میں اسے بیماری پر محمول کرتا رہا۔"

وہ متفکر' پریشان فوراً" کمرے سے نکلے تھے۔

✡ ✡ ✡

چھ ماہ بعد وہ گاؤں آئے تھے۔ خوشیاں سے نہال ہوتی سبز ہریالی نظروں کو تراوٹ بخش رہی تھی۔ تانگے بان سے ہلکی پھلکی گفتگو کرتے ہوئے بارہا دل ہمکا۔ نیچے اتر کر اپنی زمینوں میں چہل قدمی کریں۔ وہ دونوں اطراف کی پکی فصلوں کو دیکھ کے خوش ہوتے رہے۔

کپاس کے پودوں میں پھوٹنے والی پھٹیاں۔ دھان کی ہری بھری فصلیں اور قد آور کماد کے بیچوں بیچ بنے والی ٹیڑھی میڑھی راہوں پر دوڑیں لگانے' چھلانگیں مارنے اور پانی کے دائر میں نہانے' پاؤں لٹکا کر بیٹھنے کے کناروں پر بیری' جامن' آم کے پھلیے۔ درختوں کو دیکھ کر ان کے ذہن میں بے شمار باتیں' یادیں' شرارتیں تیرنے لگیں ان کے بچپن کی ہم جولی' شرارتوں کی ساتھی۔

"اب کیسی ہوگی؟" وہ سوچ کر مسکرائے۔

"حمیرا!" انہوں نے زیر لب نام لیا۔ دل چاہا کاش وہ کہیں سے اب بھی سامنے آجائے۔ وہ دونوں ٹیڑھی میڑھی پگ ڈنڈیوں پر بھاگتے دوڑتے عجیب خوشی تھی۔ کیا بچپن' گئی زندگی' گئی عزت بھی پھر لوٹی ہے؟

یادوں کے موتی چنتے چنتے خاموشی کے کتنے ہی لمحے دبے پاؤں چپ چاپ کھسکتے چلے گئے۔ تانگے بان نے اپنے کئی سوالوں کے جواب میں کسی ان دیکھے منظر میں گم صم انہیں دیکھ کر اپنی زبان تالو سے چپکالی۔

شفق زدہ شام کے اوپر رات نے آنے سے پہلے سرمئی چادر سے دھرتی کو ڈھانپ لیا۔ تانگے کی ٹک ٹک آہستہ آہستہ مدھم ہوتی چلی گئی۔ مغرب کی اذانیں ہوچکی تھیں۔ جب انہوں نے گاؤں کی حدود میں قدم رکھا تھا۔ کچے کوٹھوں سے اٹھنے والا دھواں اس بات کی علامت تھا کہ حضرت انسان پیٹ بھرنے کے انتظامات میں مگن ہیں۔

حویلی کا لکڑی کا لوہے کی میخیں لگا بہت بڑا دروازہ سامنے تھا۔ سوٹ کیس تانگے سے اتارا ہی تھا کہ بخشل دوڑتا آیا اور آتے ہی ان کے ہاتھ سے سوٹ کیس لے کر اپنے کاندھے پر رکھ لیا۔

"چھوٹے ملک جی! اندر حویلی میں ملکانی جی آپ کا انتظار کررہی ہیں۔"

انہوں نے اثبات میں سر ہلا کر حویلی کے اندر قدم رکھا۔

✡ ✡ ✡

اب کی بار فیصل آباد سے واپسی پر وہ اک احساس اور احسان تلے دبا ہوا تھا۔ ماضی کی کسمپرسی پر غمزدہ بار بار کسی گہری سوچ میں گم ہوجاتا۔ اتنی آسائشات کی ملکیت کے باوجود ساری زندگی ترستا رہا۔

"اگر وہ اپنے باپ کے گھر میں پیدا ہوتا تو کیا اتنی مشقت بھری زندگی گزارتا؟"

کالج سے یونیورسٹی تک وہ شام کو ٹیوشن پڑھا کر اپنی تعلیم کے اخراجات پورا کرتا تھا اور کچھ ماں سلائیاں کر کے رقم جوڑتی۔

ماں سے بے تحاشا محبت کے باوجود ذہن میں در

آنے والی سوچ کو روک نہ پایا۔

"آخر ماں نے ایسا کیوں کیا۔ خود بھی ساری عمر مشقت کرتی رہی اور مجھ سے بھی کرواتی رہی۔ آخر ماں نے ایسا کیوں کیا۔ کیوں اس نے مجھے باپ کا پتا نہیں دیا۔ ہمیشہ باپ کے ذکر پر کنی کترا کر بات بدل دی۔"

وہ منظر اس کے تصور میں تاحال محفوظ رہا۔ جب انٹر میں پوزیشن لے کر وہ گھر آیا تھا۔ تب ماں کے خوش ہوتے دمکتے چہرے کو دیکھتے ہی اس کے دل میں باپ کا خیال آیا اور زندگی میں پہلی مرتبہ سراپا سوال بن کر ماں کے سامنے آکھڑا ہوا۔

"اماں! آخر بتاتی کیوں نہیں ہو کہ میرا باپ کون ہے۔ کہاں رہتا ہے۔ زندہ ہے کہ مرگیا؟"

تب ماں کی آنکھوں میں گزرا وقت نمی بن کر اتر آیا۔ اس کے لب تھرتھرائے' کچھ بولنا چاہا مگر آواز حلق میں ہی گھٹ گئی۔ اجلا رنگ خوف سے تاریک ہوگیا۔ ایک لمحے میں ماں کے چہرے سے رونق اور زندگی کو اڑتے دیکھا۔ اس کے چہرے پر یکبارگی مردنی چھاگئی۔ ماں کے پورے وجود کو یوں ٹوٹتے بکھرتے دیکھ کر وہ ششدر رہ گیا۔

ماموں نے پانی کا گلاس ماں کو تھمایا۔ چارپائی پر بٹھایا اور اس کو لے کر باہر نکل آئے۔

"بیٹا! آئندہ اپنی ماں سے کبھی یہ سوال مت کرنا۔ ورنہ وہ جیتے جی مرجائے گی۔ اپنی ماں کی زندگی بھی تم ہو اور دولت بھی۔ تمہارا باپ اک امیر شخص تھا اور ہم غریب لوگ یہ شادی صرف چند دن کی پسند کی بنیاد تھی۔ اس کے بعد اس نے طلاق دے کر تمہاری ماں کو اپنی زندگی سے نکال دیا۔

طلاق کے ٹھیک چار ماہ بعد تمہاری ولادت ہوئی۔ میری کوئی اولاد نہ تھی میں نے بہن کی واپسی اور تمہاری ولادت کو دل سے قبول کیا۔ تم ہی بتاؤ کیا میں نے تمہاری تعلیم و تربیت یا پرورش میں کوئی کمی رہنے دی ہے کیا؟"

"نہیں نہیں ماموں! کیسی باتیں کرتے ہیں؟" وہ جی بھر کے شرمندہ ہوا۔ ماموں اس کے ایڈمیشن کی فیس کے لیے رکشہ بیچنے کا سوچنے لگے تھے۔ ماں نے ہی سمجھایا تھا کہ اس کے بغیر گزارہ کیسے ہوگا۔ تب ماموں نے ہنس کر کہا تھا۔ "یہ میری ذمہ داری ہے مزدوری کروں گا' ٹھیلہ لگاؤں گا مگر تم لوگوں کو بھوکا بیٹھنے نہیں دوں گا۔"

✡ ✡ ✡

"یہ گہری سوچ کسی راز کا پتا دیتی ہے۔ آپ کی یادداشت میں کوئی احساس' کوئی یاد لمحہ موجود کی موجودگی سے زیادہ اہم ہے جو حاضر کو منظر سے غائب کردیتی ہے۔"

وہ پر یقین لہجے میں بولتی حیا کو دیکھ کر خوش دلی سے بھنویں اچکا کر مسکرایا اور اس کے ہاتھ سے چائے کا کپ لے لیا۔

"حیا حسین! تمہاری باتیں مجھے ہمیشہ لاجواب کردیتی ہیں۔ تم واقعی ذہین لڑکی ہو۔"

حیا حسین کا فوراً" دل چاہا کہہ دے۔

"یہ ادراک تو مجھے محبت نے دیا ہے۔ اس میں ذہانت کا کیا دخل ہے؟" پھر اپنے اس خیال کو جھٹک کر بولی۔

"یہ طنز ہے' تعریف' مذاق یا خوشامد؟"

وہ کھلکھلا کر ہنسا اور اس لمحے حیا کے دل کی دھڑکنوں نے یقین دلایا کہ اس کی زندگی کی ساری خوشیاں اس کی ہنسی سے پھوٹتی ہیں۔

"ان میں سے کچھ بھی نہیں۔ یہ حقیقت اور سچائی ہے۔" اس نے پہلی بار حیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انتہائی یقین سے کہا تھا اور اس کے لفظوں کی سچائی آنکھوں کے رستے دل کے نہاں خانوں میں اترنے لگی۔

✡ ✡ ✡

"اماں! حمیرا کیسی ہے؟" حسین رضا گرم پراٹھے کے اوپر رکھے مکھن کے پیڑے میں نوالہ ڈبو کر منہ میں رکھتے بولا۔

"اچھی ہے میری بچی۔ آج تو مجھے ان کے پنڈ لے چل۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

اس کے دل میں وہاں جانے' اسے دیکھنے بات کرنے کا اشتیاق کڑ کر بیٹھ گیا۔

میٹھی میٹھی کسک دل کے کناروں سے آلپٹی۔ فوراً" بخشل کو آواز دے کر تانگہ لانے کا کہا۔ راستہ اس کے خیالات میں کٹ گیا۔ ہوش اس وقت آیا جب اماں اسے پکار کر اترنے لگی۔

سب سے ملنے کے بعد اس کی متلاشی نظریں حمیرا کو ہی تلاشتی رہیں۔ پتا نہیں کس کھوہ میں جا چھپی تھی۔ تب ہی وہ آگئی۔ اس کے گیلے بال پشت پر پھیلے تھے۔ شاید نہا کر نکلی تھی۔ وہ آکر اماں کے گلے لگ گئی۔

پھر پلٹ کر بے نیازی سے اسے سلام کرنے کے بعد اماں سے اتنے دنوں بعد آنے کا شکوہ کرنے لگی۔

اماں اسے اپنی مصروفیت' حسین رضا کی زمینوں کی دیکھ بھال۔ اور پڑھائی کے بارے میں بتاتی رہی۔ اب کی بار اس نے نظر بھر کر اسے دیکھا۔ وہ موقع کی تلاش میں تھا۔ اماں جب نماز پڑھنے کے لیے وضو کرنے گئی تو موقع میسر آگیا۔

"کہاں تھیں اتنی دیر سے۔ اتنا انتظار کروایا۔" بچپن والی بے تکلفی لہجے میں عود کر آئی۔

"کس نے کہا تھا انتظار کرنے کو؟" لبوں پر شرارتی مسکراہٹ مچلی۔

"دل نے۔" اس نے دونوں بازو سینے پر باندھ کر اسے دیکھا۔

"اپنے دل کو نکیل ڈال کر رکھ۔" وہ ہنسی۔

"تمہیں نکیل ڈال دوں' عمر بھر کے لیے' خود سے باندھ لوں۔"

"چل۔۔۔ بڑا آیا باندھنے والا۔" اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔

تب ہی اماں کے بولنے کی آواز آئی۔ وہ پھر شرافت سے بیٹھ گیا۔ وہ اسے گھورتے مسکرا کر باہر نکل گئی۔

"پھپھو! جائے نماز بچھادی ہے۔"

"جیتی رہو بیٹی! جیتی رہو۔"

✲ ✲ ✲

"اماں! میری فیس۔" ماہم نے ڈرتے ڈرتے سے کہا۔ فٹ بال کے ٹکڑے جوڑتی اس کی ماں نے ایک نظر اسے دیکھا۔

"کہاں سے لاؤں تمہارے لیے پیسے' یہاں تو پیٹ نہیں پلتا۔ ساری عمر محنت کی' فیکٹری کے دھکے کھائے۔ پھر بھی چار پیسے نہ جمع ہوسکے۔" وہ روہانسی ہوگئی۔

اس نے سر جھکالیا۔ اس چھوٹے سے کوارٹر میں ساری زندگی چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لیے ترستے گزری ہے۔ کیا تعلیم حاصل کرنے کی خواہش بھی پوری نہ ہوسکے گی۔

"اماں! آج آخری تاریخ ہے۔ یہ فیس دے دیں۔ بعد کی ٹیوشنز پڑھا کر پوری کرلوں گی۔" منت سے بولی۔

"اتنا اونچا کیوں اڑ رہی ہے تو کس لیے؟ میں تو تیری شادی کی تیاری کررہی ہوں۔ اک اک پیسہ جوڑ کے بس کوئی اچھا رشتہ آجائے' اس کے انتظار میں ہوں۔" وہ ناصحانہ انداز میں سمجھانے لگی۔

"اماں! شادی کی بات نہ کریں' مجھے ہر حال میں پڑھنا ہے۔ اچھی جاب کرنی ہے۔ آگے بڑھنا ہے۔" اس نے عزم سے کہا۔

"ارے کیوں چڑھ گئی ہے تجھے خواہ مخواہ کی ضد' دیکھ۔۔۔ نعیم تیرے مقدر میں ہی نہیں تھا۔ اب مقدر سے تو کوئی نہیں لڑسکتا ناں!"

"وہ میرے مقدر میں ضرور ہوتا' اگر میں بھی اعلا تعلیم یافتہ اور کھاتے پیتے گھرانے سے ہوتی تو اسے بچپن کی منگنی توڑنے کی جرات نہیں ہوسکتی تھی۔ اب میں اسے کسی مقام تک پہنچ کر دکھاؤں گی۔" اس کے لہجے میں اک عجیب بے قراری در آئی۔

"تجھے اچھی طرح پتا ہے کہ تیرا باپ نشئی تھا۔ ابھی دنیا کے تختے پر آئی بھی نہیں تھی تو کہ وہ اپنا

گیا کہ پھر لوٹ کر نہ آیا۔ مجھے یقین ہی نہیں آیا' مگر پھر روتے روتے صبر آگیا۔ اور یقین بھی۔" وہ نم آنکھیں دوپٹے کے پلو سے پونچھتے بولی۔

"وہ تو اللہ کا شکر ہے کہ میری بہن نے سہارا دیا۔ سر چھپانے کو چھت ملی' پیٹ بھرنے کو مزدوری۔ ورنہ تو ہمارا ماس بھی جانور کھا جاتے۔ لاہور میں تو کوئی بھی ہمارا نہ تھا۔"

"اماں! یہ داستان میں بچپن سے سنتی آئی ہوں۔ میری فیس کا مسئلہ حل کریں۔" وہ خوشامدانہ انداز میں بولی۔

"دیکھ ماہم! جو ایک ایک پیسہ جوڑ کے تیرے جہیز کے لیے جمع کرتی ہوں۔ وہ تو اپنی تعلیم کے چکر میں اڑا دیتی ہے۔ کہاں سے کروں گی تیری شادی؟ بول۔"

"اماں! کیوں پریشان ہوتی ہو۔ نوکری کرکے سارے پیسے واپس لوٹادوں گی۔"

"ہاں نوکریاں تو جیسے درختوں پر اگتی ہیں کہ تو راہ چلتے توڑ لائے گی۔ ارے یہاں تو اچھے اچھے گھرانوں کے پڑھ لکھ کے سڑکوں پر دھکے کھاتے پھرتے ہیں۔ بغیر رشوت سفارش کے یہاں نوکری نہیں ملتی۔"

"خورشید! اب دے بھی دے۔ کیوں دل توڑ رہی ہے بچی کا۔"

اس نے خوش ہو کر تخت پر سلائی کرتی خالہ کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ جو اپنے نام کی مانند ہمیشہ اس کے حق میں اچھی صلاح دے کر ماں کو ٹھنڈا کردیتیں۔ اماں نے آدھا جوڑا ہوا فٹ بال گھٹنوں سے پرے کیا اور اٹھ کر صندوق سے پیسے نکالنے لگی۔

✲ ✲ ✲

محبت کے بھی عجب اطوار ہیں۔ اپنے منتشر خیالات کی انجمن سجاتے سجاتے آنکھوں میں خواب' دل میں درد' ذہن میں تصویر یار سجائے محبت کے کارہنر میں متجسس و مصروف رہتے ہیں۔

میں حیا حسین۔ اسے دیکھ کے ہی اسیر ہوگئی۔ حالانکہ وہ اتنا خوبصورت نہیں کہ دیکھنے والے ٹھٹھک کر رہ جائیں۔ وہ حسن کی اس معراج پر بھی نہیں کہ اک بار دیکھنے کے بعد بار بار دیکھنے کو دل چاہے۔ میں اس احساس کو سمجھنے سے مکمل طور پر قاصر ہوچکی ہوں کہ پھر میں اسے دیکھ کر کیوں ٹھہری ہوئی۔ ایک ہی جگہ جم کر آگے نہ بڑھ سکی۔ میری نظر اس سے ہٹتی نہیں' وہ میری بینائی' عقل سے شناسائی' دل سے دانائی' یک لحظہ چرا کرلے گیا۔ مجھے اک ہی منظر نے مبہوت کردیا۔

اور میں حیا حسین کسی مندر کی دیوداسی کی طرح اس کے چرنوں میں پڑی ہوں۔ اس کے سامنے ہاتھ جوڑے آنکھیں موندے۔ مظفر' غزنوی کی طرح آیا اور مجھے مفتوح بنا کر میری ذات کا سومنات ڈھادیا۔"

لکھتے لکھتے ہاتھوں پہ بھی محبت کی تھکن اتر آئی تھی۔ اس نے سر رائٹنگ ٹیبل پر رکھ دیا۔

وہ ہلکے سے دستک دے کر بیٹی کو گڈ نائٹ کہنے کمرے میں آئے تھے۔ اسے سوتا پا کر رائٹنگ ٹیبل پر پڑی ڈائری اٹھالی۔

"مظفر حسین۔"

✲ ✲ ✲

شمالی علاقوں کے پہاڑوں کی برف باری سے پھوٹنے والی اک سرد کہر میں لپٹی شام لاہور گورنمنٹ کالج کے اسپتال کے کمرا نمبر انیس کے باہر اتر آئی۔

چوکور کمرے میں چار بیڈ تھے۔

کونے میں پڑے بیڈ پر لیٹا ہوا حسین رضا کورس کی کتابوں سے منہ موڑے دیوان غالب میں سرا محو تھا۔

دل سے تیری نگاہ جگر میں اتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

غزل کا اک اک مصرعہ اس پر وارفتگی طاری کرتا رہا۔ حمیرا کا وجود اس کے سامنے مجسم ہوگیا۔

گو کہ اس کے پاس خط و قاصد و فون کی مانند بھرپور وسیلہ اظہار کا ذریعہ نہ تھا' مگر اس کے سامنے آتے ہی حمیرا کے لب مسکرا اٹھتے۔ چہرے کی تابناکی اور شگفتہ بیانی عروج پر ہوتی۔ اس کی اک اک ادا اس بات کی

گواہی دیتی کہ حسین رضا کی محبت میں گرفتار و سرشار ہے۔

اس موسم سرما میں وہ فوراً" گاؤں آنے کے ارجنٹ تار پہ سامان سفر باندھ کر ریل میں آسوار ہوا۔ عجب طرح کے وسوسوں کے ناگ اسے ڈس رہے تھے۔

ماں بی پی کی مریض تھی۔ پتا نہیں کیا ہوا جو یوں بلوایا گیا۔ ماں کے لیے دعائیں مانگتا اسٹیشن پر اترا تو خاندانی تانگہ بان کو نہ پا کر جی جان سے ہول اٹھا۔

"یقیناً" کوئی پریشانی کی بات ہے۔ ورنہ ایسا تو کبھی نہ ہوا کہ میں لاہور سے آؤں اور سواری پہلے سے اسٹیشن پر موجود نہ ہو۔"

وہ سوٹ کیس اٹھا کر تانگہ کرائے پر کر کے آبیٹھا۔ سارا راستہ سرہاتھوں میں دیے وہ پریشان بیٹھا رہا۔ کوئی خیال کوئی منظر اس کی توجہ کھینچنے میں ناکام رہا۔

"سب خیر ہے ناں؟" سامنے سے دوڑتے ہوئے آنے والے بخشل سے بے تاب ہو کر پوچھا۔

"ہاں۔ ہاں چھوٹے ملک جی! ملک حسنین رضا کی شادی ہے۔"

"بھائی کی۔" اسے خوشگوار حیرت نے گھیرا۔

"تمہارے ماموں کاروبار کے سلسلے میں کراچی جارہے تھے۔ میں نے پکڑ لیا۔ پہلے مجھے بیٹی بیاہ کر دے دو' پھر چھوڑوں گی۔ بس آناً" فاناً" تیاری ہوئی۔ جلدی میں تمہیں تار بھیجا۔"

ماں مسلسل جوش سے بولتی جارہی تھی مگر اس کے پاؤں سے زمین کھسک گئی۔

اس کی مثال اس مسافر کی سی تھی' جو منزل پر پہنچ کر تہی دامن رہ گیا ہو۔

تقدیر کی لکھی ازلی تحریر اس کی زندگی کی لوح پر برق رفتاری سے رقم ہو گئی اور وہ اپنی ازلی سست رفتاری کے باعث حسن کی جلوہ گاہ سے ہجر کی خلوت گاہ میں ساکت و ساکن رہ گیا۔

محبت اپنی ساری حشر سامانیوں سمیت اس کے پیش قدم رہی۔ وہ سر اٹھائے اس کے ہم قدم رہا مگر جب سر اٹھایا تو ہجر کی طویل مسافت پر تنہا کھڑا تھا۔

حسین رضا نے شادی کی ساری رسومات میں بجھے من جلتے ہوئے غائب دماغی کی کیفیت میں حصہ لیا۔

مگر وہ تباہ کن ساعت جب منہ دکھائی کے لیے دیور کو پکڑ کر آگے کر دیا گیا۔

"بھرجائی کو سلامی دے چھکے!" اماں کی سرشار آواز ابھری۔

اس لمحے محبت کی تپش اور نارسائی کی آگ میں جلتے ہوئے حسین رضا کی لال بھبھوکا آنکھوں میں ساری تلخی' سارا کرب سمٹ آیا۔

اس وقت حسین رضا کے نام پر حسنین رضا کے پہلو میں بیٹھی دلہن نے بے خودی سے آنکھیں کھول کر سامنے دیکھا۔

بس یہی لمحہ قیامت خیز تھا۔ حسین رضا کے انگ انگ سے پھوٹ کر نکلنے والے بے وفائی کے طعنوں نے اسے جلا کر رکھ دیا۔

رات ہونے تک دلہن کی طبیعت خراب ہوگئی۔ کسی نے نظر لگنے کی قیاس آرائی کی' تو کسی نے جن و پری کے سائے کی خبر اڑائی۔ کسی نے جادو ٹونے کو قصور وار ٹھہرایا۔ مگر حسنین رضا کے لیے صرف سہاگ رات ہی نہیں' ساری عمر کے لیے کمرا بدری مقدر ہوئی۔

حمیرا کو آئے دن پڑنے والے بے ہوشی کے دورے طویل ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ ماں پوتے کی آس لیے قبر میں جاسوئی۔

حسین رضا نے شہر میں ہی تعلیم کی تکمیل کے بعد کاٹن فیکٹری میں منیجر کی جاب کرلی۔

☆ ☆ ☆

"سر! یہ فائل کمپلیٹ ہے۔ اس میں منصوبے پر لگنے والی رقم کا تخمینہ' نقشہ اور مکمل معلومات ہیں۔" وہ ان کے پیچھے آفس میں داخل ہوتے بولا۔

ایم ڈی صاحب نے کوٹ اتار کر کرسی کی پشت پر رکھا اور مشفقانہ نگاہ اس پر ڈالی۔

"بیٹھو بیٹا!" وہ کچھ دیر اپنے سامنے بیٹھے منتظر کو بغور

دیکھتے تذبذب کا شکار نظر آتے رہے۔ کبھی دونوں ہاتھوں کی انگلیاں پھنساتے۔ کبھی ہاتھ سیدھے کر کے فائل کے اوپر رکھتے۔

"منتظر بیٹا! مجھے تمہاری قابلیت' ذہانت اور ایمانداری دیکھ کر بے حد خوشی ہوتی ہے۔ درحقیقت تم بہت اچھے انسان ہو اپنے باپ کی طرح۔"

"سر! آپ جانتے ہیں میرے باپ کو؟" اس کے لہجے میں تجسس و حیرانی نمایاں تھی۔

"میرا مطلب ہے کہ اولاد میں والدین کی تربیت و شرافت منتقل ہوتی ہے۔ تمہیں دیکھ کر ہی احساس ہوتا ہے کہ تم بہت اچھے نیک طبیعت والدین کی اولاد ہو۔ میری دلی خواہش ہے کہ میرے منہ بولے بیٹے سے حقیقی بیٹے بن جاؤ۔"

"جی سر!" وہ کرسی پر بیٹھے حیرت سے آگے سرک آیا' اس کا عکس ٹیبل کے شیشے میں واضح دکھنے لگا۔

"تمہیں معلوم ہے کہ میری صرف ایک ہی بیٹی ہے حیا۔۔۔ بے حد حساس' آرٹسٹک مزاج' کتابوں کی رسیا' زمانے کی اونچ نیچ سے بہت دور' اس کے لیے مجھے تم سے بہتر لڑکا نہیں ملے گا۔"

"سر! آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟" اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔

"بیٹا! تمہیں معلوم ہے کہ ہمارے معاشرے میں کوئی بھی باپ اپنی بیٹی کا رشتہ خود نہیں دیتا۔ مجھے تم پر پورا مان اور بھروسا ہے۔ اس لیے خود بات کی ہے۔ بہر حال انکار اور اقرار کا حق تمہارے پاس محفوظ ہے۔ ہر صورت تم اس آفس میں کام کرتے رہو گے۔"

"سر! میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتا۔" وہ عاجزی سے سر جھکا کے بولا۔

"تم ہی قابل ہو۔ یہ فیصلہ مجھ پر چھوڑ دو۔ تم سوچنے کے لیے وقت لے سکتے ہو۔"

"جی سر!" وہ سعادت مندی سے بولا۔

"میں اس نئے کنٹریکٹ سے فارغ ہو کر کراچی کا چکر لگاؤں گا۔ کنسٹرکشن کا جائزہ لوں گا۔ تم حیا کو سائٹ پر لے جانا تاکہ اگر کام اس کی مرضی کے خلاف ہو رہا ہو تو وہ تبدیلی کروا لے۔"

"جی بہتر سر!" ٹیکسٹائل مل کی تیار ہونے والی شاندار عمارت ان کے تصور میں آسمائی' جو حیا اور اس کے متوقع شوہر کو گفٹ کرنی تھی۔

☆ ☆ ☆

یہ کیا ہوا تھا اس کے ساتھ' جو خواب آنکھوں میں سجائے' ریزہ ریزہ ہو گئے۔ کرچیاں تھیں' جو مسلسل چبھ رہی تھیں۔

"تاہم کی تو مجھے کوئی فکر نہیں جیسے ہی لڑکا ڈاکٹر بنے گا۔ فوراً" اس کا بیاہ کروں گی۔" ماں اٹھتے بیٹھتے تشکر سے کہتی۔

بچپن سے سنتے۔ اس کو یہ الفاظ ازبر ہو گئے تھے۔ مگر جیسے ہی وہ ڈاکٹر بنا۔ اچھے گھرانے کی لڑکی بیاہ لایا۔ وہ اپنی غربت کسمپرسی کے ساتھ اس امید پر گزارہ کر رہی تھی کہ شادی کے بعد اس کی خواہشات پوری ہوں گی۔ مگر اب ایک دم سے یہ دھکا۔ اور سے ٹھکرائے جانے کا احساس۔۔۔ انا پر سخت ضرب لگی۔

اس کے اندر اس صدمے کے بعد آگے بڑھنے ' اونچا معیار زندگی حاصل کرنے کی جستجو اور لگن بڑھ گئی۔ پڑھنا ہے۔ اور آگے بڑھنا ہے۔

☆ ☆ ☆

وہ سارے کام کا جائزہ لے کر بہت تھک چکی تھی۔ اپنے آفس میں دو تبدیلیاں کرانے کی ہدایات دے کر منتظر کے ساتھ گاڑی میں آبیٹھی۔

"کتنا ٹائم لگے گا؟"

"تقریباً" ایک ماہ اور۔" وہ گیٹ سے گاڑی نکالنے لگا۔

"گھر چلیں!" اس نے سوالیہ انداز میں حیا کو دیکھا۔

"شام ہو گئی ہے۔ ایک چکر سمندر کا نہ لگائیں؟"

"ضرور۔ ضرور۔" وہ بغور دیکھتے مسکرایا۔

پھر وہ مختلف کیسٹ پلیئر لگاتا رہا مگر اس کی توجہ رتی بھر اس کی طرف نہ ہوئی۔ خاموشی کے حصار میں گھری سوچوں میں ڈوبی نظر آئی۔ سارا راستہ وہ اسے دیکھتا

جانچتا آیا تھا۔

اس کے سراپے کا 'نقوش کا جائزہ لیتا رہا۔ اپنے ساتھ بیٹھی حیا پر اک نظر ڈالتا پھر ونڈ اسکرین میں دیکھتا۔ یہ میرے ساتھ بیٹھ کر کیسی لگ رہی ہے۔ اس نے سوچا۔

اس کی رنگت گندمی' حیا کی سانولی مائل۔ ان دونوں کی ناک ستواں تھی۔

بڑی بڑی آنکھوں میں ایک گہرائی اور اپنے لیے محبت ہلکورے لیتی نظر آئی۔ گھنی پلکیں اس کے حسن میں اضافے کا باعث تھیں۔ جبکہ حیا کے مقابلے میں اس کی آنکھیں چھوٹی تھیں۔ گھنی مونچھیں' بھرے بھرے ہونٹ۔

ساحل کی ریت پر اپنے ساتھ چلتے ہوئے بہت بھلی لگ رہی تھی۔

سمندر کی بھیگی تیز ہوا سے حیا کا دوپٹا اڑ کر اس کے گرد لپٹ گیا۔ اس نے اک قدم آگے آکر دوپٹے کا تھاما ہوا پلو اس کے سامنے کیا۔ وہ بے ساختہ ہنسی۔ دوپٹا اس کے ہاتھ سے چھڑالیا۔

"لگتا ہے میوزک میں تمہاری دلچسپی نہ ہونے کے برابر ہے۔ اتنے اچھے گانے چلتے رہے مگر تمہاری توجہ ہی نہیں ہوئی۔"

یکبارگی اس کا دل چاہا کہہ دے تمہارے ہوتے ہوئے کسی چیز میں دلچپی نہیں ہوتی۔ مگر صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔

"اتنی گم کیوں رہتی ہو؟"

"کسی کی قربت کے احساس میں گم رہتی ہوں۔"

"کس کے؟" وہ عین اس کے سامنے راستہ روک کے کھڑا ہوا۔

"اس کے' جو ہر قدم پر میرا راستہ روکے کھڑا ہوتا ہے۔" وہ کہنے کو کہہ گئی۔ مگر اس کی بھرپور مسکراہٹ دیکھ کر جھینپ سی گئی۔

"بابا کا فیصلہ قبول ہے؟" اس نے نگاہ حیا کے چہرے پر مرکوز کر کے استفسار کیا۔

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" وہ اس کی مرتکز نگاہ سے گھبرا کر سمندر کی موجوں کو دیکھنے لگی۔

"یہ دلی رضامندی ہے یا سعادت مندی؟" اس نے خوش دلی سے ہنستے ہوئے بازو سینے پر باندھے۔

"دونوں ہی۔" ہوا کی طرح سرسراتی آواز اس کے وجود سے ٹکرا کر اسے ہوا میں اڑا لے گئی۔

دونوں سرور کی کیفیت کو دل میں جذب کر کے ہنسے۔

دور سمندر کی گود میں لیٹنے والے سورج نے اک آنکھ میچ کر محبت سے انہیں دیکھا اور مطمئن ہو کر سو گیا۔

☼ ☼ ☼

جب سے اس کی شادی ہوئی تھی گھر میں بیٹھنا دو بھر ہو گیا تھا' وہ تھکا ماندہ زمین سے آتا کہ گھر جا کر سکون کا سانس لے گا۔

گھر جو انسان کی پناہ گاہ' تسکین' آرام' خوشی و سرور کا مرکز ہوتا ہے۔ وہ گھر اس کے لیے صرف ایک قیام گاہ بن چکا تھا۔ وہ کمرے کی طرف آتا تھا دروازہ بند ملتا۔ ہاں کا کمرا اس کی سرائے تھا۔ وہ مسافر اس میں رات ٹکتا' پھر علی الصبح اپنی زمینوں کی دیکھ بھال کے لیے چلا جاتا۔ گھر میں اس کے کھانے پینے کا خیال ملازمہ رکھتی اور اوپر کے کام' کپڑے' جوتے' تیل' کنگھی' سرمہ' عطر وغیرہ بخشل کی ذمہ داری تھا۔

سوئے اتفاق حمیرا سے اس کا سامنا ہو بھی جاتا تو اس کے پاگل پن کے دورے اس کو گھڑی بھر ٹکنے نہ دیتے۔ وہ اپنے بال نوچتی' وہ ہتھے لگ جاتا تو اس کے بال نوچتی' چٹکیاں کاٹتی' اسے گریبان سے پکڑ کر جھنجوڑنا شروع کر دیتی۔ پورے گاؤں میں یہ بات زبان زد عام تھی کہ حسنین رضا کی بیوی حمیرا کے اوپر شادی کی پہلی رات ہی خطرناک سائے کا اثر ہو گیا۔ گاؤں کی بڑی بوڑھیاں کھسر پھسر کرتیں۔ سہاگ رات جس دلہن پر زیادہ روپ آجائے اور اس پر کوئی جن عاشق ہو جائے تو اس کو اپنی بیوی بنا لیتا ہے۔ کبھی بھی شوہر کو دلہن کے قریب نہیں جانے دیتا' شوہر پاس جائے گا تو بیوی کو دورہ پڑے گا۔

عورتیں جھرجھری لیتیں اور ایسی فرسودہ باتوں سے خوف زدہ ہو کر کانوں کو ہاتھ لگا کر فورا" توبہ تائب ہوتیں۔

اس کے آئے دن کے دوروں سے تنگ آکر حسنین رضا زمینوں پر بنے ڈیرے پر رہنے لگا۔ وہاں منشی کی بیٹی زبیدہ اس کے کھانے پینے کا خیال رکھتی مگر سلیقہ مند' خوبصورت اور نوجوان تھی۔

نوجوان تو وہ بھی تھا۔ بیوی کے پاگل پن سے پریشان ایک جائے پناہ زبیدہ کے وجود میں میسر آئی تو اسے گنوایا نہیں۔ منشی سے رشتہ مانگ کر سادگی سے نکاح پڑھوا لیا۔ زبیدہ اس کے دل کی رانی کے ساتھ گھر کی ملکہ بھی بن گئی۔

ڈیرے پر ہی اس نے خوبصورت گھر بنوا لیا۔ حویلی کا جو دوسرے تیسرے روز چکر لگاتا تھا اب ہفتوں بعد ملازمہ کو راشن پانی کا خرچا دے کر کھڑے کھڑے چلا جاتا حمیرا کو دیکھے بغیر۔

ان ہی دنوں حسنین رضا زمینوں میں اپنا حصہ وصول کرنے حویلی پہنچا تو صرف حمیرا' ملازمہ اور بخشل کو پایا۔

☼ ☼ ☼

"مجھے یہ رشتہ قبول ہے سر! آپ جیسے فرشتہ صفت انسان سے رشتہ جڑنا میرے لیے باعث سعادت ہے اور حیا جیسی جینئس لڑکی کا لائف پارٹنر بننا بہت بڑی خوش نصیبی۔"

فیصل آباد پہنچتے ہی ایم ڈی صاحب کے بلاوے پر نہایت اعتماد اور پروقار طریقے سے اس نے اپنی رضامندی سے مطلع کیا۔

"برخوردار! مجھے تم سے اسی سعادت مندی کی توقع تھی۔" ڈائریکٹر صاحب بہت خوش تھے۔

انہوں نے اپنی کرسی چھوڑ دی' ٹیبل کی دوسری طرف سے گھوم کر اس کی طرف آئے۔ وہ تعظیما" کھڑا ہو گیا۔

انہوں نے گلے لگا کر پیشانی چومی۔ "آئی لو یو مائی سن۔"

اس کی آنکھوں میں بے ساختہ نمی تیر گئی۔ اس کا باپ ہوتا تو وہ بھی شاید اتنی ہی شاندار شخصیت کا مالک ہوتا۔ اس نے ایم ڈی کی آنکھوں کی چمک کو کئی گنا بڑھتے دیکھا۔

"سر! میرا اس دنیا میں ماموں کے علاوہ اور کوئی نہیں' باپ کو تو زندگی بھر نہیں دیکھا۔ ماں کی علیحدگی ہو گئی تھی۔ اس کے باوجود جب سنا کہ بابا ان کو چھوڑنے کے بعد جلد ہی فوت ہو گئے تھے تو صدمہ برداشت نہ کر سکیں اور بیمار ہو گئیں۔ کچھ عرصے کے بعد ان کی بھی ڈیتھ ہو گئی۔ میں چاہتا ہوں زندگی کے اتنے بڑے موڑ پر ماموں میری خوشیوں میں شامل ہوں۔"

"ضرور۔ ضرور برخوردار۔ کہاں رہتے ہیں تمہارے ماموں؟"

"سر! اسی شہر میں۔"

"تو پھر دیر کس بات کی ہے۔ چلو ابھی لے آتے ہیں۔"

"سر آپ؟" اس نے تعجب سے کہا۔

"ہاں۔ کیوں میں نہیں چل سکتا۔"

"کیوں نہیں سر؟" وہ دل سے مسکرایا۔ وہ ان کی لش پش کرتی بی ایم ڈبلیو میں آبیٹھا۔ "کہاں چلیں؟"

ایم ڈی صاحب کے استفسار پر وہ قدرے کھسیانا سا ہو گیا۔ اسے افسوس ہوا۔ اس نے کوئی بہانہ کر کے انہیں آفس میں ہی کیوں روک دیا۔

"سر! آپ کو تو پتا ہے کہ میرا تعلق جھنگ روڈ پر فیصل آباد کی مضافات سے ہے۔"

جب گاڑی ان تنگ گلیوں میں پہنچی تب تک اس کی فطری خود اعتمادی لوٹ آئی تھی۔ اس کے پاس ذہانت و علم کی دولت تھی' جو خریدی نہیں جا سکتی۔ اس سوچ پر مطمئن ہوا۔ وہ گاڑی سے اتر کر تنگ گلیوں میں چلنے لگا' تیسری گلی میں اپنے گھر کے سامنے پڑے تالے کو دیکھ کر رک گیا۔

"سر! اس وقت یقیناً" ماموں کام پر گئے ہوں گے۔ اصل میں وہ رکشا چلاتے ہیں۔ میں نے شاید آپ سے ذکر کیا تھا۔"

"ارے منتظر بیٹا! کیسے ہو۔"

انہوں نے لال دھاری دار رومال شانوں پر پھیلائے سفید ٹوپی پہنے متناسب قدو قامت کے آدمی کو بغور دیکھا جو منتظر سے گلے مل رہا تھا۔

"سر! یہ ہمارے پیش امام ہیں' میں نے قرآن شریف ان ہی سے پڑھا ہے۔"

"جی جی۔ یہ ان ہی گلیوں میں پل کر جوان ہوا ہے۔ بس جناب پوت کے پاؤں پالنے میں ظاہر ہو جاتے ہیں۔ میں تو شروع سے کہتا تھا کہ اپنی ذہانت اور علم سے یہ بہت ترقی کرے گا۔ بہت آگے جائے گا۔"

وہ جو انسانی کمزوری کی بنا پر اک لمحے کے لیے شرمندہ ہوا تھا۔ دوسرے ہی لمحے تعریف نے پھر پُراعتماد بنا دیا۔

"جی۔ میں دل سے قدر کرتا ہوں' اس لیے اس کے محسن و مربی ماموں سے بذات خود ملنے آیا ہوں۔" انہوں نے مصافحہ کرتے پیش امام کو مدعا بتایا۔

"جناب! ہم تو سمجھے کہ حمید کو منتظر میاں لے گئے ہیں۔ وہ تو کافی عرصے سے کسی کو نظر نہیں آیا۔ اس کا رکشا بھی نہیں۔ ہم سمجھے کہ بیچ دیا ہے۔" وہ حیرت و استعجاب سے منتظر کو دیکھنے لگے۔

"ماموں کہیں چلے گئے ہیں؟!" سے سخت دھچکا لگا۔

"کہاں جا سکتے ہیں۔" خود کلامی کی۔

"ان کا کوئی دوست رشتے دار؟" انہوں نے استفسار کیا۔

"نہیں سر! مجھے تو ایسا کوئی بھی قریبی عزیز یاد نہیں پڑتا' جن کے پاس وہ جائیں' وہ بھی اتنے عرصے کے لیے۔" وہ پریشانی سے بولا۔

گندی نالی سے ٹراتے ہوئے مینڈک باہر آنے لگے۔ بدبو کا اک بھبکا اٹھا۔ اس نے گھبرا کر ایم ڈی صاحب کو ناگواری سے ناک پر رومال رکھتے دیکھا۔

"چلیں سر! کہیں اور پتا کرتے ہیں۔"

☼ ☼ ☼

"سوچتی ہوں کہ محبت میں وصل کی تمنا کیا معنی رکھتی ہے' کیونکہ وصال تو بہر صورت ہے۔ محبوب ہم سے دور ہی کب ہوتا ہے۔ تصور و خیالات میں ہمارے پاس' ہماری دسترس میں ہوتا ہے۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے دل اسے مجسم دیکھنے چھونے' باتیں کرنے کو ہمکتا ہے۔

اور محبت میں یہ تاثیر ہے کہ چھپائے نہیں چھپتی۔

اور میں حیا حسین۔۔۔ جس محبت کو اپنی ذات سے بھی پوشیدہ رکھنے میں مگن تھی۔ اس محبت کو میرے بابا جانی نے جان لیا اور میرے دامن طلب میں ڈال دیا۔

میں دنیا کی وہ خوش قسمت' خوش نصیب لڑکی ہوں' جس کے آگے نہ ریت ورسم رکاوٹ بنی' نہ ظالم سماج آڑے آیا۔ میری خوشی کی نہ انتہا' نہ مسرت کو ناپنے کا پیمانہ کہ میرے بابا جانی نے مجھے وارفتہ شوق گرفتار محبت پا کر میری آرزو پوری کر دی تھی۔

☼ ☼ ☼

پشیمانی' ندامت اور احساس جرم کا اک نہ رکنے والا سلسلہ تھا' جس میں وہ غرق ہو رہا تھا۔ آسائشات و آرام کا عادی ہو کر وہ اپنے ماموں کو بھول بیٹھا' جس نے پالا پوسا' پڑھایا لکھایا۔ اعلا عہدے پر پہنچ کر اپنے محسن و مربی سے بے خبر رہا۔

ڈھائی ماہ پہلے جب ان سے ملنے آیا تھا تو ان کو اپنے ساتھ چلنے کا کہا تھا۔ مگر انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں پرائے گھر میں جا کر نہیں رہوں گا۔ تم اپنے مالک کے گھر میں رہتے ہو' اپنا گھر لو گے' تب ہی چلوں گا۔

اسی دن واپسی میں ضروری فائلیں دینے آفس پہنچا تو سر نے اسے دامادی میں لینے کا عندیہ دیا۔

چاہنے کے باوجود وہ یہ خوش خبری ماموں کو نہیں سنا سکا۔ اس کی فلائٹ کا ٹائم ہو چکا تھا۔ کراچی میں نئی ٹیکسٹائل مل کے انفرا اسٹرکچر کے جھمیلوں میں پھنسا رہا۔ حیا کا مرکز نگاہ۔۔۔ اس کی پسندیدگی اب ڈھکی چھپی

بات نہ تھی۔

ماموں کی گمشدگی نے اسے بوکھلا دیا۔ اس نے ایم ڈی صاحب کی مدد سے پولیس اسٹیشنز' ہاسپٹلز' ایدھی سینٹر کا ریکارڈ چیک کروایا۔ ہر جگہ ڈھونڈا' مگر کوئی پتا نہیں چل سکا۔ ڈائریکٹر صاحب نے چاروں طرف اپنے آدمی پھیلا دیے ڈھونڈنے پر' مگر کہیں سے امید افزا خبر سننے کو نہ ملی۔

وہ مامی اور ماں کی طرح ماموں کو بھی رو' پیٹ کر بیٹھ گیا۔ مگر اک کسک ضرور تھی' جو ٹیس بن کر دل میں چبھتی رہی۔

ڈائریکٹر صاحب نے جس طرح ماموں کو ڈھونڈنے میں اس کے ساتھ تگ و دو کی تھی۔ اس بنا پر اس کے دل میں ان کی عزت کئی گنا بڑھ چکی تھی۔ حیا کا مسلسل فون پر رابطہ اسے ڈھارس بندھاتا۔

بیس دنوں کے بعد ناکام و نامراد وہ کراچی لوٹ آیا۔

✡ ✡ ✡

حویلی کی اجڑی حالت اک نوکرانی کے رحم و کرم پر دیکھ کر اسے رنج پہنچا۔ وہ حمیرا کے کمرے میں آیا۔

"یہ میں کیا سن رہا ہوں؟ تمہیں دورے پڑتے ہیں یا آسیب کا سایہ ہو گیا ہے؟" وہ حیرت سے گویا ہوا۔

"تم سے بڑا آسیب میری زندگی میں نہیں آسکتا حسین رضا! بزدل تھے' نامرد تھے' تب ہی پریت کی ڈور کو توڑ کر چھپ کر بیٹھ گئے۔ نہ اتا پتا چھوڑا' نہ کبھی لوٹ کر خبر لی۔" وہ ملگجے سے حلیے' بکھرے بالوں' وحشت زدہ لال بھبھوکا آنکھیں لیے اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

کتنے ہی لمحے گزر گئے۔ وہ حیرت و دکھ سے اس کے طعنے سنتا اس کے اجڑے وجود کو دیکھتا رہا۔

"بولتے کیوں نہیں' مجھے برباد کرنے والے! جواب دو۔"

اس کی حالت دیکھ کر وہ اپنی صفائی میں اک لفظ نہ بول سکا۔ "میں نے اپنا وجود تمہیں ودیعت کیا' میرا وجود تمہاری محبت کا اسیر تھا۔ پھر کیسے کسی اور کے حوالے کر دی۔ تمہیں ہی تو سونپی تھی اپنی محبت' جذبہ اور ہر اک احساس' پھر کیوں منہ موڑ کر بھاگ گئے بزدلوں' بے ہمت لوگوں کی طرح۔"

حمیرا کے ہاتھ اس کے گریبان تک پہنچ گئے۔ وہ ساکت رہ گیا۔

"میری اس حالت کے ذمے دار تم ہو حسین رضا صرف تم...." وہ اسے جھنجوڑ رہی تھی۔ اس کے اندر اتنی ہمت نہ تھی کہ خود کو چھڑا سکے۔ وہ جب بولتے چیختے' روتے' جھنجوڑتے تھک گئی تو خود ہی اس کو اپنی گرفت سے آزاد کر دیا' تھک کر زمین پر بیٹھ گئی اور سر گھٹنوں میں دے کر سسکنے لگی۔

اس کے الجھے بال پورے وجود پر بکھر گئے۔ وہ چند ثانیے اسے یوں ہی دیکھتا رہا۔ پھر مرے مرے قدموں سے کمرے سے باہر نکل آیا۔

"بیٹا! اسے ایسے ہی دورے پڑتے ہیں۔ کوئی اس کے پاس جانے کی کوشش کرے تو دور ہی سے غرانے لگتی ہے۔ میرے قریب مت آؤ۔ میرے قریب مت آؤ۔"

اس کے جھکے سر' پھٹے گریبان کو تاسف سے دیکھ کر ملازمہ دکھ سے بولی۔ وہ اس کی دگرگوں حالت پر پشیمانی سے کلستا رہا۔ دل تو کر رہا تھا پہلے کی طرح طوطا چشمی کر کے یہاں سے بھاگ جائے' مگر وہ اس خیال کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ بہرحال وہ اس کی محبت تھی اور اس کی محبت کی وجہ سے درد میں شریک رہے گا۔ دلجوئی کرے گا۔ یہ فیصلہ کرنے میں اس کے دل نے صرف اک لمحہ لگایا تھا۔

✡ ✡ ✡

"رشیدہ بہن! اتنے اچھے رشتے کروائے ہیں محلے کی لڑکیوں کے' بس میری ماہم پر ہی تیری نظر نہیں پڑتی۔" چھوٹے سے صحن میں پڑے تخت پر دونوں پاؤں اوپر رکھ کر بیٹھی رشیدہ چائے کا کپ تخت کے کونے پر رکھتے آنکھیں سکوڑتے حیران ہوئی۔

"ارے کیوں خورشید! تیری بیٹی کی تو بچپن سے

تیرے بھانجے کے ساتھ نسبت طے تھی۔"

"ارے تجھے نہیں پتا اس نے تو اپنے ساتھ پڑھنے والی ڈاکٹرنی سے بیاہ رچا لیا۔" صالحہ خالہ نے تاسف سے کہا۔ "بس وہ دن آج کا دن' جیتے جی بہن ہمارے لیے مر گئی۔"

"اب پھر دکھڑے شروع۔" ماہم جی بھر کے جھنجلائی۔ اپنی بے وقعتی کا دکھ بھلانا بھی چاہے تو نہیں بھول پائی۔

"ارے کیوں دل چھوٹا کرتی ہے۔ کیا کمی ہے بھلا اپنی ماہم میں۔ خوب صورت' پڑھی لکھی' عمدہ اخلاق والی' ایک چھوڑ دسیوں رشتے اس کے لیے۔" رشیدہ نے انگلیوں میں پڑی انگوٹھیوں کی نمائش کرتے ہوئے ہاتھ لہرا لیا۔

"جانتی ہوں تمہیں بھی اور تمہارے تھرڈ کلاس رشتوں کو بھی۔" وہ دانت پیستے بڑبڑائی' اور خود کو انتہائی ہینڈسم ہم سفر کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتے دیکھنے لگی۔

"ارے کیا ہوا ماہم! بیٹھے بیٹھے سو گئی کیا؟" آنکھیں کھول کر ناگواری سے ماں کو دیکھا۔

"تو استری رکھ کر کپڑوں پہ کھڑی ہے اور کوئی ہوش ہی نہیں۔"

اس نے چونک کر استری والا ہاتھ اوپر کیا۔ اکلوتے اچھے جوڑے کو جلا ہوا دیکھ کر دل مسوس کر رہ گئی۔

"ہائے ہائے ابھی پچھلے ماہ ہی تو آٹھ سو روپے کا سوٹ لایا تھا۔ وہ بھی جلا دیا۔ تجھے کیا قدر ہو گی ٹکڑے جوڑتے جوڑتے انگلیاں ٹیڑھی ہو گئیں میری۔" وہ روہانسی ہو کر بولی۔

"اب جل گیا تو کیا کروں۔" وہ جھنجلائی۔ "اماں چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر بھی تم تو جان کو آجاتی ہو۔" قمیص جلنے کا غم اوپر سے ماں کی نصیحتیں۔

"اب میں کیا پہن کر کالج جاؤں؟"

✡ ✡ ✡

"حمیرا کو اس حالت میں تنہا چھوڑ کر آپ ناانصافی کر رہے ہیں۔" وہ زمین پر اس کے مقابل کھڑا اسے احساس دلا رہا تھا۔

"وہ آسیب زدہ ہے' کبھی ٹھیک نہیں ہو گی۔ اماں نے اپنی زندگی میں کوئی دعا' دوا نہ چھوڑی' ہر جتن کرنے کے بعد بھی اس کا مرض بڑھا ہے' گھٹا نہیں' بخشل بتا رہا تھا کہ اس نے تمہارے ساتھ بھی کوئی اچھا سلوک نہیں کیا۔"

وہ لاپروائی سے کہتے حد نگاہ تک پھیلے گندم کے سنہرے کھیتوں کو دیکھنے لگا۔

"وہ ذہنی مریضہ ہے۔" چند لمحے کی خاموشی بعد وہ بولا۔ "آپ کو اس کے علاج معالجے پر توجہ دینی چاہیے۔"

"اگر وہ علاج سے ٹھیک ہو سکتی ہے تو تم علاج کروالو اس کا' میری طرف سے اجازت ہے۔ مجھے دیکھ کر تو وہ مرنے مارنے پر تل جاتی ہے۔ اسی لیے میں نے گھر جانا ہی چھوڑ دیا۔"

"بھائی! وہ آپ کی ذمہ داری ہے۔ علاج سے ٹھیک ہو جائے گی۔"

"دیکھو حسین رضا! میرے اوپر اور بھی ذمے داریاں ہیں۔ زمینوں کے حساب کتاب' مزارعوں کے مسائل' آس پاس کے زمین داروں سے چھوٹی چھوٹی چپقلشیں' کس کس بات کو دیکھوں' تم میرے بھائی ہو' کچھ تو میری ذمے داریاں بانٹو۔"

"ٹھیک ہے' میں اسے ساتھ لے جانے کی کوشش کرتا ہوں' ہو سکتا ہے۔ وہ علاج سے ٹھیک ہو جائے۔ آپ ماسی حمیدہ کو ساتھ بھیج دیں۔"

وہ واپسی کے لیے پلٹا۔ بھائی کے ساتھ اس کی یہ تیسری ملاقات تھی جو حمیرا کے بارے میں فیصلہ کن ثابت ہوئی۔

✡ ✡ ✡

اس نے گھنٹہ گھر چوک پر سواری اتاری۔ اسی وقت ایک تنومند شخص رکشے میں آکر بیٹھا۔ تیل سے چپکے بال' بڑی بڑی مونچھیں' دھوتی باندھے اس شخص

کو دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا کہ پہلوان ہے۔ اس نے مسکرا کر سواری کو دیکھا۔

"کتھے جانا اے باجی؟"

"جھنگ روڈ تے کچھ اگے۔"

"اہیہ تے دور اے۔ جی کرایہ زیادہ ہوگا۔"

"آہو جی! اسیں اپنا کرایہ دیواں گے کہ جی خوش ہو جائے گا۔"

اس کا رکشا جھنگ روڈ کی طرف رواں دواں تھا اور رکشہ چلانے والا پنجابی دھرتی پر بسنے والے صوفیا کے کلام میں تسکین قلب کا متلاشی' اپنی تنہائی اور دنیا کی بے ثباتی کا نوحہ کرتا' بابا فرید گنج شکر کے دوہے گنگناتا تھا۔

روڈ پر گاڑیوں کا شور تھا' مگر اندرونی فضا میں اس کی آواز کا سحر پہلوان جی کو آئینہ دکھا رہا تھا' وہ پریشان ہو اٹھا اس حقیقت سے۔

"او باجی تسیں اوتھے رہندے ہی؟"

اس نے گنج شکر کے دوہوں کی فضا سے نکل کر اسے بغور آئینے میں دیکھا۔

"بس جی! سفر تے پنجابیاں دے پیراں نال جڑ گیا اے" مسافرت ادا من پسند مشغلہ اے۔"

"میں بھی پہلے لاہور میں رہتا تھا' پھر بد قسمتی سے حالات خراب ہوگئے' دھکے کھاتے کھاتے گوجرانوالہ' پھر سیالکوٹ' اب کافی عرصے سے فیصل آباد میں رہتے ہیں' آگے دیکھتے ہیں یہ سفر کراچی پر ختم ہوگا یا ابھی اور آگے جانا ہے۔ ہو سکتا ہے ادھر ہی ختم ہو جائے۔" وہ پنجابی میں بول رہا تھا۔

"بس بھاجی ادھر ہی روک دو۔ ہمارا سفر ختم ہوگیا۔"

اس نے رکشا روک کر کرایہ لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ مسافر نے اسے ہاتھ سے کھینچ کر پاس تیزی سے رکنے والی ویگن میں اٹھا کر ڈال دیا۔ یہ اتنا آنا"فانا" ہوا کہ اسے سوچنے سمجھنے کی مہلت بھی نہ مل سکی۔

☆ ☆ ☆

ملن کا ہے جب رت وصال میں مستقل مکین ہونے لگے تو محبت کرنے والے اپنی خوش نصیبی پر نازاں و فرحاں ہوتے ان سموں کو اپنے خوابوں کی تعبیر سمجھ کر آنکھوں سے چنتے ہوئے دل میں محفوظ رکھتے ہیں۔

ان کے بیچ دائمی ملن کا موسم آیا تھا اور اس موسم کی نوید دینے ان کے دوست و احباب برقی قمقموں سے سجے ہال میں آموجود ہوئے۔ وہ محبت کی روشنیوں سے جگمگاتے چہرے کے ساتھ دلہن کے روپ میں منتظر حسنین کے دل میں اتر گئی۔

"اپنی قسمت پر یقین نہیں آتا۔" وہ اس کا ہاتھ تھامے وفور مسرت سے بولا۔ وہ مسکرائی۔

"میرے غم دوراں کے دکھ' اپنوں کی کمی کا غم اور کرب تمہاری یہی مسکراہٹ مٹا دے گی۔"

اس کی آنکھوں میں نمی تیر گئی' اپنے ہاتھ کو تھامے منتظر حسنین کے ہاتھ پر اس نے گرم جوشی سے دباؤ ڈالا۔

"میری ساری خوشیاں تمہاری اور تمہارے سارے غم میرے۔"

شب وصل وہ جو بیٹھے میرے پہلو میں
مسکرانے لگی شب مہتاب

دولہا نے کان کے قریب سرگوشی کی۔ وہ مسکرا کر محجوب ہوئی۔

ہاں اثر یہ ہوا محبت کا
ہم سے آنے لگا ہے ان کو حجاب

محبت سے چور آواز نے اس کو خوشیوں کے سنگیت کی نوید دے دیں۔

☆ ☆ ☆

"تم نے ایسا کیوں کیا حمیرا؟" لاہور پہنچنے پر اس کا بدلا روپ دیکھ کر حیران ہوا۔

جب تک وہ کھانا اور کچن کی ضروری چیزیں لے آیا' تب تک ماسی حمیدہ نے چھوٹے سے فلیٹ کی صفائی کردی۔ وہ بھی نہا کر صاف ستھرے لباس میں اجلی

اجلی سی اس کے سامنے آبیٹھی۔

ماسی حمیدہ تھکی ہوئی تھی۔ کھانا کھا کر سو گئی تھی۔ ویسے بھی اسے ایم کھانے کی عادت تھی۔ گھوڑے بیچ کر سوتی تھی۔

"یہی سوال میں تم سے بھی کر سکتی ہوں حسین رضا! تم نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟" وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے بولی۔

"مجھے تو پتا ہی نہیں چلا' اماں نے بھائی کے لیے تمہارا رشتہ ڈال دیا' پتا چلا تو میرے ہاتھ کٹ چکے تھے۔ میں کیا کرتا۔ مگر تم نے جو خود ساختہ پاگل پن خود پر طاری کر رکھا' کیوں خود پر ایسا عذاب مسلط کیا۔"

"محبت سے بڑی سزا اور ہجر سے بڑا کوئی عذاب ہوگا۔" وہ غائب دماغی سے بولی۔

"پھر بھی تم نے اچھا نہیں کیا۔" وہ گہری سانس بھر کر نفی میں سرہلاتے بولا۔

"تم نے اچھا کیا۔ کبھی پلٹ کر خبر ہی نہ لی' میں کن حالوں میں ہوں۔"

"میں تمہاری ازدواجی زندگی میں خلل نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ یہ نہیں تھا کہ میں تمہیں بھول بیٹھا تھا' صرف یہ خیال تھا' اب تم اپنے شوہر کے ساتھ خوش رہو۔"

وہ اس سے نظریں چراتے بولا۔

"میری خوشیاں تو تم سے وابستہ تھیں' تمہاری دید سے منسلک۔ تم نے تو دیدار کے لیے ہی ترسا دیا۔ مجھے غصہ آتا جب تمہاری کوئی خیر خبر نہ ملتی' تب مجھے حسین رضا سے اور نفرت ہو جاتی' وہی تو جدائی کا سبب تھا۔" وہ یک ٹک اسے دیکھتے کرب سے گویا ہوئی۔

"تمہیں کبھی بھائی پر رحم نہیں آیا؟"

"مجھے تو خود پر رحم نہیں آیا۔ حسین رضا! تو وہ جو ہماری جدائی کا محرک بنا اس پر کیسے آتا۔ مجھے تو تمہارے وچھوڑے نے واقعی پاگل کر دیا۔ میں تو تمہاری تھی' پھر اس کی کیسے ہوتی۔ اسی لیے میں اس کی کبھی بن ہی نہ سکی' مرد تھا وہ' بالآخر مجھ پر مسلط ہو جاتا' اس کے تسلط سے آزادی کا اک یہی ذریعہ تھا' پاگل پن۔"

وہ وحشت سے بولتی رہی اور حسین رضا ہمدردی سے اسے دیکھتا رہا' وہ اس کی نہیں ہو کر بھی اسی کی رہی۔ اس کے دل میں اس کی قدر کچھ اور بڑھ گئی کہ وہ آج تک اس کے نام پر بیٹھی تھی۔ پہلے کی طرح' پہلے جیسی۔

☆ ☆ ☆

"تم واقعی اتنی خوب صورت ہو یا مجھے لگ رہی ہو؟" شب عروس میں حیا حسین کے دونوں ہاتھوں کو پکڑے منتظر حسنین حیرانی سے کہہ رہا تھا۔

"کیا اس کی وجہ بہترین ڈریس' جیولری یا میک اپ ہے۔ ہرگز نہیں مجھے تو ان کپڑوں میک اپ کا کوئی ذوق ہی نہیں' صرف یہ کہ تم میرے دل کی ملکہ ہو۔"

حیا حسین کی آنکھیں وفور مسرت سے نم ہوگئیں۔

"حیا! تم میری زندگی کا واحد رشتہ ہو۔ میری زندگی تم سے شروع ہو کر تم ہی پر ختم ہوتی ہے۔ تمہیں پا کے مجھے لگ رہا ہے کہ میں مکمل ہو گیا ہوں' مجھے پوری کائنات مل گئی ہے۔"

خوشی اس کے انگ انگ سے پھوٹتی تھی۔

"کائنات تو میری مٹھی میں ہے۔" وہ شرما کے مسکرائی۔

منتظر حسنین نے اس کے ہاتھ میں اپنے ہاتھ کو دیکھا اور ہنس دیا۔

"میں نے محبت کی کائنات کو پا لیا ہے' چپ چاپ تمہیں دل میں بسایا اور قدرت نے مہرباں ہو کر تمہیں مجھے سونپ دیا۔" وہ جذب سے گویا ہوئی۔

"میری پوری کوشش ہوگی کہ زندگی میں تمہیں مجھ سے کبھی کوئی شکایت نہ ہو۔ محبت کی کمی کا کوئی شکوہ نہ ہو۔ لوگ رشک کریں ہم پر' ہماری محبت پر' ہماری ہم سفری پر' بولو' وعدہ کرو' ہمیشہ میرا ساتھ دو گی؟" اس نے اس کے دونوں ہاتھ دبا کر وعدہ لیا۔

"میں تو سراپا تمہاری چاہت ہوں۔ حیا حسین اب حیا حسین نہیں رہی۔ حیا منتظر حسین بن گئی ہے۔ میں

www.paksociety.com

تو کب کی ختم ہو گئی۔ تمہاری ذات میں ڈھل گئی۔ محبت نے مجھے موم کی طرح پگھلا دیا ہے' جس سانچے میں ڈھالو گے' ڈھل جاؤں گی۔"

"میں تمہیں اپنے دل کے سانچے میں ڈھالوں گا' تب تم میرا دل بن جاؤ گی' میں تمہیں اپنی آنکھ کے سانچے میں ڈھالوں گا تو میری نظر بن جاؤ گی۔" وہ کہنی کے بل نیم دراز ہو گیا۔

"میں تمہاری روح کے سانچے میں ڈھل جاؤں گی تو تم [illegible] وجود تمہاری ذات میں گم کر بیٹھوں گی [illegible] اس کے سامنے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"تو پھر آؤ۔ میں تمہیں اپنی روح کے سانچے میں ڈھال کر اپنا بنا لوں۔"

وہ اس کی شرارتی نظروں سے شرما گئی۔

زندگی اپنی ساری خوب صورتی' حسن' محبت کے ساتھ اس کے پہلو میں پڑی تھی اور سہاگ رات کی خوشبو اپنے مدھم سروں کی تان اس کے اردگرد بکھیرتی جاتی تھی۔

☼ ☼ ☼

"کیا تم مجھ سے شادی کر سکتے ہو؟" اخبار پڑھتے حسین رضا نے چونک کر حیرانی سے اسے دیکھا۔

"حمیرا... اپنی بات کا مطلب سمجھتی ہو؟"

"ہاں... سمجھتی ہوں۔" وہ تن کر اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

"پاگل ہو تم..." وہ اخبار ٹیبل پر پٹخ کر اٹھا۔

"اس لیے نا کہ میں تمہارے بھائی کی بیوی ہوں۔ مگر میں نے کبھی اس نام و نہاد شادی کو تسلیم نہیں کیا۔ بندھن دل کا' دماغ کا' روح کا نہ ہو تو دنیا کا ہر قاعدہ قانون اس کو رد کرتا ہے۔"

وہ نظریں جھکا کر آہستگی سے گویا ہوئی۔

"تم میرے بھائی کی منکوحہ بیوی ہو' تم نے سینکڑوں افراد کے سامنے اس بندھن کا اقرار کیا ہے۔ اس کی زر خرید لونڈی نہیں ہو۔" وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مضبوط لہجے میں بولا۔

"میں نے اس نکاح کو کبھی بھی دل سے تسلیم نہیں کیا۔ نہیں مانتی معاشرے کے ان رسم و رواج کو جو ہندو معاشرے سے آئے ہیں اور جو عورت کو مورتی سمجھ کر کسی بھی کھونٹے سے باندھ دیتے ہیں۔ اسلام دلی رضامندی کو اہمیت دیتا ہے' جور و جبر کے جسمانی نکاح کو نہیں۔"

وہ ہذیانی انداز میں چیخ کر بولی پھر روتے ہوئے لجاجت سے کہنے لگی۔

"میں طلاق لے لوں گی' پھر تو راضی ہو جاؤ گے نا؟"

اس کی آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں نے اس کے دل کو نرم کیا۔ وہ دھیمے لہجے میں بولا۔

"دیکھو حمیرا! مجھے تم سے ہمدردی بھی ہے اور محبت بھی۔ مگر تم سے شادی نہیں کر سکتا۔ میں کس منہ سے بھائی کا سامنا کروں گا۔ دنیا کیا کہے گی' میں محبت پر عزت کو قربان نہیں کر سکتا۔"

"ہم گاؤں جائیں گے ہی نہیں' وہاں اپنے حصے کی زمین بیچ دینا تم۔ ہم اپنی دنیا الگ بسائیں گے۔"

وہ اپنی محبت کے ہاتھوں بے بس سا اسے دیکھ رہا تھا۔

"ہم اس طرح کب تک رہیں گے۔ میں تمہارے بغیر مر جاؤں گی حسین رضا! مر جاؤں گی' یا اب خود کو مار لوں گی۔ ختم کر دوں گی۔" وہ روتے روتے پھر ہذیانی ہوئی۔

"خدا کے لیے حمیرا! ایسی حرکت بھول کر بھی نہ کرنا۔ ورنہ میں خود کو کبھی معاف نہیں کر سکوں گا۔" وہ اس کی جنونی طبیعت سے واقف تھا' پریشان ہو کر بولا۔

☼ ☼ ☼

"آپا! کیا کروں۔ یہ لڑکی تو کسی بھی رشتے کے لیے مانتی ہی نہیں' چودہ جماعتیں پاس کر لی ہیں' پھر بھی کہتی ہے۔ ابھی اور پڑھنا ہے' میں اکیلی جان کب تک اس کا بوجھ ڈھوتی رہوں۔"

وہ سر پر پٹی باندھے اپنی ہمراز و ہمدرد بہن کے آگے

دکھڑا رونے بیٹھ گئی۔

"بات تو تمہاری بھی ٹھیک ہے خورشید! مگر غلط تیری بٹی بھی نہیں۔" صالحہ خاتون نے ناک کی پھننگ پر کھڑی عینک کو درست کرتے کہا۔

"آپا! بہت اونچا اڑنے کے خواب دیکھتی ہے۔ ڈرتی ہوں کہیں گر نہ جائے۔"

"اللہ نہ کرے خورشید! کیسی بدشگونی کی باتیں منہ سے نکالتی ہو اچھا ایسا کیوں نہ کریں اک چکر گاؤں کا لگا لیں ہو سکتا ہے' وہاں کوئی اچھا رشتہ مل جائے۔"

"آپا! اسے شہر کے لڑکے پسند نہیں آتے دیہاتیوں پر تو خاک بھی نہیں ڈالے گی۔" خورشید بد دل ہو کر بولی۔

"ارے بس بھی کر خورشید! دنیا بہت بدل گئی ہے۔ کیا شہر' کیا گاؤں' سب آگے بڑھنے کی جستجو میں مگن ہیں' چل رشتہ نہ سہی' رشتے داروں سے ہی مل لیں گے کتنے سال ہو گئے گاؤں کا چکر نہیں لگایا۔"

"ہاں آپا! جب سے ماہم کے ابا گم ہوئے۔ دوبارہ ہی گاؤں جانا ہوا' اب گاؤں میں بھی تو مزا نہیں رہا۔ ملکوں کا تو خاندان ہی تباہ ہو گیا۔ چھوٹے —— چودھریوں نے تو دنگا فساد برپا کر رکھا ہے' دل ہی نہیں کرتا جانے کو۔"

وہ ٹھنڈی سانس بھر کر ماضی کی راکھ کریدنے لگی۔

"ہم کون سا ملکوں کی حویلی جائیں گے۔ وہ تو بڑی ملکانی کی موت کے بعد ہی ویران ہو گئی تھی۔ اب تو ہم بھی ان کے کمی نہیں رہے۔ اپنی مزدوری کرتے ہیں کماتے ہیں' پردیس تو پردیس ہے' دل کھینچتا ہے' ان کھیتوں' پرانے گھروں کی جانب' جو اب کھنڈر بن چکے ہوں گے۔" صالحہ خاتون کا دل کر رہا تھا' پر لگ جائیں تو اڑ کر پہنچ جائیں۔

"اچھا ہے آپا!" ماہم بھی دیکھ لے گی کہ اس کا خاندان کوئی اونچے شملے والا نہیں' ملکوں کے کمی تھے کچے کوٹھوں میں بسنے والے' ہو سکتا ہے یہ دیکھ کر اونچے خواب آنکھوں میں بسانا چھوڑ دے۔" وہ دور کی کوڑی لائیں۔

"ارے چھوڑ خورشید! تیری بٹی یہ باتیں نہیں سمجھے گی۔" وہ منہ پر دوپٹے کا پلو رکھتے ہنسنے لگیں۔

☼ ☼ ☼

"کبھی کبھار مجھے لگتا ہے' میں کسی یوٹوپیا میں آگیا ہوں' جہاں سکھ ہی سکھ ہیں' محبت ہی محبت۔"

وہ مری میں بنے اپنے ذاتی ہٹ کی بالکونی میں کھڑے برف باری سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

"محبت تمہاری رفاقت ہے' محبت تمہارا وجود ہے منتظر! ایسا لگتا ہے جیسے میں تو تھی ہی تمہاری منتظر!"

وہ اس کے اوور کوٹ کے کالر پر گرتی برف ہٹاتے بولی۔ اس نے اپنے بائیں کندھے سے برف ہٹاتے اس کے دائیں ہاتھ پر اپنا دایاں ہاتھ رکھ دیا۔

"مجھے زندگی سے بہت شکایات تھیں۔ مجھے لگتا تھا میری ذہانت کو غربت کھا جائے گی' مگر زندگی نے مجھے اتنا کچھ دیا کہ کبھی کبھی تو لگتا ہے۔ جیسے خوبصورت خواب دیکھ رہا ہوں۔ آنکھ کھلے گی تو یہ خواب ٹوٹ جائے گا۔ کہیں یہ سب چھن نہ جائے۔"

"یہ خواب نہیں ہے منتظر! تمہیں دیکھ کے تو مجھے محبت کا مفہوم سمجھ میں آیا ہے۔ میں تمہیں کبھی نہیں چھوڑ سکتی۔"

اس کے مدھم لہجے میں محبت کی تپش تھی۔

"تمہاری محبت میری زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ میں تمہارا شریک زندگی ہی نہیں شریک محبت بھی ہوں حیا منتظر!" اس کے منہ سے سردی کی وجہ سے نکلنے والی بھاپ نے حیا کے بالوں کو چھوا' وہ کھلکھلا کر ہنسی۔

"اندر چلو یہاں بہت سردی ہے۔"

☼ ☼ ☼

"اندر کافی تپش ہے۔ سردی کا احساس کم ہو رہا ہے۔" وہ آتش دان کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔

وہ کافی بنا کر مڑی۔ اس کے چہرے پر سکون اور مسکراہٹ دیکھ کر اندر ہی اندر اسے گہری طمانیت محسوس ہوئی۔

"تمہیں اندازہ نہیں حیا! تمہارا اطمینان اور محبت مجھے کتنی خوشی دیتا ہے۔" کافی کے مگ کے ساتھ اس کا ہاتھ بھی پکڑ لیا۔

"زندگی کتنی خوبصورت ہوگئی ہے۔" خوشی سے حیا کی آنکھوں میں نمی آگئی۔

"بالکل تمہارے وجود کی طرح۔" اس کے شانے پر اپنا بازو حمائل کرکے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ محبت کی تپش' آگ کی تپش' وجود کی تپش آپس میں گھل مل گئی۔ خوشبو نے ان کے گرد گھیرا تنگ کردیا۔

☼ ☼ ☼

حسنین رضا کسی کام سے شہر آیا تھا۔ وہاں حمیرا کو بہتر حالت میں دیکھ کر اسے بے حد خوشی ہوئی۔

حسنین رضا بھائی کو یوں اچانک دیکھ کر بوکھلا گیا۔ ماسی حمیدہ تو اپنی ماں کی بیماری کا سن کر ایک ہفتے بعد ہی چلی گئی تھی۔ اس کی ماں دوسرے گاؤں میں رہتی تھی۔ اس نے یہ بات حسنین رضا کو نہیں بتائی تھی۔ حمیرا اسے دیکھ کر فوراً" باورچی خانے میں چلی گئی تھی۔

"مجھے یقین نہیں آرہا' یہ وہی حمیرا ہے۔" وہ حسنین رضا کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"بھائی! علاج سے کافی فائدہ ہوا ہے' ڈاکٹرز کافی پر امید ہیں۔" اس نے جھوٹ بولا۔ حالانکہ وہ ایک بار بھی ڈاکٹر کے پاس نہیں لے کر گیا تھا۔

"بہت اچھا بھئی بہت اچھا۔" وہ خوشی سے بولا۔ "اب تو میری حویلی آباد ہوجائے گی۔ زبیدہ کو میں نے ابھی تک ڈیرے پر ہی رکھا ہوا ہے کیونکہ حویلی مجھے آسیب زدہ لگتی ہے۔"

وہ سگریٹ کا کش لگاتے بولا۔

باورچی خانے میں پیچ و تاب کھاتی حمیرا مجبوراً" چائے بنانے لگی۔

"دل کررہا ہے زہر ہو تو ڈال دوں حسنین رضا!" وہ دانت پیس کر بڑبڑائی۔

"بخشل کو چھوڑ کر جارہا ہوں۔ کچھ چیزیں لے کر ایک ہفتہ بعد آئے گا۔ ابھی ملی نہیں۔"

"جی بہتر بھائی!" وہ سعادت مندی سے بولا۔ "فصلوں کی کٹائی شروع ہوچکی ہے۔ واپس جانا ضروری ہے' کوشش کروں گا کہ اک ماہ تک آجاؤں۔"

"جی بھائی! میں خود آپ کے پاس آنے والا تھا۔"

"اچھا! کس سلسلے میں؟" وہ صوفے پر بیٹھا ٹانگ پر ٹانگ رکھتے بولا۔

"میں اب جاب نہیں کرسکتا۔ آپ زمین میں سے میرا حصہ دے دیں' تاکہ بیچ کر کوئی کاروبار شروع کرسکوں۔"

"کیا؟" وہ سیدھا ہوگیا۔ "تم آبائی زمین بیچ دو گے؟" اس نے حیرت و استعجاب سے استفسار کیا۔

"جی بھائی! نہ میں گاؤں میں رہ سکتا ہوں' نہ ہی زمین پر کام کرسکتا ہوں۔"

"حسنین رضا! میں تمہیں ملکوں کی سات پشتوں پر داغ لگانے کی اجازت کبھی نہیں دوں گا۔ اگر بیچو گے تو وہ بھی میں خریدوں گا۔" حتمی فیصلہ کرکے بولا۔

"ٹھیک ہے بھائی!" مجھے تو اپنے حصے کی رقم ہی چاہیے' آپ لے لیں تو زیادہ بہتر ہے۔" وہ کہہ کر مسکرایا۔ "اچھا ہے' اپنی زمین اپنے گھر ہی رہے گی۔ ارے بھئی یہ چائے کہاں رہ گئی۔" پھر اس نے فوراً" لہجے کو سنبھالا۔ "حمیرا بھابھی! چائے لے آئیں تاکہ بھائی کو یقین آجائے کہ ان کی بیوی ٹھیک ہورہی ہے۔"

اس نے ہنس کر باورچی کی طرف دیکھا۔ وہاں سے چائے کی ٹرے اٹھائے' حمیرا کی لال بھبھوکا آنکھیں دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔ اس کی حالت دیکھ کر حسنین رضا نے ناامیدی سے سر کو نفی میں جنبش دی۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ ابھی تک مکمل ٹھیک نہیں ہے۔

☼ ☼ ☼

سیالکوٹ سے بس میں بیٹھ کر راجن پور کے سارے راستے وہ بور ہوتی رہی۔ رہ رہ کر خالہ اور اماں پر

غصہ آرہا تھا' جن کو سالوں بعد اپنا گاؤں یاد آیا اور اسے زبردستی لے کر آئی تھیں' یہ بہانہ بنا کر کہ جوان جہان لڑکی کو پیچھے گھر میں اکیلا کیسے چھوڑ جائیں۔

تھکن سے چور وہ راجن پور کے بس اسٹاپ پر گاؤں جانے والے کسی رکشے کی متلاشی تھیں۔

"ابھی اور سفر کرنا ہے؟" وہ غصے سے بڑبڑائی۔

"اے بیٹا! اب بس بھی کر' سارا راستہ منہ پھلائے بیٹھی رہی۔ اب تو صرف آدھے گھنٹے کا راستہ رہ گیا ہے۔ وہ بھی دن تھے' جب ہم یہ راستہ پیدل طے کرکے اس روڈ پر آتے تھے' پھر کہیں جانے کو بس ملتی تھی۔" صالحہ خاتون اسے نصیحت کرتے پرانے دور کی یاد کو تازہ کرنے لگیں۔

"لو مل گیا رکشا۔" خالو ابا کو رکشے میں آگے بیٹھے دیکھ کر اس نے سکون کی سانس لی۔

ریت کے چھوٹے چھوٹے ٹیلوں بعد سبز چھوٹے چھوٹے کھیت دیکھ کر اسے یکدم خوشی کا احساس ہوا۔ شہر کی آلودگی سے پہلی بار نکل کر وہ گاؤں کو دیکھ رہی تھی۔ انہیں دیکھ کچے کوٹھوں سے نکلنے والی عورتوں کا اک غول ان کے گرد جمع ہوگیا۔

اس کی ماں اور خالہ ہنس ہنس کر ان سے گلے مل رہی تھیں' جبکہ وہ تھوڑی دلچسپی سے حیران ہوکر ان ملنے والیوں کو دیکھ رہی تھی۔ جو گلے ملتے ہی میل ملاپ نہ رکھنے کے کئی شکوے لے بیٹھی تھیں۔

"ارے خالہ خورشید! یہ تیری بیٹی ہے کیا؟" اک صحت مند لڑکی پراندہ جھلاتے ہوئے بولی۔

"ہاں یہ میری بیٹی ہے۔ پوری سولہ جماعتیں پاس کی ہیں۔" وہ فخر سے بتانے لگی۔

"اچھا تو نوکری نہیں کرتی؟" استفسار ہوا۔

"ارے نوکریاں کہاں ملتی ہیں۔ آج کل اتنی آسانی سے۔" مایوسی اس کے لہجے سے ظاہر تھی۔

"ماسی! تو دل چھوٹا نہ کر' میری مالکن آج کل گاؤں آئی ہوئی ہے' میں اس سے تیری بیٹی کی نوکری کی بات کروں گی۔" بڑے پن سے دلاسا دیا۔ ماہم کی توجہ فوری طور پر اس پر گئی۔

"میرا نام زلیخا ہے۔" وہ خود ہی اپنا تعارف کرانے لگی۔

☼ ☼ ☼

"کبھی کبھی میں سوچتی ہوں' محبت آخر ہے کیا چیز۔ دو اجنبی انسانوں کے بیچ اگر قیام کرلے تو ساری دوری پاٹ دے۔ ساری اجنبیت کو ختم کردے' نیست و نابود کردے اور دو انسانوں کو یوں یکجا کرے کہ دوئی کی ساری حدیں ہی ختم ہوجائیں۔"

وہ استعجاب سے بولتی رہی۔ وہ محبت سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ اتنے قریب بیٹھے تھے' جیسے ہاتھ کی دو انگلیاں۔ بھوربن ہوٹل کے اک خوبصورت کمرے میں وہ اپنی بیوی کو معصومیت سے بولتے دیکھ کر خوش ہورہا تھا۔ اک عجیب سرشاری و محبت تھی' جو وجود سے لپٹ کر ہنی مون کو حسین سے حسین تر بنا رہی تھی۔ ایک طرف جلتے ہیٹر کی گرمی کو ان کے تنفس کی گرمی مات دے رہی تھی۔

"تیرا محبت میں بھیگتا وجود محبت ہے۔
تیرے نازک سراپے کی اٹھان محبت ہے۔
تیرے بالوں کی درازی محبت ہے۔
تیری آنکھوں کا خمار محبت ہے۔
تیرے ہونٹوں کی لالی محبت ہے۔"

وہ کھلکھلا کر ہنسی۔

"تیری یہ خوبصورت ہنسی' جو راہ چلتوں کو بھی دم سادھ کر رکھنے پر مجبور کردے' یہ ہنسی محبت ہے۔"

"اچھا بس بس!" وہ ہنستے ہنستے دوہری ہوگئی۔

"اب پتا چلا محبت کیا ہے؟" وہ اس کی آنکھوں میں اپنا عکس دیکھتے بولا۔

"ہاں۔ میری آنکھوں میں بیٹھا منتظر حسنین محبت ہے۔"

"اور میری آنکھوں میں بیٹھی حیا حسین محبت ہے۔"

☼ ☼ ☼

احتیاط کرتے کرتے وہ دونوں تنگ آچکے تھے۔ وہ پہلے والی بے باکی نہیں دکھا سکتی تھی۔ اور وہ پہلے والی بے تکلفی سے پکارتے پکارتے رک جاتا۔ اک تو بخشل، دوسری حمیدہ جو چند دن پہلے آگئی تھی۔

حمیدہ کو چھوٹا فلیٹ کھانے کو دوڑتا۔ بخشل کو شہر کا دھواں نہ بھاتا۔

"چھوٹے ملک جی! نہ باہر سکون ملتا ہے، نہ ہی گھر میں، باہر شور دھواں اندر دم گھٹنے لگتا ہے۔"

وہ دوپہر کو آکر ان کی ایسی ہی باتیں سننے پر مجبور تھا۔

گھر کے کاموں سے حمیرا نے دانستہ ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ بخشل سارے کام کرتا اور دوپہر کا کھانا وہ لے آتا، رات کا بخشل اور حمیدہ مل کر بناتے۔

"چھوٹے ملک جی! آپ روزانہ باہر کا کھانا لے آتے ہیں۔"

"کیا کروں بخشل مجبوری ہے۔" وہ معنی خیزی سے حمیرا کو دیکھتے بولا، جو پرانے حلیے میں آگئی تھی نہ بالوں میں کنگھا کرتی، نہ کپڑے بدلتی۔

"میری بات مانیں تو اب شادی کرلیں۔ کب تک یہ بازاری کھانا کھاتے رہیں گے۔"

"بس کیا کروں۔ کوئی لڑکی ہی پسند نہیں آتی جس سے شادی کروں۔" اس نے ہنس کر حمیرا کو دیکھا۔

جس نے اسے نظر بچا کر آنکھیں دکھائی تھیں۔

حمیرا سخت چڑی ہوئی تھی کہ بخشل کیوں یہاں رہ رہا تھا۔ کھل کر بات کرنے کا موقع بھی نہ ملتا۔ مجبوراً وہ بھی رات کے پچھلے پہر جاکر حسین رضا کا پاؤں ہلا کر اسے جگاتی، پھر اپنے غصے کا اظہار کرتی کہ ان دونوں کو فوراً" روانہ کردو گاؤں۔

وہ ڈر کر اسے آہستہ بولنے کو کہتا۔

وہ اور بگڑتی۔

"تھوڑا صبر کرلو۔ زمین کا حساب کتاب لے لوں تو جان چھڑاؤں گا سب سے۔ اپنی بھی اور تمہاری بھی۔" وہ اسے دلاسا دیتا۔

ایسی ہی اک رات بخشل نے ان کو کھسر پسر کرتے دیکھ لیا۔

یہ تو پاگل حمیرا بالکل ہی نہیں لگ رہی تھی۔ سلیقے سے تیار بال بنائے، نرمی سے بات کرتی حسین رضا کو محبت سے تکتی۔

بخشل کی تو آنکھیں ابلنے کو تھیں۔ تو یہ قصہ ہے، صبح سارے منہ پر پاؤڈر سرخی مل کر پاگل پن کے دورے کا صرف ڈراما ہے۔ کھڑکی کے سرکتے پردے کو دیکھ کر وہ سرعت سے اٹھا۔ ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے بخشل کی پیٹھ کو دیکھ کر وہ ڈر گیا۔

"آج ہم پکڑے گئے۔" اس نے حمیرا کو خوف زدہ لہجے میں بتایا۔

☼ ☼ ☼

وہ کافی سالوں بعد اپنے آبائی گاؤں گھومنے آئی تھی پوری فیملی سمیت۔ وہیں زلیخا سے اس کی دوستی ہوگئی۔ زلیخا ان کے پرانے نوکر کی بیٹی تھی۔ زلیخا کی دلچسپ باتیں ان کو جی بھر ہنساتی تھیں۔

وہی زلیخا اک صبح آئی تو اپنے ساتھ اک نازک و خوبصورت سی لڑکی کو لے آئی۔

"مہرین بی بی! یہ ہماری خورشید خالہ کی بیٹی ہے۔ بہت پڑھی لکھی ہے اس کو تاں کہیں نوکری دلادیں۔" اس کے منت بھرے لہجے پر وہ مسکرائے بنا نہ رہ سکی۔

"اچھا کتنا پڑھا ہے۔"

"جی ایم اے فائنل کی تیاری ہے۔" وہ اعتماد سے بولی۔

"بیٹھو، کھڑی کیوں ہو؟"

وہ اس کے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"اوہو!" زمین پر بیٹھی زلیخا نے اس کی اس حرکت پر دوپٹا منہ پر رکھا۔

مہرین نے کافی دلچسپی سے ان دونوں کو دیکھا، علم و شعور نے اسے ان کے برابر کردیا جو کمی کمین کہلاتے۔ اس کی تربیت کراچی کے ماحول میں ہوئی تھی، اسے یہ بات بری نہ لگی۔

شام تک ان کے بیچ بے تکلفی بڑھ کر دوستی کی نہج پر پہنچ چکی تھی۔

مہرین نے موبائل نمبرز کا تبادلہ کرتے اسے یقین دلایا کہ وہ اپنی کزن حیا کی گارمنٹ فیکٹری میں اس کے لیے جاب کی کوشش کرے گی۔

☼ ☼ ☼

اس کی آنکھوں پہ بندھی پٹی نے موت کے خوف کو اور بڑھا دیا تھا، وہ ایسا قیدی تھا جو پھانسی گھاٹ جارہا تھا، جس کا جرم صرف اک بے یارو مددگار بھانجے کو پال پوس کر جوان کرنا تھا۔

پھر بھی اسے یہ رنج کھائے جارہا تھا کہ منتظر کو اس نے آخری بار نہیں دیکھا۔

"کاش!" وہ بڑبڑایا۔ "میرے جنازے کو منتظر کا کاندھا نصیب ہوتا۔"

"فکر نہ کر حمید! تو عمر قید تو ضرور کاٹے گا، پر موت کا مزا اودھر ہرگز نہیں۔" پہلوان ہنسا۔

"تیرے بڑے صاحب کا کیا بھروسا پہلوان جی! وہ تو سانپ ہے، سگے رشتوں کو ڈس جانے والا، میں تو اک غریب مسکین آدمی ہوں۔"

"ہاں بھئی ٹھیک کہتے ہو۔ غریبی اور مسکینی سے بڑی بدنصیبی آج کل کوئی نہیں، ورنہ میں بھی تمہیں یہاں نہ ملتا۔" پہلوان نے ہاں میں ہاں ملائی۔

"لگتا ہے، رات آدھی سے زیادہ گزر چکی ہے۔" گاڑی کے اندر بڑھتی سردی کو محسوس کرتے گویا ہوا۔

"ہاں بھئی حمید! صبح کے لگ بھگ ہم بھی اپنی منزل پر پہنچ ہی جائیں گے۔"

باقی رات وہ گاڑی میں پہلوان کے خراٹوں کی آواز سنتا رہا، اس کے ہاتھ پیچھے کی طرف بندھے ہوئے تھے، ملنے جلنے کی مجال نہ تھی، ورنہ ایسا پہلوان جو نیند کا رسیا ہو، کے قبضے سے جان چھڑا کر چلتی گاڑی سے چھلانگ لگانا کون سا مشکل کام تھا۔

رہ رہ کر کے ڈرائیور کی کھانسی یا سگریٹ کا دھواں اسے کسی تیسرے فرد کی موجودگی کا پتا دیتا تھا۔

کہتے ہیں نیند کانٹوں پر بھی آجاتی ہے مگر اس رات وہ چاہنے کے باوجود سو نہیں پایا کہ موت کا خوف سر پر سوار تھا۔

وہ گاڑی سے اترا، کچی زمین پر پاؤں پڑے گاڑی کے جانے کی آواز دور ہوئی۔

اس نے آنکھیں کھولیں تو صبح کی پھیلتی روشنی میں آنکھیں چندھیا گئیں، جب کچھ دیکھنے کے قابل ہوئیں تو سامنے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"بخشل... تو... یہاں..."

☼ ☼ ☼

"پتا ہے میری مرحومہ ماں مہینے میں دوبار میرے لیے شامی کباب بناتی تھی۔" وہ جذب سے اس کا ہاتھ پکڑتے بولا۔

"دوبار کیوں، زیادہ کیوں نہیں۔" وہ مسکرائی۔

"ہماری حیثیت ایسی نہیں تھی کہ وہ روز میرے لیے گوشت لے سکتیں۔" وہ لب بھینچ کر بولا۔

اسے اپنے بے ساختہ سوال کے بے ڈھنگے پن کا شدید احساس ہوا، خفت مٹانے کو وہ مڑ کر کیبنٹ کھنگالنے لگی۔

"اماں جو پیسے روزانہ کے خرچے کے دیتے، اس سے چند روپے بچا کے رکھتیں، جب آدھا کلو گوشت کے پیسے جمع ہوجاتے پھر شامی کباب یا بریانی بناتی۔" وہ گزری یادوں کو کھنگالتے بولا۔

"دل کرتا ہے منتظر حسنین! میں تمہاری ساری محرومیوں کا ازالہ کردوں۔" وہ اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر آنکھوں میں جھانکتے محبت سے بولی۔

"تم ہو نا میری محرومیوں کا ازالہ۔" اس کا ہاتھ اپنے شانے سے ہٹا کر لبوں پر رکھا۔ "تمہیں پا کر تو یہ گماں تک نہیں ہوتا کہ زندگی میں اتنی مشکلات بھی تھیں۔ اگر تھیں بھی تو وہ تمہارے وجود محبت کی اک جنبش سے ختم ہوگئیں۔" اس کے لہجے میں جھانکتی خوشی نے اس کو سرتاپا سرشار کردیا۔

"اور میرے وجود کو مکمل کرنے والے تم ہو۔ اس سے پہلے میں ادھورا دل لیے بے کل پھرتی تھی، تمہیں پا کر لگا دل اک کائنات بن گیا ہے۔"

...ین ...ں ... اتنا خوش قسمت ہوں‘ مگر پھر تمہارا وجود مجھے یہ یقین دلاتا ہے اپنی خوش نصیبی کا۔ میں خدا کا شکر بجالا کر اپنی تقدیر پر نازاں ہونے لگتا ہوں۔

”ذرا یہ شامی کباب ٹیسٹ کرو تو اور زیادہ یقین آجائے گا۔“ مسکرا کے اس نے شامی کباب اس کے منہ میں رکھا۔

”اور وہ بھی تمہارے ان نفیس ہاتھوں کا بنا ہوا۔ زبردست یار۔ ایمان سے تم اگر زہر بھی گھول دوگی تو اس میں بھی ذائقہ آجائے گا۔“ وہ اسے گدگداتے بولا۔

”اف! کیا کررہے ہو۔“ وہ گھبرا کر پلٹی۔ اس کی شرارت پر کھلکھلا کر ہنسی۔

باورچی خانے سے آتے قہقہوں پر حسین رضا نے مطمئن ہوکر بیوی کو دیکھا۔

”بہت خوش ہوں ان کو خوش دیکھ کر۔“

”اللہ دونوں کی جوڑی سلامت رکھے۔“ حمیرا نے دل سے دعا کی۔

”آمین! ارے بھئی ہمیں بھی شامی کباب ملیں گے یا صرف اپنے میاں جی کو کھلاؤ گی؟“ حسین رضا ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

”انکل! آپ کو میں کھلاؤں گا۔“ منتظر نے کرسٹل ٹرے ان کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں بھئی‘ ہماری بچی تو اب صرف تمہیں ہی کھلائے گی‘ ہمیں تو بھول گئی۔“ حمیرا نے ہنستے ہوئے خوش دلی سے کہا۔

”کوئی بات نہیں آپ لوگوں کا خیال رکھنے کو منتظر ہے ناں؟“ وہ کچن سے آتے بشاشت سے بولی۔

”جی بندہ حاضر ہے۔“ منتظر نے سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکتے کہا۔

وہ محبت سے اسے دیکھتے مسکرائی اور اس کی پلیٹ میں بریانی نکالنے لگی۔

☼ ☼ ☼

”جی بھائی! تو پھر آپ نے کیا فیصلہ کیا‘ زمین میں سے میرا حصہ لیتا ہے میرا آئے گا؟“ ڈیڑھ ماہ بعد حسین رضا کے آنے پر چائے کا کپ سامنے رکھتے اس نے استفسار کیا۔

”پانچ سو ایکڑ کے پیسے تجھے مل جائیں گے۔“ وہ چائے کا گھونٹ لیتے بولا۔

”پانچ سو کیوں بھائی! باقی زمین آپ بیچنے نہیں دیں گے کیا؟“ وہ مسکرایا۔

”باقی زمین کا کیا مطلب۔ تمہارے حصے کے بنتے ہی پانچ سو ایکڑ ہیں۔“ اس کے ماتھے پر شکنیں نمودار ہوئیں۔

”کیا مطلب بھائی۔ چار ہزار ایکڑ میں سے صرف پانچ سو میرے حصے کے کیسے بنتے ہیں۔ جبکہ وارث صرف ہم دو بھائی ہیں“ وہ حیرانی سے گویا ہوا۔

”دیکھ حسین! جو زمین ابا کی تھی‘ وہ تو انہوں نے بیچ کھائی۔ ابا کے شوق تو تم جانتے ہی ہو ہمیشہ اماں کی زبانی‘ ذکر سنتے آئے کہ جائیداد کا بیشتر حصہ انہوں نے عیاشیوں کے پیچھے لٹادیا‘ باقی زمین میں نے اپنی محنت سے خریدی ہے۔“ وہ سگریٹ کا کش لگاتے بولا۔

”مگر بھائی اگر خریدی بھی ہے تو کس سے؟ اسی زمین سے کما کر‘ یا اماں کی جمع پونجی سے تو اس میں بھی میں برابر کا حصے دار ہوں۔“ وہ بددل ہوا۔

”دیکھ حسین! ساری محنت میں نے کی ہے پانچ سو ایکڑ کے پیسے لیتا ہے تو لے ورنہ یہ لے اپنی زمین کے کاغذات خود بو کر کمائی سے جائیداد بنا‘ وارث بننا تو بہت آسان ہے۔ مگر محنت کرنا بہت مشکل۔“ وہ طنزیہ بولا۔

”بھائی! اگر میرا کاروبار پانچ سو ایکڑ کے پیسوں سے اسٹارٹ ہوتا تو میں آپ کو کچھ نہ کہتا‘ مجھے تو اس سے آدھی رقم زیادہ چاہیے ٹیکسٹائل مل لگانے میں۔“ اس نے مصلحت سے کام لیا۔

”اب تو جولاہوں والا کام کرے گا‘ کیا ہوگیا ہے حسین رضا! اس سے تو بہتر ہے ملک بن کر اپنی آبائی زمین آباد کر۔“ اس کے چہرے پر غصے سے زیادہ نخوت کے آثار نمایاں تھے۔

”بھائی! میری سالوں کی پڑھائی تو اکارت جائے گی اور ویسے بھی لڑکپن سے شہر کے ماحول میں رہا ہوں‘ اب دیہات میں نہیں رہ سکتا۔“ اس کے چہرے پر تناؤ آگیا۔

”تمہاری مرضی ہے۔“ وہ بے پروائی سے بولا۔

”یہ بخشل کہاں چلا گیا؟“

”اسے میں نے سودا سلف لانے کے لیے بھیجا ہے۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔ میں اسلام آباد جارہا ہوں‘ ہفتہ لگ جائے گا۔“

”بھائی! کھانا تو کھا کر جاتے۔“ وہ اٹھ کر مصافحہ کرتے بولا۔

”نہیں کھانا میں اپنے دوست کے ہاں کھاؤں گا۔“

”اچھا ٹھیک ہے اللہ حافظ۔“

☼ ☼ ☼

”کراچی جو کبھی کولاچی ہوتا تھا‘ ماہی گیروں کا اک چھوٹا سا قصبہ ارتقائی منزلوں سے گزر کر اک عالمی بندرگاہ بن کر بہت وسیع القلب ہر ایک کی پناہ گاہ بن چکا تھا‘ کئی مدوجزر سے گزر کر اپنے اندر بدامنی چھپانے کے باوجود آج تک اس کی کشش برقرار تھی۔

وہ کراچی جس کی سڑکیں کبھی روز دھوئی جاتیں‘ ایسے دن بھی دیکھ چکا ہے‘ جن میں اس کی سڑکیں خون سے نہلائی گئیں۔ ایسا خون آلود کراچی بھی پاکستان کی ہر قومیت کے لوگوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ آج تک پناہ دیتا ہے۔ ہم بھی کراچی آئے تو کراچی ہی کے ہو کے رہ گئے۔“ مہرین نے اسے اپنے والدین کے ماضی کے بارے میں بتایا۔

وہ مہرین کے لان میں بیٹھی کراچی کی تاریخ دلچسپی سے سنتی رہی۔

”اسی کی دہائی کے بعد یہاں صنعت کی تباہی شروع ہوئی‘ دہشت گردی بعد میں بھتہ خوری نے رہی سہی کسر نکال دی۔ آہستہ آہستہ یہاں سے ٹیکسٹائل انڈسٹری فیصل آباد منتقل ہوگئی‘ مگر آج بھی بیشتر ہیڈ آفس کراچی میں ہی ہیں۔ اس شہر میں سب کچھ ہے تبس اک امن کی کمی ہے۔

”کراچی کے حالات پورے ملک کے لوگوں کو رنجیدہ رکھتے ہیں۔“

ماہم نے گہری سانس بھری۔

”ہم نے بھی اپنی ٹیکسٹائل ملیں جا کر فیصل آباد لگائیں۔ اب انکل حسین نے حیا کے نام گارمنٹ فیکٹری لگائی ہے‘ میں نے حیا سے بات کرلی ہے‘ تم کل جانا‘ وہاں منتظر تمہیں کہیں نہ کہیں ایڈجسٹ کرلے گا۔“

ملازم شام کی چائے کے ساتھ پکوڑے اور نمکو رکھ گیا تھا۔

”تھینک یو مہرین! میں آپ ہی کی دوستی اور ولا سے پر سیالکوٹ سے یہاں تک چلی آئی ہوں۔“ وہ پکوڑوں سے لطف اندوز ہوتے تشکر سے بولی۔

”ہاں بھئی اب دوستی کی ہے تو نبھائیں گے بھی‘ چلو میں آج تمہیں کراچی کا سمندر دکھاؤں۔“

☼ ☼ ☼

”تو تم نے ساری عمر یہاں گزار دی۔“ حمید دکھ سے بولا۔

”ہاں زندہ رہنے کا اک یہی چارہ تھا۔“ بخشل کے لہجے میں یاسیت تھی۔

”کبھی بیوی بچی یاد نہیں آئیں؟“ حمید نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔

”بہت۔ جی کرتا ہے یہاں سے بھاگ جاؤں۔ ان کو جا کر دیکھوں‘ ملوں‘ لمحہ لمحہ سوچتا ہوں اب بچی اتنی بڑی ہوگئی‘ اب یہ کررہی ہوگی۔ وہ کررہی ہوں‘ پڑھ رہی ہوگی۔“

”پھر بھاگے کیوں نہیں؟“

”اگر میں بھاگ جاتا تو میرے پہنچ جانے سے پہلے انہیں قتل کردیا جاتا۔“ اس کے چہرے پر اذیت تھی۔

”سوچتا کیا ہوا جو دور ہوں‘ انہیں دیکھ نہیں پاتا مگر وہ بحفاظت خوش تو ہیں۔ ملک بہت ظالم ہے۔“ وہ نفرت سے بولا۔ ”یہ دولت اور طاقت بڑی منحوس

ہیں۔ انسان کو انسانیت کے درجے سے گرانے والی' بندہ پھر بندہ نہیں رہتا' خود کو خدا سمجھنے لگتا ہے۔"

"نعوذباللہ!" وہ نفی میں سر ہلانے لگا۔ بخشل کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ آگئی۔

"جب زندگی اور موت کے فیصلے بندہ اپنے ہاتھ میں لے لے تو بندہ بندہ نہیں رہتا' شیطان بن جاتا ہے۔ اللہ پاک کبھی نہ کبھی تو ایسے ابلیسوں کی رسی کھینچتا ہے' آخر موت تو انہیں بھی آنی ہے۔"

حمید نے اثبات میں سر کو جنبش دی۔

"اچھا حمید! میں ذرا باہر کی ہوا کھا آؤں۔"

"میں تمہارے ساتھ نہیں نکل ۔۔۔ سکتا؟"

"آج پہلوان سے پوچھتا ہوں۔ اگر اجازت دے دی تو کل تم بھی ساتھ چلنا۔"

حمید کھڑکی کی سلاخوں سے اس کو باہر جاتے دیکھتا رہا' وہ چند فرلانگ دور پڑی چارپائی پر بیٹھا پہلوان سے بات کر رہا تھا۔

"پہلوان جی! حمید کی قید کب ختم ہوگی!"

"ارے بخشل تو درویش آدمی ہے۔ قابل بھروسا۔ کبھی بھاگنے کی کوشش نہیں کی۔ حمید پر ابھی اعتبار نہیں۔ کچھ عرصہ گزرے پھر دیکھیں گے۔"

"مجھے تو آج تک یہ پتا نہیں کہ یہ گاؤں کس تحصیل میں آتا ہے' کبھی کسی سے پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی' جب عمر ایسے ہی گزارنی ہے' تو پھر کیا فائدہ۔" وہ گہری سانس بھرتے بولا۔

"ہاں۔ ہاں تب ہی تو تم پر اعتبار ہے۔" بخشل جا کر برگد کی گھنی چھاؤں میں بیٹھ گیا۔

☼ ☼ ☼

وہ اس کی شرٹ پر استری کر رہی تھی۔ مختطر گاؤن پہنے بال تولیے سے پونچھتا اس کے پاس آیا۔

"اتنے ملازم ہوتے ہوئے خود کام کیوں کرتی ہو۔"

"مختطر! تمہارے کام کر کے مجھے خوشی ہوتی ہے۔" مڑ کر آنکھوں میں جھانکا۔ اس نے ہنس کر تولیہ اس کے شانوں پر رکھا۔ اور شرٹ اس کے ہاتھوں سے سنبھالی۔

اس تولیے میں اس کے محبوب کا لمس تھا۔ خوشبو تھی۔ وہ اک جذب کے عالم میں اسے سونگھنے لگی۔ منہ پر پھیرنے لگی۔ مختطر نے کف لنکس لگاتے اسے دیکھا۔

"میں تمہارے پاس ہوں' بہت قریب' دسترس میں' پھر ان بے جان چیزوں سے کیوں محبت کرتی ہو؟"

"اس میں تمہاری خوشبو ہے' یہ تولیہ بڑا معطر لگتا ہے۔"

"یہی تو کہہ رہا ہوں جان! مجھ سے محبت کرو' میری پرچھائیوں سے نہیں۔" وہ اسے شانے سے پکڑ کر قریب کرتے بولا۔

"تم سے محبت کی وجہ سے ہی تو تمہاری ہر بات' ہر چیز سے محبت ہے۔" مختطر پہ گڑی اس کی آنکھوں میں محبت روشنی بن کر چمکی۔

مختطر نے وفور مسرت سے لب بھینچ کر آنکھیں موندیں۔ گہری سانس محبت بن کر اس کے چہرے سے ٹکرائی۔

"اتنی محبت ۔۔۔ میں پاگل ہو جاؤں گا حیا!" وہ ٹھہر ٹھہر کے بولا۔ اس کے لہجے میں پیاسے مسافر کی تھکن تھی جو پانی پا کے سیراب ہو۔

دروازے پہ دستک ہوئی۔

"بیگم صاحبہ اور صاحب جی آپ لوگوں کا انتظار کر رہے ہیں۔"

ان دونوں کو ناشتے کی ٹیبل پر آتے دیکھ کر وہ دونوں مسکرائے۔

"بیٹا! حیا کے ساتھ تمہیں خوش دیکھ کر میری رگوں میں زندگی دوڑ جاتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ میرے سارے گناہوں کا کفارہ ادا ہو گیا ہو۔" وہ ان کے چہروں پر نگاہیں مرکوز کرتے بولے۔

"اور میں بھی اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتی ہوں جس نے میری بیٹی کی زندگی خوشیوں سے بھر دی ہے۔" حمیرا نے چائے کپ میں ڈالتے محبت سے دیکھا۔

"ہم دونوں اور ہماری زندگی آپ کے گناہوں کا

کفارہ نہیں' نیکیوں کا صلہ ہے بابا جان!" حیا کے چہرے پر والدین کے لیے محبت ہی محبت تھی۔

"صحیح انکل! آپ لوگ تو فرشتہ صفت ہیں' اس بات کو مجھ سے زیادہ کون جانتا ہے۔ ہر ماہ مخصوص رقم کے چیک مختلف فلاحی اداروں کو میں ہی ارسال کرتا ہوں۔"

مختطر چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے بولا۔

"ارے نہیں بیٹا! ہم تو گناہ گار ہیں۔ بس اللہ نے کچھ نیک کام کرنے کی توفیق دی ہے۔ ان میں سے ایک نیکی تم بھی ہو۔" وہ بہت گہرے لہجے میں بولے۔

"اور میں سمجھتا ہوں' میرے ماں باپ کی پتا نہیں کون سی نیکی ہے جو مجھے اتنی محبتیں ملی ہیں۔ کیوں آنٹی! ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟" اس نے تھوڑی خاموش' تھوڑی گم صم حمیرا کو مخاطب کیا۔

"ہوں ۔۔۔ ہاں ۔۔۔ ہاں!" وہ اچانک اس سوال پہ بوکھلا گئیں۔

ان دونوں نے اپنے بزرگوں کو دیکھ کر محبت بھری نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

☼ ☼ ☼

"ہائے ۔۔۔ چار ہزار ایکڑ میں سے صرف پانچ سو ایکڑ دے رہا ہے تمہیں۔ دیکھا حسنین! تمہارا بھائی دغا کر رہا ہے تمہارے ساتھ ۔۔۔ میں کہتی تھی نا جیسا تم اسے سمجھتے ہو' ویسا نہیں وہ۔" اس نے لوہا گرم دیکھ کر ہتھوڑا رسید کیا۔

"مجھے خود یقین نہیں آتا' بھائی میرے ساتھ ایسا کر سکتے ہیں۔" وہ تاسف سے گویا ہوا۔

"تم تو ہو ہی بھولے محبت کی پٹی اتار کر دیکھو تو تمہیں حسنین رضا کی اصل صورت نظر آئے۔" وہ نفرت سے بولی۔ "پہلے تمہاری محبت پر قبضہ کیا' اب ملکیت پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔"

حسنین رضا نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی خاموشی بتا رہی تھی کہ وہ متفق تھا اس کی بات سے۔

وہ زبیدہ کو بخشل کے ساتھ اسپتال میں چھوڑ کر آگیا تاکہ تنہائی میں حمیرا سے صلاح و مشورہ کر سکے۔ اس رات کے بعد وہ کافی محتاط ہو گئے تھے۔ حسنین رضا کے آنے میں اک دن تھا۔ وہ زبیدہ کو جانے سے پہلے لیڈی ڈاکٹر کو اک بار دکھانے کا مشورہ دے کر تنہا ہونا چاہتا تھا۔

جب سے حسنین رضا گیا تھا۔ غصے کا لاوا ابل رہا تھا اس کے اندر۔ رہ رہ کر اسے غصہ آ رہا تھا کہ وہ اتنے سال اپنا حق وصول کرنے کیوں نہ گیا۔ جائیداد کا فیصلہ ماں کی زندگی میں کیوں نہ کر لیا۔

حمیرا نے بغور اس کی پیشانی پر شکنوں کے جال کو دیکھا۔

"دیکھو حسنین' تمہارا بھائی دھوکے باز اور جھوٹا ہے۔ میں نے خود پھوپھی کو کہتے سنا تھا کہ حسنین کے حصہ کی زمین دو ہزار ایکڑ ہے اب وہ صرف پانچ سو پہ تمہیں ٹرخا رہا ہے۔"

مسلسل ضربوں پہ لوہا نرم ہو رہا تھا۔

"میں سمجھتا تھا میرا بڑا بھائی جائیداد کو محنت محبت سے سنبھال بھی رہا ہے اور بڑھا بھی رہا ہے۔"

"غلطی تو تمہاری ہی تھی' تم ہی کور چشم نکلے۔ اعتبار کے اندھے پن کا شکار۔ تم نے محبت و ملکیت دونوں کی خبر نہ رکھ کر خود پر ظلم کیا اور بے خبری میں مارے گئے۔" وہ اس کے مضبوط لہجے پر اسے دیکھتا رہ گیا۔

"میں کیا کرتا۔ تم میرے بھائی کی بیوی تھیں۔ یہ میری مجبوری اور بے بسی ہی تھی جس نے مجھے گاؤں آنے سے روکا۔ میں جائیداد وغیرہ کے معاملات کو بھی نہ دیکھ پایا۔ فرار کی راہ اختیار کی خود سے' تم سے حالات سے۔" وہ دکھ سے گویا ہوا۔

"میں اس کی تھی ہی نہیں۔ رشتہ وہ ہوتا ہے جو انسان قبول کرلے' میرے دل' روح' ذہن' عقل نے اسے شروع دن سے ہی تسلیم نہیں کیا۔ تم بغاوت تو کرتے ۔۔۔ میں ہر حال میں تمہارا ساتھ دیتی۔ میں کل بھی تمہاری تھی اور آج بھی تمہاری ہوں۔ میں ابھی بھی حسنین کے ساتھ نہیں جاؤں گی اگر کسی نے ایسی

کوشش کی تو ماردوں گی اسے بھی اور خود کو بھی۔" اس کا حتمی لہجہ اسے سوچنے پر مجبور کر گیا۔

"میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا۔" وہ بے تاب ہوا۔ حمیرا بے ساختہ مسکرائی۔

"ہاں ہمارا ملاپ تو ہو کے ہی رہے گا' مگر فی الحال یہ سوچنا ہے کہ جائیداد میں پورا حصہ کیسے وصول کیا جائے۔" وہ پرسوچ انداز میں گویا ہوئی۔

"ہاں بہت سوچا ہے' مگر کوئی حل سمجھ میں نہیں آیا۔" وہ پیشانی ملنے لگا۔

"حل تو ہے میرے ذہن میں بس تم راضی ہو جاؤ تو سارے مسئلے ختم' ساری پریشانیاں دور۔" وہ پراسرار انداز میں بولی۔ حسین رضا نے بغور اسے دیکھا۔

"کون سا حل؟"

"تم میرے منصوبے کے تحت عمل کرتے رہو' کوئی سوال نہ پوچھو۔"

اس کی آنکھوں کی چمک دیکھ کر حسین نے لب بھینچ کر بھنویں سکیڑتے اسے دیکھا۔

"وعدہ؟" اس نے ہاتھ بڑھایا۔

وہ چند ثانیے خاموش رہا پھر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "ہاں پکا وعدہ اک مرد کا۔"

☆ ☆ ☆

وہ فائل کھولے بیرون ملک سے آنے والے مختلف آرڈرز کا معائنہ کر رہا تھا' جب حیا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔

"منتظر! فارغ ہو؟"

"تمہارے لیے تو ہر مصروفیت چھوڑ سکتا ہوں۔" اس نے فائل بند کر کے اسے دیکھا۔ وہ سامنے کھڑی لڑکی کی طرف متوجہ تھی۔

"یہ میری نئی سیکریٹری ہیں مس ماہم! جس کی تم نے سفارش کی تھی۔" وہ اٹھتے ہوئے مسکرایا۔

"اچھا' جس کے لیے مہرین نے کہا تھا۔"

"ہاں اور مس ماہم! یہ میری وائف ہیں۔ حیا منتظر حسین۔" اس نے تعارف کرایا۔

"جی السلام علیکم۔" وہ سر کو جنبش دیتے بولی۔

"وعلیکم السلام!" اس نے ہنستے ہوئے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ "ابھی جلدی میں ہوں ان شاء اللہ پھر ملاقات ہوگی۔"

"جی جی ضرور۔ ضرور۔" وہ حیا کے دوستانہ انداز پر اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے بولی۔

"پرانی سیکریٹری کو فارغ کر دیا؟" گاڑی میں بیٹھتے استفسار کیا۔

"نہیں' وہ پریگننسی کی وجہ سے چار ماہ کی چھٹی پر ہے' وہ آئے گی تو میں ماہم کو کہیں اور ایڈجسٹ کر لوں گا۔ فی الحال تو تمہارا حکم تھا سو تعمیل ضروری تھی۔" وہ گیئر لگاتے اسے دیکھ کر مسکرایا۔

"اچھا!"

وہ اس کی دلفریب مسکراہٹ کو کئی ثانیے محبت سے دیکھتی رہی۔

"کیا دیکھ رہی ہو؟"

"تمہارا ساتھ رہا تو زندگی کتنی حسین و خوشگوار گزرے گی۔" وہ جذب سے گویا ہوئی۔

"ہوں!" وہ اثبات میں سر ہلانے لگا۔

"محبت کے سامنے ہر جذبہ ہر احساس فضول لگتا ہے۔" منتظر کو دیکھتے اسے ماں کی بات یاد آئی۔

"ماں بننے کے بعد نہ آنکھ میں نیند اترتی ہے نہ دل میں سکون۔ محو دعا لب بے سکونی کو تھپک کر پرسکون کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ماں کی ممتا بڑا عجیب جذبہ ہے' ہر چیز پر دکھ بھلا دینے والا۔"

"امی! یہ آپ کی محبت کی شدت ہے' ورنہ ہر ماں ایسی تو نہیں ہوتی۔" اس نے ماں کے گلے میں بانہیں ڈال کے کہا تھا۔

مگر اب سمجھ میں آرہا تھا کہ محبت کسی بھی رنگ میں ہو اس کے احساسات ایک جیسے رہتے ہیں۔ محبت کی قسمت میں بے چینی اور بے سکونی ہی لکھی ہے۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" منتظر نے اسے گم صم دیکھ کر استفسار کیا۔

اس نے چونک کر اپنے ساتھ بیٹھے ڈرائیونگ

کرتے منتظر کو اسی محویت سے دیکھا۔

"تمہیں اور محبت کو۔"

اس نے گیئر لگاتے منتظر کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

☆ ☆ ☆

برگد کی گھنی چھاؤں میں موٹے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھا بخشل منتظر تھا اس دیوانی جھلی لڑکی کا جو بارہا اس سے دعا مانگ گئی تھی کہ پہلوان کے منجھلے بیٹے سے اس کی شادی ہو جائے۔

وہ ہر بار اس نمانی نار کو دیکھ کر مسکرا دیتا اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیتا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا جس پر فون نمبر لکھا تھا۔

"بابا جی تسی دعا کرو میڈا پریم مینوں مل جائے۔" وہ آگئی۔

"میں وظیفہ پڑھوں گا' تیری مراد بر آئے گی' مگر تجھے میرا ایک کام کرنا ہوگا۔"

"مجھے ہر شرط منظور ہے۔" بے تابی اور بے ہوا ہوئی۔

اس نے ارد گرد دیکھا۔ آئی گرمیوں کی دوپہریں ابھی سے سنسان تھیں کوئی ذی روح نہ تھا۔

"مجھے ایک فون کرنا ہے۔ ایک دن کے لیے فون لا دے۔"

"بس۔ اتنی سی بات بابا جی!" وہ خوشی سے نہال ہوئی۔ "یہ تو کوئی مسئلہ نہیں۔ میں اس سے کہہ کر منگوا دوں گی۔"

"ہاں مگر راز راز ہی رہے یوں۔۔۔۔ جیسے تمہارا راز میرے پاس راز ہے۔" بخشل کی انگلی تنبیہا" اٹھی۔

"بابا جی! اس کی تو فکر نہ کر۔ تو بس ہماری شادی کے لیے آج سے وظیفہ پڑھنا شروع کر دے۔"

"کر رہا ہوں۔"

"بہت بہت مہربانی بابا جی!"

☆ ☆ ☆

اس نے سامنے بیٹھی عورت کو نفرت سے دیکھا تھا۔ اس کا خوب صورت' باوقار چہرہ اچانک بھیانک ہوا جس پر نحوست کے سائے منڈلا رہے ہوں۔

ماضی کی یادیں یادداشت کے کواڑ توڑ کر آوارد ہوئیں۔ اس کی نمانی ماں جو کبھی سلائی مشین سے سر اٹھا کر خلا میں گھورتی۔ اکثر ایسا کرنے پر وہ ان کی خود کلامی سننے کی کوشش کرتا۔

"ڈائن ہے تو ڈائن۔۔۔۔ بچھل پیری! تو نے میرا گھر اجاڑ دیا۔ میری زندگی برباد کر دی۔ تو سکھی نہیں رہے گی' تو بھی سکھی نہیں رہے گی۔"

تب سے آج تک اسے اس ڈائن کی تلاش رہی تھی۔ وہ ڈائن آج اس کے سامنے تھی اور بے فکر' سکھی' خوش تھی۔

اس کا دل چاہا وہ اسے قتل کر دے' مگر دوسرے ہی لمحے اس خیال کو جھٹک دیا۔ اسے ماموں تک پہنچنا تھا۔

حیا چائے لے کر آنے والی تھی اور اس کے آنے سے پہلے ہی وہ سرعت سے باہر نکل آیا۔

☆ ☆ ☆

"منتظر!" چائے کا کپ تھامے حیا سارے گھر میں اسے پکارتی اور ڈھونڈتی رہی۔

"آخر کہاں چلا گیا؟"

سیل فون بند جا رہا تھا۔

وہ لان میں لگے نئے پودوں کے بارے میں مالی سے معلومات لیتی رہی۔

"السلام علیکم۔۔۔ کیا ہو رہا ہے؟" مہرین کی آواز پر اس نے مڑ کر دیکھا اور کھل اٹھی۔

"ارے واہ! آج صبح ہی صبح کیسے راہ بھول گئیں۔" وہ اس سے گلے ملتے بولی۔

"دانی کو اسکول چھوڑنے گئی تھی' سوچا گھر جانے سے پہلے تم سے ملتی چلوں۔۔۔۔" وہ لان میں پڑی کرسی پر بیٹھتے بولی۔ اس نے ملازم کو چائے لانے کا کہا۔

"ہاں یاد آیا۔ تم نے میرے کہنے پر اس لڑکی کو ملازمت دی بلکہ اس کی رہائش کا انتظام بھی کر دیا۔ اس کی ماں بہت دعائیں دے رہی تھی۔"

ان دعاؤں کا [illegible] تھی تو منتظر ہے جو آپ نے اپنے [illegible]
اتنا خیال رکھتا ہے۔"

"وہ ملیں گے تو ان کا بھی شکریہ ادا کروں گی۔"

"اچھا بس! دوستوں میں شکریہ نہیں ہوتا۔ تم نے اک کام کہا میں نے کر دیا۔ کوئی بڑی بات نہیں۔"

☼ ☼ ☼

وہ پریشان تھی۔ منتظر سے اک ہفتے سے کوئی تفصیلی بات نہ ہو پائی تھی' وہ مختصر بات کر کے فون رکھ دیتا۔ کبھی ایک آدھ میسج پڑھا دیتا۔ اس کا سیل اکثر بند ملتا۔ وہ جھنجلا جاتی۔ اس کی اتنی جدائی اس کے لیے ناقابل برداشت تھی۔

امی روز اس سے منتظر کے بارے میں پوچھتیں۔ وہ روزانہ انہیں مختلف بہانے' کام کی مصروفیت' مشینوں کے سودے وغیرہ کا بتا کر مطمئن کر دیتی۔

اسے محسوس ہوتا کہ امی اس کے چہرے پر لکھی کوئی تحریر پڑھنا چاہتی ہیں۔ ان کی کرید بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کے لیے ماں کا رویہ بھی حیران کن تھا۔ وہ اس کی طرف سے شادی کے بعد کچھ زیادہ ہی پریشان رہی تھیں۔

"شاید شادی کے بعد ماؤں کو یہ احساس زیادہ ستاتا ہے کہ بیٹیاں اب پرائی ہو گئی ہیں کسی اور کے اختیار میں کسی اور کی ماتحت' مگر میرے ساتھ تو ایسا کچھ نہیں ہے۔ منتظر بے حد خیال رکھنے والا اور محبت کرنے والا ہے۔"

وہ سوچ کر مطمئن ہو جاتی مگر اب منتظر کا ہجر اس سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔

"میں چند دن کے لیے فارغ ہوں' تم فوراً" پہلی فلائٹ سے پہنچو' تاکہ کچھ وقت اکٹھے گھومنے پھرنے میں گزاریں۔"

وہ فون پر وصل کی نوید سن کر فوراً" پیکنگ میں جت گئی۔

"بیٹا! اپنا بہت خیال رکھنا اور مجھے اپنی خیریت کی اطلاع دیتی رہنا۔"

"امی! میں اپنے شوہر کے پاس جا رہی ہوں' کہیں اور نہیں' آپ کیوں اتنی پریشان ہو رہی ہیں۔" وہ ان کو متفکر دیکھ کر ہنستے ہوئے ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر بولی۔

"ہاں بیٹا! ماں ہوں اور ماؤں کا دل کبھی بھی اولاد کی طرف سے مطمئن نہیں ہوتا۔"

"امی! یہ صرف آپ کا مسئلہ نہیں ہر محبت کرنے والے کا مسئلہ ہے' میں بھی جان گئی ہوں یہ کیفیات جب سے منتظر سے محبت کی ہے۔" وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر بولی۔

"اللہ تم دونوں کی جوڑی سلامت رکھے اور ہمیشہ ایک دوسرے سے اتنی ہی محبت کرو' زندگی ہنسی خوشی گزرے۔"

"آمین' بالکل ایسے جیسے آپ کی اور بابا کی۔" وہ شرارت سے کھلکھلائی۔

"اللہ کی پناہ میں۔" انہوں نے کہتے گاڑی کا دروازہ بند کیا۔

☼ ☼ ☼

وہ تین دن اکٹھے اسلام آباد میں گھومتے رہے۔ اس کے بعد وہ لاہور آ گئے' دو دن وہاں رہے' وہ خود ہی فون کر کے ماں باپ کو خیریت کی اطلاع دیتی رہی' کیونکہ منتظر نے اسے سیل آف رکھنے کو کہا تھا۔ اپنا بھی وہ بند ہی رکھتا۔ وہ اکثر جھنجلا کر کہتا۔

"یہ موبائل فون ایسی بلا ہے جس کے ہوتے کوئی پرائیویسی نہیں رہتی۔ خلوت ہو یا جلوت' ہر وقت بجتا ہی رہتا ہے۔ سو اس کا بند رہنا ہی بہتر ہے جب تک ہم ایک دوسرے کے ساتھ ہیں۔"

وہ اس کی باتوں پر کتنی ہی دیر ہنستی رہی۔ زیادہ تر فون بند ہی رکھتی۔ آن کر کے ماں کو فون کرتی۔

وہ بذریعہ ٹرین ملتان جا رہے تھے۔

"ٹرین ہی کیوں؟" اس نے حیرت سے منتظر کو دیکھا۔

"ارے یار! وہ سفر تو گھنٹوں میں ختم ہو جاتا ہے۔

میں تمہاری سنگت میں لمبا سفر کرنا چاہتا ہوں تاکہ یہ زندگی بھر یادگار رہے۔"

اور واقعی ٹرین کا سفر یادگار رہا۔

منتظر کی توجہ و محبت پر وہ خوشی سے جھوم جھوم جاتی۔

☼ ☼ ☼

"تم تو واقعی میرا چاند ہو بیٹا! اتنی اچھی ملازمت اور اتنا اچھا گھر۔" خورشید فلیٹ میں گھومتے مسرور ہوئی۔

"اماں! انسان کوشش کرے تو سب کچھ پا سکتا ہے ابھی تو میرا ترقی کا سفر شروع ہوا ہے۔ یہ فلیٹ میری منزل نہیں۔" وہ عزم سے بولی۔

"ہاں اللہ تمہیں اپنے ارادوں میں کامیاب کرے۔ مجھے تم پر واقعی فخر محسوس ہوتا ہے' کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اپنا گھر بھی ہو سکتا ہے۔" وہ خوشی سے نم آنکھیں پونچھنے لگیں۔

"اماں یہ اپنا نہیں مگر میں چند سالوں میں اپنا بھی خرید لوں گی۔"

"ان شاء اللہ' ضرور اللہ تمہاری یہ امید بھی پوری کرے گا' اچھا بیٹا یہ سامان تم نے خریدا ہے؟" وہ اک اک چیز کو غور سے دیکھتے بولی۔

"نہیں اماں' یہ ڈیکوریٹڈ ہی ملا ہے۔" وہ ہنستے بولی۔

"اب تو میں بھی آپا کو اپنے پاس بلاؤں گی اور جی بھر کے ان کی خدمت کروں گی اور سارے احسانات کا بدلہ چکاؤں گی۔" خورشید آئندہ کے منصوبے بنانے لگی۔

"ہاں اماں! ضرور۔"

☼ ☼ ☼

"پتا نہیں کیا ہوا' اتنے دن ہو گئے نہ کوئی فون آیا نہ منتظر میاں آئے۔ اللہ کرے خیریت سے ہو۔"

حمید کی سرگوشی پر بخشل نے دروازے کی طرف دیکھ کر کھڑکی سے باہر دیکھا' وہاں کسی کو نہ پا کر اطمینان کی سانس لی۔

"مجھے ڈر ہے کہ جذبات میں آ کر منتظر کوئی جذباتی

قدم نہ اٹھا سکیں۔" اک وہم اور وسوسہ حمید کے اندر سر اٹھانے لگا۔

"یار! کیوں ناامید ہوتے ہو۔ جب تک سانس ہے تب تک آس ہے۔" وہ اس کے خدشات کو نظرانداز کرکے بولا۔

"پتا نہیں اللہ کی رحمت کس وقت جوش میں آجائے' وہ سارے بند دروازے کھول دے۔"

حمید زور زور سے اثبات میں سرہلانے لگا۔ "میری تو پھر بھی خیر ہے تھوڑا عرصہ ہوا ہے قید کو مگر تم نے تو ساری عمر اس قید و بند میں گزار دی۔" وہ ایک بار پھر مایوس ہوا۔

بخشل کے لبوں پر پُراسرار مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"اللہ کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی حکمت پوشیدہ ہوتی ہے حمید میاں! اگر میں قید نہ ہوتا تو نشئی چرسی بنا رہتا۔ اس قید نے مجھے اللہ کے قریب کردیا اس تنہائی میں میرا ہمراز' ہمدم' دوست میرا رب ہمیشہ میرے ساتھ ہوتا ہے۔ میں اپنے سارے دکھڑے اس کے سامنے بیان کرتا ہوں' وہ میرے دل بے قرار پر اطمینان کا نزول فرماتا ہے' پھر کوئی دکھ' دکھ نہ رہتا' کوئی قید' قید نہیں رہتی۔ میں اس سے اپنی تنہائیاں بانٹتا' اس سے رحم مانگتا' اپنی بیٹی کے لیے دعائیں مانگتا اور مجھے لگتا میرے رب نے میری ساری دعائیں قبول کرلی ہیں... مجھے لگتا ہے میری بیٹی جہاں بھی ہے بہت خوش ہے اور خوش رہے گی۔"

اس کی آنکھوں کی چمک دیکھ کر حمید کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی۔

"ہاں کہتے تو تم بھی ٹھیک ہو۔ یہاں کا بخشل اس بخشل سے یکسر مختلف ہے جو پی پلا کر راتوں کو گلیوں میں پڑا رہتا تھا۔"

"اور یہ بھی دیکھو کہ اللہ نے اس کے دل میں رحم ڈالا اور ہمیں زندہ رکھا۔ اس نے تمہیں بھی قتل نہیں کروایا۔ میرے ساتھ قیدی بنالیا۔"

"بے شک بخشل! بے شک... یہ میرے مالک کریم کا احسان ہے۔" حمید کے دل پر کچھ دیر پہلے چھائی اداسی کے بادل چھٹنے لگے' یاسیت کی جگہ امید نے قدم

رکھ دیے تھے۔

☼ ☼ ☼

"پتا نہیں کیوں دل حیا کی طرف سے پریشان رہتا ہے' عجیب وسوسے واہمے گھیرے رہتے ہیں۔" انہیں دودھ کا گلاس تھماتے ہوئے بولیں۔

"کیوں کوئی ایسی ویسی بات ہوگئی ہے کیا؟" انہوں نے بغور بیوی کو دیکھا۔

"نہیں بات تو کوئی نہیں ہوئی مگر..."

"تو پھر خواہ مخواہ پریشانی کیوں؟" انہوں نے بات درمیان میں کاٹ دی۔ "حیا خوش ہے شوہر کے ساتھ۔ اسے کوئی مسئلہ نہیں۔" انہوں نے چشمہ اتار کر مطالعے کے لیے کھولی کتاب بند کرتے ہوئے کہا۔

"یہی تو مسئلہ ہے کہ ہر وقت یہی دھڑکا لگا رہتا ہے کہ وہ واقعی خوش ہے یا دکھتی ہے۔"

"اف بیگم صاحبہ! آپ تو واقعی پاگل ہوگئی ہیں۔ وہم کا علاج مجھ غریب کے پاس کیا حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں ہوگا۔" وہ دل کھول کر ہنسے۔

"اسی پاگل پن میں تو آپ کو پایا تھا۔" وہ مصنوعی ناراضی سے بولیں۔

"جی ہاں اور ہمیں بھی پاگل کردیا۔" وہ متبسم ہوئے۔

"بڑا دانا سمجھتے تھے خود کو۔" وہ مسکرائے جتانے والے انداز میں اترائیں۔

"ہاں جناب! آپ جیسی چاہنے والی ہو تو بندہ سب کچھ کر گزرتا ہے' کچھ بھی سوچے سمجھے بنا۔" انہوں نے آخری بات خود کلامی کے انداز میں لمبی سانس بھر کر کہی۔

"کیا کہا زور سے بولیے نا۔" وہ جھنجلائیں۔

"حیا سے بات ہوئی تھی۔" اس نے بات بدل دی۔

"ہاں۔ صبح ہوئی تھی۔"

"پھر اپنے سارے برے خیالات و خدشات نکال کر ڈسٹ بن میں پھینک دیں اور اب سونے کی

کوشش کریں۔" انہوں نے ... چادر اوڑھتے نصیحت کی۔

وہ خاموشی سے اثبات میں سرہلا کر سونے کے لیے دراز ہوگئیں۔

☼ ☼ ☼

صحرا میں بنی اک عالیشان حویلی تھی۔ جس کے لمبے برآمدوں میں پرانی طرز کے ٹائلز لگے ہوئے تھے۔ اس کے اک شاہی بیڈ روم میں منتظر حسنین سگریٹ پر سگریٹ ہی نہیں سلگا رہا تھا۔ خود بھی سلگ رہا تھا۔ حیا گم صم اسے تک رہی تھی۔

اس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا اور آگے کیا ہونے والا تھا۔ تقدیر سے کہاں دھوکا کھا گئی۔ تب اس نے اپنے محبت بھرے دل کو امین بنایا اور میدان فیصلہ میں کود پڑی۔

"منتظر! میں نے تم سے محبت کی ہے' میں تمہارا ساتھ ہر قدم پر نبھاؤں گی۔"

"تم مجھ سے محبت کا ذکر نہ ہی کرو تو بہتر ہے۔" اک لحظے کو پلٹ کر اسے دیکھا۔ جھنجلاہٹ اس کے ہر فعل سے مترشح تھی۔ وہ پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

حیا دھیرے سے چلتی اس کی پشت پر آگئی۔ حیا کی گہری سانسوں کی گرمی اس کے کانوں کی لوؤں کو چھوتی باہر کی ٹھنڈک میں مدغم ہوگئی۔

"کیا ہمارے بیچ اتنی دوری پڑ چکی ہے کہ محبت از کار رفتہ ہوئی۔" سرسراتی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

"تمہارے اس رشتے اور محبت نے مجھ سے میرا عزیز ترین اکلوتا رشتہ اور محسن چھین لیا ہے حیا!" وہ تپتی دھوپ بنا اس کو جھلسانے لگا۔

حیا نے بمشکل خود کو سنبھالا۔

"ہم محبت کے مرید اپنی فہم و فکر سے سارے الجھے معاملات کو سلجھادیں گے' ساری ناانصافیوں کی تلافی کرلیں گے منتظر! مجھے صرف تمہارا ساتھ درکار ہے۔"

آکھڑی ہوئی۔ "منتظر! صرف تمہاری محبت تمہاری وفا' تمہارا اعتماد چاہیے مجھے۔" اپنا ہاتھ اپنائیت سے اس کے کندھے پر رکھتے وہ ملتجی ہوئی۔

اس نے آگ اگلتی سرخ انگارہ بنی آنکھیں اس پر گاڑیں۔ تپتا ہاتھ اپنے کندھے پر رکھے اس کے ہاتھ پر رکھا زور سے پکڑا اور اٹھا کر اتنی ہی شدت سے جھٹک دیا۔

وہ لڑکھڑا گئی۔

"جنہوں نے نفرت بوئی... جو بے وفائی کے مرتکب ہوئے... جو اعتماد و اعتبار کو پارہ پارہ کرنا جانتے ہوں... جنہیں رشتوں کا کوئی پاس نہیں۔"

وہ غصے سے ٹھہر ٹھہر کر بولتا رہا۔

"کیسی مضحکہ خیز بات ہے کہ وہ مانگتے ہیں مجھ سے' محبت' وفا اور اعتماد؟" وہ طنزیہ بولتے استہزائیہ انداز میں ہنسا۔

اس کا وجود اس توہین آمیز رویے پر شعلوں کی زد

میں آگیا۔

عشق ہے ظاہر میں خوشبو کا سفر
راستہ جاتا ہے' انگاروں کے بیچ

حیا حسین صرف اک رات کے فاصلے سے خوشبوئے محبت کے سفر سے انگاروں کے بیچ جھلس رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ کوس رہے تھے' اس دن کو جس دن فیصل آباد میں ایک صبح اپنی گاڑی سے ٹکراتے اس بھلے سے نوجوان کو دیکھ کر انہیں بہت کچھ یاد آگیا تھا۔ اس کا چلنا' ہاتھ اٹھا کر پسینہ پوچھنے کا انداز انہیں کسی کی یاد دلا رہا تھا۔ قدرتی طور پر اسے کشش محسوس ہوئی۔ ڈرائیور کو گاڑی ریورس کرنے کا کہا' وہ سڑک پر پاؤں پکڑے ابھی تک درد کو ضبط کرنے کی کوشش میں مگن تھا' اس کی فائل کے کاغذات نیچے بکھرے تھے۔

"نوجوان! زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟" انہوں نے سن گلاسز اتار کر گاڑی کا دروازہ کھولتے پوچھا۔

"نہیں سر! ہم غریب لوگ تو چوٹیں کھانے کے عادی ہوتے ہیں۔" وہ سرٹیفکیٹس چنتے فائل میں رکھتے بولا۔

اس کے طنزیہ پُراعتماد لہجے پر حسین رضا کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"آؤ میرے ساتھ۔" اس نوجوان نے چند سیکنڈ سوچنے کے بعد ان کی آفر قبول کرلی۔

"کہاں ہے تمہاری منزل؟"

"جہاں نوکری مل جائے۔"

"اچھا۔" وہ مسکرائے "کیا کررہے ہو آج کل۔"

"سر ایم اے اکنامکس کے بعد روڈ ماسٹری۔"

وہ لب بھینچتے مسکرائے۔ اس کے بولنے کا انداز بھی کسی کی یاد دلاتا تھا۔

اتنی مشابہت پر انہیں پیار آیا۔

"کل دس بجے میرے آفس پہنچ جانا۔" انہوں نے اپنا وزیٹنگ کارڈ اس کی طرف بڑھایا۔

"تھینک یو سر!" اس نے وزیٹنگ کارڈ جیب میں ڈال کر ہلکا سا جھک کر مصافحہ کیا۔ ان کا دل چاہا تھا اسے گلے لگالیں' اپنی خواہش پر خود حیرانی ہوئی' مگر اس کے وجود سے اپنائیت کی خوشبو پھوٹ رہی تھی' وہ اپنے احساسات کو سمجھنے سے قاصر تھے۔

☆ ☆ ☆

سارے کانٹے راستے سے ہٹانے کے بعد ایک گواہ ہی بچا تھا۔ جو راز آشنا بن چکا تھا۔ وہ اس کے قتل کا ارادہ کرچکا تھا۔ وہ بھائی کے چہلم کی دعوت دینے کے لیے دوست کے پاس گیا۔ وہاں میلاد کی محفل سجی تھی۔

"اسلام کسی بے گناہ انسان کے قتل کی حمایت نہیں کرتا' جس نے اک بے گناہ انسان کو قتل کیا۔ گویا اس نے ساری انسانیت کو قتل کردیا۔"

پتا نہیں کیا ہوا' اسے لگا اس کے دل کو جیسے کسی آہنی ہاتھ نے جکڑ لیا ہو' اس کی حالت غیر ہوگئی۔ گھر آیا تو حمیرا نے کہا۔

"بس اک آخری گواہ ہے۔ اسے بھی مروا دو تو بہتر ہے۔"

"نہیں۔ اب اور قتل نہیں۔" وہ فوراً بولا' حمیرا نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"کیا ہوا حسین رضا؟" اس کی غیر ہوتی حالت پر وہ گھبرا گئی۔

"میرا دل بہت پریشان ہے۔ پتا نہیں کیا ہوگیا ہے۔"

"اچھا تم اس کو قید کروا دو' تاکہ وہ کبھی ہمارا راز افشا نہ کرسکے۔ تم اس وجہ سے پریشان ہونا؟"

وہ خالی خالی نگاہوں سے حمیرا کو تکتا رہا۔

"حسین رضا! ہمارا مستقبل بہت شاندار ہے' تم خوامخواہ پریشان ہورہے ہو۔ ہم نے اک دوسرے کو پالیا ہے۔ ہماری محبت جیت گئی۔"

وہ آہستہ آہستہ اس کے زخموں پر پھاہے رکھتی دلاسے دیتی رہی۔

(دوسری اور آخری قسط آئندہ ماہ)

قرۃ العین خرم ہاشمی

"بے جی! آپ کو کیا پتا کہ شہروں میں رہنا کتنا مشکل ہے۔ تسی ٹھہرے پنڈ دے سدے سادے بندے! شہروں کی بھول بھلیاں کیا جانو۔۔۔!"

آدھی اردو' آدھی پنجابی میں بات کرتی ہوئی سوہنی نے صحن میں مشین لگائی ہوئی تھی۔ صحن کے کونے پہ بچھی چارپائی پہ بیٹھی بے جی پالک کے پتے توڑ رہی تھیں۔ ہاتھوں کے ساتھ ساتھ سوہنی کی زبان بھی مسلسل چل رہی تھی۔ بے جی اس کی ساس تھیں۔ جو گاؤں سے چار دن پہلے اپنے چھوٹے بیٹے احمد کے گھر رہنے آئی تھیں۔ ان کی باقی آل اولاد گاؤں میں ہی مقیم تھی۔ احمد کو شہر میں رہنے کا شوق شروع سے ہی تھا۔ اس نے بمشکل بی اے پاس کیا اور کسی فیکٹری میں نوکری پہ لگ گیا۔

آٹھویں پاس سوہنی سچ میں بہت سوہنی تھی۔ صورت کی بھی اور مزاج کی بھی۔ اسی لیے بے جی اپنے لاڈلے بیٹے کے لیے سوہنی کو بہت چاؤ سے دلہن بنا کر گھر لے آئیں۔

احمد نے دو کمروں کا چھوٹا سا گھر کرایہ پہ لے لیا تھا' اور شادی کے بعد سوہنی کو شہر لے آیا تھا۔ شروع کے دن ہر ایک کی طرح ان کے بھی بہت اچھے گزرے۔ نہ کوئی فکر نہ کوئی فاقہ۔۔۔ دونوں ایک دوسرے میں مگن بہت خوش تھے۔ زندگی بہت پرسکون اور اس کا آنے والا ہر پل خوشی کے ہزار رنگ لے کر آتا تھا۔

مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب ذمہ داریوں کا سورج آنگن میں چمکنے لگا تو اس کی گرم تپتی دھوپ زندگی کے بے فکری کے رنگوں کو اڑانے لگی تھی۔ آگے پیچھے ہوئے تین بچے عمروں کے ساتھ بڑھتی ان کی ضرورتیں' مہنگائی' خرچے' خواہشیں' سب آپس میں ایک دوسرے سے ٹکرانے لگے تھے۔

احمد کی قلیل آمدنی میں اتنے خرچے پورا کرنا سوہنی کو بہت مشکل لگتا تھا۔ مگر جیسے تیسے کرکے گزارہ ہو رہا تھا۔

سوہنی کے تینوں بچے جن کی عمریں بالترتیب بڑی فاطمہ سات سال' زین چھ سال اور سب سے چھوٹی آصفہ پانچ سال کی تھیں۔ تینوں بچے اسی محلے کے اسکول میں جاتے تھے۔

سوہنی کو اب اکثر ہی اپنا گاؤں بہت یاد آتا تھا۔ گاؤں کی کھلی فضا' خالص چیزیں' رشتوں کا خلوص و پیار ۔۔۔ جو یہاں کی زندگی میں ناپید تھا۔ دو کمروں کا یہ گھر اب تنگ پڑنے لگا تھا۔ چھوٹا سا صحن جس میں گھر کے اکثر کام یہیں بیٹھ کر نمٹائے جاتے تھے۔ بچے اکثر کھیلنے سے رہ جاتے تھے۔ وہ جب کبھی بھی گاؤں جاتے تھے تو وہاں بہت مزے کرتے تھے۔ بے جی کا گھر کافی بڑا اور

کھلا تھا۔ دو بیٹوں اور ان کی آل اولاد کے ہونے کے باوجود گھر میں کافی جگہ اور گنجائش تھی۔ اس لیے بے جی کی تینوں بیٹیاں بھی آئے روز آئی ہوتیں۔ احمد کبھی کبھی ضد کر کے ماں کو اپنے پاس لے آتا تھا۔ مگر بے جی کا دل بھی احمد کے چھوٹے اور بند گھر میں گھبراتا تھا۔

مگر وہ احمد کی خوشی اور پوتے پوتیوں کی چاہ میں ہر دوسرے مہینے چکر لگا لیتی تھیں اور دس پندرہ دن رہ جاتی تھیں۔ وہ اپنے ساتھ پنڈ کی بہت سی سوغاتیں بھی لاتی تھیں۔ سوہنی کی بھی اپنی ساس سے بہت بنتی تھی۔ کیونکہ بے جی نے ہمیشہ سوہنی کو ایک بیٹی کی طرح ہی سمجھا تھا۔ کچھ سوہنی کو بھی رشتوں کا بہت لحاظ و مروت تھا۔ سو رشتوں کی گاڑی بہت سکون سے رواں دواں تھی۔

ابھی بھی سوہنی بے جی کے سامنے اپنے دکھڑے رو رہی تھی۔ جسے بے جی چہرے پہ ہلکی مسکراہٹ لیے سن رہی تھیں۔

"بے جی! میں اتنی احتیاط کرتی ہوں بجلی استعمال کرنے میں مگر پھر بھی بل اتنا آتا ہے کہ احمد ہر بار مجھے ڈانٹتے ہیں۔ اب بھلا بتاؤ کیا میں بجلی جان کر زیادہ استعمال کرتی ہوں۔"

سوہنی کپڑے اچھی طرح نچوڑ نچوڑ کر بالٹی میں رکھتی جا رہی تھی۔ ابھی یہ بالٹی اٹھا کر اسے چھت پہ جانا تھا تاکہ کپڑے چھت پہ پھیلا سکے۔

"بے جی! آپ بیٹھو! میں کپڑے ڈال کر آتی ہوں چھت پہ۔ ساتھ ہی اپنے پنجرے بھی دیکھ آؤں گی۔ بھوکی پیاسی بیٹھی ہوں گی بے چاری چڑیاں۔"

سوہنی جلدی جلدی بولتی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ چھت میں ایک کونے میں چھوٹے چھوٹے تین چار پنجرے رکھے ہوئے تھے۔ جس میں مختلف قسم کے پرندے تھے۔ چڑیوں اور طوطوں کی تعداد زیادہ تھیں۔ سوہنی ان کے دانے پانی کا بہت دھیان رکھتی تھی۔

سوہنی کے فارغ ہو کر آنے تک بے جی مسالا بھون چکی تھیں۔ بے جی بہت چاق و چوبند اور ہر وقت متحرک رہنے والی خاتون تھیں۔ سوہنی کے کتنے ہی کام انہوں نے خود ہی اپنے سر لے لیے تھے۔ حالانکہ سوہنی بہت منع کرتی تھی مگر بے جی ان سنی کر کے لگی رہتیں۔ بے جی کچھ دنوں سے دیکھ رہی تھیں کہ سوہنی اکثر ہی احمد سے کسی نہ کسی بات کو لے کر الجھنے لگتی تھی۔

احمد بھی مرد تھا۔ باہر سے تھکا ہارا آتا تو سوہنی کی ذرا سی بات پہ بھی بھڑک اٹھتا۔ اس طرح دونوں میں ان بن رہنے لگی تھی۔ گھر کا ماحول، جو کبھی خوشگوار ہوتا تھا وہ خاموش اور سہما سہما سا رہنے لگا تھا۔

بے جی کافی دنوں سے سوچ رہی تھیں کہ کن لفظوں میں سوہنی کو سمجھائیں کہ ان کی بات اسے بری بھی نہ لگے اور وہ سمجھ بھی جائے۔ احمد بیٹا تھا اس کے لیے ماں کا حکم بھی کافی تھا اور ویسے بھی گھر کو پر سکون رکھنے اور اس کا ماحول خوشگوار بنانے میں عورت کو زیادہ قربانی دینی پڑتی ہے۔ عورت کے صبر اور برداشت سے ہی گھر جنت بنتے ہیں۔ جس کی تلاش اور تمنا میں ہر مرد رہتا ہے۔

☆ ☆ ☆

اس دن موسم بہت خوشگوار تھا۔ ہوا کی مستیاں اپنے عروج پہ تھیں۔ سوہنی بے جی کے پاس بیٹھی ان کی ہدایت کی روشنی میں زین کی قمیص کاڑھ رہی تھی۔ بے جی کے ہاتھ میں بہت صفائی تھی۔ سوہنی بھی بے جی کی زیر نگرانی کچھ نہ کچھ سیکھتی رہتی تھی۔ تینوں بچے پاس ہی کھیل رہے تھے۔ سوہنی وقتاً "فوقتاً" ان تینوں پہ بھی نظر ڈال رہی تھی اور بے جی سے باتوں میں بھی مشغول تھی۔

"ارے یہ کیا کر رہے ہو۔۔۔ ہٹو وہاں سے۔"

سوہنی نے تینوں بچوں کو پنجروں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتے دیکھا تو انہیں منع کرنے لگی مگر تب تک چھوٹی آصفہ نے غلطی سے پنجرے کا دروازہ کھول دیا تھا اور اس میں مقید چڑیاں اڑنے کو پر تولنے لگیں۔

سوہنی بھاگتی ہوئی پنجرے تک آئی۔ تینوں بچے ماں کے غصے سے ڈر کر نیچے بھاگ گئے۔ سوہنی چڑیوں کو پکڑنے کی کوشش کرنے لگی۔ ان میں سے کچھ کو بہ مشکل واپس پنجرے میں ڈال پائی۔

"آنے دو آج ان کے باپ کو۔۔۔ وہ ہی خبر لیں گے ان تینوں کی۔ بہت بدتمیز اور شرارتی ہو گئے ہیں۔"

سوہنی ہوا کے زور سے لڑتی ادھر ادھر جاتی

"کیا ہوا بے جی! آپ ایسے کیوں دیکھ رہی ہیں؟"

سوہنی نے بے جی کو اپنی طرف پر سوچ نگاہوں سے دیکھتے پایا تو بولی۔

"سوہنی! تمہیں نہیں لگتا کہ تم نے زبردستی ان پرندوں کو قید کر کے ان کے فطری حق سے محروم کر دیا ہے۔"

بے جی نے کہا تو سوہنی اچنبھے سے بولی۔ "یہ کیا بات ہوئی بے جی! میرا شوق ہے پرندے پالنا۔ ان کی دیکھ بھال کرنا۔"

سوہنی نے کہا تو بے جی بے ساختہ بولیں۔ "جیسے تمہیں شوق ہے اپنے چھوٹے چھوٹے مسئلوں کو بھی پرندوں کی طرح قید کرنے کی کوشش کرتے رہنا۔"

"میں سمجھی نہیں آپ کی بات۔" سوہنی نے ہوا سے اڑتے اپنے بالوں کی چند لٹوں کو کان کے پیچھے کیا اور بے جی کی طرف دیکھ کر بولی۔

"سوہنی! کبھی تم نے غور کیا ہے پتر! یہ مسئلے بھی ایسے ہی ہوتے ہیں جیسے یہ پرندے۔ جس طرح پرندوں کو قید کرنے کی کوشش میں تم ہلکان ہو رہی ہو اسی طرح چھوٹی چھوٹی باتوں اور مسئلوں کے پیچھے بھاگنے اور انہیں پکڑنے کی کوشش میں ہم ایسے ہی الجھے اور ہلکان ہوتے رہتے ہیں۔

سوہنی پتر! تو چھوٹی چھوٹی باتوں اور مسئلوں کو لے کر سارا دن چکرائی رہتی ہے اور احمد کو بھی سنا سنا کر پریشان کر دیتی ہے۔ ان مسئلوں کو آنے والے وقت پہ بھروسا کر کے چھوڑ کر دیکھ۔ اس رب نے ہر چیز کا حل دے رکھا ہے۔ اگر تنگی ہے تو آسانی بھی اسی کی طرف سے آتی ہے۔"

بے جی نے گم صم کھڑی سوہنی کو پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"مگر بے جی۔۔۔ پرندوں کو آزاد کر دینے کی بات تو سمجھ آئی ہے مگر ان مسئلوں [illegible] یا ان سے کیسے آزادی حاصل کر سکتے ہیں؟ ہر انسان اپنے کل کو بہتر بنانے کے لیے سوچتا ہی ہے۔ اس میں غلط کیا ہے؟"

"پتر دیکھ! جب تک سانس چلتی ہے یہ مسئلے مسائل اسی طرح آتے جاتے رہتے ہیں۔ ان کا کوئی مستقل حل تو ہوتا نہیں ہے۔ تو کیوں نہ ہم اپنے عمل اور کوشش کے ساتھ ساتھ اس کی ذات پہ بھروسا کر کے توکل کو اپنا کر اپنے مسئلوں کو بھی آزاد فضاؤں میں پرندوں کی طرح اڑا دیں۔ ان کے بارے میں سوچنے سے یا کڑھنے سے پریشان رہنے سے وہ فوراً" ختم تو نہیں ہو جائیں گے۔"

بے جی نے نرمی اور محبت سے کہا تو سوہنی نے آگے بڑھ کر سب پنجروں کے دروازے کھول دیے۔ جن میں مقید پرندے آزادی پاتے ہی پھر کر کے اڑ گئے۔

"بے جی۔۔۔ ایسے ناں۔۔۔!"

سوہنی نے اڑتے پرندوں کو دیکھتے ہوئے کہا تو اس کے انداز پہ بے جی مسکرا دیں۔

"ہاں ایسے ہی۔۔۔" بے جی نے سوہنی سے کہا وہ ان کے پاس بیٹھ کر دوبارہ قمیص کاڑھنے لگی۔ سوہنی سمجھ چکی تھی کہ مسئلوں پہ ایک دوسرے سے الجھنے کے بجائے انہیں آنے والے کل کی فضاؤں میں آزاد چھوڑ دینا چاہیے۔ جو ذات سبب دے سکتی ہے وہ اسباب بھی خود ہی پیدا کر دیتی ہے۔ بس اس پہ توکل کر کے صبر سے اچھے وقت کا انتظار کرنا چاہیے۔

"بے جی! تسی بڑے چنگے ہو۔" سوہنی بے ساختہ بے جی سے لپٹی خالص پنجابی لہجے میں بولی۔

"ہٹ جھلی۔۔۔" بے جی نے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا اور اسے قمیص مکمل کرنے کی ہدایت دیتے ہوئے خالی پنجروں کی طرف بڑھ گئیں۔ پنجرے میں نہ سہی مگر آزاد اڑتے پرندوں کے لیے چھت پہ دانہ اور پانی تو رکھنا ہی تھا ناں۔۔۔

☆

وہاں کی روشنیوں نے بھی ظلم ڈھائے بہت
میں اُس گلی میں اکیلا تھا اور سائے بہت

کسی کے سر پہ کبھی ٹوٹ کر گرا ہی نہیں
اس آسماں نے ہوا میں قدم جمائے بہت

نہ جانے رُت کا تصرف تھا یا نظر کا فریب
کلی وہی تھی مگر رنگ جھلملائے بہت

جو موتیوں کی طلب نے کبھی اُداس کیا
تو ہم بھی راہ سے کنکر سمیٹ لائے بہت

بس ایک رات ٹھہرنا ہے، کیا گِلہ کیجیے
مسافروں کو غنیمت ہے یہ سرائے بہت

جمی رہے گی نگاہ ہوں پہ تیرگی دن بھر
کہ رات خواب میں تارے اُتر کے آئے بہت

شکیب کیسی اُڑان، اب وہ پر ہی ٹوٹ گئے
کہ زیرِ دام جب آئے تھے، پھڑپھڑائے بہت

شکیب جلالی

میرے شہرِ دل کو کس کی نظر لگ گئی
میری گلیوں کی رونق کہاں کھو گئی
روشنی بجھ گئی، آگہی سو گئی
ہم تو نکلے تھے ہاتھوں میں سورج لیے
رات کیوں ہو گئی؟
رات کیوں ہو گئی طالبانِ سحر؟
ہم سے کیوں روشنی نے یہ پردہ کیا
کیوں اندھیروں نے رستوں پہ سایا کیا
آؤ سوچیں ذرا!
آگہی سے پرے، روشنی کے بنا
جتنے امکان ہیں سارے مر جائیں گے
جو بھی تخلیق ہے، وہ بکھر جائے گی
زندگی اپنے چہرے سے ڈر جائے گی
طالبانِ سحر! آؤ سوچیں ذرا، آؤ دیکھیں ذرا
آرزو کے ستاروں سے دمکا ہوا
پرچمِ روشنی کس طرح پھٹ گیا
کون سا موڑ ہم سے غلط کٹ گیا
پھول رُت میں خزاں کس طرح چھا گئی؟
بیچ کیا ہو گئی؟
ہم تو نکلے تھے ہاتھوں میں سورج لیے
رات کیوں ہو گئی؟

امجد اسلام امجد

سرو صنوبر شہر کے مرتے جاتے ہیں
سارے پرندے ہجرت کرتے جاتے ہیں

جھوٹی سچی تعبیروں کی خواہش میں
کیسے کیسے خواب بکھرتے جاتے ہیں

کیسے کیسے یاروں کا بہروپ کھلا
کیسے کیسے خول اُترتے جاتے ہیں

ان حالوں کب اپنے آپ کو دیکھا تھا
کہنے کو دن رات گزرتے جاتے ہیں

ماں مٹی نے خوں مانگا تھا اور بیٹے
پانی سے تالاب کو بھرتے جاتے ہیں

کبھی کبھی کوئی ایسا مسافر آتا ہے
رستے اپنے آپ سنورتے جاتے ہیں

شہرِ غزل کی گلیوں میں دلگیر ترے
تجھ سے تیری باتیں کرتے جاتے ہیں

احمد فراز

شام ہوگی

بچھڑنا ہی اگر لکھا ہے قسمت میں
تو اس میں دیر کاہے کی
چلو اس پل اسی لمحے بچھڑتے ہیں
ابھی تم آنکھ جھپکو گے
ابھی میں ہاتھ اپنے دل پہ رکھوں گی
ابھی تم مجھ سے کہہ دو گے
جُدا ہیں راستے اپنے، مگر تم حوصلہ رکھنا
بچھڑنا ہی اگر لکھا ہے قسمت میں
تو اس میں دیر کاہے کی
چلو اس پل اسی لمحے بچھڑتے ہیں

فاخرہ بتول

پہلا اصول

ایک بڑے ڈپارٹمنٹل اسٹور کے مینجر نے ایک سیلز مین کو آفس میں بلا کر ڈانٹ ڈپٹ کرتے ہوئے کہا۔

"میں یہاں سے دیکھ رہا تھا کہ تم ایک گاہک سے لڑ رہے تھے۔ تمہیں تو دکان داری کا پہلا اصول ہی معلوم نہیں کہ گاہک کی کسی بھی بات کی کبھی تردید نہیں کرتے۔ وہ جو بات کہے، تمہیں جواب میں یہی کہنا چاہیے کہ "آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں جناب۔" اس کے بعد وہ اپنی بات سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ویسے وہ گاہک کہہ کیا رہا تھا؟"

سیلز مین نے سر جھکا کر جواب دیا۔

"سر! وہ کہہ رہا تھا کہ تمہارے مینجر سے بڑا گدھا میں نے آج تک نہیں دیکھا۔"

مہک علی۔۔۔ گجرات

ٹھوس ثبوت

تیز رفتاری کے جرم میں ایک صاحب کا چالان ہوا اور انہیں مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا گیا۔ انہوں نے صحت جرم سے انکار کرتے ہوئے کہا۔ "جناب عالی! میں تو صرف تیس کلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے جا رہا تھا۔"

"کیا تم اپنی بات کا کوئی ثبوت پیش کر سکتے ہو؟" مجسٹریٹ نے دریافت کیا۔

"جناب! ثبوت کے طور پر صرف اتنا جان لینا کافی ہے کہ اس وقت میں اپنی بیوی کو لینے اپنے سسرال جا رہا تھا۔" ان صاحب نے جواب دیا۔

انیلا سرفراز۔۔۔ ہجرت کالونی

کنجوسی

اسکاٹ لینڈ کا ایک کاشت کار باشندہ نہایت کنجوس تھا۔ گیہوں کو فروخت کرنے کے بعد وہ پوسٹ آفس پہنچا، تاکہ اپنی بیوی کو ٹیلی گرام بھیج سکے۔ اس نے ٹیلی گرام کی عبارت لکھی۔

"گیہوں کو خاصے منافع پر فروخت کر دیا ہے۔ میں کل آ رہا ہوں تمہارے لیے تحفہ لے کر۔"

پوسٹ آفس والے کو یہ عبارت پکڑاتے ہوئے اسے کچھ خیال آیا۔ اس نے پیغام واپس لے لیا اور خود سے مخاطب ہوا۔

"منافع کے بارے میں لکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ اچھی طرح جانتی ہے کہ میں نقصان میں تو فروخت کروں گا نہیں۔" سو اس نے عبارت کے وہ الفاظ کاٹ دیے اور دوبارہ مضمون باندھا۔

"گیہوں کو فروخت کر دیا ہے۔"

یہ لکھ کر وہ دوبارہ تذبذب کا شکار ہو گیا۔ "یہ لکھنے کی بھی کیا ضرورت ہے۔ اسے معلوم ہے کہ میں اسی کام کے لیے شہر آیا ہوں۔"

اس نے یہ جملہ بھی قطع کر دیا اور دوبارہ لکھا۔

"تمہارے لیے تحفہ لے کر۔۔۔"

یہ جملہ لکھ کر پھر سوچ میں پڑ گیا۔ "کیوں۔۔۔ یہ کوئی سالگرہ یا تہوار کا موقع تو نہیں ہے۔"

لہٰذا یہ الفاظ بھی اس نے کاٹ دیے۔ اس کے بعد اس نے ٹیلی گرام کے پیسے جیب میں واپس رکھے اور خوشی خوشی پوسٹ آفس سے باہر آ گیا۔

"گھر جا کر خود ہی بتا دوں گا سب۔"

سیما راشد۔۔۔ جی ٹی روڈ

غلط

تعمیراتی کمپنی کے ایک بڑے منصوبے میں مکانوں کی طرز تعمیر یکساں تھی۔ ایک نئی فیملی اس آبادی میں منتقل ہوئی اور اپنے مکان میں اوون نصب کروایا۔ کچھ دنوں بعد اوون والوں کی دکان پر فون موصول ہوا۔

"جناب! کچھ دن قبل ہم نے آپ سے اپنے گھر میں اوون نصب کروایا تھا۔ وہ اکھاڑنا پڑے گا۔ کیونکہ وہ آپ نے غلط گھر میں لگا دیا ہے۔"

"غلط گھر میں۔۔۔" دکان کے مالک نے حیرت سے کہا۔ "یہ کیسے ممکن ہے۔ آپ لوگ خود وہاں موجود تھے۔"

"وہ بات تو ٹھیک ہے جناب! دراصل۔۔۔ ہم خود غلط گھر میں شفٹ ہو گئے تھے۔" مالک مکان نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔

مہوش اسلم۔۔۔ ٹھٹھہ

مقام شکر

پولیس نے ڈاکوؤں سے مقابلے کے بعد جنگل کا محاصرہ ختم کیا تو ڈی ایس پی نے انسپکٹر سے پوچھا۔

"تمہاری نفری پوری ہے نا؟" انسپکٹر نے اثبات میں جواب دیا مگر ڈی ایس پی تشویش سے دوبارہ بولا۔

"تم نے اچھی طرح گنتی کر لی تھی نا؟"

"جی ہاں سر! میں نے خوب اچھی طرح گنتی کر لی تھی۔" انسپکٹر نے بھرپور یقین سے جواب دیا۔

"شکر ہے۔" ڈی ایس پی نے اطمینان کی سانس لی۔ "اس کا مطلب ہے کہ میں نے جس بھاگتے ہوئے سائے پر گولیاں برسائی تھیں، وہ ڈاکو ہی تھا۔"

عرفانہ نثار۔۔۔ کھاریاں

انشورنس پالیسی

"سر! آپ ہماری ایک انشورنس پالیسی لے لیں۔ دوسری مفت ملے گی۔" اس نے اپنے تئیں ایک زبردست پیش کش کی۔

"اگر میں مر گیا تو؟" میں نے تشویش سے پوچھا۔

"پہلی کے پیسے پہلی بار مرنے پر۔ دوسری کے پیسے دوسری بار مرنے پر۔" وہ نہایت اطمینان سے بولا۔

"میرا لائف انشورنس لینے کا کوئی ارادہ نہیں۔ میں تعطیلات پر جا رہا ہوں۔" میں نے بر امان کر قطعیت سے کہا۔

"اچھا تو ٹریول انشورنس کروا لیں۔" اس نے فوراً دوسری پیش کش کر ڈالی۔

"میرا چھٹیوں پر دوسرے جہان جانے کا پروگرام ہے۔" میں نے جل کر کہا۔

"خوب۔۔۔ بہت خوب۔۔۔ ہم اسلامی انشورنس بھی کرتے ہیں۔" وہ میرے غصے سے متاثر ہوئے بغیر خوش دلی سے بولا۔

"رہنے دو بھائی۔۔۔ میں جہنم جا رہا ہوں۔" میں سخت بے زار ہو کر بولا۔

"سر! پھر آپ ہماری ہیلتھ انشورنس پالیسی لے لیں۔" وہ متانت سے بولا۔ "یہ آگ سے جلنے والے زخموں کو کور کرتی ہے۔"

مہرین نعمان۔۔۔ اسلام آباد

گھر والا

راستے میں ایک صاحب کو اپنے دوست مل گئے۔ ان کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ صاحب پریشان ہو کر دوست سے کہنے لگے۔

"اوہو۔۔۔ یہ کیا حالت ہو رہی ہے تمہاری۔۔۔ آؤ میں تمہیں گھر چھوڑ آؤں۔"

"رہنے دو۔۔۔ میں ابھی گھر سے ہی آ رہا ہوں۔" دوست نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔

فریال صلاح الدین۔۔۔ سائٹ ایریا

نغمہ کا دولہا

دلہن رخصت ہو رہی تھی۔ رشتے دار خواتین اور

دلہن کی سہیلیاں گلے مل مل کر رو رہی تھیں۔ وہیں ایک لڑکی ایک کونے میں کھڑی بجائے رونے کے غصے سے دانت پیس رہی تھی۔

"کیا بات ہے۔ تم یہاں کیوں کھڑی ہو۔ کیا تمہیں نغمہ کی رخصتی کا دکھ نہیں ہو رہا۔" دوسری سہیلی نے ناک پونچھتے ہوئے کونے میں کھڑی لڑکی سے پوچھا۔

"دکھ کرے میری جوتی۔" لڑکی نے غصے سے کہتے ہوئے ساتھ ہی پیر بھی زور سے زمین پر مارا۔

"جو سلوک نغمہ نے میرے ساتھ کیا۔ کوئی دشمن بھی نہیں کر سکتا۔ وہ ہمیشہ مجھ سے کہتی تھی۔ ندیم سے جتنی ترش روی سے پیش آؤ گی۔ اتنا ہی اس کے اندر تمہارے لیے جذبہ محبت بڑھے گا۔"

"ندیم کون؟" سہیلی رونا بھول کر حیرت سے پوچھنے لگی۔

"نغمہ کا دولہا۔" لڑکی نے دوبارہ دانت پیسے۔

حمنہ عدنان۔۔۔ گلستان جوہر

سرکاری افسر

ایک صاحب بستر پر لیٹے لیٹے کسی کام سے بچوں کو آوازیں دے رہے تھے مگر کوئی بچہ ان کی بات نہیں سن رہا تھا۔ بیگم بھی وہیں موجود تھیں۔ وہ بھی لاپروائی سے ایک طرف بیٹھی رہیں۔ شوہر کی برداشت سے باہر ہوا تو طنزیہ کہنے لگے۔

"بیگم! مجھے لگتا ہے۔ ہمارے بچے کسی ہوٹل کے بیرے بنیں گے۔ جب بھی انہیں بلاتا ہوں، حاضر ہی نہیں ہوتے۔"

"زبان سنبھال کر بات کرو۔" بیگم غضب ناک ہو کر بولیں۔ "یہ دو ٹکے کی نوکریاں تم خود کرنا۔ میرے بچے سرکاری افسر بنیں گے۔ وہ کسی کی نہیں سنیں گے۔ خواہ ان کا باپ ہی کیوں نہ ہوں۔"

جویریہ عدنان۔۔۔ گلستان جوہر

بور بت

"ڈاکٹر صاحب! میں بہت پریشان ہوں۔ مجھے بہت زیادہ بولنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ اتنی کہ میں اپنے آپ سے بھی باتیں کرنے لگی ہوں۔"

خاتون نے ماہر نفسیات سے اپنی پریشانی بیان کی۔

"اس میں پریشان ہونے والی کیا بات ہے۔" ماہر نفسیات نے آنکھیں سکوڑ کر پوچھا۔

"ڈاکٹر صاحب! بہت زیادہ باتیں کر کے میں اپنے آپ کو کتنا بور کرتی ہوں۔ آپ کو اس کا اندازہ نہیں ہے۔" خاتون رونکھی ہو کر بولیں۔

ماہم جبین۔۔۔ لیبر اسکوائر

گھر کی مرغی

سیکریٹری نے اپنے باس کے کمرے میں داخل ہو کر کہا۔

"سر! ایک خاتون آپ سے ملاقات کرنا چاہتی ہیں۔"

"کیا وہ خوب صورت ہے؟" باس نے اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھا۔

"جی ہاں! انتہائی خوب صورت اور دلکش۔" سیکریٹری نے جواب دیا۔

"اچھا۔۔۔ اسے اندر بھیج دو۔" باس نے کہا اور جلدی جلدی اپنے بال سنوارنے لگا۔ جب وہ عورت ملاقات کر کے چلی گئی تو باس نے اپنے سیکریٹری کو طلب کیا۔

"تم احمق تو نہیں ہو۔۔۔؟" باس نے غصے میں کہا۔ "اس بدصورت عورت میں تمہیں حسن کہاں سے نظر آ گیا تھا؟"

"میں معذرت خواہ ہوں سر!" سیکریٹری نے لجاجت سے کہا۔ "انہوں نے اپنا نام نہیں بتایا تھا، ان کے انداز سے میں سمجھا کہ وہ آپ کی بیوی ہیں۔"

"وہ میری بیوی ہی تھی۔" باس نے آہستہ سے کہا۔ "جاؤ دفع ہو جاؤ۔"

فوزیہ سعید۔۔۔ گلشن اقبال

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابوجری جابر بن سلیم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا۔

"مجھے نصیحت فرما دیجیے۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"کبھی کسی کو گالی نہ دینا۔"

حضرت ابوجری فرماتے ہیں، اس کے بعد میں نے کبھی کسی کو گالی نہیں دی۔ نہ آزاد کو نہ غلام کو نہ اونٹ کو نہ بکری کو۔

یہ تھی حکومت،

ایک دن سخت گرمی والی دوپہر حضرت عمرؓ تنہا جنگل کی طرف جا رہے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے دور سے دیکھا تو پہچان لیا کہ امیر المومنین ہیں۔ قریب جا کر دریافت فرمایا۔

"امیر المومنین! اس سخت گرمی اور لو میں کہاں جا رہے ہیں؟"

فرمایا: "بیت المال کا ایک اونٹ گم ہو گیا ہے اس کی تلاش میں جا رہا ہوں۔"

انہوں نے عرض کیا: "کسی خادم کو کیوں نہ بھیج دیا؟"

فرمایا: "قیامت میں سوال مجھ سے ہوگا، خادم سے نہیں۔"

عرض کیا: "پھر تھوڑی دیر توقف کر کے تشریف لے جائیے، ذرا گرمی کم ہو جائے۔"

فرمایا: "جہنم کی آگ اس سے بھی زیادہ گرم ہے۔" یہ کہہ کر اسی دھوپ اور لو میں تشریف لے گئے۔

فہمیدہ اطہر۔ لاہور

اللہ کی رحمت سے نہ مایوس ہو،

امید کے متعلق بیسیوں کہانیاں ہیں مگر ابو علی ناقد کی کہانی سب سے عجیب ہے۔ یہ امیر المومنین معتضد کی خلافت کے عہد میں جیل کے قیدیوں کو کھانا بہم پہنچاتا تھا۔

وہ بیان کرتا ہے کہ ایک دن مجھے قید خانے میں ایک ایسے قیدی سے سابقہ پڑا جس سے انتہائی بے رحمی سے سلوک کیا جاتا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پیروں میں بیڑیاں پڑی تھیں۔ اور لوہے کی ایک بہت بڑی بل اس کی کمر پر رکھی جاتی تھی۔

میں نے اس سے اس بامشقت سزا کا سبب پوچھا تو اس نے جواب دیا۔

"بالکل بے گناہ ہوں اور کسی اور مجرم کا خمیازہ بھگت رہا ہوں۔ واقعہ یوں ہے کہ ایک رات یحییٰ کے بازار میں ایک دوست کے ہاں میری دعوت تھی۔ کھانے سے فارغ ہو کر دیر تک میں اور وہ دوست ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے جب نیند نے ستایا تو میں رخصت ہو کر اپنے گھر چلا آیا۔ بازار میں پہنچا ہی تھا کہ کوتوال اور اس کے سپاہیوں نے مجھے گرفتار کر لیا۔

بات یہ تھی کہ اس رات ایک شخص قتل کر دیا گیا تھا اور اس کی لاش سڑک کے اس حصے میں پڑی تھی جہاں سپاہیوں نے مجھے دیکھا تھا۔ ان کو غلط فہمی ہوئی کہ قاتل میں ہی ہوں۔ چنانچہ مجھے پکڑ لیا اور کوتوالی میں لے جا کر بہت مارا پیٹا کہ اپنے جرم کا اقرار کر لوں مگر چونکہ یہ جرم میں نے نہیں کیا تھا اس لیے میں برابر انکار کرتا رہا۔ جب وہ کسی طرح میرا جرم ثابت نہ کر سکے تو مجھے قید خانے بھیج دیا۔

میرے عزیز و اقربا بغداد کے بڑے بڑے لوگوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ انہوں نے میری بے گناہی کی شہادتیں دیں، اس لیے میں پھانسی کی سزا سے تو بچ گیا مگر قید سے نہ چھوٹ سکا۔ چنانچہ سولہ سال سے میں یہاں قید ہوں اور سزائے بامشقت کاٹ رہا ہوں

لیکن اس تکلیف کے باوجود اللہ کے فضل و کرم سے مایوس نہیں ہوں۔ مجھے امید ہے کہ ایک نہ ایک دن میں آزاد ہو جاؤں گا اور اس دوزخ سے نکل کر آزادی اور آرام کا سانس لے سکوں گا۔"

ابوعلی ناقد کہتا ہے کہ میں اور وہ قیدی ابھی باتوں میں مصروف تھے کہ اتنے میں شور و غل کی آوازیں آئیں۔ معلوم ہوا کہ قید خانے کا دروازہ توڑ دیا گیا ہے اور جیلر کو قتل کر کے قیدیوں کو رہا کر دیا گیا ہے۔ میں اور میرا ساتھی بھی باہر نکلے اور میں اس کی امید کی انتہا اور یک بہ یک اس کی کامیابی پر تعجب کرتا ہوا اس سے رخصت ہوا۔

عائشہ۔ گوجرہ

ہمیں عادت ہے حرف چننے کی

- اپنے آپ سے محبت کرنا اتنا سنگین گناہ نہیں جتنا اپنے آپ سے لاپروائی ہے۔ (شیکسپیئر)
- حسد حاسد کو مرنے سے پہلے مار دیتا ہے۔ (بقراط)
- محبت، احساسات کی تفسیر کا نام ہے۔ (بروس لیز)
- غلطی مان لینے سے انسان کا ذہنی بوجھ کم ہو جاتا ہے۔ (سائرس)
- جب صورت حال خطرناک ہو تو دانا لوگ خاموش رہتے ہیں (جان سلزن)
- قلم کا زخم بہت گہرا ہوتا ہے۔ یہ زندوں کو موت کی نیند سلا سکتا ہے۔ مردوں کو زندگی بخشتا ہے۔ (جان ٹیلر)
- جس چیز کی ضرورت نہیں اس کی جستجو مت کرو۔ (سقراط)
- سیدھے راستے کی درازی سے اندیشہ نہ کرو۔ (سقراط)
- ٹھوکر لگنے سے پہلے جو ہوشیار ہو جائے، وہ کامیاب ہوتا ہے۔ (سقراط)
- معاشرے میں باغیوں کا وجود ضروری ہے، ورنہ سب کا ایک جیسا ہونا کوئی اچھی بات نہ ہوگی۔ (ڈی جے این رائٹ)
- کچھ چیزیں جلد کھو جانے کے لیے ہی ہوتی ہیں، ان کے لیے چیزوں کو کھونے کا فن سیکھ کر خوش رہنے کا فن سیکھیں۔ (الزبتھ بشپ)
- ساکھ بنانے میں بیس سال لگتے ہیں اور یہ ساکھ پانچ منٹ میں برباد ہو جاتی ہے۔ (وارین بفٹ)
- زندگی میں میری کامیابی کا راز یہ ہے کہ میں پندرہ منٹ پہلے اپنے کام پر موجود ہوتا ہوں۔ (روز ویلٹ)
- جسمانی بدصورتی کے علاوہ بھی بدصورتی کی بہت سی قسمیں ہیں، مثلاً احمق ہونا، جاہل ہونا، لالچی ہونا، ہوس پرست ہونا۔ (آلڈس ہکسلے)
- جس کا ارادہ پختہ اور اٹل ہے وہ دنیا کو اپنے سانچے میں ڈھال سکتا ہے۔ (جان سائرن)

سیدہ نسبت زہرا۔ کہروڑ پکا

کہاوتیں

- زندگی صرف نسل کے لیے ہوتی ہے اور اچھا نام ہمیشہ کے لیے۔ (جاپانی کہاوت)
- کامیابی وہ سیڑھی ہے جس پر جیبوں میں ہاتھ ڈال کر نہیں چڑھا جا سکتا۔ (امریکی کہاوت)
- ذہن ایک پیراشوٹ کی طرح ہوتا ہے کہ اسے کھولیں گے تو یہ کام کرے گا۔ (ہندی کہاوت)
- کسی کی خوشیوں میں شریک ہونے سے اس کی خوشیاں دوگنی ہو جاتی ہیں اور کسی کے غموں میں شریک ہونے سے غم آدھے ہو جاتے ہیں۔

(سوئٹزرلینڈ کی کہاوت)

- سوتے ہوئے کتے کو سویا رہنے دو، بیدار ہو کر وہ یقیناً آپ پر بھونکے گا۔ (ترکش کہاوت)
- اگر تم خود ترقی نہیں کر سکتے تو دوسروں کو ترقی کرتے دیکھ کر آنکھیں بند مت کرو۔ (جرمن کہاوت)
- تلوار اور عورت کی چلتی ہوئی زبان کو مدہم کرنا ہی اصل بہادری ہے۔ (روسی کہاوت)
- روتی ہوئی عورت اور بیمہ ایجنٹ کی باتوں پر کبھی اعتبار مت کرو۔ (جاپانی کہاوت)

گڑیا شاہ۔ کہروڑ پکا

زبان کے لگائے ہوئے زخم

کسی جگہ ایک لڑکا رہتا تھا، انتہائی اکھڑ مزاج اور غصے سے بھرا رہنے والا۔ اسے راضی کرنا تو آسان کام تھا ہی نہیں۔

ایک دن اس کے باپ نے ایک تھیلی میں کچھ کیلیں ڈال کر اسے دیں کہ آئندہ جب بھی تم اپنے آپے سے باہر ہو جاؤ یا کسی سے اختلاف رائے ہو جائے تو گھر کے باغیچے کی دیوار پر جا کر ایک کیل گاڑ دیا کرو۔

لڑکے نے پہلے دن باغیچے کی دیوار پر سینتیس کیلیں گاڑیں لیکن اگلے دن سے اس نے بار بار باغیچے میں جا کر دیوار پر کیل ٹھونکنے کے بجائے اپنے آپ پر کنٹرول کرنا شروع کر دیا اور روزانہ دیوار پر گاڑی جانے والی کیلوں کی تعداد کم سے کم ہوتی چلی گئی، حتیٰ کہ ایک دن اس نے ایک بھی کیل دیوار میں نہ گاڑی شام کو لڑکے نے باپ کو خوشی سے بتایا کہ اس نے آج ایک بھی کیل دیوار میں گاڑنے کے لیے استعمال نہیں کی۔

باپ نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اس سے کہا۔ "ٹھیک ہے مگر آج سے تم ایک اور کام کرو، جس سارے دن میں تم اپنے آپ پر مکمل کنٹرول رکھو تو اس دن جا کر دیوار سے ایک کیل واپس نکال لیا کرنا۔"

اس کام میں بہت سے دن لگ گئے مگر آخر کار وہ دن آ پہنچا جب لڑکا دیوار سے ساری کیلیں واپس باہر کھینچ چکا تھا۔

باپ لڑکے کا ہاتھ پکڑ کر اسے باغیچے کی دیوار کے پاس لے گیا اور کہا

"بیٹے! بے شک تم نے اس عرصے میں اپنے غصے اور مزاج پر قابو پا کر بہت اچھی کارکردگی دکھائی ہے، مگر اس دیوار کو دیکھو جس پر کیلوں کے گاڑنے اور اکھاڑنے سے پڑنے والے بدنما نشانات ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہ گئے ہیں۔ اور یہ دیوار اب دوبارہ کبھی ویسی نہ ہو سکے گی جس طرح کہ پہلے تھی۔ بالکل اسی طرح جب تم اپنے معاملات میں دوسروں سے اختلاف رائے کے دوران یا غصے کی حالت میں تند و تیز باتیں، طعن و تشنیع یا بدزبانی کرتے ہو تو ان پر بالکل ایسے ہی گہرے اور برے اثرات چھوڑ رہے ہوتے ہو جا ہو تو خنجر کسی کے پیٹ میں گھونپ دو۔ خنجر سے لگا ہوا زخم مندمل ہو جائے گا، تمہاری معافی اور التجا سے اس شخص کے ساتھ تمہارے تعلقات بھی دوبارہ بحال ہو جائیں گے مگر خنجر کے زخم کے اثرات ہمیشہ باقی رہیں گے۔ زبان کے لگے ہوئے زخم تو خنجر کے لگے ہوئے زخموں سے بھی زیادہ دلوں پر گہرے اثرات رکھتے ہیں۔ دوست نایاب ہیرے اور بیش قیمت جواہرات کی مانند ہوتے ہیں، بہتر ہے کہ اپنی زبان کو قابو میں رکھنا کہ اس کے لگائے ہوئے گھاؤ مندمل نہیں ہوں گے۔"

(فرائیڈے اسپیشل۔ روزنامہ جسارت)

دین

مسجد ہی فقط اللہ کا گھر نہیں، اس کے باہر ایک دوسری مسجد بھی ہے۔ اس سے بہت بڑی، جس کا نام دنیا ہے۔ جس طرح چھوٹی سی مسجد میں آدمی ہر کام اور ایک ایک حرکت اللہ کی ہدایت کے مطابق انجام دیتا ہے، اس طرح اس مسجد سے باہر بھی آدمی اپنے سارے معاملات اور تعلقات اللہ تعالیٰ کے فرمان کے بموجب قائم رکھے تو یہی عبادت ہے اور اسی کا نام دین ہے۔

تحریم۔ فیصل آباد

خالد جیلانی

فوزیہ ثمر بٹ ——— گجرات

مجھے ضبط غم پہ غرور تھا، میرے آنسوؤں نے دغا کی
میرے راز پرسش حال پر میری چشم غم سے ٹپک گئے
مجھے چھوڑ دیں کہ سنبھال لیں میری لاج آپ کے ہاتھ ہے
مجھے اعتراف شکست ہے میرے پاؤں راہ میں تھک گئے

اُمِ امستل ——— گنگا منڈ ضلع گجرات

ہر خواب اپنے میری آنکھوں کے حوالے کر کے
تو کہاں ہے مجھے سپنوں کے حوالے کر کے
مجھ کو معلوم تھا اک روز چلا جائے گا
وہ مری عمر کو یادوں کے حوالے کر کے

سیدہ نسبت زہرا ——— کہروڑ پکا

اک ادھورے عشق کا قصہ چھیڑا اور شام کچھ ڈھلنے لگی
گھر کا گھر پرچھائیوں سے بھر گیا اور شام کچھ ڈھلنے لگی
موسم سرما کی ڈھلتی آخری بے رنگ شاموں کے بیچ
زخم مہکے، درد سا دل میں اٹھا اور شام بھی ڈھلنے لگی

حمنہ شاہ کھگا ——— ملتان

کیسے جی سکتے اگر پل پل کا کرتے احتساب
زیست کی خاطر بہت کچھ درگزر کرنا ہی تھا

آمنہ اُجالا ——— ڈہرکی

کوئی روٹھے اگر تم سے اُسے فوراً منا لینا
انا کی جنگ میں اکثر جدائی جیت جاتی ہے

نویدہ ——— گوجر خان

مجھے منزلوں سے عزیز تر تیری راہ گزر کی مسافتیں
کہ لکھی ہیں میرے نصیب میں ابھی عمر بھر کی مسافتیں

حنا سلیم اعوان ——— گاؤں اکھون باندی

اہل نظر کے بحث میں کس نے یہ کہہ دیا
رہنا کسی کے ساتھ، محبت کسی کے ساتھ
ہوتی ہے اس کے دل کو کسی اور کی طلب
رکھتی ہے عمر بھر اسے قسمت کسی کے ساتھ

شفق شان شاہ ——— گوجرہ

اُس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑی تو محسوس ہوا
یہی وہ جگہ ہے جہاں راستہ بدلنا ہے

رخسانہ کوثر ——— کوٹلی آزاد کشمیر

سوچتے ہیں بنا ہی ڈالیں اب
کوئی فرقہ اداس لوگوں کا

سیدہ نسبت زہرا ——— کہروڑ پکا

کر دے مجھ سے کوئی وعدہ کبھی نہ بچھڑنے کا
تمہیں کیا فرق پڑتا ہے بچھڑتے ہیں، سسکتے ہیں

گڑیا شاہ ——— کہروڑ پکا

ہے آج بھی ہماری انا کا وہی مزاج
مشکل ہے اپنے درد کا اظہار آج بھی

فوزیہ ثمر بٹ ——— گجرات

مجھے محبت کرنا نہیں آتا
مجھے محبت کے سوا کچھ نہیں آتا
زندگی گزارنے کے دو ہی طریقے ہیں محسن
ایک مجھے نہیں آتا، ایک مجھے نہیں آتا

نوال افضل گھمن ——— گجرات

یہ غلط ہے عرش بریں نہیں کہاں پاؤں رکھوں زمیں نہیں
تیرے در پہ سجدے کا شوق ہے جو یہاں نہیں تو کہیں نہیں
کسی بت تراش نے شہر میں مجھے آج کتنا بدل دیا
میرا چہرہ میرا نہیں رہا یہ جبیں بھی میری جبیں نہیں

رضوانہ شکیل راؤ ——— لودھراں

کیا حسن اتفاق ہے ان کی گلی میں ہم
اک کام سے گئے تھے کہ ہر کام سے گئے

ارم کمال ——— فیصل آباد

انا کا معاملہ درپیش تھا ورنہ حقیقت میں
اسے میری، مجھے اس کی کمی محسوس ہوتی ہے

شائستہ اکبر ——— گڈو کالونی

پاس خاطر تھا اسیری میں ہمیں صیاد کا
ورنہ ہوتا دام سب ٹکڑے اگر پر مارتے

لاریب ——— چونیاں

ظلم سے نسل پڑھے جبر سے تن میل کرے
یہ عمل ہم میں ہے بے علم پرندوں میں نہیں
ہم جو انسانوں کی تہذیب لیے پھرتے ہیں
ہم سا وحشی کوئی جنگل کے درندوں میں نہیں

ندا یوسف ——— فیصل آباد

دیے جو بام پر رکھے تھے میں نے بجھ گئے سارے
اسی تاریک شب میں اُس کو میرے گاؤں آنا تھا
وہ جب اوجھل ہوا تو ہم بھی اپنے آپ سے چونکے
اُسے آواز دینا تھی، اُسے واپس بلانا تھا

نادیہ عباس دیا ——— موسیٰ خیل

عمر بھر کا حساب کر ڈالا
اس نے پھر لاجواب کر ڈالا
ہم خزاں کا اجاڑ منظر تھے
چھو کے اس نے گلاب کر ڈالا

کائنات اصغر بلوزدار ——— ڈہرکی

اس رات ٹوٹتے ہوئے تاروں کی گونج میں
ہم کتنی دیر چلتے رہے، کچھ پتا نہیں
کب تک ہم اپنے ان کہے لفظوں کی کرچیاں
فرش ہوا سے چنتے رہے کچھ پتا نہیں

زینت نذیر ——— لاہور

پھر یوں ہوا کہ دل یکجا نہیں رہے
وہ بھی انا پرست تھا میں بھی انا پرست تھا

نخبہ اکرم ——— گاؤں کو ٹیگی

میرے دیکھے ہوئے سپنے کہیں لہریں نہ لے جائیں
گھروندے ریت کے بنا کر توڑ دیتا ہوں
عدیم اب تک وہی بچپن وہی تخریب کاری ہے
قفس کو چھوڑ دیتا ہوں پرندے چھوڑ دیتا ہوں

آسیہ جاوید ——— علی پور چٹھہ

حال پر میرے توجہ، میری ہر بات پہ جی
اب جو ہے مجھ پہ عنایت کبھی ایسی تو نہ تھی

شاہ ——— کہروڑ پکا

پھر یوں ہوا کہ ساتھ تیرا چھوڑنا پڑا
ثابت ہوا کہ لازم و ملزوم کچھ بھی نہیں

حمنہ حبیب ——— عبدالحکیم

کیا غضب ہے کہ اُس کی خاموشی
مجھ سے باتیں ہزار کرتی ہے

فاطمہ ——— کبیر والا

اس کی صورت کو جب سے دیکھا ہے
میری آنکھوں پہ لوگ مرتے ہیں

نوال افضل گھمن ——— گجرات

کبھی موسموں کے سراب میں کبھی بام و در کے عذاب میں
وہاں عمر ہم نے گنوا دی جہاں سانس لینا محال تھا
کہیں خون دل سے لکھا ہوا تھا تیرے سال ہجر کا سانحہ
وہ ادھوری ڈائری کھو گئی وہ نجانے کون سا سال تھا

مریم خان ——— لانڈھی کراچی

کتنی بدل چکی ہے وہ رُت جذبے بھی وہ نہیں رہے
دل پہ تیرے فراق کے صدمے بھی وہ نہیں رہے
یہ بھی ہوا کہ تیرے بعد شوق سفر نہیں رہا
جن پہ بچھے ہوئے تھے دل رستے بھی وہ نہیں رہے

عروبہ خان ——— مری

انا پرست ہے اتنا کہ بات سے پہلے
وہ اُٹھ کے بند میری ہر کتاب کر دے گا

سنیں صبغت ——— کینیڈا

تھی میری تباہی میں کچھ دشمنوں کی بھی سازش
ورنہ یہ اجڑنے کا موسم تو نہیں تھا

سیتل آصف ——— حیدر آباد

تیرے گرد ہے میری دعاؤں کا دائرہ
میں تیری عافیت کی مبارک لکیر ہوں

مریم اُمِ امستل ——— گجرات

زخم دینے کا انداز کچھ ایسا ہے
زخم دے کر پوچھتے ہیں اب حال کیسا ہے
کسی ایک سے گلہ کیا کرنا اے دوست
ساری دنیا کا مزاج ایک جیسا ہے

دستک دستک دستک

شاہین رشید

ثانیہ سعید

"اسیلو جی کیا حال ہیں۔"

"جی اللہ کا شکر ہے۔"

"نم اور اسیرزادی۔ بیک وقت دو سیریلز آن ایر ہوئے۔ ایک میں نگیٹو رول اور دوسرے میں پوزیٹو رول تھا۔ رسپانس کس کا زیادہ اچھا تھا؟"

"رسپانس تو دونوں کا ہی بہت اچھا تھا۔ ایک میں مظلوم بیوی کا جو اپنے سے کم عمر شوہر کو بہت ناز و نعم سے پالتی ہے اور پھر جب وہ جوان ہو جاتا ہے تو خوشی خوشی اس کی شادی کر دیتی ہے۔ لوگوں نے بہت زیادہ ہمدردی کا اظہار کیا کہ آپ کے ساتھ بہت زیادتی ہوئی ہے اور ایک بیوی کے لیے یہ بڑا امتحان ہے کہ وہ اپنے ہاتھوں سے اپنے شوہر کی شادی کروائے۔"

"ونی کے موضوعات پر کئی سیریلز بن چکی ہیں مگر اس کی انفرادیت یہ تھی کہ اس میں ایک پڑھے لکھے گھرانے کو دکھایا گیا تھا۔"

"بالکل۔ تب ہی تو سارے کام صبر و شکر سے ہوئے مگر اس کی کم عمر بیوی تو ہمیشہ میری دشمن ہی رہی جبکہ میں اس کے ساتھ مخلص تھی۔"

"تو کیا ابھی بھی یہ روایات پائی جاتی ہیں اور زمانہ اتنی ترقی کر گیا ہے پھر بھی اسے زندہ رکھا ہوا ہے؟"

"مسئلہ یہ ہے کہ انسان کتنا ہی پڑھ لکھ کیوں نہ جائے اپنی روایات کے تابع ہی رہتا ہے اور یہ روایات انچھی بھی ہیں۔ کبھی بڑی عمر کی لڑکی اس کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے تو کبھی بہت ہی چھوٹی عمر کی لڑکی ایک بوڑھے آدمی کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے۔ یہ فرسودہ رسم و رواج ہیں ان کا خاتمہ ہونا چاہیے ورنہ لڑکیاں تو جیتے جی مر جائیں گی۔"

"ثانیہ! آپ نے ہمیشہ پوزیٹو رول کیے۔ شاید "اسیرزادی" میں پہلی بار نگیٹو رول کیا۔ یہ کردار طبیعت کے خلاف تھا؟"

"کوئی رول فنکار کی طبیعت کے خلاف نہیں ہوتا۔ کیونکہ فنکار نام ہی ایسی شخصیت کا ہوتا ہے، جو ہر رول کرنا جانتا ہو۔ تو اسیرزادی کا رول مجھے اچھا اور عام روٹین سے ذرا ہٹ کے لگا۔ اس لیے میں نے کر لیا اور اس کا بھی بہت اچھا رسپانس ملا۔ ایک طرف "نم" سے ہمدردیاں مل رہی تھیں تو دوسری طرف

"اسیرزادی" سے نفرت۔ تو یہ سب کچھ تو چلتا رہتا ہے۔"

"اور جھمکا جان میں طوائف کا کردار؟"

"ہاں اسے بھی لوگوں نے بہت پسند کیا تھا اور مجھے بہترین اداکاری کا لکس ایوارڈ بھی ملا تھا۔ بس زندگی کے تجربات اور مشاہدات کا نچوڑ ہم تو پیش کر دیتے ہیں۔ لوگ پسند کرتے ہیں تو خوشی ہو جاتی ہے مجھے پہلا "ہم" ٹی وی ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔"

"تنقید و تعریف کو انجوائے کرتی ہیں؟"

"نہ صرف انجوائے کرتی ہوں بلکہ سیکھتی بھی بہت کچھ ہوں۔ صحیح تو کہا جاتا ہے ہم فنکار ساری عمر سیکھنے کے عمل سے گزرتے رہتے ہیں۔"

"جس طرح ایک ڈاکٹر ساری عمر پڑھنے کے عمل سے گزرتا رہتا ہے۔ خیر یہ بتائیے سال میں ایک یا دو سیریلز کیوں کرتی ہیں؟"

"میں کام کا بیڑا دو صورتوں میں اٹھاتی ہوں ایک تب کہ میں ذہنی طور پر کام کے لیے آمادہ ہوتی ہوں اور دوسری جب کوئی بہت ہی اچھا اور میری پسند کا رول ہوتا ہے کیونکہ میرا نہیں خیال کہ اداکاری اتنا آسان کام ہے کہ اسکرپٹ پڑھا اور پرفارم کر دیا۔ اس کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنا پڑتا ہے۔"

"آپ نے آنکھ کھلتے ہی والد صاحب کو تھیٹر کرتے دیکھا لوگوں کے لیے کام کرتے دیکھا۔ تو آپ کے بھی یہی خواب تھے کہ والد کے نقش قدم پر چلوں؟"

"خواب تو بے شک یہی تھے کہ والد کے نقش قدم پر چلوں کیونکہ بہت کم عمری سے والد صاحب کے پروڈیوس کردہ تھیٹر میں کام کر رہی ہوں مگر اس کے علاوہ بھی میری یہ خواہش تھی کہ میں کسی اور شعبے میں نام پیدا کروں۔ تدریس یا میڈیسن کے شعبے میں جاؤں مگر پھر تھیٹر میں اور اس کے بعد ٹی وی پروگراموں میں اتنی زیادہ مصروف ہو گئی کہ تدریس اور میڈیسن کا خیال چھوڑ دیا اور سائیکولوجی میں ماسٹرز کیا۔"

"اظہار کا موثر ذریعہ تھیٹر کو کہا جاتا ہے ٹی وی کو نہیں؟ جبکہ ٹی وی تو ہر گھر میں ہوتا ہے؟"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں لیکن آپ نے شاید یہ بات محسوس کی ہو گی کہ ٹی وی ڈرامے ایک ہی نشست میں بیٹھ کر نہیں دیکھے جاتے۔ پھر وہ کئی کئی اقساط پر مبنی ہوتے ہیں جبکہ تھیٹر کم دورانیے کا ایک مکمل ڈرامہ ہوتا ہے۔ لوگ توجہ کے ساتھ دیکھتے ہیں اور اچھی باتوں کو دل میں اترتا ہوا محسوس کرتے ہیں۔ فوری رسپانس بھی تھیٹر سے ہی ملتا ہے۔ آڈینس کو بھی اندازہ ہوتا ہے کہ کیا اچھا ہو رہا ہے اور فنکاروں کو بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ جو پیغام دینا چاہ رہے ہیں وہ لوگوں تک پہنچ رہا ہے یا نہیں۔"

"یعنی آپ کے کہنے کا مقصد ہے کہ تھیٹر کے ذریعے معاشرے میں تبدیلی لائی جا سکتی ہے۔"

"بالکل لائی جا سکتی ہیں۔ میں بہت موثر ذریعہ سمجھتی ہوں تھیٹر کو۔"

ثانیہ سعید 20 اگست 1975ء میں پیدا

ہوئیں اور تقریباً" دس سال کی عمر سے اس فیلڈ سے وابستہ ہیں اور اب بھی ان کا پروفیشن ہے۔ ثانیہ کی شادی 1999ء میں شاہد شفاعت کے ساتھ ہوئی اور یہ اپنی ازدواجی زندگی میں بہت خوش ہیں۔ فیوچر میں ان کا ارادہ فلموں میں کام کرنے کا بھی ہے مگر اس شرط کے ساتھ کہ کردار بھی اچھا ہو اور فلم کی اسٹوری بھی جان دار ہو' جبکہ ٹی وی ڈراموں سے وہ کافی مطمئن ہیں۔

تنویر جمال

"آج کل کیا مصروفیات ہیں؟"

"آپ کو معلوم ہی ہے کہ میں آج کل ڈراما پروڈکشن میں ہوں۔ تین چار ڈراما سیریلز کے لیے کام کر رہا ہوں اور خود بھی پرفارم کروں گا۔"

"آج کل کے ڈرامے کیا یکسانیت کا شکار نہیں ہیں۔"

"بالکل ہیں۔ موضوعات تقریباً" ایک جیسے ہوتے ہیں' بس پیش کرنے کا انداز مختلف ہوتا ہے۔ یہ ڈرامے ہمارے معاشرے کے عکاس نہیں ہیں۔"

"چینلز زیادہ آگئے ہیں یا افراتفری بہت ہوگئی ہے۔"

"افراتفری زیادہ ہوگئی ہے' پہلے کہانی پر بہت توجہ دی جاتی تھی' کوشش کی جاتی تھی کہ کوئی کہانی کسی دوسری کہانی سے میچ نہ کرے۔ مگر اب ایسا نہیں ہے۔"

"سنا ہے اب تو سیٹ پہ اسکرپٹ ملتا ہے اور کام شروع ہوجاتا ہے؟"

"ایسا بھی ہے۔ لیکن فنکار محنت کرتے ہیں' لیکن پہلے کی بات کچھ اور تھی پہلے تو ریہرسل پہ بھی بہت توجہ دی جاتی تھی۔ مگر اب نہیں۔"

"کیا معیار گرا ہے؟"

"میں نہیں سمجھتا کہ مکمل طور پر معیار گرا ہے' کیونکہ اچھے اور برے ڈرامے تو ہر دور میں ہوئے ہیں اور اب بھی ملا جلا رجحان ہے۔ بہت سے ڈرامے بہت معیاری اور بہت اچھے ہیں۔"

"آپ نے ڈراما سیریل "جانگلوس" سے شہرت پائی۔ اب بھی لوگ اس حوالے سے پہچانتے ہیں؟"

"جی جی۔ بالکل۔ پہچانتے ہیں۔ گزرے زمانے کے ڈراموں کو تو لوگ آج تک یاد رکھتے ہیں۔ ہوتے ہی اتنے اچھے تھے ڈرامے اور پھر کاظم پاشا جیسے ڈائریکٹر اور پروڈیوسر۔"

"اور گھر میں سب ٹھیک ہیں۔ آپ کی بیگم۔ بچے وغیرہ۔"

"جی اللہ کا شکر ہے۔ سب ٹھیک ہیں اور گزشتہ پانچ چھ سال سے جاپان میں ہی ہیں۔"

"اچھا۔ کیا کراچی کے حالات سے گھبرا کر آپ نے ان کو جاپان بھیج دیا؟"

"ارے نہیں اصل میں میری بیٹیاں جاپان میں تعلیم حاصل کر رہی تھیں اور بیٹا امریکا میں۔ تو بچوں کی وجہ سے بیگم کو وہاں شفٹ ہونا پڑا۔ ورنہ تو ہم ایک عرصے سے پاکستان اور کراچی میں تھے۔"

"تو آپ؟۔ اپنے پروفیشن کی وجہ سے؟"

"میرے یہاں رہنے کی دو وجوہات ہیں' ایک تو جیسا آپ نے کہا کہ میرا پروفیشن ہے پھر میری ماں یہاں رہتی ہیں اور مجھے اپنی ماں سے بہت پیار ہے انہیں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ ہاں' جاپان میرا آنا جانا لگا رہتا ہے۔"

"بچے آپ کی فیلڈ میں آئے؟"

"نہیں۔ ایک بیٹی صحافی ہے اس نے صحافت پڑھی ہے' ایک کی شادی کردی ہے اور ایک بیٹا ہے۔ اس کے بارے میں تو میں نے آپ کو بتا ہی دیا ہے۔"

"بیگم کو اردو آتی ہے؟"

"ہاں۔ ہاں کیوں نہیں۔ اب تو وہ بہت اچھی اردو بول لیتی ہے اور میں اپنی بیوی کی جتنی تعریف کروں کم ہے۔ وہ نہ صرف ایک اچھی بیوی ہے بلکہ بہت اچھی ماں بھی ہے۔ میں بہت خوش ہوں اپنی لائف میں۔"

"اور ہمیشہ خوش رہیں۔ ان شاء اللہ جلدی آپ کا تفصیلی انٹرویو کروں گی۔"

"ان شاء اللہ"

عابدہ پروین

بہت زمانہ ہوگیا عابدہ پروین صاحبہ سے بات کیے ہوئے۔ مگر ان کی کچھ باتیں آج بھی ہمارے پاس محفوظ ہیں۔

"کس عمر سے گا رہی ہیں اور کب احساس ہوا کہ گلے میں سُر ہے؟"

"والد صاحب بتاتے ہیں کہ جب تین سال کی تھی تو کچھ نہ کچھ گاتی رہتی تھی' والد کو احساس ہوا کہ بیٹی کے گلے میں تو سُر ہے اور اگر ابھی اس کی تربیت کی گئی تو یہ بہت نام پیدا کرے گی اور ان کی تربیت اور محنت کام آئی۔"

"گویا گھٹی میں موسیقی ہے۔"

"جی۔ بالکل گھٹی میں ہے میوزک۔ والد صاحب خود بہت بڑے گلوکار تھے ان کا اپنا اسکول تھا اور بہت لوگ ان سے میوزک سیکھنے کے لیے آتے تھے۔"

"عارفانہ کلام کی طرف رجحان رہا۔ وجہ؟"

"ہمارے گھر کا ماحول بہت ادبی اور مذہبی تھا تو جیسا گھر کا ماحول ہو بچہ بھی اسی کا عادی ہوجاتا ہے۔"

"ملک سے باہر جاتی ہیں تو کیسا محسوس کرتی ہیں؟"

"بہت اچھا محسوس کرتی ہوں کیونکہ دوسرے ملکوں میں بھی میرے چاہنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور میں تقریباً" دنیا کے سارے ممالک میں جاچکی ہوں اور اپنے فن کا اظہار بھی کرچکی ہوں۔"

"صرف اپنے پاکستانی ہی شرکت کرتے ہیں آپ کے پروگرام میں؟"

"میرے پروگرام میں ہر وہ شخص وہ خواتین و حضرات شرکت کرتے ہیں جن کو عارفانہ کلام سے لگاؤ ہے اور جو اردو زبان کو سمجھتے ہیں۔"

"ایوارڈز کی تعداد کتنی ہوگئی ہوگی؟"

"ماشاء اللہ کافی ایوارڈز مل چکے ہیں۔ مثلاً" شاہ عبداللطیف بھٹائی ایوارڈ جو کئی سال تک ملتا رہا۔ اس کے علاوہ حضرت شاہ قلندر ایوارڈ' پرائڈ آف پرفارمنس' گریجویٹ ایوارڈ' ہلال امتیاز اور بھارت کا لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔"

"صوفی شعراء کے علاوہ کن شاعروں کو بہت شوق سے پڑھتی ہیں آپ؟"

"صوفی شعراء کے علاوہ میں پروین شاکر' فیض احمد فیض' احمد فراز' عبید اللہ علیم' نصیر ترابی اور احمد فراز کا کلام بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔"

"صرف شاعری سے شغف ہے یا نثر سے بھی لگاؤ ہے۔"

"ارے بابا کیوں نہیں لگاؤ ہوگا' مجھے تو پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ میں زیادہ تر اشفاق احمد' بانو قدسیہ' منو بھائی اور ہر اچھا لکھنے والا مجھے پسند ہے اور میں انہیں پڑھتی رہتی ہوں۔"

"بچوں نے آپ کا اثر لیا؟ میرا مطلب ہے کہ انہیں میوزک سے لگاؤ ہے۔"

"میری دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ بیٹے اور ایک بیٹی کی شادی ہوچکی ہے اور میں ماشاء اللہ سے نانی بھی ہوں اور دادی بھی ہوں۔ جہاں تک شوق کی بات ہے تو بچوں کو شوق ہے' مگر ابھی اس فیلڈ میں نہیں آئے ہیں۔"

"ایک بار آپ نے کہا تھا کہ آپ ایک میوزک اکیڈمی قائم کریں گی تو پھر کیا سوچا اس بارے میں؟"

"ہاں ان شاء اللہ ضرور۔ اپنی آرٹ گیلری میں میوزک کی ٹریننگ ضرور دوں گی۔"

"آرٹ گیلری؟"

"جی آرٹ گیلری جو کہ اسلام آباد میں ہے اور یہاں ملبوسات' جیولری اور پینٹنگز کی نمائش وغیرہ ہوتی ہے'

شعاع کے ساتھ

ادارہ

ثوبیہ نور۔ بھاول نگر

شعاع کو ہم نے ایسے دریافت کیا جیسے کولمبس نے امریکہ دریافت کیا۔ یعنی بے خبری میں۔ ارے بھئی ہمارے اردگرد' اگواڑے' پچھواڑے' دور یا نزدیک کہیں بھی کوئی ڈائجسٹ نہیں پڑھتا اس کے باوجود ہم اس کے "بے قاعدہ" سے "باقاعدہ" قاری بن چکے ہیں۔ تو دریافت ہی کیا نا اسے؟

ہوا کچھ یوں کہ ہمیں ایک تھا بادشاہ ٹائپ کہانیاں پڑھنے اور سننے کا بہت شوق تھا۔ اور شازی ایک دن فرماتی ہیں۔ یار پیا! میں نے بھی ایک کہانی پڑھی تھی' سناؤں؟ اور پھر کہانی سنانی شروع کردی۔

"ایک گھر میں کافی سارے کزنز رہتے تھے ان میں سے ایک ناراض ہو کر گھر چھوڑ کر چلا گیا اس کی بہن بہت روتی تھی وغیرہ اور اس سے آگے میں نے پڑھی ہی نہیں۔

اب وہ محترمہ تو اطمینان سے بیٹھ گئیں لیکن میں مصیبت میں گرفتار ہو گئی کہ پتا نہیں آگے کیا ہوا؟ خیر کافی خواری کے بعد وہ کتاب ملی تو پتا چلا کہ وہ بھائی ہی آئندہ زندگی میں رونے والی بہن کے مجازی خدا ثابت ہوتے ہیں کیونکہ وہ بھائی نہیں بلکہ چچازاد تھے۔

یہ تو ابتدا تھی اس کے بعد تو چراغوں میں روشنی نہ رہی' سمجھ آئی یا نہ آئی کبھی ہاتھ لگنے والا کوئی خواتین یا شعاع چھوڑا نہیں۔

جہاں تک بات ہے دلچسپ واقعہ کی تو جناب۔
کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے
کہ دل سینے میں چپ ہو جاتا ہے
ہر جانب اک اندھیرا گھپ ہو جاتا ہے۔

آہو جی! کچھ ایسی ہی صورت حال بنی تھی کہ امی نے کسی کام کے لیے مجھے آواز دی میں وہیں یہ رسالہ رکھ کر چلی گئی۔ میرے ایک انکل جی چلے آئے۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ ہم تو ان سے چوری چوری رسالہ پڑھتے تھے۔

خیر ادھر وہ اندر داخل ہوئے ادھر میں نے چھوٹی بہن کو اشارا کیا کہ "اسے چھپادو" پہلے تو اس نے توجہ نہیں دی' مگر جب آنکھوں ہی آنکھوں میں منت شنت کی تو وہ محترمہ بادل نخواستہ اٹھیں۔ رسالہ اٹھایا' اتنے میں انکل جی بھی سر پر پہنچ گئے' اور وہ بھی عین میری آنکھوں کے سامنے رسالہ لہرا کر کہتی ہیں۔

"ایہہ چھپانا اے؟" میں نے تو سنی ان سنی ہی کردی جیسے بلی کو دیکھ کر کبوتر آنکھیں بند کرلیتا ہے۔ آخر کار محترمہ کو ہم پر ترس آہی گیا وہ رسالے کو اندر چھپا آئیں اور جب ہم اپنا کام مکمل کرکے واپس آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک "ننھی سی بچی" جو ہمارے گھر مہمان آئی ہوئی تھی۔ رسالہ عین انکل جی کے سامنے رکھے "تصویریں" دیکھ رہی تھی اور ہم؟

"ہم ہنس دیے ہم چپ رہے منظور تھا پردہ اپنا"
لیکن اس دن انکل جی نے مجھے کچھ بھی نہ کہا (ظاہر ہے ساری محنت انہوں نے اپنی آنکھیں سے دیکھی تھی)

2 ۔ یہ تو بالکل ٹھیک کہا گیا ہے کہ "افسانوں کی دنیا میں سب جھوٹ نہیں ہوتا" بلکہ میرا تو خیال ہے کچھ بھی جھوٹ نہیں ہوتا۔ آپ پڑھتے جائیے زندگی کے مختلف رخ آپ کے سامنے کھلتے جائیں گے کہیں رنگینیاں ہیں شوخیاں ہیں تو کہیں خون کی ہولیاں' کسی کی چوڑیاں گندم کے سیر پر بکیں یا کسی غریب کے محنت سے بنائے گئے تاج کسی امیر کی شان میں مزید اضافہ کرنے پہنچ جائیں۔ جھوٹ تو کچھ بھی نہیں ہوتا بس آگاہی مصیبت بن جاتی ہے۔ صدیوں کا سفر اپنے سر پر لادنا آسان تو نہیں؟

ایسی تو کئی تحریریں ہیں جو دل پر نقش ہیں۔ جیسے "بیاباں میں ہے لالہ منتظر کب سے"۔۔۔ دل من مسافر من' میں نیل کرایاں نیلکاں کو تو پڑھ کر آنکھیں چھلک پڑیں اور "رقص جنوں" کو تو گویا سانس روک کر پڑھا تھا۔ بشریٰ جی! بہت کم پڑھا ہے آپ کو مگر۔

"دل بھول نہیں پاتا۔"

اس کے علاوہ عمیرہ احمد' جبین سسٹرز' تنزیلہ ریاض (جو اب نہ جانے کہاں غائب ہو گئی ہیں) فائزہ افتخار اور اس کے علاوہ بھی کافی ساری رائٹرز ہیں جن کی تحریریں انمٹ نقش چھوڑ جاتی ہیں۔

اور ہاں عالیہ بخاری کے لیے تو میں کہوں گی کہ مجھے لگتا ہے انہیں لکھنے کے لیے بالکل محنت نہیں کرنا پڑتی ہوگی۔ لفظ خود بخود ہی نوک قلم سے نکل کر بکھرتے ہیں اور بڑی بڑی باتیں سادہ سادہ انداز میں بتائے چلے جاتے ہیں۔

اور نگہت سیما جی! سن لیجیے کہ میں آپ کی تحریریں کبھی رات کو نہیں پڑھتی' ہمیشہ صبح ہونے کا انتظار کرتی ہوں کیونکہ مجھے لگتا ہے پھر میں سو نہیں پاؤں گی۔ اور نمرہ! آپ کے لیے تو بس جنت کے پتے ہی بہت ہے باقیوں کا ذکر نہ بھی کیا جائے تو۔

3 ۔ خوبیاں اور خامیاں؟ بتا تو دیتی ہوں پر علیحدہ خود ہی کرلیجیے گا برائے مہربانی۔

تو جناب! سب سے بڑی خامی تو یہ ہے کہ چھوٹی سی بات پر آسانی سے مہینوں تک کڑھ سکتی ہوں۔ بقول شائستہ "تمہیں پریشان رہنے کی عادت ہے۔ خیر "لوگوں کا کیا ہے کہنے دو۔"

جی بھر کے غیر مستقل مزاج ہوں کوئی ایسا کام آج نہیں کرتی جو کل ہو سکتا ہو۔ (یعنی ہمیشہ دیر کردیتا ہوں) مستقل مزاج نہیں ہوں بڑی سے بڑی بات آسانی سے ہضم کرلیتی ہوں ہر انسان میں خوبصورتی تلاش کرلیتی ہوں۔ کبھی کسی کا برا نہیں چاہا اور عمل کم کرتی ہوں پلاننگ زیادہ کرتی ہوں۔ اتنی بہت ہیں نا؟ خود ہی اپنا تجزیہ کیا ہے کسی سے مدد نہیں لی (پوچھتی تو کون سا کسی نے بتا دینا تھا) ہاں تعریفی جملہ۔

لوگ کہتے ہیں کہ میں سمجھ دار ہوں۔
پتا نہیں' شاید "لوگ کہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہوں گے"

4 ۔ ساون میں تو بس دل چاہتا ہے کہ نیا شعاع ہو اور بس۔ نیا سے مراد ہے پہلے پڑھا ہوا نہ ہو' ورنہ کچھ عرصے تک یہ بھی پتا نہ تھا کہ اس کے ٹائٹل پر کس طرح کے مناظر ہوتے ہیں۔ اب تو اللہ کا شکر ہر ماہ دونوں (شعاع' خواتین) باقاعدگی سے پڑھ لیتے ہیں (میرا باجی کی مہربانی سے)

جہاں تک دلچسپ واقعہ کا ذکر ہے تو ایک دفعہ کچھ

یوں ہوا کہ بڑا اہم ٹیسٹ تھا اور سر نے دھمکی دی تھی "جو کل نہ آیا وہ پھر نہ آئے" لیکن جیسے ہی کل آئی ساتھ ہی بارش آگئی اور میں نے اطمینان سے کال کرلی سر کو کہ سر جی! اتنی تیز تو بارش ہو رہی ہے ٹیسٹ تو نہیں ہوگا؟ جواباً "انہوں نے بھی بتایا کہ بیٹا جی ٹیسٹ تو شروع بھی ہوچکا ہے۔ اب بارش بھی سردیوں کی تھی تو سب نے ہی کہا کہ "چھوڑو' اتنی بارش میں کہاں ٹیسٹ ہونے لگا ہے' بیٹھ جاؤ آرام سے۔

لیکن میری ایک ٹیچر نے ایک دفعہ کہا تھا کہ "با ادب' بانصیب' لہٰذا میں نے کتابیں اٹھائیں اور اور "ہمت عوراں مدد خدا" کے تحت باہر آگئی مین روڈ تک پہنچتے پہنچتے جس نے بھی دیکھا' مشکوک نظروں سے ہی دیکھا۔ اس کی وجہ شاید میری ڈریسنگ بھی ہو۔ اس دن میں نے بلیک ٹراوزر کے ساتھ بلیو قمیص پہنی تھی پر وہ بلیک کوٹ اور بلیک ہی شال میں بالکل ہی چھپ گئی تھی۔ اتفاق کی بات جوتا اور بیگ بھی بلیک تھا۔ اور بادلوں کے ساتھ دن بھی بلیک بلیک سا ہو رہا تھا۔

اب ایسے مشکوک موسم میں' ایسی مشکوک ڈریسنگ کے ساتھ' سب نے مشکوک نظروں سے ہی دیکھنا تھا' خیر ہمیں کیا؟ لیکن جناب ہماری لاپروائی اس وقت اڑنچھو ہوئی جب ایک زبردست سا دھماکا عین دائیں جانب ہوا' سچی بات ہے اس وقت تو لگا تھا گویا سر پر ہی ہوا ہے۔ ساتھ ہی یاد آگیا کہ لوگ کہتے ہیں۔ بلیک رنگ پر آسمانی بجلی گرتی ہے۔ اب ہمیں یوں ہی محسوس ہوا کہ آسمانی بجلی گری ہے اور اب پتا نہیں گھر والے پہچان بھی پائیں گے یا نہیں؟

ہم شاید اس سے آگے حساب کتاب تک بھی پہنچتے پر اچانک پیچھے سے آواز آئی۔

"جانا ہے؟" پیچھے مڑ کر دیکھا تو یہ رکشے والا تھا۔ اب جانا تو تھا مگر حواس گم تھے یہ بتانا مشکل ہو رہا تھا کہ جانا ہے اور یہ بھی بھول چکا تھا کہ کہاں جانا ہے؟ خیر آہستہ آہستہ حواس بیدار ہوئے تو منزل کے بارے میں بتایا اور ساری ہمت جمع کرکے رکشے میں بیٹھ گئے اور اس کے بعد ادھر ادھر دیکھا تو پتا چلا کہ وہ وین تھی جس کا ٹائر پھٹ گیا تھا۔ اور ہمارے حواس گم کر گیا تھا۔ ارے! یہ بھی کوئی ڈرنے والی بات تھی؟" باقی راستہ یہ ہی سوچتے رہے۔ جب "منزل مقصود" پر پہنچی ——

تو پتا چلا ابھی دنیا سے فرماں برداری ختم نہیں ہوئی کیوں کہ پوری کلاس ہی حاضر تھی جب ہم پہنچے تو ہمیں بھی خالی خالی نظروں سے دیکھا گویا کہہ رہی ہوں۔

"ہم تو ڈوب گئے تم کو پکارا کب تھا"

تب تو ہمیں آنکھیں پڑھنے کا ہوش ہی نہیں تھا مگر جب ٹیسٹ سامنے آیا تو ہی نگاہوں کا مفہوم اچھی طرح سمجھ میں آیا تھا۔

ویسے ہمیں برہم میں آتے کسی "میر" نے نہیں بس کلاس نے ہی دیکھا تھا اس کے باوجود "چراغوں میں روشنی نہ رہی" اور نتیجتاً "پوری کلاس نے موبائلز کی روشنی میں ٹیسٹ مکمل کیا' پتا نہیں اکیڈمی کے UPS وغیرہ کیا ہوئے؟

"رات گئی بات گئی۔" والا معاملہ نہیں ہوا بلکہ جب نتیجہ آیا تو۔

"چشم مہتاب بھی شبنم کی جگہ خوں روئی"

پسندیدہ کتابیں تو بہت سی ہیں بلکہ نصابی کتابیں بھی پسندیدہ ہوتیں اگر ابن انشا کی بتائی ہوئی کتابوں جیسی ہوتیں جس کا ذکر انہوں نے 'اندر کیا ہے' کے عنوان سے کیا ہے۔

ویسے "عشق کا ق — اندھیری رات کے مسافر- شاہین" کو کافی دلچسپی سے پڑھا اور کچھ دن پہلے بشریٰ رحمٰن کی "چپ" پڑھی تھی وہ بھی اچھی لگی۔

پسندیدہ اشعار میں یہ شعر بھی شامل ہیں۔

جو اعلیٰ ظرف ہوتے ہیں ہمیشہ جھک کر ملتے ہیں
صراحی سرنگوں ہو کر بھرا کرتی ہے پیمانہ

کہ انہیں کام نہیں ملتا لیکن میکال ذوالفقار نے اس روایت کو توڑتے ہوئے کہا ہے کہ "میرا اس وقت سنہرا دور چل رہا ہے۔ میں اس وقت ڈراما انڈسٹری میں بہت مصروف ہوں۔ میرے کئی ڈراموں کی شوٹنگ چل رہی ہیں اور کئی ڈرامے آن ایر ہیں۔" میکال نے مزید کہا کہ "وقت کے ساتھ ساتھ ہر شعبے میں تبدیلی ضروری ہے اور وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں' جو وقت کے ساتھ اپنے آپ کو تبدیل کرلیتے ہیں (تبدیلی کے ساتھ اپنی اصل شناخت بھی ضرور رکھنا چاہیے ورنہ؟) ہماری ڈراما انڈسٹری اس وقت عروج پر ہے اور یہاں انٹرنیشنل معیار کے مطابق ڈرامے تخلیق کیے جارہے ہیں۔ (جی ہاں انڈیا اور ترکی کے ڈرامے) ہاں بے شک ڈراموں کا ایک دور تھا' جب بہترین ڈرامے ہوا کرتے تھے (جب ہی تو یونا انسٹیٹیوٹ میں ہمارے ڈرامے دکھا کر اداکاری سکھائی جاتی تھی۔)

محنت

بھلا بتائیے اب خبر یہ ہے کہ گلوکارہ فریحہ پرویز نے اسمارٹ رہنے کے لیے جم جوائن کرلیا ہے۔ (فریحہ اب

گل صفہ سہیل

استقبال

ماڈل مہرین سید بیٹی کی پیدائش کے بعد برطانیہ سے واپس پاکستان آگئی ہیں۔ کچھ عرصہ قبل وہ ڈلیوری کے سلسلے میں برطانیہ گئی تھیں اور تقریباً" دو ماہ قبل انہوں نے ایک بیٹی کو جنم دیا تھا (مہرین! آپ کو مہرین جونیئر کی پیدائش مبارک ہو) مہرین کے سسرالی رشتہ داروں نے اس موقع پر بہت خوشی کا اظہار کیا اور ان کا بھرپور استقبال بھی کیا۔ مہرین سید کچھ عرصہ آرام کے بعد شوبز کی سرگرمیوں کا آغاز کریں گی۔

منہ اور در

ہمارے زیادہ تر فنکار ہی رونا روتے نظر آتے ہیں

مزید اسمارٹ نس کس لیے بھئی؟) وہ ایک معروف جم میں روزانہ تین گھنٹے ایکسر سائز کرتی ہیں (تین گھنٹے فریحہ ریاض کرلیتیں تو گانا ہی سیکھ لیتیں) فریحہ اس حوالے سے کہتی ہیں کہ "میں خود کو اسمارٹ رکھنے کے لیے یہ محنت کررہی ہوں کیونکہ شوبز میں خود کو اسمارٹ رکھنا بہت ضروری ہے" (صحیح کہا آپ نے لیکن ہمیں حیرت ہے کہ ہماری اداکارائیں کیوں نہیں یہ جم جوائن کرتی ہیں۔ جبکہ انہیں تو چوبیس گھنٹے ہی ایکسر سائز کی ضرورت ہے۔

وجہ

شمعون عباسی نے اپنی فلم "گدھ" میں مرکزی کردار کے لیے ہمایوں سعید کی جگہ اداکار شان کو کاسٹ کرلیا ہے۔ شمعون عباسی نے یہ فیصلہ شان کی فلم وار کی کامیابی کے بعد کیا ہے (ہمایوں کی بھی تو "میں ہوں شاہد آفریدی" کامیاب ہوئی تھی) گدھ گزشتہ دو سالوں سے کاغذی تیاریوں تک محدود تھی مگر اب بالآخر اس کی شوٹنگز کا آغاز ہونے والا ہے۔ (ابھی بھی ہونے والا ہے؟) مزے کی بات ہے کہ شمعون نے

ہمایوں کی جگہ شان کو کاسٹ کیا ہے جبکہ خود شان نے اپنی فلم ارتھ کے لیے ہمایوں سعید کو کاسٹ کرلیا ہے اور ان کے مقابل ہیروئن کا کردار ادا کریں گی حمیمہ ملک (اوہو تو یہ وجہ تھی شمعون صاحب!)

بات نکلے گی تو پھر۔۔۔

"چینلز کو ہر طرح کی آزادی ہے جو چاہیں دکھادیں (میڈیا آزاد جو ہے بھئی) بگ باس میں وینا ملک کی حرکتیں ایک چینل سے دکھائی گئیں پھر اداکارہ کی "قدرتی" لباس میں تصاویر بھی میڈیا نے چوبیس گھنٹے میں اڑتالیس بار دکھائیں اور کوئی چینل بھی اس میں پیچھے نہیں رہا۔ حد تو یہ ہے کہ ایک چینل نے ایک مذہبی پروگرام کی میزبانی بھی ان اداکارہ کے سپرد کردی، جہاں وہ لوگوں کو مذہبی مسائل کے بارے میں جاتی نظر آئیں۔ حد یہ کہ انڈیا کو خوش کرنے کے لیے پاکستان کی ایک خفیہ ایجنسی کا نام بھی اپنے بازو پر لکھوالیا۔ اس حرکت کے بعد ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ پاکستان کے تمام چینلز ان کا بائیکاٹ کردیتے لیکن اس

کے بجائے انہوں نے انٹرویو کی سیریز شروع کردی۔ خاتون کو اپنے دفاع میں بولنے کا بھرپور موقع فراہم کیا۔ محترمہ نے مادر پدر آزادی کی حمایت کی اور مطالبہ کیا کہ اس کے لیے خاص طور پر قانون سازی کی جائے۔ جسم کی نمائش کو انہوں نے اپنی شخصی آزادی قرار دیا۔

کوئی بھی چینل ایسا نہ تھا جنہوں نے اس اداکارہ کے انٹرویوز اور نیک خیالات عوام تک پہنچانے کا فریضہ انجام نہ دیا ہو۔ بعض چینلز سے تو دو دو تین بار انٹرویو نشر ہوئے جو شاید کسی دانش ور، کسی عالم، کسی سیاست دان کے بھی نشر نہ ہوسکے۔

پھر انہوں نے شادی کا اعلان کیا تو ان کی شادی کی تقریبات اس طرح دکھائی گئیں جیسے لیڈی ڈیانا کی شادی ہو۔ شادی کے بعد میاں صاحب کے انٹرویو کی سیریز شروع ہوگئی۔ سارے چینلز باری باری یہ سعادت حاصل کرتے رہے۔ شائستہ لودھی۔۔۔ اتنا آگے بڑھیں کہ دوبارہ شادی ہی منعقد کرادی۔ وینا ملک سے اپنی محبت و عقیدت کا مظاہرہ انہوں نے منقبت لگاکر کیا۔ جیو کی مقبولیت مخالفین کو کھٹک رہی تھی۔ ایک چینل نے اس کو دکھایا اور بار بار دکھایا (یعنی جو توہین شائستہ لودھی نے ایک بار فرمائی تھی، وہ بار بار اس کے مرتکب ہوئے) پھر کیا تھا، سارے چینلز پر باہمی اخوت کا وہ مظاہرہ دیکھنے میں آیا کہ اللہ دے، بندہ لے۔ انہوں نے بھی سنگ ہاتھوں میں اٹھالیے۔ جو سر سے پیر اس گنگا میں نہائے ہوئے تھے۔ چند اینکرز کو چھوڑ کر جو واقعی صحافی ہیں، سب نے خوب سنگ ملامت برسائے۔ حالانکہ جو کچھ شائستہ لودھی نے کیا، وہ کوئی پہلی بار نہیں ہوا تھا، یہ منقبت اس چینل پر جو سب سے زیادہ غیرت و حمیت کا مظاہرہ کررہا ہے، چار بار اسی شادی بیاہ کے چھچھورپن اور اچھل کود میں نشر ہوچکی ہے اور ایک چینل پر تو باقاعدہ بھنگڑا بھی ڈالا جاچکا ہے۔ اس وقت پیمرا اور کیبل آپریٹر نیند کی گولیاں کھاکر سوئے ہوئے تھے؟

پیشہ وارانہ رقابت میں چینلز اور اینکرز کے جو اصل چہرے سامنے آئے۔ وہ بہت افسوسناک ہے۔ بہتری اسی میں ہے کہ یہ لوگ تھوڑی احتیاط سے کام لیں ورنہ۔۔۔

بات نکلے گی تو بہت دور تک جائے گی۔

کچھ اِدھر اُدھر سے

☆ نریندر مودی سے گجرات کے مسلم فسادات کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ انہیں گجرات میں مسلمانوں کی مارے جانے کا ویسا ہی افسوس ہے جیسے کسی کتے کے پِلّے کے کار سے کچلے جانے پر ہوگا۔
(آکانومسٹ لندن)

☆ حالات کے پیش نظر اس کا امکان بہت کم ہے کہ فوج ایک بار پھر شب خون مارے کیونکہ خزانہ بھی خالی ہے اور عوام اب تک حکومت سے پوری طرح مایوس نہیں ہوئے ہیں۔

(روزنامہ جسارت)

☆ پرویز مشرف نے گزشتہ انتخابات میں الیکشن کمیشن کے سامنے اپنے جو گوشوارے داخل کیے تھے ان میں ان کے نقد اثاثے ان کے اپنے بیان کے مطابق 645 ملین تھے۔ جس میں 2012ء میں انہوں نے 129 ملین روپے کا اضافہ ظاہر کیا یعنی 1290 لاکھ روپے۔ اس کے علاوہ اسلام آباد میں چک شہزاد کی جنت، کراچی، گوادر اور دوسرے شہروں میں پیلاس اور لندن میں اپنی جائیداد کا ذکر نہیں کیا۔ انہوں نے اعتراف کیا کہ پچھلے تین برس سے انہوں نے ایک دمڑی کا ٹیکس ادا نہیں کیا۔
(گرددپیش آصف جیلانی۔ لندن)

ملنے کی گھڑی جو ٹھہری ہے

نایاب جیلانی

تیرگی کے بگولوں میں کھوئی ہوئی صبح تلاشنا مشکل ضرور تھا۔ تاہم ناممکن ہرگز نہیں تھا۔ پھر بھی اتنا حوصلہ' اتنا صبر اور اتنی برداشت کہاں سے آئی؟ مرنے والوں پہ صبر آجاتا ہے' بچھڑنے والوں پہ نہیں۔۔۔ پھر جب آنکھ دیدار کے لیے ترس رہی ہو۔۔۔ آنکھ بھی ماں کی۔۔۔ جس میں انتظار کائی کی طرح جم رہا تھا اور تیرہ بختی کا کوئی انت نہیں تھا۔ ہر سال عید آتی اور بنا آہٹ کیے گزر جاتی اور وہ اپنی یادیں تحفوں کی صورت بھیجتا' قیدیوں سے موتیوں کے کلپ بنوا بنوا کر۔۔۔ یہ میری بہن کے لیے جس کے بالشت بھر کے بال۔۔۔ وہ پوچھتا۔ "لمبے کیے ہیں یا نہیں؟ اتنا پیارا کلپ کیسے لگے گا؟"

میں نے کہا۔ "غم نہ کھا۔۔۔ کسی تبرک کی طرح سنبھال رکھا ہے۔۔۔ بچی بڑی ہوئی تو دکھاؤں گی۔"

وہ ہنسنے لگتا۔ اس کی ہنسی زندگی کا اثاثہ اور پوری زندگی کا سرمایہ ہے۔۔۔ یہ کون نہیں جانتا تھا؟

ایک دن امی نے حسرت سے کہا۔ "کب آؤ گے بیٹا۔"

کہنے لگا۔ "امی! جیل خانے کے تالے جب کھلیں گے۔۔۔ اللہ نے چاہا تو ضرور کھلیں گے۔"

آواز میں ہمت اور جوان مردی ہوتی۔ سوز و گداز میں ڈوبی آواز۔۔۔ اکثر ماہیے گا کے سناتا تھا۔ اس کی آواز میں ایک سحر تھا۔ ہاتھ کا بہت کھلا۔۔۔ جو آیا خرچ دیا۔۔۔ خود پہ نہیں دوسروں پہ۔۔۔ ابو سے فرمائش کر کر کے مستحق قیدیوں کے لیے استعمال کی چیزیں منگواتا۔

مجھے یاد ہے۔۔۔ ہر سال امی نئے گرم کپڑے' چادریں' جوتے' جرسیاں اور سوئٹر بھیجتی تھیں۔ وہ ہر سیزن میں اپنی چیزیں "حق داروں" کو دے دیتا تھا۔ یادوں کے کرب انگیز سیل رواں میں اس کی "سخاوت" کا بڑا مواد تھا۔ جب ہم ساتھ تھے تو بہت لڑتے تھے۔ جب جدا ہوئے تو بہت روتے تھے۔

ہمارے دل کی دھڑکنیں اس کی ہر کال سے بندھی تھیں۔

ہر گرمیوں میں وہ بیمار ہو جاتا تھا۔ جب وہ بیمار ہوتا تو خدمت کروانے کے لیے مجھے یاد کرتا تھا۔ جب جیل میں گیا تو لاڈ اٹھوانے والے اور اٹھانے والے چھوٹ گئے۔

اس نے کہا۔ "قید کیا ہوتی ہے پہلے نہیں پتا تھا۔ اب پتا چل رہا ہے۔"

زندگی میں "زندان" کے بارے میں کبھی گمان' خیال اور وہم تک نہیں آتا تھا۔ زندان کو برت کے اس کا شعور آیا۔ زندان کیا ہے؟ تنہائی' دکھ' کرب اور اکیلے پن کا گڑھ۔ جس میں چہرے نظر آتے ہیں۔ کوئی اپنا نظر نہیں آتا۔

زندان کی تشریح اس سے بڑھ کے کیا؟ جب دن دیکھنے کو دل چاہے تو دن نظر نہ آئے۔ جب رات دیکھنے کو دل چاہے تو رات دکھائی نہ دے۔

بیرک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک آنے جانے کی آزادی تھی۔

جب ہائی کورٹ میں ضمانت کی تاریخ نکلتی۔ صبح سے لے کر رات کی تاریکی تک آس سسک سسک کر تھک جاتی اور کان ضمانت مسترد ہونے کی خبر سن کر دل وحشی کو دہلانے لگتے۔ امید' آس اور لگن دیے کی آخری لو کی طرح کانپنے لگتی تھی۔ تاہم دعا سے یقین کبھی ہلکا نہیں پڑا تھا۔ یقین زندہ اور سلامت تھا۔

اس دنیا میں کوئی غروب آخری نہیں۔ ہر غروب کے بعد ایک نیا سورج طلوع ہوتا ہے۔ بشرطیکہ آدمی اپنی شام کو صبح میں بدلنے کا حوصلہ رکھتا ہو۔ ہر خط اور جیل سے آنے والی فون کال کے بدلے میں لفظوں کے حوصلہ افزا امرت کو بوند بوند قطرہ قطرہ سماعتوں میں ٹپکانا بھی تیغ بر آں کے مترادف تھا۔

جواباً "وہ صلابت' مضبوطی' استحکام' استواری کے سارے اسباق بھول جاتا۔ اس کی بھیگی آواز میں جیل خانوں کے نوحے ہوتے' تنہائی کی کاٹ ہوتی۔ ٹھنڈ سے ٹھٹھرا دینے والی راتوں کی ٹھنڈک ہوتی۔ جسم کو جھلسا دینے والی گرمی کی کراہٹ ہوتی۔

صلیب صرف "چلیپا کا نشان" نہیں ہوتی جو "دار" پہ چڑھتے ہیں' سولی دار ہوتے ہیں۔ ان سے صلیب کی تشریح پوچھی جائے تو صرف ایک لفظ "موت" کا ہر اس لہجوں اور لفظوں سے ٹپکتا ہے۔

منصف کے سامنے بند کمرے میں "حکم کی تاریخ" پہ موت و حیات کا فیصلہ سننا بھی ایک قیامت تھا۔ جب ساجھی (دوست) کو سزائے موت کا حکم ہو گیا اور "اسے" عمر قید کی سزا۔۔۔ آنسو گرے تو نہیں تھے' پر اندر کہیں اتر ضرور گئے۔ دکھ عمر قید کی سزا کا نہیں تھا۔ باپ کے جھکے کندھوں پہ جدائیوں کے بار لاد دینے کا تھا۔

میانوالی جیل خانہ' زندہ لوگوں کے لیے برزخ کے سوا کچھ نہ تھا۔ سردی میں لحاف کی اجازت نہ تھی۔ آدھا کمبل نیچے بچھا کے آدھا اوپر لے کر نیند کو آوازیں دینا پل صراط سے گزرنے کے برابر تھا۔ ماں نے سنا تو تڑپ اٹھی۔ دو اور کمبل بھیجے۔

"ایک نیچے بچھایا کرو' ایک اوپر لیا کرو۔۔۔ ٹھنڈ نہ اترے تو ایک اور اوپر لو۔" ٹھنڈ پھر بھی نہ کم ہوئی۔

ماں نے پوچھا تو آرام سے بتایا۔ "دو کمبل بیرک میں بھجوا دیے ہیں۔ دو میاں بیوی ہیں نا امی! ان کے ساتھ ایک چھوٹا بچہ بھی ہے۔ بے چارے بہت غریب تھے۔ ان کی تو ملاقات کرنے والا بھی کوئی نہیں۔۔۔ بس انہیں دے دیے۔"

میرا بھائی ایسا ہی دیالو ہے۔ امی چیزیں پکا پکا کے بھیجتیں۔ وہ بانٹ بانٹ کے نہ تھکتا۔ ساری جیل کا دلارا تھا میرا بھائی۔ ہاتھ اٹھانے والے اتنے ہاتھ تھے پھر بھی دعا قبولیت کی معراج سے کوسوں دور تھی۔ تب نافہم تھے ہم انسان۔۔۔ یہ جانا ہی نہیں۔ دعا تو کب کی قبولیت کا شرف پا گئی۔ اب تو بس انتظار باقی ہے کہ جیل خانے میں لکھا ہوا اس کے حصے کا رزق ابھی باقی تھا۔ آس میں ڈولتے فون' کبھی کبھار کے لکھے خط۔۔۔ بس ایک ہی پکار' ایک ہی بکا' ایک ہی التجا۔

"امی! میری میٹھی امی! نہ رویا کریں امی! آپ بوڑھی ہو گئیں تو میں بوڑھا ہو جاؤں گا۔ آپ کے آنسو مجھے ملیامیٹ کرتے ہیں۔"

اس کے لہجے کا کرب' دکھ' اداسی' غم اور حسرت۔۔۔ خون کے آنسو رلاتی تھی۔ امی رات رات بھر بیٹھ کے وظائف کرتیں۔ سوا' سوا لاکھ آیت کریمہ پڑھنا۔ درود' نعت کی محفلیں' قرآن خوانی' دعائیں' طویل تر عبادتیں' نوافل' وظائف۔۔۔ پانچ سالوں میں کوئی ایک دن' کوئی ایک لمحہ بھی ایسا نہیں گزرا تھا' جو امی نے اپنا کوئی ایک بھی وظیفہ چھوڑا ہو۔

ایک دفعہ امی بیمار ہو گئیں تو رات دو بجے اس کی کال آگئی۔ امی تنہا تھیں' وہ گھبرا گیا۔

"بھابھی کو کیوں جانے دیا۔ بجو کو بلا لائیں۔ امی آپ اکیلی ہیں۔ اتنی بیمار ہیں۔ میرے دل کو کچھ ہو رہا ہے۔"

وہ بے حد پریشان اور متفکر ہوا۔ رات تین بجے پھر فون آگیا۔ چوری چھپے' دھیمی آواز میں بولتا ہوا۔ خوف' ڈر' ہراس۔۔۔ کوئی آنہ جائے' امی نے ڈانٹا۔

"کیوں بار بار کال کرتے ہو' کوئی آجائے گا۔" وہ

گھبرا رہی تھیں۔

"امی! میں تو مسجد گیا تھا آپ کے لیے دعا کرنے آپ کو آرام آیا؟ دیکھیں، میں نے اتنی دعا کی ہے۔ نفل بھی مانے ہیں۔"

دھیمی آواز میں ماں کے لیے اتنی بے قراری تھی کہ امی کے آنسو گرنے لگے۔ حیرت انگیز طور پر امی کا درد ختم ہو گیا۔ اس کی دعا میں اتنی تاثیر تھی کہ امی کی تکلیف رفع ہو گئی تھی اور وہ امی کو چپکے چپکے بتا رہا تھا۔

"امی! میں ایسی جگہ پہ کھڑا ہوں۔ یہاں کوئی نہیں آسکتا۔ دروازے کی کنڈی لگا رکھی ہے۔ امی! یہاں اتنی بدبو ہے کہ کھڑا رہنا دشوار ہے۔ اتنی غلیظ بساند اٹھ رہی ہے۔ تعفن اور بدبو سے معدہ الٹنے کو ہے۔ پائپ سے گندا پانی رس رہا ہے۔ ٹوٹے پائپ اور گندگی سے اٹھتے گٹر کے پاس کھڑا ہوں۔ ٹونٹی کھول رکھی ہے، تاکہ آواز باہر نہ جائے۔ آپ کی طبیعت پوچھنے کو فون کیا ہے۔ مجھے کیسے نیند آتی۔ آپ بیمار جو ہیں۔"

ناک دبا دبا کر سانس لینا کتنا دشوار تھا اس کے لیے۔ امی جانتی تھیں۔ امی کا دل بھر بھر آیا۔ ان کا بیٹا خوشبو کا دیوانہ ہے۔ جیل میں پرفیوم کی اجازت نہیں تھی۔ وہ پھول منگوا لیتا تھا۔ خوشبوؤں سے عشق کرنے والا ابلتے گٹر والی لیٹرین کا دروازہ بند کر کے چوری چوری ماں کو فون کیا کرتا تھا۔ زندگی نے آزما آزما کے اسے لوہا بنا دیا۔

جب وہ جیل گیا، تب اس کی مسیں بھیگ رہی تھیں۔ وہ نوعمر لڑکا تھا۔ کچے ذہن کا نا سمجھ بچہ۔ جیل میں پانچ سال گزارنے کے بعد ہر نسل، ہر رنگ کے بندوں سے ملنے کے بعد اس پہ کیسے کیسے "رنگ" چڑھے ہیں؟ یہ تو ساتھ رہنے کے بعد پتا چلے گا۔

اس کی زندگی کے پانچ سال کی کہانی اتنی مختصر نہیں جو چند لائنوں میں سمیٹ سکوں۔ جو اس پہ بیت چکی ہے۔ اس داستان کو چند اوراق میں سمیٹا بھی نہیں جا سکتا شاید صفحے ختم ہو جائیں اور لفظ ہاتھ میں نہ آئیں۔ وہ کہتا ہے۔ "پانچ سالوں میں مجھے دو خوشی کی خبریں ملیں۔ جب میرا بھانجا ہوا اور جب میرا بھتیجا ہوا۔" اس نے جیل میں مٹھائیاں بانٹی تھیں۔

جس شب برادری میں بیٹھ کر مدعی نے راضی نامے کا اقرار کیا، اسی شب صلح کی اطلاع جیل میں بھجوا دی تھی اور پوری رات جیل میں جشن منایا گیا تھا۔ اس کے ساتھی کہتے ہیں کہ "خوشی اس بات کی ہے تم زندان سے نکل رہے ہو۔ غم اس بات کا ہے کہ ہم بچھڑ رہے ہیں۔ پھر بھی یہ بچھوڑا گوارا ہے ہمیں۔"

یہ الفاظ داد شاہ کی زندگی کے پانچ سالوں کا کرب بیان کرنے کے لیے بہت کم ہیں۔ پھر بھی میری اپنی بہنوں سے گزارش ہے۔ جو میرے دکھوں میں شریک رہیں۔ جن کی دعاؤں میں میرے ویر کا ذکر آیا۔ جن کی دعاؤں میں میرے داد کا نام آیا۔ جن کے لبوں نے میرے بھائی کی اسیری کے ختم ہونے کی دعا کی۔ جنہوں نے پچھلے پانچ سال سے میرے ساتھ رابطہ رکھا۔ میرے بھائی کے لیے رب کائنات سے رہائی مانگی۔ کوٹ چغتیے سے لے کر کراچی تک۔ پنجاب سے لے کر سندھ تک۔ اتنی طویل دعاؤں کے حصار میں رہنے والا سید شہزاد عباس (داد شاہ) اپنی بہنوں کی دعاؤں کے طفیل اتنی طویل مدت کے بعد عنقریب اپنی ماں سے ملنے آرہا ہے۔

وہ قارئین جو مجھے جانتے بھی نہیں، پھر بھی میرے لیے دعا گو ہیں اور وہ دوست جو مجھے جانتے ہیں اور میرے لیے دعا کا حصار کھینچتے ہیں۔ میں ان سب کی تہ دل سے شکر گزار ہوں۔

خصوصی طور پہ امتل آپی کی جنہوں نے خانہ کعبہ میں میرے بھائی کے لیے خصوصی دعا کی تھی۔ میں ان کی محبت کا اپنے معمولی الفاظ سے شکریہ ادا نہیں کر سکتی۔ سدرہ صدیقی، نرجس، فاطمہ گوندل، میرا پیارا بھائی گلریز حیدر اور حسن۔ میں آپ سب کا خواتین ڈائجسٹ کے توسط سے شکریہ ادا کرتی ہوں۔ آپ سب کے نام، میری ایک دعا۔

فضل خدا کا سایہ، تم پہ رہے ہمیشہ
ہر دن چڑھے مبارک، ہر شب بخیر گزرے

☆

شادی مبارک ہو

نازش لیاقت ہمراہ آصف جپال

بشریٰ گوندل

جب سے ہوئی ہے شادی، آنسو بہا رہا ہوں۔ آفت گلے پڑی ہے، اب تک نبھا رہا ہوں

قارئین کرام۔ کچھ لوگوں کے شادی کے حوالے سے ایسے ہی نظریات و خیالات ہوتے ہیں۔ جب خود شادی شدہ ہو جاتے ہیں تو دوسروں کو ڈراتے ہیں، روکتے ہیں کہ شادی نہ کرنا یارو پچھتاؤ گے سارى لائف۔ یا شادی ایسے لڈو ہو رہے جو کھائے پچھتائے، جو نہ کھائے پچھتائے۔ لیکن پھر بھی باز کوئی نہیں آتا، بھئی اگر پچھتانا ہی ٹھہرا تو کھا کے ہی پچھتائیں گے۔

آصف بھائی کی شادی ہمارے خاندان کی بہت بڑی خوشی تھی۔ ہم حیران ہی تو رہ گئے تھے جب سنا کہ آصف بھائی کی شادی ہو رہی ہے۔

بھائی کی شادی کا مسئلہ بڑے سالوں سے التوا کا شکار تھا۔ بہرحال شادی ہو گئی ہے۔

فرحت نے اسلام آباد سے فون کر کے مجھے یہ اطلاع دی تھی۔ وہ بہت خوش تھی۔

اڑتی اڑتی ایک خبر نے ہمارے ارمانوں پر اوس ڈال دی کہ وہ لوگ شادی پر صرف چند قریبی لوگوں کو ہی انوائیٹ کر رہے ہیں۔ ہیں۔ تو کیا ہم قریبی لوگ نہیں ہیں؟ افسوس کے ساتھ صدمہ بھی ہوا۔

ربیعہ اور شہریار نے ہمارے لیے اسٹینڈ لیا اور بائیکاٹ کا اعلان کر دیا کہ اگر ہماری خالہ لوگ نہیں آئیں گی تو پھر کوئی بھی نہیں۔ اور بچے اکثر اپنی بات منوا لیتے ہیں۔ سلیقے اور ہنر سے اور ضد سے۔ اور ہم جوش و خروش سے تیاری میں مصروف ہو گئے سر شام مہندی کے فنکشن میں شرکت لائٹ سا پروگرام۔ دونوں بھابھیاں، عظمیٰ اور کلثوم بھاگ دوڑ میں مصروف تھیں۔ کلثوم ہماری بڑی بہن ہیں اور عظمیٰ کزن۔ ارم نظر نہیں آرہی تھی، اعظم، شوکت اور آصف کی اکلوتی بہن ارم کو تو پیش پیش ہونا چاہیے تھا۔ پھر معلوم ہوا کہ ارم اپنی بیٹی کو تیار کر کے خود تیار ہو رہی تھی کہ اس کی دادی ساس کے انتقال کی خبر

آگئی۔ انا للہ وانا علیہ راجعون۔ زندگی کے ساتھ موت کا رشتہ برحق ہے۔

ارم سنتے ہی چلی گئی تھی' پھر جنازے کے بعد صہیب کے ہمراہ ہی لوٹی۔ آصف بھی جنازے میں شرکت کے لیے چلا گیا اور لوگ فنکشن کے لیے اس کو پوچھ رہے تھے۔ بڑی بوڑھی خواتین ہائے وائے کرنے لگیں کہ مایوں کے دولہا کو جنازے میں کیوں بھیج دیا؟

جنازے کے فوراً" بعد ارم' صہیب اور آصف آگئے۔

ہم پیلا دوپٹا گلے میں ڈال کر ــــ آصف بھائی کے ساتھ بیٹھ کر تصویریں بنوا رہے تھے۔

"ہم لوگ اگر شادی میں شامل نہ ہوتے تو یہ فوٹو شوٹ کون کراتا' ہے نا اعظم بھائی؟"

"ہاں جی ــ آپ کی بڑی مہربانی' اب جی بھر کے تصویریں بنوائیں۔" وہ ہنستے ہوئے خود بھی کیمرے کے سامنے آبیٹھے۔ ارم اور وہ تینوں بھائی اپنی دادی اور ابو کے ساتھ تصویریں بنوا رہے تھے اور اداس بھی تھے۔ یقیناً" خوشیوں بھری اس گھڑی میں اپنی امی اور ماموں کی کمی محسوس کر رہے تھے۔ ایسے خوشی کے موقعوں پر دنیا چھوڑ جانے والے شدت سے یاد آتے ہیں اور آنکھ نم ہو جاتی ہے۔

ارم کی بیٹی عدین اور شوکت بھائی کا ابراہیم بہت پیارے لگ رہے تھے۔

ربیعہ' بنیلہ' سحرش' مشاعل' حریم' ساریہ' نور' نوال' شہربانو چھوٹی لڑکیاں بڑی پیاری لگ رہی تھیں۔ فریش اور خوش باش بھی.... سب نے مل کر ڈانس کے ہلکے پھلکے مظاہرے کیے۔

"جن لوگوں نے زبردستی شادی میں شمولیت کی ہے' وہ بھی ذرا درمیان میں آئیں نا۔" اعظم بھائی ہماری طرف متوجہ تھے۔ پھر تمکنت اور عمر دونوں بہن بھائی نے عثمان بھائی کی کمی کو پورا کرنے کے لیے مل کر خوب صورت ڈانس کیا اور نازیہ' حسن اور زوہیب حسن کی یاد تازہ کردی۔

رات گئے تک محفل سجی رہی۔ صبح زبردست ناشتے سے فارغ ہو کر ہر کوئی تیار ہو رہا تھا۔ دولہا راجہ کسی روایتی ڈریس کے بغیر گلے میں پھولوں کا ہار ڈالے نظر لگ جانے کی حد تک خوب صورت لگ رہا تھا' ہر نظر میں ستائش تھی اور ہر لب پر دائمی خوشیوں کی دعا۔ شہریار چاچو کا شہ بالا بنا ہوا تھا۔

شفیع بھائی کی بیوی آمنہ سے ملاقات خوشگوار رہی۔ ریسٹورنٹ کے ہال میں فنکشن تھا۔ جلدی جلدی کرتے بھی آدھا دن گھر پہ ہی گزر گیا۔ جب ہال پہنچے تو وہی دیکھے بھالے جانے پہچانے تھوڑے سے لوگ تھے۔ ہاں البتہ صاف ستھرے اور بہت پرسکون ماحول میں کھانا کھایا گیا اور دیگر رسموں کے بعد چند گاڑیوں پر سوار ہو کر تھوڑے سے باراتی ــ بھلوال روانہ ہوئے۔ شادی ہال میں ہمارا شاندار استقبال ہوا اور وی آئی پی پروٹوکول دیا گیا۔

نازش اور مہوش دونوں بہنیں بہت پیاری لگ رہی تھیں' نازک' معصوم اور خوب صورت.... چہروں پر آنسوؤں کی لکیریں' غم کے نقوش اور ضبط کی کوشش میں بار بار بھیگتی آنکھیں دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ جانے والوں کی یاد کتنی زور آور ہوتی ہے۔ ضبط کرتے کرتے بھی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔ ان کی امی بھی اداس' غم زدہ اور بہت پریشان لگ رہی تھیں۔ کیونکہ کچھ ہی عرصہ قبل نازش کے ابو کی وفات ہوئی تھی۔

ابھی رخصتی میں کچھ دیر تھی' لیکن شام گہری ہو رہی تھی' سو ہم گھر واپس آگئے' اس دعا کے ساتھ کہ اللہ آصف بھائی اور نازش کو ہمیشہ شاد و آباد اور خوش باش رکھے اور سب خاندان والوں کی خوشیاں قائم رکھے۔ (آمین)

☆

امت الصبوح

انوکھا شہر

ہندوستان کی تاریخ شہنشاہوں' بادشاہوں' راجوں اور مہاراجوں' نوابوں اور حکمرانوں کے کارناموں' فتوحات' شکستوں' مہمات اور سلطنتوں اور رجواڑوں کے عجیب و غریب حالات' واقعات اور حیرت انگیز انکشافات سے اٹی پڑی ہے۔

ناصر الدین خلجی' سلطان غیاث الدین خلجی کا بیٹا تھا۔ اقتدار کی ہوس میں اس نے اپنے باپ کی پیرانہ سالی اور اس کی طوالت عمر سے تنگ آکر کئی بار زہر دینے کی کوشش کی۔ آخر کار بوڑھے باپ کے قتل کے بعد ناصر الدین خلجی نے من مانی شروع کر دی اور اس کے مہمات پسند اور رنگین مزاج ذہن نے ایک انوکھا منصوبہ بنایا۔ اس نے ایک انتہائی خوب صورت اور دیدہ زیب شہر بنانا شروع کر دیا۔ جس کے کوچہ و بازار' روشیں' خیابان' باغ اور تالاب' نہریں' آبشار' جھیلیں' جھرنے' محرابیں' خوب صورت مکانات' محلات اور در و بام بہترین صناعی کے شاہکار تھے۔ اس شہر کی خوب صورتی کا کوئی ہمسر نہ تھا۔

اس شہر کے انتظام و انصرام اور آبادکاری کے لیے اس نے اپنی مملکت کی تمام خوب صورت عورتوں اور نوخیز دوشیزاؤں کا چناؤ کیا۔ ان کو انتظامی خدمات اور عہدے سونپے اور انہیں اس شہر میں آباد کیا۔ اس شہر میں مردوں کا داخلہ ماسوائے بادشاہ کے ممنوع تھا ـــــ ملکہ اور شہزادوں کے خوب صورت محل اور حویلیاں سنہری رنگ کے تھے' جبکہ دوسری خواتین عمال اور وزارتی عہدوں پر فائز خواتین کے مکانات نقرئی رنگ کے تھے۔ زنانہ پولیس اور محافظ فوجی خواتین کے مکانات سنگ سرخ سے بنائے گئے تھے۔ غرض کہ تاجر' دکان دار' اساتذہ' طالبات' کاریگروں کی رہائش گاہیں مختلف دیدہ زیب رنگوں سے سجی تھیں۔

اس شہر بے مثال میں کوئی مسجد' مقبرہ یا خانقاہ نہیں تھی۔ مدرسے' مکتب اور درس گاہیں تھیں مگر وہاں علم و ادب کے بجائے رقص و موسیقی' آرائش گیسو' افزائش حسن' زیورات سازی' عطر سازی اور فنون لطیفہ کی تعلیم و تدریس دی جاتی تھی۔ ہر سال فوجی پریڈ' مقابلہ حسن اور فیشن پریڈ ہوا کرتی تھی۔ بادشاہ اور ملکہ کو سلامی دی جاتی تھی اور ان کی خدمت میں نذریں پیش کی جاتی تھیں۔

جان بچانے کا انعام اور سزا

بادشاہ عیش و عشرت کا دلدادہ تھا۔ اس کی شراب نوشی اور رنگین روز و شب کے افسانے مشہور تھے۔ ایک مرتبہ حوض خاص میں نہاتے ہوئے بادشاہ سرمستی کی کیفیت میں غوطہ لگاتے ہوئے حوض کے گہرے حصے کی طرف چلا گیا اور ڈبکیاں کھانے لگا۔ پانی' ناک اور حلق کے راستے جسم کے اندر چلا گیا۔ وہ ڈوبنے لگا تو اس کو نکالنے کی کوشش یوں کامیاب نہ ہو سکی کہ وہ بری طرح ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ کوئی اس کے قریب نہ آسکا۔ جب وہ بے ہوش ہو گیا اور اس کا جسم غرق ہو گیا تو ماہر غوطہ خور کنیزوں نے اسے بالوں سے پکڑ کر باہر نکالا اور بڑی کوشش کے بعد اس کو ہوش میں لایا گیا۔ کئی گھنٹے بعد جب اس کے ہوش ٹھکانے آئے اور پورا واقعہ اس کے گوش گزار کیا گیا تو اس نے پہلے تو جان بچانے پر ان وفادار کنیزوں کو انعام و اکرام سے نوازا' لیکن پھر اس قصور پر کہ بادشاہ کے بال پکڑ کر

کھینچنے سے اس کی اہانت ہوئی' ان سب وفادار کنیزوں کو جنھوں نے اس کی جان بچائی تھی' قتل کرادیا۔ دوسری مرتبہ جب ایسا ہی واقعہ پیش آیا تو کسی نے اسے باہر نکالنے کی جرات نہ کی اور بادشاہ سلامت غوطے کھا کھا کر ڈوب گئے اور تہہ نشین ہوگئے' حتیٰ کہ بادشاہ کی موت واقع ہوگئی' لیکن کسی نے اس کی موت کے یقین سے پہلے اسے نکالنے کی ہمت نہ کی۔

بادشاہ کی آنکھ بند ہوتے ہی عورتوں کا یہ انوکھا شہر اپنی موت آپ مرگیا۔ عالی شان محلات' حویلیوں اور مکانات پر امرا اور روسا قابض ہوگئے۔ عورتوں کے نظم و نسق کا تمام نظام درہم برہم ہوگیا۔ اثر و رسوخ امرا و روسا اور اعلا درباری عہدے دار اپنی من پسند اور خوب صورت عورتوں کے مالک بن گئے۔ شہر کے گلی کوچے ویران ہوئے۔ باغات' شکار گاہ اور محلات بھی ویران ہوگئے اور صنف نازک پر مشتمل پندرہ سے بیس ہزار آبادی والا شہر ویران اور کھنڈر بن گیا اور اس کی داستان قصہ پارینہ ہوگئی۔

شیر شاہ سوری نے 1540ء میں قنوج کی جنگ میں چوسر کے مقام پر ہمایوں کو شکست دے کر سوری حکومت کی بنیاد ڈالی تھی۔ وہ قرون وسطیٰ کا ایک بہت بڑا منتظم حکمراں تھا۔ حکومت سنبھالتے ہی اس نے نظم و نسق' سماجی بہبود اور عدل و انصاف کے قیام کے لیے ملک کو انتظامی حلقوں میں تقسیم کردیا۔ اپنے ملک کے چپے چپے سے واقف ہونے اور لوگوں کے حالات جاننے کے لیے اس نے ملک کے طول و عرض کے دورے شروع کیے اور سفر کرتے کرتے وہ ریاست بھوپال میں مالوے کے شہر مانڈو پہنچ گیا۔ شہر کے مقدم نے علاقے کی تاریخ اور حالات بیان کرتے ہوئے اس عجیب و غریب شہر کا بھی ذکر کیا جو ناصر الدین خلجی نے آباد کیا تھا اور اس کے تاریک پہلو اور گھناؤنے باب کے سبب مورخین نے اس کو عوام سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی تھی۔ البتہ مقامی لوگوں اور ان کی نسلوں کو اس شہر اور اس کے بدنام ماضی کے حالات بخوبی معلوم تھے۔ مقدم کے اہل کاروں نے شیر شاہ سوری کو اس کے بانی کی قبر پر لا کھڑا کیا۔

شیر شاہ سوری حالات سنتا جاتا تھا اور غم و غصے سے پیچ و تاب کھاتا جاتا تھا۔ پھر اسے ضبط کا یارا نہ رہا اور اس نے اپنے مصاحبوں اور سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ اس مزار کی ڈنڈوں سے خبر لیں اور اس کی شکل بگاڑ دیں اور آئندہ کوئی ادھر کا رخ نہ کرے۔

جہانگیر نے بھی شیر شاہ سوری کے اتباع میں اپنے جوتے سے قبر کی خبر لی' جس کے بعد اس کے اہل کاروں اور مصاحبوں نے ٹھوکروں' لاٹھیوں اور لاتوں سے قبر توڑ پھوڑ دی اور سب مردہ بادشاہ پر باآواز بلند لعنت اور نفرین کرنے لگے۔ شہنشاہ جہانگیر نے جو پہلے ہی غیظ و غضب سے بھرا ہوا تھا' حکم دیا کہ اس بدبخت بادشاہ کی قبر کھود کر اس کی لاش کو جلا دیا جائے۔ بہرکیف اپنے ایک مشیر کے سمجھانے پر بادشاہ نے اپنی رائے بدل دی اور لاش کو دریا برد کردیا۔

شاہی محل اور دربار

بادشاہ اور ملکہ کے دربار خاص کے ستون' سنگ

مرمر کی محرابیں اور پائے دان آبنوس اور ہاتھی دانت کی صناعی کا نمونہ تھے۔ ملکہ عالیہ اور شہزادیوں سے لے کر اعلا سے ادنیٰ کنیزوں کے لباس انتہائی دیدہ زیب اور فاخرانہ تھے اور حسب مراتب مختلف معیار' رنگوں اور مختلف نمونوں کے ملبوسات پر مبنی تھے۔ ہر درجے کی کنیزوں اور خادماؤں کی خوشبویات اور عطر مختلف اور الگ قسم کے ہوتے تھے۔ دیوان خاص اور دیوان عام ان متنوع اور مسحور کن خوشبوؤں سے ہمیشہ مہکتے رہتے تھے۔

ملکہ معظمہ اور بادشاہ کے لیے زرنگار تخت اور مرصع کرسی رکھی رہتی تھی۔ جس کے نیچے چاندی کے سکوں کا چبوترہ تھا۔ مقابلہ حسن کے انعقاد کے بعد جو دوشیزائیں بادشاہ کی نظروں میں جچ جاتیں' ان کو اعلا اور مرکزی عہدوں پر ترقی دے دی جاتی اور بادشاہ سال بھر ان کے ساتھ رنگ رلیاں مناتا تھا۔

بادشاہ کی تفریح کے لیے کئی میل کے رقبے پر پھیلی ایک شکار گاہ بنوائی گئی تھی۔ جس میں جنگلی پرندے' چوپائے **مثلاً** ''ہرن' بارہ سنگھے' نیل گائے' جنگلی بکرے اور سانبھر وغیرہ چھوڑے گئے تھے۔ اس میں تربیت یافتہ شکاری خواتین کا ایک عملہ موجود رہتا تھا۔ ایک بہترین نشانہ باز چست و چالاک خواص میر شکار تھی۔

عیدین کے موقع پر مینا بازار منعقد کیا جاتا تھا۔ جس میں دکانوں کے خوب صورت اسٹال لگائے جاتے تھے۔ اس پورے بازار کو رنگ برنگی جھنڈیوں' جھاڑ' فانوس اور پھولوں سے سجایا جاتا تھا۔ طرح دار' خوب صورت اور ماہر تھوک اور خوردہ فروش خواتین دکان دار اعلا طبقے کی خواتین کو خریداری کی طرف مائل کرتی تھیں۔ یہ بازار تین دن اور بعض مرتبہ ایک ہفتے جاری رہتا تھا۔ ایک دن بادشاہ اور ملکہ کے دورے اور خریداری کے لیے مخصوص ہوتا تھا۔ بڑھتے ہوئے شہر کی آبادی پندرہ ہزار سے بھی تجاوز کرگئی۔

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

آم کا بھرواں اچار

اجزا :

کچے آم	ڈھائی کلو
بھنی سونف	آدھا پاؤ
میتھی دانہ	چھ کھانے کے چمچے
ثابت دھنیا	چار کھانے کے چمچے
ہلدی، پسی مرچ	ایک ایک چھٹانک
کلونجی	تین کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ
سرسوں کا تیل	ڈھائی لیٹر

ترکیب :
سخت گٹھلی والی کیریوں کے چار، چار ٹکڑے اس طرح کریں کہ وہ بالکل الگ نہ ہو جائیں۔ جڑی رہیں۔ گٹھلی نکال کر پھانکوں پر نمک اور ہلدی لگا کر چوبیس گھنٹوں کے لیے چھوڑ دیں۔ نمک، ہلدی لگانے سے کیریاں پانی چھوڑ دیں گی۔ وہ اضافی پانی نکال دیں۔ سونف، میتھی، کلونجی اور ثابت دھنیا موٹا موٹا کوٹ لیں اور پھانکوں میں یہ مسالا بھر دیں۔ مرتبان میں ڈال کر اوپر سرسوں کا تیل ڈال دیں۔ مرتبان کو تین، چار دن دھوپ لگائیں۔ پھر اچار کو کسی برتن میں نکال کر اچھی طرح ہلائیں۔ دوبارہ مرتبان میں ڈال کر مزید دو دن کے لیے رکھ دیں۔ آم کا مزے دار بھرواں اچار تیار ہے۔

خشخاش گوشت

اجزا :

گوشت	ایک کلو
لہسن ادرک پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
پیاز	تین عدد
پسی خشخاش	آدھا کپ
زیرہ، مرچ	ایک ایک چائے کا چمچہ
گرم مسالا، ہلدی	آدھا آدھا چائے کا چمچہ
دہی	تین چوتھائی کپ
پسی مونگ پھلی	ایک کھانے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :
گوشت میں دہی، نمک، مرچ، ہلدی، زیرہ، لہسن ادرک پیسٹ مکس کر کے رکھ دیں۔ تیل میں پیاز سنہری کریں اور سبز الائچی کے ساتھ گوشت ڈال کر ہلکی آنچ پر پکائیں۔ گوشت گل جائے تو خشخاش، مونگ پھلی اور گرم مسالا ڈال دیں۔ تیل الگ ہونے تک پکائیں پھر بھون لیں۔ ایک کپ پانی ڈال کر شوربہ بنائیں اور پانچ منٹ تک ہلکی آنچ پر رکھ دیں۔ پھر نان یا چپاتیوں کے ساتھ پیش کریں۔

گڑمبا

اجزا :

کیریاں	دو عدد
گڑ	آدھی پیالی
لونگ، الائچی	چار، چار عدد
سوجی	تین کھانے کے چمچے
گھی یا تیل	دو کھانے کے چمچے

ترکیب :
تیل گرم کر کے لونگ کڑکڑائیں اور کیری کی قاشیں کاٹ کر ہلکی سی تل کر نکال لیں۔ اسی تیل میں سوجی اور الائچی ڈال کر ہلکا سا بھونیں، پھر دیگچی چولہے سے اتار لیں۔ پانچ منٹ بعد چار کپ پانی ڈال کر آہستہ آہستہ چمچہ ہلائیں، تاکہ گٹھلیاں نہ بنیں۔ کیری اور گڑ ڈال کر دوبارہ ہلکی آنچ پر پکائیں۔ جب گڑ گھل جائے تو سمجھیں گڑمبا تیار ہے۔

آلو بخارے کا مربہ و شربت

اجزا :

آلو بخارے	تین پاؤ
چینی	سوا کلو
املی	ایک چھٹانک
کالا نمک	حسب ضرورت

آدھا کلو آلو بخارے دھو کر ایک گلاس پانی کے ساتھ ہلکی آنچ پر پکائیں۔ بالکل نرم ہو جائیں تو ڈوئی سے دبا کر سارا گودا نکال لیں۔ ململ کے کپڑے سے چھان لیں۔ چھنے ہوئے آمیزے میں آدھا کلو چینی ڈال کر دوبارہ پکائیں۔ پانی خشک ہو جائے، آمیزہ یکجان اور گاڑھا ہو جائے تو اتار لیں۔ ٹھنڈا کر کے محفوظ کر لیں۔ آلو بخارے کا مزے دار مربہ تیار ہے۔

بقیہ ایک پاؤ آلو بخاروں کو املی اور تین گلاس پانی کے ساتھ پکائیں۔ گاڑھا ہو جائے تو ململ کے کپڑے سے چھان لیں۔ چھنے ہوئے پانی کو بقیہ تین پاؤ چینی کے ساتھ دوبارہ اتنا پکائیں کہ ایک تار کا قوام بن جائے۔ اتار کر ٹھنڈا کر لیں۔ بوقت استعمال کالا نمک اور برف ڈال کر پیش کر دیں۔

خوبانی کا میٹھا

خشک خوبانی	ایک کپ
شکر	آدھا کپ
کریم	پانچ کھانے کے چمچے
بادام	حسب ضرورت

خوبانی کو دو ٹکڑے کر کے تھوڑے سے پانی میں چھ یا سات گھنٹوں کے لیے بھگو دیں، پھر اسی پانی کے ساتھ ہلکی آنچ پر دس منٹ تک پکائیں۔ نرم ہو جائے تو شکر ڈال کر ڈھکن ڈھک دیں۔ چاہیں تو بلینڈر میں ڈال کر باریک پیسٹ بنا لیں، ورنہ ہاتھ سے ہلکا ہلکا میش کر لیں۔ پیالے میں نکال کر ٹھنڈا کریں، پھر کریم اور کترے ہوئے بادام چھڑک کر سجاوٹ کریں۔

موتیوں جیسے دانت

☆ آپ جو بھی ٹوتھ پیسٹ استعمال کرتے ہیں' اس معمول کے ٹوتھ پیسٹ کو برش پر لگانے کے بعد اس پر برائے نام بیکنگ سوڈا چھڑک لیں۔ واضح رہے کہ ایک سوڈا وہ ہوتا ہے جو کپڑوں کی دھلائی میں استعمال ہوتا ہے جسے زیادہ واضح الفاظ میں کاسٹک سوڈا کہا جاتا ہے' اسے کھانے پینے میں یا دانتوں پر لگانے میں ہرگز ہرگز استعمال نہ کریں۔ دوسری قسم کا سوڈا جسے کھانے والا سوڈا کہتے ہیں اور عموماً" اسے روٹی اور دوسری اشیائے خورونوش میں استعمال کیا جاتا ہے' اسے آپ ٹوتھ پیسٹ پر چھڑک کر ہفتے میں صرف ایک بار تقریباً" دو منٹ تک دانتوں پر برش کریں تو آپ کو فرق واضح نظر آئے گا۔

☆ کینو یا سنگترے کے چھلکے عموماً" لوگ ضائع کردیتے ہیں۔ آپ اس چھلکے کے اندرونی سفید حصے کو اپنے دانتوں پر پانچ منٹ تک ملیں۔ آپ کو فوری طور پر پتا چل جائے گا کہ آپ کے دانت پہلے سے زیادہ چمک دار ہوگئے ہیں۔

☆ ان دنوں بازار میں اسٹرابیری وافر دستیاب ہے۔ کھانے کے علاوہ آپ ایک اسٹرابیری اپنے دانتوں کی صفائی کے لیے بھی استعمال کرلیں۔ ایک اسٹرابیری کو دانتوں سے کچلیں اور اسے دس منٹ تک دانتوں پر ملیں' آپ کو فوری فرق محسوس ہوگا۔

☆ ناریل یا کھوپرے کے تیل میں تھوڑا سا بیکنگ سوڈا شامل کریں اور اس آمیزے سے اپنے دانتوں کو معمول کے مطابق برش کریں۔ اس سے آپ کے دانت سفید تر بھی ہوں گے اور مضبوط بھی ہوجائیں گے۔

☆ کینو اور سنگترے موسمی پھل ہیں۔ مگر کیلا ہر موسم میں دستیاب ہوتا ہے۔ آپ کیلے کے چھلکے کے اندرونی حصے کو بھی اپنے دانتوں پر مل سکتے ہیں۔ چھلکے کو ملنے کے بعد پندرہ منٹ تک کلی نہ کریں' بعد میں دانت صاف کرلیں۔ دانت زیادہ چمک دار نظر آئیں گے۔

☆ پلاؤ اور بریانی کو خوشبودار بنانے کے لیے جو خاص قسم کے خشک پتے استعمال کیے جاتے ہیں' انہیں آپ "تیج پات" کے نام سے جانتے ہوں گے۔ یہ پتے دانتوں کو سفید اور چمک دار بنانے میں بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ایک پتے کو دانتوں سے چبا کر پیسٹ جیسا بنالیں اور پھر اسے انگلی سے ملیں' پھر کلی کرکے پہلے اور موجودہ دانتوں کا فرق ملاحظہ کریں۔

وزن کم کرنے کے لیے

کریلا موسم گرما کی سبزی ہے۔ خواتین یہ بات پڑھ کر بہت حیران ہوں گی کہ کریلا موٹاپا دور کرتا ہے۔ آپ اس کی سبزی بنا کر ہفتے میں تین بار کھائیں۔ کریلے سکھا کر اس کا سفوف بھی طبیب کی ہدایت کے مطابق روزانہ کھایا جاتا ہے۔ تاہم یہ سفوف دو گرام سے زیادہ نہ استعمال کیا جائے اور اپنے ڈاکٹر سے مشورے کے بعد ہی کھایا جائے۔ اس کے استعمال سے وزن کم ہوتا ہے اور جلد شفاف ہوتی ہے۔